رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

سالنامہ

جنوری ۱۹۶۳ء

۹۶

مدیر
محمد طفیل

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
ممالکِ غیر سے ۲۵ روپے

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

طلوع

لت کوئی بھی ہو، بُری ہوتی ہے۔ اگر کوئی لت لگی نہ ہو۔ تو زندگی کا لطف بھی کیا۔ اس اعتبار سے خوش بخت ہوں کہ ایک چھوڑ کئی کئی لتیں لگا رکھی ہیں۔

پچھلے دنوں دوست احباب "تعزیت" کے لیے آنے لگے ــــ "بھئی کیا بات ہے۔ اب کوئی خاص نمبر نہیں آ رہا؟" ــــ میں جواب دیتا رہا ــــ "بہت سوچ چکی، تھک گیا ہوں، کوئی موضوع بھی تو ہو۔ جن جن نمبروں کا ڈول ڈال رکھا ہے۔ وہی مکمل نہیں ہوتے۔ کیا کروں؟ ــــ میں تو خود شوق اور بے بسی کے درمیان معلق ہوں"۔

یاروں نے مشورہ دیا: "اور کچھ نہیں تو ہر سال ایک سالنامہ ہی نکال دیا کریں"

چلو، یہ بات، اس نمبر کے نکالنے کے لیے سہارا بن گئی ــــ وہی لت والی بات!

یوں تو نقوش کے پہلے بھی سالنامے نکلے۔ مگر یہ پہلا نمبر ہے۔ جسے میں خود سالنامہ سمجھ کر پیش کر رہا ہوں۔ ایک آدھ دفعہ کے علاوہ، پہلے تو یہ ہوا کہ بغیر کسی پلان کے، اگر زیادہ چیزیں جمع ہو گئیں تو ادارہ نے پرچے کی پیشانی پر سالنامہ کا لفظ لکھ دیا۔ اب کے ایسا نہیں ہوا۔ اچھا یا بُرا، جو کچھ بھی ہوا۔ خوب سوچ سمجھ کر ہوا۔ ذرا آپ بھی تو دیکھیں کہ اس سالنامہ پر زرِ کثیر صرف ہوا ہے۔ یا کثیر خونِ دل، یا کچھ بھی نہیں؟ ــــ میں اپنی طرف سے کیا کہوں، چُورا ہو چکا ہوں۔ اگر کچھ بھی سکت ہوتی، تو باتیں کرنے کی بجائے، آسمان سے اور تارے نہ توڑتا ــــ اب ذرا اطمینان ہے تو یہ، کہ میرا قلم گُنگ بھی ہوا تو نقوش کے صفحات بولیں گے۔

منٹو کہا کرتے تھے "جب تک میرا لکھا ہوا افسانہ چھپ نہیں جاتا۔ میں یہی سوچتا ہوں میرے ہاں میت رکھی ہے" میں بھی اپنی اور اپنے دوستوں کی کاوشوں کو جب تک آپ کے حوالے نہیں کر لیتا۔ چین نہیں پڑتا۔ بے کل رہتا ہوں۔ جان سُولی پہ لٹکتی رہتی ہے۔

اُفوہ! ــــ خونِ دل کی سبیل لگانا بھی کتنا دشوار ہے!

محمد طفیل

دعوتِ سفر

جوش ملیح آبادی

آؤ کعبے سے اٹھیں سوئے صنم خانہ چلیں
بخُمِ فقر و بہ پیمانۂ شاہانہ چلیں

درخورِ کیف نہیں موردِ مگس کی دنیا
ساتھ بلقیس کو لیں اور سلیمانہ چلیں

کانپ اُٹھے حرمِ سترِ عفافِ توحید
یوں پئے سجدۂ سنگِ درِ بتخانہ چلیں

آہِ شب گیر و مناجاتِ سحرگاہی کو
نعرۂ ہُو پہ نچاتے ہوئے خمخانہ چلیں

مشعلِ حُسن کے اطراف میں سناٹا ہے
آؤ سینوں میں لیے آتشِ پروانہ چلیں

آؤ اے زمزمہ سنجانِ سراپردۂ گل
بہ ہوائے نفسِ تازۂ جانانہ چلیں

بُت اگر راہ میں مل جائیں جھکیں بہرِ سلام
اور خدا راستہ روکے تو حریفانہ چلیں

تا نہ محسوس ہو واماندگیٔ راہِ دراز
زلفِ پُرپیچ کا چھیڑے ہوئے افسانہ چلیں

پھینک کر سبحہ و سجادہ و دستار و کلاہ
بہ رباب و دف و طنبورہ و پیمانہ چلیں

بادہ و ساغر و طاؤس و غزل کے ہمراہ
ذرہ ذرہ پہ لٹاتے ہوئے میخانہ چلیں

خاک قدموں سے اڑے سر پہ دھنک بن جائے
یوں سوئے گل کدۂ عشوۂ جانانہ چلیں

فرشِ صحرا پہ مچل جائے جوانی کی ترنگ
ثبت کرتے ہوئے یوں لغزشِ مستانہ چلیں

رخصت اے بندہ خرامی کہ وہ دن آپہنچا
جس پہ جھکتے تھے اب اس خاک پہ یزدانہ چلیں

آؤ پھر جوشؔ کے ہمراہ دو عالم کو لیے
خدمتِ پیرِ مغاں میں پئے نذرانہ چلیں

فراق گورکھپوری

○

یہ گھاٹیاں یہ اُداسی یہاں نہ باندھو ناؤ
یہ اور دیس ہے ساتھی، یہاں نہ باندھو ناؤ

دعا کریں گے مناظرِ کنارِ دریا کے
سفر ہی میں ہے بھلائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

فلک کو آہ کہ جل تھل یہاں ہیں ڈانواڈول
زمیں خلاف ہے بھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

تمھارے آتے ہی دیکھو جبینِ ساحل پر
ہزار ہا شکن آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

یہاں کی آب و ہوا میں ہے اور ہی بو باس
یہ سرزمیں ہے پرائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

یہ باندھ، گھاٹ کی یہ سیڑھیاں، ستون و فصیل
نہیں ہیں خطرے سے خالی یہاں نہ باندھو ناؤ

ڈبو نہ دیں ہیں یہ گیت قربِ ساحل سے
جو دے رہے ہیں سنائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

جو بیڑے آئے تھے اس گھاٹ تک ابھی اُن کی
خبر کہیں سے نہ آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

اگرچہ ساتھیو ہم نے یہاں تک آنے میں
بڑی مصیبت اُٹھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

یہ مانتا ہوں کہ پہنچے ہیں اس ٹھکانے تک
بصد ہزار [illegible] یہاں نہ باندھو ناؤ

رہے ہیں جس سے شناسا یہ آسماں، وہ نہیں
یہ وہ زمیں نہیں بھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

قریب آئے ہیں جب ہم، تو بازگشت ندا
ہمارے کانوں میں آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

یہاں کی خاک سے ۔ ہم بھی مشام رکھتے ہیں
وفا کی بُو نہیں آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

یہاں سے دور بہت دور ساتھیو ہم کو
بلاتی ہے کوئی وادی، یہاں نہ باندھو ناؤ

جو سرزمینِ ازل سے ہمیں بلاتی ہے
وہ سامنے نظر آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

ق

ہم اپنے آپ کو پا جائیں گے پہنچ کے وہاں
ابھی بڑھے چلو بھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

نظر فریب اشارے وہ دستِ ساحل کے
وہ لنگروں کی دہائی، یہاں نہ باندھو ناؤ

سوادِ ساحلِ مقصود آ رہا ہے نظر
ٹھہرنے میں ہے تباہی، یہاں نہ باندھو ناؤ

جہاں جہاں بھی ہمیں ساحلوں نے للچایا
صدا فراق کی آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

اثرؔ لکھنوی

(۱)

گلچینیٔ جمال کا لپکا بھی چھوڑ دے
وہ جلوہ گر ہو اس کی تمنا بھی چھوڑ دے

نقشِ خودی کو دل سے مٹانے کے ساتھ ساتھ
ذوقِ سجود ناصیہ فرسا بھی چھوڑ دے

ہستی میں آپ نشہ ہے کیف و سرور ہے
اے رند شغلِ بادہ و مینا بھی چھوڑ دے

اُس کے حضور شرحِ تمنا تو اک طرف
عرضِ نیازِ عشق کا سودا بھی چھوڑ دے

ترکِ تعلقات کی اتنی تو مشق کر
اُڑ کر بگولہ دامنِ صحرا بھی چھوڑ دے

کندہ ہے لوحِ دل پہ جو اک نقشِ نازنیں
اُس کو بہار، ذوقِ تماشا بھی چھوڑ دے

مانوس ہو کے لیلیٔ حسنِ خیال سے
بڑھ کر رہیں خاک اُڑانا بھی چھوڑ دے

منزل وہ عشق کی ہے کہ اندازہ ہو اگر
ناز اپنی رفعتوں پہ ثریا بھی چھوڑ دے

کیسی ہوس کہ صبحِ سعادت طلوع ہو
اے بے خبر خیالِ مسیحا بھی چھوڑ دے

تسلیمِ عاشقی میں نہیں دخلِ آرزو
اے دل خیالِ عرضِ تمنا بھی چھوڑ دے

اے شاہدِ جمال بجا ہے ترا حجاب
لیکن مجھی سے مجھ کو چھپانا بھی چھوڑ دے

پردہ دری نہ ٹھہریں کہیں پردہ داریاں،
کوئی نہ کوئی نقش ہویدا بھی چھوڑ دے

نظارہ ہے محال جو تیرے جمال کا
تو پھر خطا معاف سنورنا بھی چھوڑ دے

پابندیوں سے اور بڑھیں گی درشتیاں،
اس گرگِ نفس کو کبھی تنہا بھی چھوڑ دے

آوارہ مثلِ سیل ہو مٹنے کے واسطے
سرگشتگی کے شوق میں دریا بھی چھوڑ دے

عقل اور عشق شیر و شکر ہو چکے اثرؔ
کیونکر کہوں کہ دونوں کو یکجا بھی چھوڑ دے

فیض احمد فیض

○

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لُٹا دیا

میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

ادھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض صاحب کی یہ غزل ایک روزنامہ میں بھی چھپ گئی ہے۔ اس کے باوجود ہم اسے چھاپ رہے ہیں تاکہ یہ ادبی حلقوں تک بھی پہنچ جائے۔ (ادارہ)

حفیظ ہوشیارپوری

○

نقشِ ہستی معجزہ ہے شوخیٔ تدبیر کا
نام ہوتا جا رہا ہے خامۂ تقدیر کا

زندگی میں زندگی کے راز کا جویا ہوں میں
خواب ہی میں منتظر ہوں خواب کی تعبیر کا

کس کی سعیٔ نارسا کا عکس ہے افلاک پر
کہکشاں پر کیوں گماں ہوتا ہے جوئے شیر کا

ہو گیا کچھ اور روشن مطلعِ صبحِ جمال
اُن پہ احساں ہے مرے دستِ گریباں گیر کا

تو مری نظروں کا اعجازِ مسیحائی تو دیکھ
نو بنو ہے دمبدم عالم تری تصویر کا

یہ طلسمِ بے حسی ٹوٹے کسی صورت حفیظ
کاش برپا ہو کوئی ہنگامہ دار و گیر کا

احمد ندیم قاسمی

○

عام ہو جائے نہ میرے بتِ سیم فام کا نام
گردشِ چشم کو دوں گردشِ ایّام کا نام

نام بدنام ہے نکہت کا، مگر موجِ صبا
چھپ رہی ہے مرے محبوبِ گل اندام کا نام

وصل کے بعد کی تنہائی بھی اک دنیا ہے
لوگ آغاز کو دے دیتے ہیں انجام کا نام

شب نہ کٹتی، تو نئی آگ نہ جلتی دل میں
صبح کی ساری شرارت ہے، مگر شام کا نام

دل کی چیخوں میں سنائی نہیں دیتا کچھ بھی
شبِ خاموش ہے شاید اسی کہرام کا نام

آسماں کچھ بھی نہیں، عجزِ بصارت کے سوا
نارسائی ہے محبت کی ـــ لبِ بام کا نام

کتنے معصوم ہیں انساں، کہ بہل جاتے ہیں
اپنی کوتاہی کو دے کر غم و آلام کا نام

ایک لمحے کو رُکا ہوں تو افق پھیل گیا
اب تو مر کر بھی نہ لوں گا کبھی آرام کا نام

یوں مسلماں تو بہت ہیں، مگر اب تک نہ سنا
اک مسلماں سے بھی، اک پیروِ اسلام کا نام

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ "ندیم"
میرا کردار کا کردار ہے، اور نام کا نام

بارکش

مجید امجد

کھنچتے پہیے، پتھ پتھریلا، چلتے بجتے سُم
تپتے لہو کی رَو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان،
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنور! ترا یہ جتن،
کالی کھال کے نیچے، گرم، گٹھیلے ماس کا مان!

لیکن تیری اُبلتی آنکھیں، آگ بھری، پُر آب،
سارا بوجھ اور سارا کشٹ، ان آنکھوں کی تقدیر،
لاکھوں گیانی من میں ڈوب کے ڈھونڈیں جگ کے بھید،
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے دنیا کی تصویر

مجروح سلطان پوری

○

دستِ پُرخوں کو کفِ دستِ نگاراں سمجھے
قتل گہ تھی جسے ہم محفلِ یاراں سمجھے

کچھ بھی دامن میں نہیں خارِ ملامت کے سوا
اے جنوں ہم بھی کسے کوئے بہاراں سمجھے

ٹوٹے دھاگے ہی سے کرتے ہیں رفو چاک جگر
کون بے چارگیٔ سینہ فگاراں سمجھے

ہاں وہ بیدرد تو بیگانہ ہی اچھا یارو
جو نہ توقیر غمِ دردگساراں سمجھے

خندہ زن اُس پہ رہے حلقۂ زنجیرِ جنوں
جو نہ کچھ منزلتِ سلسلہ داراں سمجھے

توڑ دیں ہم جو نہ تلوار تو کہیے مجروح
تیغ زن کیا ہنرِ زخم شعاراں سمجھے

شاد عارفی

○

مشکل سے اُس بُت کی قسمیں — دو سچّی ہوتی ہیں دس میں
کاش مرا دل ہوتا بس میں — ورنہ اُس محفل کی رسمیں
لڑنے کا الزام نہ دیجے — ملتی ہیں نظریں آپس میں
خنجر سے شمشیر بنے گا — وہ ظالم دو چار برس میں
اُس کافر پہ آئی جوانی — اور جوانی کس کے بس میں
یہ پردہ یہ چلمن کب تک — پھول نہیں کانٹوں کے بس میں
مے بن کر کیوں آجاتی ہے — تلخی انگوروں کے رس میں
وقت انھیں جھٹلا دیتا ہے — سب کھاتے ہیں سچّی قسمیں
دشمن کو دھوکا مت دیجے — کھا کر میرے سر کی قسمیں
مجبوری میں چند اشارے — طے کر سکتے ہیں آپس میں

شاد "بڑے شاعر"... کھاتے ہیں
"اُس کا جھوٹا"... "اُس کی قسمیں"

شاؔد عارفی

○

غم کو رُسوا سے حکایت کیا کریں　　کافرو۔ "کفرانِ نعمت" کیا کریں
نوجوانوں کو نصیحت کیا کریں　　ق　　لازمی شے ہے محبت۔ "کیا کریں"؟
ناصحِ مشفق سے پوچھا چاہیے　　عشق ہو جائے تو حضرت کیا کریں
زاہدِ قبلہ۔ "بڑی تاخیر کی"　　"ختم شد"۔ اب "صرفِ خدمت" کیا کریں
شکر ہے دراصل مجبوری کا نام　　"دعوئ صبر و قناعت" کیا کریں
ہم وفاداروں کی "غیبت اور آپ"　　ہم ہیں اور "پاسِ شریعت" کیا کریں
دُور تک تکتے رہیں اُس کی طرف　　اور ہم ہنگامِ رخصت کیا کریں
جب کرم کا اُن کو آتا ہے خیال　　سوچتے ہیں۔ "ترکِ عادت کیا کریں"
ہم بھی چپ ہیں رنگِ محفل دیکھ کر　　وہ بھی اظہارِ رفاقت کیا کریں
موسمِ گل کا دلاتی ہے یقیں　　باغبانوں کی سیاست۔ کیا کریں؟

بزم جھوٹے شعر کی عادی ہے شاؔد
التماسِ واقعیت کیا کریں؟

اے ہم وطنو!

مصطفیٰ زیدی

کون ہے آج طلب گارِ نیاز و تعظیم   وہی ہر عہد کا جبروت، وہی کل کے لئیم
وہی عیّار گھرانے، وہی فرزانہ حکیم   وہی تم لائقِ صد تذکرہ و صد تکریم
تم وہی دشمنِ احیائے صدا ہو کہ نہیں
پسِ پردہ یہ تمھی جلوہ نما ہو کہ نہیں

تم نے ہر عہد میں ہر نسل سے عیاری کی   تم نے بازاروں میں عقلوں کی خریداری کی
اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی خودداری کی   خوف کو رکھ لیا خدمت پہ کماں داری کی
آج تم مجھ سے مری جنسِ گراں مانگتے ہو
حلفِ ذہن و وفاداریٔ جاں مانگتے ہو

جاؤ یہ چیز کسی مدح سرا سے مانگو   طائفے والوں سے ڈھولک کی صدا سے مانگو
اپنے دربانوں کے جیسے فقرا سے مانگو   اپنے دربار کے گونگے شعرا سے مانگو
مجھ سے پوچھوگے تو خنجر سے عدو بولے گا
گردنیں کاٹ بھی دوگے تو لہو بولے گا

تم نے ہر دور میں دانش پہ کئی وار کیے   کبھی سُولی پہ چڑھا کر لبِ گفتار سیے
اپنی آسائشِ یک عمرِ گریزاں کے لیے   سب کو تاراج کیا تم نے مگر تم نہ جیے
علم نے خونِ رگِ جاں دیا اور نہ مرا
علم نے زہر کا پیمانہ پیا اور نہ مرا

علم سقراط کی آواز ہے عیسیٰ کا لہو   علم گہوارہ و سیّارہ و انجام و نمو
علم عباسِ علمدار کا زخمی بازو   علم بیٹے کی نئی قبر پہ ماں کے آنسو
وادیٔ ابر میں قطروں کو ترس جاؤ گے
تم ان اشکوں پہ ہنسو گے تو جھلس جاؤ گے

بہ وفاداریِ تہذیب و فرامینِ علم　　بہ گہرباریِ الفاظِ صنادیدِ عجم
بہ صدائے جرسِ قافلۂ اہلِ قلم　　مجھ کو ارواحِ شہیدانِ مقدس کی قسم
منزلیں آ کے پکاریں گی سفر سے پہلے
جھک پڑے گا درِ زنداں مرے سر سے پہلے

تم ہی بتلاؤ کہ میں کس کا وفادار بنوں　　عصمتِ حرف کا یا دار کا غمخوار بنوں
مشعلوں کا کہ اندھیروں کا طلبگار بنوں　　بیچ دوں راز کہ خود محرمِ اسرار بنوں
کون سے دل سے تمھیں ساعتِ فردا دے دوں
قاتلوں کو نفسِ حضرتِ عیسیٰ دے دوں

صبحِ کاشی کا ترنم مری آواز میں ہے　　سندھ کی شام کا آہنگ مرے ساز میں ہے
کوہساروں کی صلابت مرے ایجاز میں ہے　　بالِ جبریل کی آہٹ مری پرواز میں ہے
یہ جبیں کون سی چوکھٹ پہ جھکے گی ، بولو
کس قفس سے مری پرواز رکے گی ، بولو

کس قفس سے غمِ دل قید ہوا ہے اب تک　　کس کے فرمان کی پابند ہے رفتارِ فلک
کون سی رات نے روکی ہے ستاروں کی چمک　　کس کی دیوار سے سمٹی ہے چنبیلی کی مہک
جھومتے ہیں شبِ میسور کے گیسو اب تک
اک طلسمات ہے بنگال کا جادو اب تک

آج بھی درۂ خیبر سے اذاں آتی ہے　　اب بھی بھٹ شاہ کی ہر رات غزل گاتی ہے
اب بھی لاہور کی ہر شام خراباتی ہے　　آج بھی وقت کی نوبت تمھیں سمجھاتی ہے
دل کی درگاہ میں پندار مٹا کر آؤ
اپنی آواز کی پلکوں کو جھکا کر آؤ

آج تم رام کے مونس نہ ہنومان کے دوست　　تم نہ کافر کے ثنا خواں نہ مسلمان کے دوست
تم نہ الحاد کے حامی ہو، نہ ایمان کے دوست　　تم نہ اشلوک کے ساتھی ہو نہ قرآن کے دوست
تم تو سکوں کی چمکتی ہوئی جھنکاروں میں
اپنی ماؤں کو اٹھا لاتے ہو بازاروں میں

ذہن پر خوف کی بنیاد اُٹھانے والو ٹینک اور جیپ کو کھیتوں میں چلانے والو
گیت گاتے شہر کو بندوق سے ڈھانے والو فکر کی راہ میں بارود بچھانے والو
کب تک اِس شاخِ گلستاں کی رگیں ٹوٹیں گی
کونپلیں آج نہ پھوٹیں گی تو کل پھوٹیں گی!

ہو گئے راکھ جو کھلیان اُنھیں دیکھا ہے؟ ایک اک خوشۂ گندم تمھیں کیا کہتا ہے؟
ایک اک گھاس کی پتی کا فسانہ کیا ہے؟ آگ اچھی ہے کہ دستورِ نمو اچھا ہے؟
آج جو بیتی ہے کیا کل بھی یہی بیتے گی
بینڈ جیتے گا کہ شاعر کی غزل جیتے گی

کس پہ لبیک کہو گے کہ نہ ہو گی باہم جوہری بم کی صدا اور صدائے گوتم
رزق برتر ہے کہ یہ شعلہ بداماں ایٹم گھر کے چولھے سے اُترتی ہوئی روٹی کی قسم
زخم اچھا ہے کہ ننھی سی کلی اچھی ہے
موت اچھی ہے کہ بچوں کی ہنسی اچھی ہے

کیا قیامت ہے کہ ذرّوں کی زباں جلتی ہے مصر میں جلوۂ یوسف کی دکاں جلتی ہے
عصمتِ دامنِ مریم کی فغاں جلتی ہے بھیم کا گرز اور ارجن کی کماں جلتی ہے
چوڑیاں روتی ہیں پیاروں کی جدائی کی طرح
زندگی ننگی ہے بیوہ کی کلائی کی طرح

بوٹ کی نوک سے قبروں کو گرانے والے تمغۂ مکر سے سینوں کو سجانے والے
جھومرے، نیورنے، قرآبہ اُٹھانے والے برچھیوں والے، کماں والے، نشانے والے
پھر جگہ ڈھونڈ رہے ہیں کسی بیٹھک کے لیے
ظلم کی دھوپ میں اخلاص کی ٹھنڈک کے لیے

صاحبانِ شبِ دیجور سحر مانگتے ہیں پیٹ کے زمزمہ خواں دردِ جگر مانگتے ہیں
کور دل، خیر سے، شاہیں کی نظر مانگتے ہیں آکسیجن کے تلے عمرِ خضر مانگتے ہیں
کم بغل، لطف کا، حاتم سے صلا چاہتے ہیں
فیلیے، دوست کے پردے میں چھپا چاہتے ہیں

تو ہی بول اے درِ زنداں، شبِ غم تو ہی بتا   کیا یہی ہے مرے بے نام شہیدوں کا پتا
کیا یہی ہے مرے معیارِ جنوں کا رستا   دل دہلتے ہیں جو گرتا ہے زمیں پر پتّا
کس کی آواز ہے زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
کون سا خوف لگا بیٹھا ہے دیوار کے ساتھ

اتنی ویراں تو کبھی صبحِ بیاباں بھی نہ تھی   اتنی پُرخار کبھی راہِ مغیلاں بھی نہ تھی
کوئی تمہید برائے غمِ دوراں بھی نہ تھی   ہاں کوئی وجہِ گرفتاریٔ یاراں بھی نہ تھی
اے وطن کیسے یہ جالے در و دیوار پہ ہیں
کس شقی کے یہ طمانچے ترے رخسار پہ ہیں

اے وطن یہ ترا اُترا ہوا چہرہ کیوں ہے   غرفہ و بامِ شبستاں میں اندھیرا کیوں ہے
درد پلکوں سے لہو بن کے چھلکتا کیوں ہے   ایک اک سانس پہ تنقید کا پہرا کیوں ہے
کس نے ماں باپ کی سی آنکھ اُٹھالی تجھ سے
چھین لی کس نے ترے کان کی بالی تجھ سے

رودِ راوی ترے ممنونِ کرم کیسے ہیں   صنعتیں کیسی ہیں تہذیب کے خم کیسے ہیں
اے ہڑپّہ ترے مجبورِ قدم کیسے ہیں   بول اے ٹیکسلا تیرے صنم کیسے ہیں
ذہن میں کون سے معیار ہیں برنائی کے؟
مانچسٹر کے لبادے ہیں کہ ہرنائی کے؟

عسکریت ہے بڑی شے کہ محبت کے اصول   بولہب کا یہ گھرانہ ہے کہ درگاہِ رسولؐ
طبل و لشکر متبرک ہیں کہ تطہیرِ بتولؓ   مسجدیں علم کا گھر ہیں کہ مشن کے اسکول
جب بھی تاریخ کے قصے ہمیں دہرائیں گے
خیمۂ شمر میں ہم لوگ نظر آئیں گے

غلام ربانی تاباں

○

وفا نے شیوۂ تسلیم اختیار کیا
حضورِ دوست بہت ہم کو شرمسار کیا

جنوں پہ طنز و ملامت بجا مگر کس نے
چمن میں رنگ خروشی کا کاروبار کیا

ہوئے تو پھر اُسی غمزے کے ہم شکار ہوئے
کیا تو پھر اُسی کافر کا اعتبار کیا

یہ اور بات کوئی وجہِ انتظار نہ تھی
تمام عمر مگر ہم نے انتظار کیا

تری طلب کا یہ ادنیٰ سا اک کرشمہ ہے
مرے جنوں کو بھی پابندِ رہ گزار کیا

ق

بہار آنے سے پہلے ترے دوانوں نے
نمو کا راز زمانے پہ آشکار کیا

صبا کی طرح رہے گلستاں میں آوارہ
گلوں کی طرح گریباں کو تار تار کیا

کہاں کہاں سے گزرنا پڑا اُسے تاباں
ہمارے ساتھ سفر جس نے اختیار کیا

مرسیہ

جگن ناتھ آزاد

یہ نظم، شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربیؒ کے زاد بوم مرسیہ (اسپین) میں کہی گئی تھی

کیوں نہ ممتازِ جہاں ہو تری عالی نسبی — تو ہے وہ شہر کہ ہے مولدِ ابنِ عربی
مرسیہ! ان سے فرومایہ نہیں رتبہ ترا — قرطبہ ہو کہ غرناطہ کہ اشبیلیہ!
تو بھی ہے خاتمِ اندلس میں نگینے کی طرح — تو بھی طوفانِ جہاں میں ہے سفینے کی طرح

تری مٹی کا فسوں موجِ گلستاں میں نہیں
ترے ذرّوں کی چمک لعلِ بدخشاں میں نہیں

کل تھا جس طرح طلیطلہ مرا مقصودِ سفر — آج تو عین اسی طرح ہے مسجودِ نظر
کچھ حقیقت کی خبر ہو مجھے، واللہ نہیں — اور میں شیخؒ کے رتبے سے بھی آگاہ نہیں
ابابِ راز ہوں ترا علم سے بیگانہ سہی — تو بلاشبہ حقیقت ہے میں افسانہ سہی

مجھ کو لیکن دلِ بیتاب لیے پھرتا ہے
دن ہو یا رات ہو اِک خواب لیے پھرتا ہے

مرسیہ! لعلِ ادب کا تجھے معدن کہیے — یا تجھے نطقِ گہربار کا مخزن کہیے
کشتیٔ روح کا طوفاں میں سہارا تو ہے — یہ جہاں روم سمندر ہے کنارا تو ہے
اور چمکیں گے تری خاک کے ذرّات ابھی — تجھ کو معلوم نہیں اپنے مقامات ابھی
وقت آئے گا جب اسپین تجھے جانے گا — جو ترا رتبۂ عالی ہے وہ پہچانے گا

آج ناقدریٔ ایام سے تاراج ہے تو
ورنہ ایام کے ماتھے کا حسیں تاج ہے تو

راز یزدانی

جنوں سے حلقۂ دانش کے درمیاں پہنچی
کہاں سے بات الجھتی ہوئی کہاں پہنچی

خبر ملی کہ ابھی وہ یہاں سے گزرے ہیں
مری نگاہِ محبت جہاں جہاں پہنچی

بلند تر ہے چمن سے حریمِ نازِ بہار
جہاں نہ کشمکشِ برق و آشیاں پہنچی

یہ برقِ طور یہ دار و رسن یہ غنچہ و گل
کہاں کہاں نہ مری سعیِ رائگاں پہنچی

حریمِ دوست بھی کس کی گزر ہوئی ہے مگر
نظر بہ تابِ حریفِ مزاج داں پہنچی

یقیں کے بعد ہے کیا اس نگاہ کی منزل
حدودِ بزمِ یقیں تک جو بدگماں پہنچی

شدید تر تو نہ تھے ضابطے اسیری کے
مگر قفس میں نہ رودادِ آشیاں پہنچی

جہاں ہے شکوۂ ستم بھی خطا شعاری ہیں
اس انجمن میں بھی فریادِ بیدلاں پہنچی

حجابِ دوست۔ ذرا ان ترانیوں سے بھی پوچھ
کہاں تک اپنی محبت کی داستاں پہنچی

جبیں پہ داغِ ندامت غلط نہیں اے چاند
مجھے خبر ہے۔ تری چاندنی کہاں پہنچی

فلک نے رات جلائے کئی چراغ اے راز
کہاں تک اپنے اندھیروں کی داستاں پہنچی

میکش اکبرآبادی

○

کلائی اُس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی
نقاب اُس نے سنبھالی مگر سرک بھی گئی

وہی چراغ تمنّا وہی پیامِ اجل
جو برقِ راہ کو چمکا گئی کڑک بھی گئی

کبھی وہ طرزِ ستم بھا گئی مرے دل کو
کبھی وہ شانِ ترحم مجھے کھٹک بھی گئی

نسیم آئی ہے شاید گلے لگا کے انھیں
کہ میرے پاس تو آئی مگر جھجک بھی گئی

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام
یقیں تو کب تھا مگر آبروئے شک بھی گئی

وہ اک نظر مری عقل و جنوں کا حاصل ہے
جو اُس نظر سے ملی اور پھر بھٹک بھی گئی

نگاہِ دوست سے دل میرا خوں ہوا میکشؔ
نگاہِ دوست سے میری غزل مہک بھی گئی

عبدالعزیز خالد

○

دل کا فسانہ طلسمِ ہوشربا ہے
عیش و عقوبت ہے رنج و گنج و عنا ہے

دیو پری کو فریب سے کرے اغوا
نور کا بُرکا ہے مُشتِ گِل پہ فدا ہے

حیرت ہوا فراسیاب ششدر ہو حیراں
کوکب و بُستاں نے کس کا ساتھ دیا ہے

عمرو کی عیاریوں سے ہر کوئی عاجز
یہ ہے نظر کردہ اس سے کون بچا ہے

اوڑھے گلیم اور ہو نگاہ سے اوجھل
اس کو نبیؑ سے عجیب تحفہ ملا ہے

مرد و مخنّث ابھی، کبھی زن و امرّد
ذائقہ اس نے طرح طرح کا چکھا ہے

مُوئے کو آتی ہیں قسم قسم کی گھاتیں
دھم سے مری خوابگاہ میں کُود پڑا ہے

جال میں ہر شے سمیٹ کر بھی نہیں خوش
طعنۂ بخیلی کے سُن کے جھینپ رہا ہے

ایک بلا ہیں امیر حمزہ کے پوتے
ہر گھڑی کوئی نہ کوئی فتنہ بپا ہے

گرسنہ ہے شیرِ شرزہ، بیشہ ہے خالی
بچ کے غزالو، کہ خون منہ کو لگا ہے

جام کھنکتے ہیں بزم میں ہے گھما گھم
ساقیٔ گلچہرہ سلسبیل بنا ہے

مست نگہ میں اثر خمار کا جھلکے
نشے کے ڈوروں نے چہرہ لال کیا ہے

مخضرِ لذّت ہے زر نگار چھپر کھٹ
فرش مشجّر کا چاندنی پہ بچھا ہے

لاتی ہیں پریوں کے ڈولے چاندنی راتیں
بن بخدا حجلۂ زفاف بنا ہے

برق گھٹا میں چھپی ہے بدر دُوجی میں
دلبرِ دوشیزہ محوِ ناز و ادا ہے

لعلی پوشاک رنگ روپ بھبوکا
آتشِ سیال نے گلال کیا ہے

دیتی ہے نشے میں چھاتیوں کے ٹھوکے
جام بیک جرعہ درکشید کیا ہے

خاطرِ مشتاق وصل کی متقاضی
ہونٹ پہ انکار ہے نظر میں رضا ہے

چاکِ عمودی سے جھلکے گوشۂ گریباں
دیدہ و دانستہ بے نقاب کیا ہے

ایسی دھما چوکڑی مجھے نہیں بھاتی
بیٹھے نچلے مرا ایک دیکھ رہا ہے

لہجہ کہ جیسے پہاڑ سے جھرے جھرنا
باغ میں کوئل کہیں پہ کوک رہا ہے

کون سمجھتا ہے مہوشوں کے بہانے
تم سے لگائی بجھائی ہم سے گلا ہے

رم کریں وحشت سے خواستگار تلذذ
نام کھدے ان کا جس نگیں پہ گما ہے

کر نہ مرے دشمنوں سے لطف و مدارا
جو پھرے عہد و وفا سے ننگ وفا ہے

آئی ہے تم جا تو راہ کی تھکی ماندی
چہرے کی رنگت اڑی ہے سانس چڑھا ہے

چھپ کے ہٹاتی ہے سینے پر سے دوپٹہ
اس کو برس آن لگا شروع ہوا ہے

نکلے کھلے ہونے کی ہیں آپ ہوں حامی
کاندھے سے ڈھلکا دوپٹہ سینہ کھلا ہے

ڈال کے سایہ مجھے دوانہ بنایا
سحر ہے افسوں ہے جذب کاہ رُبا ہے

(ب)

رس بھرے ہونٹوں کا تم پیو گے سدھا رس
اور کوئی ہوں گے چھلکے چوسنے والے

معتکف کنجِ انزوا و خموشی
بُردِ یمانی خیال و خواب کی اوڑھے

سائی بدھائی ہے جوڑ توڑ ہے کیا کیا
سوتے ہیں تیغ برہنہ بیچ میں رکھ کے

بیٹی ہیں پھر دامیاں چھنار سی جگمگ
کیلے کے پتے بچھے ہیں پیڑ کے نیچے

دوست ہے ایک سکوت ہے ہمدم
لو منزلِ غم نہ بے وفائی کے دھڑکے

بادِ بہاری چلے ہمیشہ جلو میں
روشنی تجھ سے طبیعتِ سحری لے

کیوں ہیں پرائے مزے یہاں ڈالتی کھنڈت
ہر کوئی مسؤل قول و فعل کا اپنے

رشکِ قمر مبتلا خوفِ الم میں
ہونٹوں پہ بتخالے اور تلوؤں میں چھالے

سنگِ شرارت سے چور شیشۂ عصمت
آتش سوزندہ چہرہ فرطِ شفق سے

نیند جوانی کی سوئے موئے برابر
بال جھٹکتی دوپٹہ اوڑھتی اٹھے

لڑکی سنا ہے کہ کرتی پھرتی ہے سیریں
کس کے سراغی ہیں ٹوٹے ہار کے دانے

شوق ادھر ہے ادھر ہے شرم و تکلف
دیکھیے آغاز ہو کس اور سے پہلے

مردِ عبیدِ نسا و حرمِ نسواں
پلکیں ہمیشہ نئی نویلی کے پیچھے

چُن لیے گردوں نے دانہ ہائے کواکب   مرغِ شبا ہنگ کے لبوں پہ ہیں نالے
مستی لگی ہے جما ہوا ہے لکھوٹا   ایسی حسیں بھی نہیں کہ جو کوئی رت جگے
سُرمگیں چتون ہے اور مدھ بھری آنکھیں   دیدۂ ناظر، فروغِ حسن سے جھپکے
مر دوئے دم دھاگے پھانسے مجھ کو نہ بنلا   کاٹے ہیں کس پیلتن نے شیر کے پنجے
کرنہ اِس آوارہ خانماں سے محبت   سہ نہ سکے گی مسافروں کے وچھوڑے
رہتے ہیں رہن بلائے سحر ہمیشہ   حمزہ کے نورِ نظر ہیں عقل کے کورے
عارضہ کمبخت کو چھنالے کا لاحق   عشق جتاتی ہے جھوٹ موٹ ہر اک سے
ہوش میں آؤ کجا تم اور کجا میں   آئیں گے اب لوٹ کر نہ پہلے زمانے
موج کلائی میں آئی چوڑیاں ٹوٹیں   زلفِ چلیپا لپٹ گئی ہے کمر سے
دست و گریباں ہے شوق و شرم سے شوخی   ہنس کے طمانچہ وہ ڈھیلے ہاتھ سے مارے
پاؤں کی چھاگل سنائے مژدۂ آمد   دستِ حنائی میں پور پور ہیں چھلّے
چھیڑنے والی نہانی راز کی بھیدی   نیند کو کھوئے لپٹ کے رس بھری سوئے
گھومے ہزاروں جگہ اکیلی دکیلی   سیر کا لپکا ہے گھٹ کے گھر میں نہ بیٹھے
آؤ تو کوئی نہیں ہے بارہ دری میں   ڈوبتے سورج کے ہیں یہ آخری شعلے
نہروں پہ ہر جا کنول بلور کے روشن   ڈال دیئے مانجھنوں نے چشموں میں بجرے
محض حصولِ نشاط کے لیے زندہ   یہ جو نظر آ رہے ہیں چھیل چھبیلے
سیفِ سیاست ابن آفتابِ سعادت   محترز آرزو ہوس سے ریب و ریا سے
اصلِ کرامت ہے استجابتِ دعوات   اُطلبوا اکبادکم کی رمز سمجھ لے
میں تو ہوں مشغول برگِ راہ قیامت   مسئلے سود و زیاں کے پوچھ نہ مجھ سے
آپ عبارت نگار آپ معبّر   کوئی سخن فہم ہو تو دادِ سخن دے
فکر و نظر کا سفر ہے کارِ محبت   کر نہ کسی سے تو بحثِ علم میں جھگڑے

شوق کو یکساں ہے مدح و ذمِ خلائق
آگ کے دریا میں عشق غوطہ لگائے

عبدالمجید حیرت

○

آپ کی جب سے توجہ کم ہے
اس گنہگار کو غم ہی غم ہے

کون سی شب ہے کہ ہے بے شیون
کون سا دن ہے کہ بے ماتم ہے

وہ جو اک یورشِ غم ہے ہم پر
وہ بھی تھم تھم کے نہیں، پیہم ہے

اثرِ آہ و فغاں دیکھ لیا!
آنکھ مشکل سے کسی کی نم ہے

چارہ گر جلد توجہ فرمائیں
جانے کس کس کا لبوں پر دم ہے

آشیانے کے عوض، کنجِ قفس
ایک افتاد یہی کیا کم ہے

کب نکالے سے نکل سکتا ہے
وہ جو اُس زلفِ دوتا میں خم ہے

نقص کچھ اُن کے تکلم میں نہیں
صرف اندازِ بیاں مبہم ہے

دیکھ کر رنگِ جہاں اے حیرت
اور شیرازۂ دل برہم ہے

ٹیڑھی دیوار

ظہور نظر

یہ خرابہ کبھی آباد نہ ہوگا مجھ سے
گر گئی رنگ کی دیوار
بجھی شمعِ جنوں
کوئی بے جان سا شرارہ بھی نہ ٹھہرا دل میں
شعلۂ دردِ گریزاں کو تو کیا روکتا میں
موجۂ دودِ تمنا بھی نہ ٹھہرا دل میں

اس قدر تیز ہوا
اتنی بیابانیٔ دل
اتنی معصوم وفا، پہلے نہ دیکھی نہ سُنی
یاد کا کیا ہے ـــــ سرِ دشتِ وفا
یاد تو اب بھی چمکتی ہے مگر تو ہی بتا
ریت کے ڈھیر سے ابرق کی زری کس نے چُنی ؟
چاندکے نور سے پوشاکِ سحر کس نے بُنی ؟

تجھ کو اصرار ہے ـــــ یہ،
اس قدر تیز ہوا،
اتنی بیابانیِ دل،
اتنی معدومِ وفا جو کبھی دیکھی، نہ سنی
صرف تجدیدِ محبت کے نہ ہونے تک ہے
تیری زلفیں مری باہوں میں نہ سونے تک ہے

اور میں سوچتا ہوں
دشتِ امکاں میں بجز،
منتشر ریگِ تمنا کیا ہے
کیا میں تجدیدِ محبت کے محل کی دیوار
منتشر ریگِ تمنا سے اٹھا لوں گا؟ نہیں!
یہ خرابہ کبھی آباد نہ ہوگا مجھ سے!!

بن کے آسیب،
شبیں پاؤں ٹپکتی ہوں جہاں
حسرتیں اپنے تعاقب میں بھٹکتی ہوں جہاں
سیڑھیاں رنگ کی تعمیر کرے کون وہاں!؟
یہ خرابہ کبھی آباد نہ ہوگا مجھ سے!!

شاعر لکھنوی

○

مجھے اب اعتبارِ غم نہیں ہے
بہت دن سے کوئی برہم نہیں ہے
وہ کیوں دیکھے گلوں کی مسکراہٹ
جسے اندازۂ شبنم نہیں ہے
تجلّی کی فراوانی مسلّم
نظر کا حوصلہ بھی کم نہیں ہے
بدل کر رہ گئی تاریخِ جنّت
جواب لغزشِ آدم نہیں ہے
کلی چٹکے تو بڑھ جاتی ہے خوشبو
شکستِ دل کی قیمت کم نہیں ہے
خوشا یہ عالمِ چشمِ توجّہ
نظر میں اب کوئی عالم نہیں ہے
فریبِ ماہ و انجم کھانے والو
خود اپنی روشنی بھی کم نہیں ہے
ہوئے آزاد تو سمجھے یہ شاعر
رہائی قید سے کچھ کم نہیں ہے

ایک حادثہ

نور بجنوری

خوابوں کی مہکتی سیجوں پر
گیتوں کا دھواں لہرانے لگا
احساس کی نازک شاخوں میں
عفریتِ ہوس بل کھانے لگا
تنہائی کی ظالم چیخوں سے
ایوانِ وفا تھرّانے لگا

وعدوں کے لچکتے ریشم سے
فولاد کے بے حس تیر بنے
افلاک شفق میں ڈوب گئے
خورشید و قمر نخچیر بنے
وہ عارض و لب اس محشر میں
کس کس کے لیے تصویر بنے

اک موج کفِ ساحل سے اٹھی
اور اپنا سفینہ لوٹ گئی
اک نار کے چنچل ہاتھوں میں
چاہت کی گگریا پھوٹ گئی
دل جس کے لیے ضد کرتا تھا
وہ کانچ کی گڑیا ٹوٹ گئی

نور بجنوری

○

بال بکھرائے کوئی دل کے حرم سے نکلا
ایک شعلہ سا مری نوکِ قلم سے نکلا

وحشتِ عشق نے جی بھر کے مچائیں دھومیں
وہ بیاباں بھی مرے نقشِ قدم سے نکلا

سِل گئے ہونٹ تو ہر موئے بدن بول اٹھا
یہ بھی دستور ترے عہد میں ہم سے نکلا!

اپنے صحرا کے مقدر میں کوئی پھول نہیں!
ایک آنسو نہ تری چشمِ کرم سے نکلا!!

چوم لو فرطِ عقیدت سے چھلکتا ہوا جام
یہ وہ خورشید ہے جو مطلعِ جم سے نکلا

نورؔ گل کر دیے یاروں نے محبت کے چراغ
خارِ حسرت بھی یہاں دام و درم سے نکلا

خوابوں سے ڈر لگتا ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

کل کا سورج اسی دہلیز پہ دیکھے گا مجھے
کل بھی کشکول مرا شام کو بھر جائے گا
کل کی تخلیق بھی ہوگی یہی اک نانِ جویں
کل بھی ہر دِن کی طرح یونہی گزر جائے گا

بھوک کی آگ جو بجھتی ہے تو نیند آتی ہے
نیند آتی ہے تو کچھ خواب دکھاتی ہے مجھے
خواب میں ملتے ہیں کچھ لوگ، بچھڑ جاتے ہیں
ان کی یاد اور بھی رہ رہ کے ستاتی ہے مجھے

کل بھی ڈھونڈوں گا انھیں جا کے گلی کوچوں میں
کل بھی مل جائیں گے ان خوابوں کے پیکر کتنے
کل بھی یہ ہاتھ لگاتے ہی بدل جائیں گے
کل بھی پھینکیں گے مری سمت یہ پتھر کتنے

آج کی رات مجھے نیند نہیں آئے گی
آج کی رات مجھے خوابوں سے ڈر لگتا ہے

شعر گوئی کی میسّر ہو جو فرصت اے دوست

احسن علی خاں

زندگی ہے مری اک جہدِ معیشت ، اے دوست
شعر کہنے کی نہیں ہے مجھے فرصت اے دوست
شوقِ نظارہ بھی ہے ، ذوقِ سماعت بھی مگر
خواہشِ جلوہ و نغمہ ہے اک حسرت اے دوست
شمعِ جذبات کی لو مثلِ زباں ہے لیکن
کیسے بخشوں اسے گفتار کی طاقت اے دوست
گھٹ کے رہ جائے تو احساسِ مسرت بھی ہے غم
گیت بن جائے تو غم بھی ہے مسرت ، اے دوست
صاف و سادہ ہے بہت حرفِ صداقت اے دوست
اس میں کس طرح بھر دوں رنگِ اشارات اے دوست
نج کے دنیا میں کہوں شعر ، مگر کیا ہوگا
نخلِ احساس و تخیل کا ثمر کیا ہوگا؟
ہوں گے اشعار مرے حزن و طرب کے آنسو ،
گر گئے ریت پہ یہ اشک اگر ، کیا ہوگا
مردِ ناداں سے گلہ کیا کہ نہیں اس میں سمجھ
جو ہو دانا کے بھی ہیرے کا جگر ، کیا ہوگا؟
جہاں ایٹم کے دھماکوں سے ہیں مفلوج اعصاب
اس جگہ گوش بر آوازِ بشر کیا ہوگا؟
میری اس تلخ نوائی کا اثر کیا ہوگا ؟
پھر بھی کیوں ہے مجھے کچھ کہنے کی حسرت اے دوست

اس لیے ہے کہ حقیقت میں مرا قلب حزیں
منفعل ہے، مگر انسان سے مایوس نہیں
یہ وہ انساں ہے کیا جس نے زمیں کو تسخیر
اور جو چوم رہا ہے مہ و زہرہ کی جبیں
ایک عالم کے عناصر تو کیے ہیں بس میں
اختیار اس کو مگر اپنی ہی فطرت پہ نہیں
آہ، بیچارہ کشاکش میں ہے بین ضدّین
کبھی نزدیک خدا ہے، کبھی شیطاں کے قریں
مگر انساں ہے نہ اللہ، نہ ابلیس لعین
وہ تو انساں ہے بایں پستی و عظمت اے دوست

خیر و شر کیا؟ فقط احساس ضمیر بیدار
اور ضمیر؟ ایک نگہبانِ متاعِ اقدار
اور قدریں؟ وہ نواہی و اوامر کے ستون
جن پہ جمعیتِ انساں کی عمارت کا ہے بار
مگر افسوس کہ جمعیتِ انسان ہے آج
کہیں مغرب، کہیں مشرق کے خداؤں کی شکار
یہ خدا، اُف یہ خدا، قاتلِ انساں، یہ خدا!
ان خداؤں کی ثنا مجھ سے نہ ہوگی زنہار
صرف انسان کے گُن گائیں گے میرے اشعار
شعر گوئی کی میسّر ہو جو فرصت اے دوست

جمیل ملک

○

رو رو آنسو خشک ہوئے، برسات آئی، برسات گئی
کون کہے اب کس کے دوارے اشکوں کی بارات گئی

بیتے سال کی بات ہے کیا کیا چھم چھم بادل برسے تھے
اب کے برس تم پاس نہیں تو بن برسے برسات گئی

کس امید پہ جیون کاٹیں، کس سے من کی بات کہیں
تیرے ملن کی آس تھی جھوٹی، وہ بھی تیرے ساتھ[1] گئی

سنگی ساتھی پاس نہیں تھے، دشمن گھات میں بیٹھے تھے
جان سی چیز ملی تھی ہم کو، وہ بھی ہاتھوں ہاتھ[2] گئی

ڈوب گئے آشا کے تارے، راکھ ہوئے پروانے بھی
نگر نگر کے دیپ بجھا کر اب کس دیس میں رات گئی

جگ سے توڑ کے رشتے ناطے، کیوں گم سُم بیٹھے ہو جمیلؔ
اُٹھو، سورج سر پہ آیا، رات کے ساتھ وہ بات گئی

[1] ساتھ [2] ہاتھ

طلوع و غروب

فارغ بخاری

تجھے یاد ہوگا
اسی موڑ پر ایک دن ہم ملے تھے
وہ دن کیا بہار آفریں تھا
خوشی سے کلوں کی طرح ہم کھلے تھے
حسیں قہقہوں کے چراغاں تھے ہر سُو
خزاں کے تصوّر سے نا آشنا
رنگ و بو کے سفینے ہیں
ذوقِ جنوں کے سہارے بہے جا رہے تھے

اسی موڑ پر توڑ کر آج بندھن
بڑی بے دلی سے جدا ہو رہے ہیں
کہ جیسے کسی اجنبی راستے پر
جدا ہونے کو دو مسافر ملے ہوں

جان پہچان

خاطر غزنوی

اونگھتی گلیوں میں ڈھولک کی صدائیں سو گئیں
لگ گئی ہو گویا سب بے تاب ہاتھوں میں حنا
اجنبی خوشبو کی لپٹوں میں بسا حجلہ
سکوں افزا فضا
شوریدہ سر جذبوں کی باہم سازشیں
خامشی کے دودھیا چہرے پہ پردوں کی حزیں سی سرسراہٹ سے خواہشوں کے نشار
تازہ پھولوں کی جواں مہکار میں لپٹا ہوا
مخمل و کمخواب کے بستر پہ ابریشم کا ڈھیر
جس کے ہر ریشے نے بخشیں خوابگوں نرماہٹیں

یاد ہے اب سے اٹھارہ سال پہلے کی وہ رات
میں نے جب لہجے میں نازک تتلیوں کی نرم اڑانوں کا تاثر گھول کر ——
نام پوچھا —— !
اُس سے اُس کے گاؤں کی اِک اِک گلی کی بات کی !!
اُس کی ہر مرغوب، نامرغوب شے پر بحث کی !!!

اطلسی ملبوس،
گورے رنگ،
کاجل سے جھکی پلکوں،
لجائی شوخ آنکھوں
اور اُس ملبوس سے بھی نرم بالوں کی ستائش میں حسیں الفاظ کے دریا بہائے!!!!

ہم اٹھارہ سال سے ملتے ہیں روز
مخمل و کمخواب کے بستر پہ اب ریشم کا ڈھیر
بکھرے بکھرے چند ریشوں کے سوا کچھ بھی نہیں
اطلسی زلفیں — دھواں،
اور رنگ — روز و شب کی راکھ
شوخ آنکھوں میں کئی بیتی ہوئی راتوں کے خواب
اور پلکوں پر زمانوں کے سفر کی گرد کی گہری تہیں

ہم اٹھارہ سال سے اک دوسرے کو دیکھتے ہیں صبح و شام
میری بانہیں،
میری بخشیں!!
میری راہیں!!!
میرے ہاتھ!!!!
اُس کے محرم ہیں تمام
ہوسکا لیکن نہ اب تک اُس کا محرم — میرا نام

شفقت کاظمی

○

خوش ہو کے سہہ رہا ہوں زمانے کے غم ابھی
اُتنی تو ہے کسی سے اُمیدِ کرم ابھی

اِن دوریوں پہ بھی تجھے پاتے ہیں رُو برو
جیسے دخیل ہوں تیری خلوت میں ہم ابھی

مجھ پر ہوئی جو تیری نوازش تو کیا ہوا
کیا جانے کتنے لوگ ہیں بہ یادِ غم ابھی

شاید مرے خلوص میں ہوگی کوئی کمی
آتے ہیں ورنہ کیوں وہ تصوّر میں کم ابھی

تمہیدِ التفات اُٹھانے سے فائدہ
ہم کو ہیں یاد وہ تیرے اگلے کرم ابھی

راہِ دیارِ دوست ملے کب خبر نہیں
پیشِ نظر ہے جلوۂ دیر و حرم ابھی

وہ لوگ بیشتر جو دغا دے گئے تجھے
تیری نگاہ میں ہیں وہی محترم ابھی

محرومیوں نے گھیر لیا کاظمی ہمیں
رکھا تھا راہِ دوست میں پہلا قدم ابھی

رفعت سلطان

○

زہر بھی اب نہیں پیمانے میں
جائیں کیا سوچ کے میخانے میں

آ کے بیٹھا ہے جو ویرانے میں
ہے شعور اتنا تو دیوانے میں

اک صنم سے ہے عقیدت مجھ کو
چھپ کے جاتا ہوں صنم خانے میں

چاندنی رات ہے پھر چاندنی رات
ہو نہ عذر اُن کو اگر آنے میں

تیری آنکھوں کا تغافل تو نہیں
لوگ کیوں جاتے ہیں میخانے میں!

اس قدر سہل نہیں جل مرنا
شمع کا سوز ہے پروانے میں

یہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے
آپ اور میرے سیہ خانے میں!

چھوڑ آئے ہیں ترا شہر، مگر
دل کو تسکیں نہیں ویرانے میں

ذکر کرتے ہوئے اُن آنکھوں کا
ہم چلے آئے ہیں میخانے میں

ہے وہی میرا خدا بھی رفعت
چھپ کے بیٹھا ہے جو بتخانے میں

یوسف جمال انصاری

○

کس کو سُدھ بُدھ ہے تن من کی، کس کو ہے اپنا چاؤ یہاں
ریت کی ڈور میں جیسے بندھی ہو اپنی جیون ناؤ یہاں
اَنہونی جب ہونی ٹھہری، کس کی شکایت کس سے گلہ
کب بھرتے ہیں گھاؤ یہاں، تم کتنے ہی اشک بہاؤ یہاں
یادِ خدا میں ہم دنیا سے ہات اُٹھائے بیٹھے ہیں،
بھولی بھالی صورت والو! ہم کو مت پرچاؤ یہاں
اپنے آپ پہ مرنے والو! اپنے کو پہچانو بھی
آئینہ چمکانے والو! چہرہ تو چمکاؤ یہاں
ہنس کے کبھی تو کلام کرو، ہم دکھیاروں کو رام کرو
حسن و جوانی دو دن کے ہیں، رہ جاتا ہے سبھاؤ یہاں
اپنے آپ میں ڈوب نہ جاؤں جیسے موتی ساگر میں
جس کو میں نے دل میں جگہ دی اُس نے کیا سھتراؤ یہاں
پیر پیمبر کتنے آئے دنیاداری کم نہ ہوئی
پک گئے کان یہ سنتے سنتے "بابا! دل نہ لگاؤ یہاں"
خونِ جگر ابر کرنے والے چاند پہ دھاوا ماریں گے
دھرتی کے پھیلاؤ سے بڑھ کر حرص کا ہے پھیلاؤ یہاں
پھولوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، کانٹوں سے رستا ہے لہو
بادِ خزاں نے کیا ہے اب کی کیسا کچھ پتھراؤ یہاں
پانی سے تشبیہہ نہ دوں گا، پانی بھی کب سستا ہے
پوچھنے والے پوچھ رہا ہے خونِ وفا کا بھاؤ یہاں
اپنے آپ سے کب تک پیارے آنکھ مچولی کھیلو گے؟
ست جُگ ہے یہ بھول بھلیاں، جو ڈھونڈو سو پاؤ یہاں

بشیر بدر

○

جب تک نگارِ دشت کا سینہ دُکھا نہ تھا
صحرا میں کوئی لالۂ صحرا کھِلا نہ تھا

دو جھیلیں۔ اُس کی آنکھیں پہ لہرا کے سو گئیں
اُس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا

جاگی نہ تھیں نسوں میں تمنّا کی ناگنیں
اِس گندمی شراب کو جب تک چکھا نہ تھا

ڈھونڈھا کرو جہانِ تحیّر میں عمر بھر
وہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے میں نے کہا نہ تھا

اِک بے وفا کے سامنے آنسو بہاتے ہم؟
اتنا ہماری آنکھ کا پانی مرا نہ تھا

دو کالے ہونٹ۔ جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے
اک ہم ہی ایسے تھے کہ ہمارا خدا نہ تھا

وہ کالی آنکھیں شہر میں مشہور تھیں بہت
تب اُن پہ موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا نہ تھا

میں۔ صاحبِ غزل تھا حسینوں کی بزم میں
سر پہ گھنیرے بال تھے ماتھا کھُلا نہ تھا

خالدؔ مینائی

○

صحنِ چمن میں ذکر ہے گفتارِ یار کا
لے جوئبار کی ہے ترنم ہزار کا

کشتہ ہوں نرمیٔ نگہِ چشمِ یار کا
مارا مجھے اگرچہ ہے انداز پیار کا

ہے سلسلہ ازل سے خزاں اور بہار کا
فطرت کو اک جنون ہے تکمیل کار کا

وہ صحنِ باغ اور وہ آمد بہار کی
وہ وقتِ صبح اور وہ عالم نکھار کا

سب کچھ بھلا چکا ہوں مگر بھولتا نہیں
جانا دلِ حزیں کا اور آنا بہار کا

دل کو عزیز خاطرِ الفت بہار میں
الفت کو پاس اک دلِ دیوانہ وار کا

لانا نہ لب پہ حرفِ شکایت حضورِ دوست
آنا مگر وہ گریۂ بے اختیار کا

کتنی فسوں طراز ہے وہ چشمِ التفات
ہوتا ہے جبر پر بھی گماں اختیار کا

اُس سمت جو نظر بھی ہے پروانہ وار ہے
کیا وصف کیجئے رُخِ زیبائے یار کا

آئی تو ہائے حشر میں دامن کی یاد آئی
دینا پڑا حساب ہمیں تار تار کا

مجھ سے سنو حکایتِ جورِ فلک کہ میں
مارا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا

جب سے اداشناسِ محبت ہوا ہے دل
شکوہ نہیں رہا ستمِ روزگار کا

اب میں ہوں اور سرورِ مۓ دل گدازِ عشق
اب جیت کی خوشی ہے نہ کچھ رنج ہار کا

اہلِ وفا کو تیری محبت سے کام ہے
شکوہ فراق کا نہ گلہ انتظار کا

گویا ہیں مجھ سے آخرِ شب کی خموشیاں
اک شور ہے کہ شکر ہے پروردگار کا

خالدؔ جگر تو آنکھ سے خوں ہو کے بہ گیا
اب رنگ دیکھنا ہے دلِ بیقرار کا

اختر ہوشیارپوری

○

یوں نہ خود کو کبھی آوارہ و رسوا کرتے
ہم اگر جانتے کیوں تیری تمنا کرتے

پتہ کھڑکے بھی تو ہم تیری صدا جانتے ہیں
شب کے سناٹے میں کیوں تجھ کو پکارا کرتے

یہ بدن آئنہ آسا یہ جبیں ماہِ تمام
تو اگر پاس بھی ہوتا تجھے دیکھا کرتے

ہم تو اے دوست! محبت میں جہاں سے گزرے
تم بھی اک روز کسی وعدے کو ایفا کرتے

کوئی اس پھیلے ہوئے دشت میں زنداں ہوتا
اپنا احوال ہی دیواروں سے پوچھا کرتے

اب تو یہ سوچ کے چپ ہیں کہ ہیں محروم تمام
مل بھی جاتا وہ اگر ہم کو تو پھر کیا کرتے

نگہِ شوق نہ اس رُخ سے پلٹ کر آئی
عمر گزری نگہِ شوق کو رُسوا کرتے

غمِ دل پر غمِ جاں پر کہ غمِ دوراں پر
زیست! تیرے لیے کس کس پہ بھروسا کرتے

تیری نظروں نے یہ انداز کہاں سے پائے
کاش ہم تجھ کو شریکِ غمِ دنیا کرتے

زندگی اپنی بہرحال بسر ہو جاتی
تو نہ آتا تو ترا راستہ دیکھا کرتے

دل پریشاں کا پریشاں ہی رہے گا اختر
یہ اگر جانتے کیوں ترکِ تمنا کرتے

جاگتا سوتا موسم

شاعر ندیم

ے پوچھوں کہ یہ عالم کیا ہے
ردِ غمِ زیست کا مرہم کیا ہے
نہ دلِ زار کسی وجہِ تسلی کے قریں
نہ ضیا پاش مری رات کے تاروں کی جبیں
داغِ دل ایک طرف داغِ جگر ایک طرف
پارہ پارہ مری جمعیتِ خاطر کی زمیں

نہ کسی لب پہ کسی نام وفا کا الہام
نہ کوئی چاہنے والوں میں بہت ہی بدنام
نہ بہاروں ہی کا موسم نہ خزاں کی یورش
نہ ابھی صبح کی مستی نہ خمارِ مئے شام
نہ چمن سوگ کی موجوں میں ابھی ڈوبا ہے
نہ سرِ شاخِ گل و لالہ و نسریں کا مقام

نہ خیال خط و خال رُخ و چشم بیمار
نہ نمائش پہ ہیں آمادہ نقوشِ خمدار
یاد کی بزم جو سجتی ہے تو پھیکی پھیکی
بھولنے کو بھی اُسے دل نہیں ہوتا تیار
عاشقی کشمکشِ مرگِ مسلسل کی نمود
کچھ وہی حال سا جیسے کہ "مریز و کجدار"

نہ کوئی خضرِ رہِ شوق نہ بالِ جبریل
نہ ٹھہرنے کی اجازت نہ کہیں بانگِ رحیل
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ بھی نہیں
نہ کوئی گردشِ ایام سے بچنے کی سبیل
کیا کسی طرح نہ بیتے گا یہ رنگیں ماتم
یہ مرا جاگتا سوتا موسم

عالمی اسلحہ نمائش

ابو سعید قریشی

(۱)

سپٹنک

یہ سپٹنک ، واسٹوک اور ماہتابی کیپشیول
قصرِ استبداد کے اُڑتے نقیب
دیوِ استعمار کے سارے اسیر
گیگارن اور اس کے سب بھائی تمام
کائناتی کیپشیول کے رحم میں
سائنسی انسان کے تخم
جا رہے ہیں ماہتابی زچہ خانوں کی طرف
کرۂ خاکی سے دور !!
اپنی پیدائش کے عنواں کے لیے

ہاں میاں۔ اسقاط کیوں ممکن نہیں !
کون جانے آج تک
کتنے سپٹنک کھو چکے
اور ان کے بطن میں
کتنے جیالے ۔ مردِ میداں ، سُورما !
زندگی سے ہاتھ اپنے دھو چکے !

یہ مگر مت بھولنا کہ دیوتا نے جنگ کے
بھینٹ سے کر دے دیا ہے
ان کو اپنا اگن بان
اور اک اونچا مقام
ان کی زد میں آگئے ہیں اس طرح
قصر ویران اور شہر تابناک
جگمگاتی شاہراہیں
ملگجے خوابوں کے گنج
رقص گاہیں، معبد و ایوان ——— سب
اک بگولا بن کے اُڑ سکتے ہیں
اس تہذیب کے منظر تمام

یہ شپنک ۔ واسٹوک ——— !
کائناتی مورچوں کے پاسباں
آج ان کی زد میں ہیں
ہفت آسماں
ان سے بچ کر کوئی جائے گا کہاں

(۲)

مسائیل

اور یہ مسائیل ہے
ملک الموت کی پیغام رساں
پیٹ میں آگ لیے
ناگ لیے
عقل کا سحر و فسوں
سامری فن کے اشارے پہ یہ اُڑتی ڈائن

کسی مامن، کسی مسجد، کسی مندر، کسی مکتب سے نہیں ڈرتی ہے
نئی دنیا کہ پرانی دنیا
اس کی بس ایک اڑان
پیرس و لندن و نیویارک
ماسکو، قاہرہ، دلی، بغداد
بمبئی، ڈھاکہ، لاہور، کراچی
اک ایک!

فاصلے ختم ہوئے
موت کی راہ میں حائل نہیں کوئی دیوار
نہ سمندر، نہ حصار
اس ہوائی کی لگائی ہوئی آگ
چشمِ عبرت ہی بجھا سکتی ہے!

(۳)

ایٹمی سب میرین

آؤ دیکھو یہ نرالی مچھلی
اسد البحر ہے یہ
(یعنی کہ روسی لاین ہے)
پیٹ میں اس کے ہیں کتنے یونس
امتحان جن کو لیے پھرتے ہیں
بحرِ ظلمات کی پہنائی میں!
مہ و خورشید کی دنیا سے افق سے، شب انجم سے، ضیاؤں سے نہاں
بحرِ خونخوار کی موجوں کے تلاطم کے سوا
ان کی قسمت میں نہیں کوئی صدا
کوئی صدا،

نفسِ بادِ صبا
لبِ لعلیں کا لمس
پھول کے دل کے دھڑکنے کی صدا
کوئی نہیں
کچھ بھی نہیں !
ہفت قلزم کے یہ نگراں ہیں ——مگر
بحری قزاق کوئی
کوئی جہاز
جال سے اس کے نکل کر نہیں جا سکتا کہیں کوئی نہنگ !

(۴)

ایٹم بم

اور یہ ایٹم بم ہے
یعنی اک ذرۂ ناچیز کے جوہر کا جلال
بنی آدم کے کمالات کا حکمت کا عروج
ہیروشیما کا وہ سایہ تو تمھیں یاد ہی ہوگا شاید
اہلِ مشرق کے لیے
مغربی عدل کی
انصاف و مساوات کی پیغام رساں ایٹمی صبح
اک بگولا تھی کہ شعلہ تھی کہ کیا تھی ؟ —— ہمیں معلوم نہیں !

قصۂ روزِ حساب
مرگِ انبوہ کا میلہ جس میں
پیرِ صد سالہ و نوخیز جواں
زندہ مے خوار و سلمہ شورہ خدا جو سارے !

زنِ پارینہ و معشوقِ جواں
طفلِ گہوارہ و طفلِ مکتب
سب کے سب نعرہ زناں شامل تھے
ان میں اک بچہ تھا
گنگناتا ہوا
مکتب کو رواں،
ایٹمی امن کا معصوم شکار،
موت سے تیز شعاعوں نے دبوچا اس کو
اور پھر لے گئیں ان دیکھے ستاروں کی رصدگاہوں میں
بھائی ہابیل کی معراج دکھانے کے لیے
کرۂ خاک کا انجام بتانے کے لیے

اسلحہ خانے میں اپنے لیکن
میگاٹن بامب بھی موجود ہیں، جانے کتنے
ہیروشیما کے کروڑوں سورج
ناگاساکی کے ستارے لاکھوں
سامنے جن کے ہیں شمعِ کشتہ!
میگاٹن بم کی حدت سے سمندر کھولے
سنگ و فولاد کی شریانوں کے بادل آئیں
شہر بن جائیں وہ ویرانہ نہیں
پامپیائی سے کھنڈر
موہنجوڈارو سے آثارِ قدیم!

شہر آشوب

(ایٹمی جنگ کے بعد)

کچے دھانوں میں دودھ سوکھ گیا
گھاؤ سے گیہوں کے لہو ٹپکا
سیپیوں نے تڑپ کے ساحل پر
کچے موتی اُگل دیئے کتنے
باغ میں تتلیوں کے پر جل کے
جھلسے پھولوں پہ راکھ بن کے گرے
پردۂ ساز سے دھواں اٹھا
محفلوں میں فغاں بلند ہوئی
میکدہ یا سرائے وحشت ہے!
واژگوں جام اور خُم حیراں
تیشہ بر دوش سرنگوں فرہاد
سوچتا ہے میں کون ہوں کیا ہوں؟
خسرؔو پرویز و کوہکنؔ ہیں کون؟
کون شیریں ہے بیستوں کیا ہے؟

اِرتقا کا تمام باب ہوا
وسعت امکاں میں کھو گیا انساں
ہو گئی بزم ہائے و ہُو خاموش
دیدۂ آفتاب بند ہوا
تھک کے ارمان سو گئے سارے
قصۂ شہزاد ختم ہوا!

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

○

اِک دمِ سرد ہے اب بادِ صبا میرے بعد — پھیکی پھیکی سی ہے گلشن کی فضا میرے بعد

قدر اے عشق رہے گی تری کیا میرے بعد — کس کو پہنائے گا تو تاجِ وفا میرے بعد

مجھ کو محروم نہ رکھ بے سبب آزادی سے — کس کے کام آئے گی یہ مشقِ جفا میرے بعد

چھوڑے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں — آ ہی جائے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

میرا خوں کر کے ہتھیلی ہے حنا سے بیزار — اب تو زلفیں بھی ہیں شانے سے خفا میرے بعد

دیکھنا غور سے رُخسارِ جفا کی زردی — آئینہ تم کو دکھائے گی وفا میرے بعد

اب کُھلا یہ کہ ہے اِک ظلم کم آمیزی بھی — ہے خجل اپنے تغافل پہ حیا میرے بعد

محفلیں عہدِ گزشتہ کی ہوئیں خواب و خیال — کھو گئے اپنے غموں میں رفقا میرے بعد

مل گیا مجھ کو مرے ذوقِ شہادت کا صلہ — بُوئے خوں بانٹتی پھرتی ہے صبا میرے بعد

دل کہ تھا زینتِ آرائشِ کاکل نہ رہا — جب کُھلی زلف تو یہ پھول گرا میرے بعد

میں نہیں ہوں تو بیاباں بھی ہے اک بزمِ خموش — خامشی ڈھونڈتی ہے نغمہ سرا میرے بعد

اب کوئی ظرف نہیں بادۂ رنگیں کا حریف — بہکی پھرتی ہے مئے ہوش رُبا میرے بعد

نقشِ پائے غمِ صفدر بھی مٹا راہوں سے
لُٹ گیا قافلۂ مہر و وفا میرے بعد

آتشؔ لودھیانوی

○

پوچھو دریا کا، خبر دینے لگیں گے نہر کی
میں نے دیکھی ہے عجب یہ رسم تیرے شہر کی

میں بنا پھرتا ہوں اپنے شہر ہی میں اجنبی
انتہا کب ہو نہ جانے اس انوکھی لہر کی

جھانکتی ہیں بام و در سے کیسی کیسی صورتیں
سونے والوں کو خبر کیا شب کے پچھلے پہر کی

شعلۂ گل کی طرح جی کو فروزاں کر گئی
یہ ادا بھی میں نے دیکھی ہے نگاہِ قہر کی

کل جہاں گلشن مہکتے تھے وہاں اب دھول ہے
یہ پرانی ریت ہے عبرت سرائے دہر کی

گرم لُو کے تند جھونکے مثلِ بادِ شام تھے
چاندنی سے بھی خنک تھی دھوپ اک دوپہر کی

اُس سے ملنے اپنے گھر سے جس گھڑی نکلا تھا میں
چل رہی تھی بادِ صرصر راستوں میں قہر کی

میں تو یونہی ہنس دیا تھا، پھروں رُلوایا مجھے
تجھ سے بھی ہے سنگدل مخلوق تیرے شہر کی

آتشؔ اُس کی بے رخی کا گُل نہ مرجھایا کبھی
گو چلی سو مرتبہ باغوں میں آندھی زہر کبھی

صادق نسیم

○

شہرِ طلب میں آج عجب حادثہ ہوا
ہر آئینے میں تھا ترا چہرہ سجا ہوا

آیا وہ رنگ و نور میں لپٹا ہوا خیال
شب کی سیاہیوں میں شفق گھولتا ہوا

پھر تیرا نام لے کے جلا ایک اک چراغ
پھر اپنا گھر ہے آئینہ خانہ بنا ہوا

کلیاں نہیں تو آ کوئی پتھر ہی پھینک جا
دکانِ شیشہ گر کی طرح ہوں سجا ہوا

آیا ہوں تیری زلف میں تریاق ڈھونڈنے
میں اپنے دل کی تیرگیوں کا ڈسا ہوا

ہر روز ڈھونڈتا ہوں تری یاد کا افق
میں آفتابِ شام کی صورت تھکا ہوا

کن منزلوں کی سمت چلا کاروانِ شوق
دل پر تمھارے نقشِ قدم ڈھونڈتا ہوا

مرجھا نہ جائے لالۂ صحرائے آرزو
آہوں کی سرد سرد ہوا سے کھلا ہوا

آگے نکل گیا ہوں گلوں کے دیار سے
خاروں پہ سرخ سرخ نشاں چھوڑتا ہوا

پھر جاں بلب ہوں آج سرِ رہگزارِ شوق
ہر حادثے سے تیرا پتہ پوچھتا ہوا

کچھ شعلۂ نوائے غزل بھی ہے تیز تر
صادق نسیم کا بھی ہے کچھ دل دکھا ہوا

خورشید احمد جامی

○

یہ کس کی آنچ ہے کس کے بدن کی خوشبو ہے
ترا خیال مرے ساتھ ہے کہ خود تو ہے

مری نگاہ سے تیری جواں امنگوں تک
وہی سماں ہے وہی فاصلوں کا جادو ہے

سُلگ اُٹھے ہیں کہیں زخم شبنمی بو سے
کہیں اُداس کوئی چاندنی لب جُو ہے

حیات آج وہ زخموں کا شہر ہے - جس میں
نہ صبحِ عارضِ گُل ہے نہ شامِ گیسو ہے

یہ اشک و آہ کا موسم یہ خارزارِ الم
دیارِ گُل کی تمنا کا ایک پہلو ہے

ہر ایک درد میں ہے شعلۂ یقینِ وفا
ہر ایک رات میں خوابِ سحر کی خوشبو ہے

سُنا ہے تلخ حقائق کی بستیوں سے پرے
کہانیوں کے سمن زار ہیں جہاں تُو ہے

مرے قریب ہے اک درد کی صدا جامی
مری تلاش میں اک بیقرار آنسو ہے

عبیداللہ علیم

○

خوشا وہ دور کہ جب تجھ سے رسم و راہ نہ تھی
سکون کفر نہ تھا، زندگی گناہ نہ تھی

نفس نفس پہ اُبھرتی ہوں سُولیاں جیسے
حیات اتنی تو پہلے کبھی تباہ نہ تھی

بہ فیضِ حسرتِ دیدارِ خسروانِ جنوں!
اِدھر بھی دیکھ گئے جس طرف نگاہ نہ تھی

خود اپنی روشنیِ طبع کے ستائے ہوئے
وہ ہم تھے دہر میں جن کو کہیں پناہ نہ تھی

جہاں کے درد کو اپنا ہی درد جانتے ہیں
یہ حوصلہ تھا کہاں جب تمہاری چاہ نہ تھی

وہ اِک نگاہ کہ سب کچھ سمجھ لیا تھا جسے
تباہیِ دل و جاں پہ وہی گواہ نہ تھی!!

محقّق

داہی

یہ جو اک حضرت چلے آتے ہیں گورستان سے
یہ نہ سمجھیں آپ، ہیں بیزار اپنی جان سے

آپ کو یونہی ہے آثارِ قدیمہ سے لگاؤ
جس طرح چونا ڈلی کتھے کو نسبت پان سے

آپ کو قبروں سے الفت عشق ویرانے سے ہے
آپ گھبراتے ہیں جیسے جاگتے انسان سے

کوئی کتنا ہی بڑا ہو، فلسفی، شاعر، ادیب
عمر بھر اس سے رہا کرتے ہیں آپ انجان سے

ہاں مگر جیسے ہی پا جاتا ہے بیچارہ وفات
آپ اس کو چاہنے لگتے ہیں جی سے جان سے

سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد
پھر یہ فرماتے ہیں اُٹھ کر عالمانہ شان سے

مرنے والا دفن ہے گو سرزمینِ ہند میں
آئے تھے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

طول و عرضِ قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ
گورکن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے

یہ تھا اک رُخ صاحبِ تحقیق کی تصویر کا
دوسرا رُخ بھی بیاں کرتا ہوں سنئے دھیان سے

ہیں بزعمِ خود محقق آپ ہندوستان کے
آپ نے نقطے گنے ہیں میرؔ کے دیوان کے

شہر کے اندر کتابوں کا جو قبرستان ہے
گورکن ہیں آپ اسی مشہور قبرستان کے

کلستے ہیں موت کو تحقیق کے اتنا مہین
آپ کے آگے جولاہے مات ہیں ایران کے

زیرِ تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے　　کس قدر بچے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پہ یا پانچ بج کر سات پر　　داغ نے توڑا تھا دم زانو پہ منّی جان کے
رند نے اک بیوفا کے عشق میں کھائے تھے جو　　وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے
دُھن ہے یہ ثابت کریں دلّی تھا ملٹن کا وطن　　اور سودا کے چچا بوچر تھے انگلستان کے
الغرض رہتی ہے روز و شب یہی بس ایک فکر
کوئی گلدستہ اُتاریں طاق سے نسیان کے

آپ کو ہے والہانہ عشق مخطوطات سے　　جیسے سنّاٹے کو الفت ہو اندھیری رات سے
کرم خوردہ اور بوسیدہ کتابوں کے ورق　　ڈھونڈھ کر لاتے ہیں آپ اس شہر اُس دیہات سے
لے کے اِن اوراقِ پارینہ کو یوں آتے ہیں خوش　　لوٹتے ہیں جس طرح نوشہ میاں بارات سے
پھر مہینوں تک عرق ریزی کیا کرتے ہیں آپ　　جوڑتے ہیں سلسلہ اس ڈال کا اُس پات سے
سرحدِ وہم و گماں کو چھوڑ کر میلوں پرے　　کھیلتا ہے ذہن دوراز عقل امکانات سے
اُس پہ طرّہ یہ کہ رکھتے ہیں کھلے بندوں جناب　　دل میں بغضِ للّٰہی اوروں کی تصنیفات سے
گر کسی نے لکھ دیا یہ میرؔ کے دو ہاتھ تھے　　آپ اس کو رد کریں گے اپنی تحقیقات سے
آپ کی تحقیق یہ ہوگی کہ ٹُنڈا تھا غریب
اور اسے ثابت کریں گے اُس کی کلّیات سے

ٹیڈی گرل

فرقتؔ کاکوروی

کل بس میں اک گٹھڑی ملی
پوچھا تو ٹیڈی گرل تھی
شرم و حیا میں فرد تھی
عورت سے زائد مرد تھی
تھا جتنا پانی آنکھ کا
وہ سِن سے پہلے مر چکا
بازو کی دونوں مچھلیاں
چلّا رہی تھیں پی کہاں؟
آنکھیں پھٹی، زلفیں کٹی
باچھیں چری، چتون کڑی
ہونٹوں پہ لپ اسٹک ملی
دانتوں سے رانیں چھیلتی
ہلدی سی سِل پر پیستی
شرم و حیا کو کھیلتی
عورت کا سنگِ میل تھی
سینہ کھلا بڑاق سا
دل چوکڑی بھرتا ہوا

کولے کی ساری بوٹیاں
خشکی پہ جیسے مچھلیاں
ابرو کماں خنجر رواں
پیہم رواں، پیہم دواں
گالوں پہ کچھ دھبّے پڑے
اک خنجر مذموم کے
تھا جسم پر جمپر کسا
جیسے ہو اک بستر بندھا
آدھا کھلا آدھا کسا
یا کھال ہی میں ہو بسا
کپڑا بہت باریک سا
سینے پہ تھی اک الگنی
یہ شے دوپٹہ تھی کبھی
اب وہ گلے کا ہار تھی
اقرار میں انکار تھی
پہلے یہ ہوتی تھی جلی
اب ہے مگر حرفِ خفی
آنکھیں کھلی اور دل کہیں
تھی خود کہیں منزل کہیں،

کچھ قیل تھی کچھ قال تھی
اک صاحبِ اقبال تھی
اعمال ہی اعمال تھی
اک سبزۂ پامال تھی
اعضا کو پھڑکاتی ہوئی
ننگوں کو شرماتی ہوئی
کولوں کو مٹکاتی ہوئی
طرفہ ستم ڈھاتی ہوئی
تھی جسم پر جھلّی چڑھی
کھڑکی پہ جیسے چق پڑی
جب بس میں وہ چڑھنے لگی
بولی کہ روکو میں گری
دو ایک نے جب ہلپ کی
مشکل سے تب بس پہ چڑھی
جمپر جو اک دم پھٹ گیا
کونے سے کونا ہٹ گیا
دل نے کہا اچھا ہوا
یہ روز کا جھگڑا کٹا

اک بوجھ تھا ہلکا ہوا
ہے جسم جتنا کھل گیا
عشاق کے کام آئے گا
آنکھوں کو ان کی بھائے گا
اُن کو لہو رلوائے گا
تڑپائے گا برمائے گا
یہ دیکھ کر اک منچلا
جو دُور تھا بیٹھا ہوا
آپے سے باہر ہوگیا
ضبط و تحمل چھوڑ کر
شرم سے منہ موڑ کر
ٹانگوں کو اپنی جوڑ کر
ریلے میں بس کے پل پڑا
پھر کچکچا کر زور کا

اُس نے بگوٹا لے لیا
پروا نہ کچھ ہلکا پڑا
گو تلملا کر رہ گئی
لیکن وہیں بیٹھی رہی
دل میں بڑا کہتی رہی
پھر بھی مزا لیتی رہی
اور جب ذرا ٹھنڈی ہوئی
انگڑائی لے کر ہنس پڑی
یہ سوچ کر تکتی رہی
اور زیرِ لب کہتی رہی
یہ صاحبِ دل کون تھا؟
فرہادِ کامل کون تھا؟
جو کر کے ہانڈی بد مزا
چکھ کر نمک چلتا ہوا

اتنے میں جب آنکھیں لڑیں
غمزوں میں باتیں ہوگئیں
یاں تک تو ہے ہم کو پتہ
اس داستانِ عشق کا
پھر بعد اس کے کیا ہوا
اخبار میں اتنا پڑھا
اک قیس و لیلیٰ کا جتھا
خوش مزگیاں کرتا ہوا
ہے شب سے تھانے میں ڈٹا
چھوڑا گیا یا چھٹ گیا
واللہ عالم کیا ہوا؟

ایک دوست کی موت

کرشن چندر

پہلی بار جب میں نے اُسے دیکھا۔ تو وہ کالج کے ایک خوب صورت دریچے کے پیچھے کھڑا ہو کر بڑے باوقار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پہلی نظر ہی میں اُسے میں نے پسند کر لیا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی نظر ہی میں اپنے آپ کو پسند کرا لیتے ہیں۔

وہ بالکل لانبا، سیدھا کسی تربیت یافتہ فوجی نوجوان کے انداز میں کھڑا تھا۔ گندمی رنگ، گول چہرہ، چیتے کی سی پتلی کمر اور مضبوط دھڑ سے اُس کی وجیہہ شخصیت کا اندازہ کرتے ہوئے میرے دل میں بے اختیار اُس کے لیے ایک ایسی گہری کشش محسوس ہوئی کہ میرا دل اُس سے ملاقات کرنے، اُسے جاننے پہچاننے، اُسے اپنا دوست بنانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

اُس کی شخصیت میں سب سے اہم اُس کے بال تھے میں نے اپنی زندگی میں ایسے باوقار مردانہ چہرے پر ایسے خوبصورت بال نہیں دیکھے۔ اُس کے سر کے بال گہرے سنہرے تھے۔ ایسے گھنے اور ملائم گویا ریشم کے لچھے۔ اُس کی مغرور مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساس ہوا، جیسے اُسے بھی اپنے خوب صورت بالوں کی اہمیت کا احساس ہے۔

اُس کے بالوں کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں اُن میں انگلیاں پھیروں، انھیں اپنے گالوں سے لگا لوں۔ انھیں چوم لوں۔ اُن میں ڈوب جاؤں میں بے اختیار کالج کا بڑا دروازہ کھول کر اُس سے ملنے کے لیے اندر چلا گیا۔

اب تو ہر روز میری اُس سے ملاقات ہوتی ہے اور میں ہر روز بڑے پیار سے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں اُس کی ریشمیں زلفوں سے کھیلتا ہوں۔ کبھی اُن سے اپنی ٹھوڑی گدگداتا ہوں۔ کبھی اپنے گال، کبھی اُس کا سر پانی سے بھگو دیتا ہوں۔ کبھی اُسے تولیے سے پونچھ کر صاف کر دیتا ہوں۔ اور میرا دوست اب میری کسی حرکت پر معترض نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ میرا شیونگ برش ہے!

شروع کے چند دنوں میں وہ مجھ سے کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا رہا۔ اُس کے بال مجھے چبھتے تھے۔ میری انگلیاں اُس کی پتلی کمر سے پھسل جاتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا۔ جیسے میرے رخساروں سے چھوتے ہی اُس کا سارا بدن مجھ سے

بغاوت کر رہا ہے - اپنی شخصیت کی حفاظت پر تل گیا ہے - مگر ہر نئی دوستی اور رفاقت میں یہی ہوتا ہے - شروع
شروع میں نئے دوست ایک دوسرے کو جانچتے ہیں - ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں - ایک دوسرے کے
قریب آتے ہوئے بھی اپنی ذات کو بچانے پر مجبور ہوتے ہیں - مبادا اُن کی شخصیت مجروح نہ ہو جائے - دوستی میں ایک
باوقار توازن اور فاصلہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں -

ہر نئی دوستی میں یونہی ہوتا ہے - سپردگی کی وہ منزل بہت دور ہوتی ہے جب توازن ٹوٹ جاتے ہیں اور فاصلے
مٹ جاتے ہیں - اور جھجک غائب ہو جاتی ہے - اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو سمجھتے ہوئے بے جھجک اپنا سب کچھ
اُس کے حوالے کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے - اور اپنی روح کے سارے دروازے اپنے دوست کے لیے کھول دیتا ہے -
یہ منزل سمجھ کی اور سپردگی کی، ایک دوسرے میں ڈوب جانے کی بہت دیر میں آتی ہے - اس کے لیے وقت چاہیے -
اور دل کا درد - اور وہ لذت آشنا کیفیت جو کچھ پانے سے نہیں بلکہ کچھ کھونے سے پیدا ہوتی ہے -

اس لیے شروع شروع میں وہ مجھ سے کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا رہا - کبھی اُس کے بال مجھے چبھتے - کبھی بار بار بھگونے
سے بھی اُس کے بالوں میں نرمی نہ آتی - بار بار رگڑنے سے بھی رخساروں پر وہ جھاگ نہ آتا جس کی مجھے توقع تھی - اور
میں سوچنے لگتا - کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی - ایسے پالتے ہیں - اسے اس قدر اپنے قریب لاتے ہیں - ہر نئی دوستی کے شروع
میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے - جیسے آپ مغائرت کی دیوار کو گھونسے مارتے ہیں - اور وہ دیوار نہیں ٹوٹتی - اور دوسرے
فریق کی مدافعت کی وجہ سے نہیں ٹوٹتی - جیسے اس دوستی کو آگے بڑھانے میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے - صرف دوسرے
فریق کا قصور ہے - ہر آدمی اپنے اعتقادات - خیالات اور اندھی غرض سے اس قدر بندھا ہوتا ہے کہ دیوار کے دوسری
طرف نہیں دیکھ سکتا - دوستی کے پہلے دن اُس ہوا کی طرح ہوتے ہیں جو گرم گھٹی راتوں میں سانس روک کر کھڑی ہو جاتی
ہے - اور شبنم کی پہلی بوند یا پھولوں کی پہلی خوشبو کا انتظار کرتی ہے -

انہی دنوں میں ایک دن میں نے غصے میں آ کر شیونگ برش کو نیچے زمین پر پٹخ دیا - زمین پر گرتے ہی برش
باتھ روم کی سفید اور سخت ٹائیلوں سے ٹکرایا - اور لڑھکتا ہوا اُس گندی آہنی جالی پر جا گرا جس کے نیچے گندی موری
بہتی تھی - میں نے دیکھا کہ دھڑ کے قریب اُسے چوٹ آئی ہے - کمر کے قریب ایک جگہ سے اُس کا سنہرا پالش اُکھڑ
گیا ہے اور اُس کے سنہرے بال صابن کے سفید سفید جھاگ میں لتھڑے ہوئے آہنی جالی کے کوڑے میں غلیظ ہو
چلے ہیں - سفید سفید جھاگ والے شیونگ برش کو یوں گندگی میں گرتا دیکھ کر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا - مجھے ایسا
محسوس ہوا جیسے میں نے کسی صاف ستھرے دھلے دھلائے بچے کو اُٹھا کر کسی گندی موری میں پھینک دیا ہو -

جلدی سے بڑھ کر میں نے اپنے شیونگ برش کو زنگ آلود آہنی جالی سے اُٹھا لیا - اور دیوار گیر سینک
(SINK) کی ٹونٹی کھول کر اُسے دھونے لگا - اُسے ٹونٹی کے زوردار کھلے پانی کے نیچے رکھ کر میں اپنے ہاتھوں سے
اُس کی غلاظت دھونے لگا - جو میری ہی دی ہوئی تھی - میں نے بار بار اُس کے سر کو پانی سے دھویا - بار بار صابن
لگایا - اور دھویا - اور جب برش خوب اچھی طرح سے صاف ہو گیا - تو میں نے بڑے احتیاط سے اُسے تولیے سے

پونچھا۔ اُس کا سر خشک کیا۔ اور پھر اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ تو مجھے ایسا احساس ہُوا جیسے اُس کے بال انتہائی نرم اور ملائم ہو چکے ہیں۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ جب میں اُس کے بالوں کو دائیں بائیں گھماتا ہوں تو وہ بے حد نرم معلوم ہوتے ہیں۔ اور جب بائیں سے دائیں گھماتا ہوں تو وہ سخت اور کھُردرے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یکایک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ اور مجھے معلوم ہُوا کہ اب تک میں اپنے دوست کو غلط گھماتا رہا ہوں۔

"دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے!" شیونگ بُرش نے ایک میٹھی شکایت کے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "اپنی غرض سے مجبور ہو کر اکثر انسان اپنے دوست کی شخصیت کو نہیں دیکھتے۔ اُس کے طریق کار اور زاویہ نگاہ کو بھول جاتے ہیں اور اُسے غلط طریقے پر گھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اک ذرا سی سمجھ سے معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے!"

میں نے اُس کے نرم نرم بالوں کو دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمھیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟"

شیونگ بُرش نے جواب دیا "وہ دوستی ہی کیا جس میں زخم نہ ہوں!"

شیونگ بُرش سے یہ میری پہلی بات چیت تھی۔ بہت سے انسان صرف انسانوں سے بات کرتے ہیں کچھ لوگ جانوروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس دُنیا کی ہر چیز بولتی ہے۔ کرسی بات کرتی ہے۔ کھٹیا گویا ہوتی ہے۔ تصویر تقریر کرتی ہے۔ دیوار سرگوشی کرتی ہے کل دان کے پھول نغمہ سُناتے ہیں اور راستے کے پتھر ہر آن کچھ کہتے جاتے ہیں۔ محبت، نفرت اور ذہانت سے ہر چیز بولتی ہے۔ سُننے اور سمجھنے والا موجود ہو تو کائنات کی کوئی ایک شئے کسی دوسری شئے سے الگ نہیں رہتی۔

اس لیے اب کی بار جو میں نے اُسے پانی میں بھگو کر صابن لگایا۔ اور اُسے اپنے رخسار پر دائیں سے بائیں گھمایا تو مجھے اُس کے بال پہلے سے کہیں زیادہ ملائم اور نرم معلوم ہوئے اور شیو بھی عمدہ بن گیا اور میں نے اپنے دوست کو بدلنے کا خیال ترک کر دیا۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے۔ اور مجھے اپنے دوست کے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ میری طرح اُسے بھی ٹھنڈے پانی کے غسل سے نفرت ہے۔ سرد پانی سے اُس کا جسم ٹھٹھر جاتا ہے۔ بال سخت ہو جاتے ہیں اور جھاگ بھی زیادہ نہیں آتا۔ بہت گرم پانی سے بھی وہ گھبراتا ہے۔ اُس کے سر کے بال ایسے کمزور اور لجلجے سے ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک سے شیو نہیں ہو سکتا۔ نیم گرم پانی اُس کے لیے بہترین ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ وہ جو اکثر میری گرفت سے پھسل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں اُس کی کمر کو بڑے زور سے پکڑتا ہوں۔ دوست پر جس قدر آپ کی گرفت مضبوط اور سخت ہو گی اُتنا ہی وہ رسیاں تڑا کر آپ سے اور بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے گرفت ہلکی ہونی چاہیئے۔ اور رویّہ مدھم۔ شیونگ بُرش کو پکڑنے کا بہترین

طریقہ یہ ہے کہ اُسے عورت کی طرح پکڑا جائے اور عورت کو پکڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے شیونگ برش کی طرح تھاما جائے۔ تبھی بہترین نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ اگلے چند مہینوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے شیونگ برش کو ایک خاص قسم کی صابن کی ٹکیہ پسند آگئی ہے۔ روزالی۔ اس دوران میں میں نے بہت سی صابن کی ٹکیاں بدلیں۔ آسٹرا۔ جامکو۔ تارا۔ شاہ پسند۔ مگر کسی صابن سے وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو روزالی کی خاصیت ہے۔ مرد کی طرح شیونگ برش بھی حسن پرست ہے اور وہ اپنی صابن کی ٹکیہ پہچانتا ہے۔ اور میں نے شیونگ برش سے کہا "یوں دیکھا جائے تو ایک صابن کی ٹکیہ اور ایک عورت میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ کبھی عورتیں صابن کی ٹکیہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ملائم اور نرم ہوتی ہیں اسی طرح مہکتی ہیں۔ صاف ستھری اور اجلی معلوم ہوتی ہیں۔ پیار سے تھوڑی تھوڑی چھوتی ہیں۔ رخسار چومتی ہیں اور گردن میں باہیں ڈال کر ہر روز مرد کی حجامت بناتی ہیں!"

شیونگ برش بولا "مگر صابن کی ٹکیہ گھلتی بھی تو ہے۔ یہ شمع ساں گھلنا کوئی صابن کی ٹکیہ سے سیکھے۔ کسی دوسرے کی خاطر رفتہ رفتہ گھل گھل کر اپنی جان دے دینا اسی مخلوق کا خاصہ ہے۔ اتنی بڑی قربانی تو آج تک کسی شیونگ برش نے نہ دی ہوگی۔ جس دن یہ صابن کی ٹکیہ ختم ہو جائے گی تم بازار سے دوسری خرید لاؤ گے۔ ٹکیہ مرد کی بے وفا فطرت جانتی ہے۔ پھر بھی ہر آن گھلتی ہے۔ اور گھل گھل کر مرد کے رخسار چمکاتی ہے۔ ایسا ایثار عورت کے سوا اور کس سے ممکن ہے؟

میں چپ ہو رہا کیونکہ عمر عزیز کے پینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی کنوارا تھا۔ لیکن میں نے اتنا ضرور کیا کہ آئینے کے سامنے اپنے شیونگ برش اور اس کی ٹکیہ کو اکٹھا کھڑا کر دیا۔ اور پھر ان دونوں کو یوں ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کانچ کے بلند و بالا دریچوں والے ہال کے باہر میاں بیوی مسکراتے ہوئے اپنے مہمانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دونوں ایسے متبسم اور خوش معلوم ہو رہے تھے۔ کہ جب سے میں ان دونوں کو ہمیشہ اکٹھا رکھتا ہوں، آئینے کے سامنے۔ البتہ جب کبھی اپنے شیونگ برش سے خفا ہوتا ہوں۔ تو اس کی ٹکیہ کو اٹھا کر آئینے کے دوسرے کونے کی طرف الگ رکھ دیتا ہوں۔ اس وقت میرے شیونگ برش کی صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے بڑا مزا آتا ہے مجھے ان دونوں کو اکٹھا کرنے میں اور پھر جب جی چاہے تو الگ کر دینے میں! شاید خدا کو بھی کچھ اس طرح کا مزا آتا ہوگا۔ ۔ ۔

دفتر میں ایک بدنام لڑکی تھی۔ سوفی۔ سنا ہے کئی جگہ اس کا معاشقہ چلتا تھا۔ وہ میرے پاس بھی کبھی کبھی آتی تھی۔ بس یونہی سی تھی۔ دبلی پتلی سانولی۔ آنکھوں کے سوا اس کے چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور ابرو کمان کی طرح تنے ہوئے۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے پاس آنکھوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں اس لیے وہ اپنی آنکھوں سے بہت سا کام لیتی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھنے کے علاوہ بولتی بھی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے سن بھی رہی ہیں۔ کبھی کبھی بانہہ پھیلا کر اپنے پاس بلاتی تھیں، کبھی کبھی آہیں بھر کر سسکتی ہوئی معلوم

ہوتی تھیں۔ کبھی وہ بلّی کی آنکھوں کی طرح چالاک دکھائی دیتیں۔ کبھی سقراط کی آنکھوں کی طرح فلسفے میں ڈوبی ہوئیں۔ کبھی بچوں کی طرح بھولی۔ اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی کہ ایک مرد اپنی آنکھوں سے کتنا کام لے سکتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ اُسی سے کام لیتا ہے۔

میں اُس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ بس یونہی میرے پاس چلی آتی ہے دوسروں سے اُکتا کر، اور وہ دوسرے بھی غالباً میری طرح زمانے سے حالات سے زندگی سے ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے ہوں گے۔ اور اسی طرح سلسلے وار ایک سے دوسرے سے تیسرے تک یہ یکسانیت اور اکتاہٹ کی زنجیر چلتی ہے۔ جس میں کسی فرم، کسی دفتر یا کسی مِل کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے۔ رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا نیم تاریک بدبودار سیلا ہوا کمرہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف بانس کی کھپچیوں کے بک شیلف پر بہت سی کتابیں اور فائلیں پڑی رہتی ہیں۔ دوسرے کونے میں کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا رہتا ہے، دو تین کرسیاں ہوتی ہیں۔ ایک ٹیڑھا سا سٹول ہوتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی میز ہوتی ہے۔ جو بیک وقت کھانے کی میز، مطالعے کی میز، تاش کی میز اور مہمانوں کے سونے کا کام دیتی ہے۔ جس پر کسی زمانے میں ایک خوب صورت میز پوش بچھا ہوا ہوگا۔ لیکن جس کا گہرا سبز رنگ اب متواتر استعمال سے اور نہ دُھلانے سے سیاہی مائل ہو چلا ہے۔ جس کے گلابی کنارے پر چھپی ہوئی اجنتا کی حسیناؤں کے چہروں پر پانی کے دھبے، سگریٹ کی راکھ، شوربے کی چکناہٹ، فونٹین پن کی سیاہی، اور صابن کی جھاگ جمی ہوئی ہے، اور ان سب کے بیچ بان کی ایک جھلنگا چارپائی ہوتی ہے۔ جس پر بیٹھے بیٹھے آدمی زندگی کے سب کام کر سکتا ہے۔ اسی پر آلتی پالتی مار کر کھانا کھا سکتا ہے، پائینتی پر فائلیں رکھ کر کام کر سکتا ہے۔ میز قریب گھسیٹ کر شیو کر سکتا ہے۔ عورت کو قریب گھسیٹ کر محبت کر سکتا ہے۔ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ جی سکتا ہے۔ سو سکتا ہے۔ مر سکتا ہے۔ آخر ہمارے ایسے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک بان کی کھاٹ کے سوا اور چاہیے بھی کیا۔ اور میرے ایسے شکست الوجود اور کاہل کے مارے ہوئے آدمی کے نزدیک تو جنّت کا تصوّر بان کی کھاٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ جس پر بیٹھے بیٹھے بھی زندگی کے سارے کام سر انجام دیئے جا سکتے ہیں اور میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ وہ کس طرح کی جنّت ہوگی جس کے لیے دنیا کے لوگ دن رات اتنی بڑی نیکیاں کرتے پھرتے ہیں۔ یہ نیکیاں جن کے چمکتے ہوئے خول کے اندر خود غرضی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کس طرح کی جنّت ہمیں دیں گی؟ کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی بان کی ایک چھوٹی سی کھٹیا پر لیٹ جائے اور چپکے چپکے نیلے آسمان کو دیکھ کر رویا کرے، یا خوب صورت عورتوں کو ہولے ہولے گلی میں سے گزرتے دیکھ کر مسکرایا کرے یا بلّی کے بچّوں کو ایک دوسرے سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا کرے۔ کبھی کبھی نیکی کرنے سے مجھے یہ کام بہت بہتر معلوم ہوتے ہیں!

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس دن سوتی آجاتی تھی۔ اور ہمیں کوئی بیہودہ سی فلم دیکھنے کے لیے باہر جانا نہیں ہوتا تھا تو میرے کمرے کا نقشہ بدل جاتا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی ساڑھی کا پلّو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر کمرے میں جھاڑو دیتی تھی۔ پھر میرے بک شیلف کو ٹھیک کرتی تھی۔ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر کی چھان پھٹک کرنے کے بعد رسالوں کو الگ

کرتی تھی - اور کتابوں کو قطار وار الگ فرش پر سجا دیتی تھی - میز پر میرا سامان قرینے سے رکھتی تھی - سٹول پر رکھے ہوئے کلاک کو چابی دیتی تھی - اور پھر ہاتھ منہ دھو کر میرے قریب آ کر بان کی کھاٹ پر بیٹھ جاتی تھی - اور میں ان تمام کاموں کے بدلے میں اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے ایک بوسہ دیتا تھا - جیسے جھاڑو بھارو کا کام ٹھیک سے کرنے پر ہم بھنگی کو ایک دوانی دے دیتے ہیں -

اسی طرح وہ کبھی کبھار آتی رہی اور زندگی کو برداشت کرنے کا یہ سلسلہ نیم بیزاری اور نیم اکتاہٹ کے عالم میں چلتا رہا - لیکن ایک دن جو وہ آئی، تو میں نے اسے عجب رنگ میں پایا - وہ بے حد کھوئی کھوئی اور گم سم اور کبھی کبھی وحشت زدہ سی دکھائی دیتی اور پھر گھبرا کے میری طرف دیکھتی - اور جب میں نے پوچھا کیا بات ہے - تو کچھ نہیں، کہہ کر بار بار گاتی رہی - اور پھر پریشان ہو کر اپنی ساڑھی کے پلو کو اپنی انگلی پر لپیٹتی رہی اور کھولتی رہی - ہار کر میں اس کے ذہنی خلفشار کی طرف سے انجان بن گیا - اور باتھ روم سے شیو کا سامان اٹھا لایا - اور وہیں میز آگے گھسیٹ کے اس کے سامنے شیو کی تیاری کرنے لگا -

آخر کار وہ بولی - تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ؟

کیوں کر لوں !

وہ بہت دیر تک چپ رہی - آخر اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی - بالکل گھبرا کر بار بار سر ہلا کر بولی: "میں — میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں"

تو اپنی مصیبت مجھ پر کیوں لانا چاہتی ہو !

تم سے نہ کہوں تو پھر کس سے کہوں ! —

جواب میں میرے ذہن میں بہت سے نام آئے - مگر میں چپ رہا -

اس نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو ؟"

"نہیں !"

غالباً اس جواب کی اسے توقع نہیں تھی - کیونکہ یہ سنتے ہی اس نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا - ایک لمحے کے لیے میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا - پھر ٹس ہو کر بیٹھ گئی - اور میں چپ چاپ شیو بناتا رہا - اور جب شیو بنا چکا تو اس نے صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا میرا شیونگ برش اٹھا لیا اور اسے دھیرے دھیرے اپنے رخساروں پر پھیرنے لگی -

کیا کر رہی ہو ؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا -

"مرد بننا چاہتی ہوں" اس نے سسکتے سسکتے کہا -

جب وہ چلی گئی - تو شیونگ برش نے مجھ سے کہا - تم کتنے کڑوے اور کھردرے ہو - کیا تم میری طرح کسی دوسرے کی مصیبت پر جھاگ نہیں لگا سکتے - جھاگ لگانے سے زندگی کے بہت سے کانٹے نرم پڑ جاتے ہیں ! —— کیا تم اتنا بھی

نہیں سمجھتے ؟

سب سمجھتا ہوں - میں نے کہا - لیکن کیا کروں ؟ میرے ذہن میں جس بیوی کی تصویر بسی ہے اُس پر سوفی پوری نہیں اترتی - اور جو پوری اُترتی ہے اُسے حاصل کرنے کے لیے میری تنخواہ پانسو روپے ہونی چاہیئے - تم سمجھتے ہو میں شادی نہیں کرنا چاہتا - مگر کس سے کروں شادی اور کہاں پر ہے وہ گھر جس کے آنگن سے مجھے آسمان نظر آتا ہو - اور کہاں رکھونگا میں اپنے بچوں کو ؟ اس نیم تاریک بدبودار مرغیوں کے ڈربے میں ؟ ——— تو پھر ہم اپنے آپ کو انسان کیوں کہتے ہیں - صاف صاف مرغیاں اور بھیڑیں اور بکرے کیوں نہیں کہتے - اس لفظی رعایت کا کیا فائدہ ؟ جبکہ میری تنخواہ ایک سو ساٹھ روپے ہے - اور سال میں تین روپے کی ترقی مجھے ملتی ہے - اور تین سال کے بعد جب میرے ہاں تین بچے ہو جائیں گے تو جناب میں تو اُن تین بچوں کو نو روپے ماہانہ پر نہیں پال سکتا - اگر میں اپنے خوابوں کی دیوی سے نہیں سوفی سے بھی شادی کرلوں تو بھی نہیں پال سکتا !

دوسرے دن دفتر میں سوفی مجھے کہیں نہیں دکھائی دی - معلوم ہوا اُس نے استعفٰے دے دیا ہے - وہ کہیں چلی گئی ہے - میں بھونچکا سا رہ گیا - اس طرزِ عمل کی مجھے اُس سے اُمید نہ تھی - میں تھوڑا سا خوش بھی ہوا - چلو کسی نے میری خاطر اپنے آپ کو پریشانی میں تو ڈالا - اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی کچھ ہوں - پھر میرے خیالات نے دوسری راہ اختیار کی - اُونہہ ؟ کہیں جھنجھلا کر چلی گئی ہو گی - کسی نہ کسی سے وہ ضرور شادی کرلے گی - کوئی نہ کوئی احمق اُسے ضرور مل جائے گا -

دن پھر اُسی یکسانیت سے گزرنے لگے - اُسی اکتاہٹ اور بیزاری سے جو میری طبیعت کا خاصا بن چکی تھی - اس دوران میں جوآن آئی - جس کے بال بھورے تھے - اور آملی جس کی آنکھیں بھوری تھیں - اور دملا جس کی ناک چپٹی تھی اور ——— نام گنانے سے کیا فائدہ ؟ ——— اُن سب کی صورتیں گو مختلف تھیں - لیکن وہ سب ایک سی تھیں - وہ سب بہت سوں میں سے کسی ایک کو تلاش کر رہی تھیں - اور ہم بھی بہتوں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ رہے تھے - اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم سب لوگ کسی بہت بڑے کھنڈر میں آنکلے ہیں اور ایک دوسرے کے چہروں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں - ایک راستہ دوسرے راستے کو کاٹتا ہے - ایک چہرہ دوسرے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے - ایک نگاہ گہری پہچان کی ملتی ہے - مگر دوسرے لمحے ہی میں وہ چہرہ مکمل اجنبی ہو جاتا ہے - اور راہی مایوس ہو کر پھر اپنی تلاش پر آگے دوڑنے لگتا ہے - اور سارا کھیل یوں لگتا ہے جیسے کسی اندھیری غلام گردش میں بہت سے چوہے مختلف سمتوں میں ایک دوسرے پر پھلانگتے ہوئے جا رہے ہوں -

اپنی بے معنی بے مقصد زندگی سے عاجز آکر میں نے ایک دن فرم کی ملازمت سے استعفٰے دے دیا - اور سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گیا - کیونکہ جب کبھی کوئی نیا وائسرائے ہندوستان میں آتا تھا - میرا جی اُس کا گلا گھونٹ دینے کو چاہتا تھا - مجھ سے پہلے میرے باپ کا بھی یہی جی چاہتا تھا - اور اُس سے پہلے میرے باپ کے باپ کا - اور اس طرح نسلوں اور پشتوں سے جمع ہوتی ہوئی یہ نفرت مجھ تک پہنچی تھی - اور جب اس نفرت کی حدّت سے میرا خون کھولنے لگا - اور جب فرم کے انگریز مینجر کو دیکھ کر مجھے بخار سا چڑھنے لگا تو میں نے فرم کی ملازمت چھوڑ دی اور سول نافرمانی کی

تحریک میں حصہ لینے لگا۔ کیونکہ نفرت ایک مرض ہے۔ اور جب تک آدمی اسے اپنے جسم اور روح کی سسٹم سے خارج نہ کر دے سے چین نہیں آ سکتا۔ اس لیے جب مجھے دو سال کی قید ہوئی تو مجھے قرار سا آ گیا۔ دل کو ایک تسکین سی ہوئی۔ جیسے مرض سے نجات مل گئی۔ جیل کی زندگی سے مجھے کسی طرح کی حیرت نہ ہوئی۔ جو آدمی زندگی بھر ایک تنگ و تاریک کھولی میں رہنے کا عادی ہو۔ اسے جیل کی بارکیں کیوں بری معلوم ہوں گی جس آدمی نے اپنی ساری زندگی جھونپڑے نما ڈھابوں کا غلیظ کھانا کھا کر بسر کی ہو اسے جیل کا کھانا کیوں برا معلوم ہوگا۔ جو آدمی ایک چھوٹی سی میز پہ۔ چار فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پر ایک کونے میں صبح سے شام تک سر جھکائے دس گھنٹے کام کرنے کا عادی ہو اسے جیل کی مشقت سے کیا تکلیف ہوگی؟ یہ جیل بہت بڑی تھی۔ اور اس میں سینکڑوں قیدی تھے۔ اور لمبی لمبی دیواروں کے اندر گھاس کے میدان تھے اور درختوں کی قطاریں تھیں۔ اور پھولوں کے قطعے تھے۔ اور رات کو بارکوں کے باہر چاندنی چھٹکتی تھی۔ اور ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسمان نظر آتا تھا۔ اور دو وقت ہر ایک کو کھانا ملتا تھا جو جیل سے باہر ہر کسی کو کہاں ملتا ہے اور رہنے کو ایک فرش اور ایک چھت ملتی ہے۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ سردیوں میں جب فٹ پاتھ بہت ٹھنڈے ہوتے ہیں اور برساتوں میں جب وہ بہت گیلے ہوتے ہیں۔ بہت سے غریب لوگ بے گھر لوگ چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل میں آ جاتے ہیں۔ اور مزے سے تین چار ماہ گزار کر چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ دراصل جرم نہیں کرتے۔ بلکہ حالات سے ایک طرح کی سول نافرمانی کرتے ہیں۔ اور یہ سول نافرمانی ہزاروں سال سے جاری ہے اور بڑی بڑی جیلوں کے باوجود اس وقت تک جاری رہے گی جب تک باہر کی دنیا میں عام آدمیوں کو وہ سہولتیں بہم نہ پہنچائی جائیں گی جو بڑی سے بڑی جیل میں بھی ایک عام قیدی کو حاصل ہوتی ہیں!

جیل میں مجھے تیسرے درجے میں رکھا گیا تھا۔ جہاں میری طرح کے سینکڑوں لوگ مجھ سے پہلے موجود تھے۔ اور جن کی زندگیاں مسلسل ایک تیسرے درجے کا سفر رہی تھیں۔ یہاں ہم سب لوگوں کو ایک سے کپڑے دیئے گئے تھے! اور مزے کی بات یہ تھی کہ ہمارا کوئی نام نہ تھا۔ ہم سب نمبر تھے۔ اور میرا نمبر ۱۴۵ تھا۔ اور میری بارک کے تالے کا نمبر ۱۱۷ تھا۔ اور میرے شیونگ برش کا نمبر ۱۳۳ تھا۔ اور یہاں آ کر پہلی بار میں نے ایک انسان کے مقابلے پر اپنے آپ کو ایک آہنی تالے اور لکڑی کے ایک شیونگ برش کے بہت قریب محسوس کیا۔ اور شاید اسی لیے بہت محفوظ بھی ہوا ۔۔۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ بری طرح کے شکست اور کاہل انسانوں کے لیے جو لاکھوں آدمیوں کو جنگ کی بھٹی میں نہیں جھونک سکتے۔ جو یا ان کی ایک کھٹیا پر لیٹ کر صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کے لیے جیل بہترین جگہ ہے!

جیل میں میں اپنا شیونگ برش لے گیا تھا۔ اور جیل کے ساتھیوں میں میرا شیونگ برش بہت مقبول ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ واقعی ایک عمدہ شیونگ برش تھا۔ اور بڑی محنت سے اپنا کام کرتا تھا۔ حالانکہ جیل میں عمدہ صابن اور عمدہ بلیڈ دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ پھر بھی شیونگ برش بڑی تن دہی سے اپنا کام کئے جاتا تھا۔ اور ہر روز تقریباً دس بارہ آدمیوں کی شیو کرتا تھا۔

ان آدمیوں میں اناؤ کا بھگیلو اہیر بھی تھا۔ بھگیلو ساڑھے چھ فٹ کا اونچا لانبا احمق تھا جو انگریزوں کی فوجی ٹرین کے آنے سے قبل ریل کی پٹڑی اکھاڑتے ہوئے پایا گیا تھا۔ اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے صرف سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اس کی چھاتی بڑی چوڑی تھی اور داڑھی بڑی سخت تھی۔ اور گردن بیل کی طرح مضبوط تھی۔ اور وہ اکثر اپنے وارڈروں سے جھگڑا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بالکل پاگل ہو گیا۔

اُس نے اپنے وارڈر کا جبڑا توڑ دیا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ میرا آئینہ توڑ دیا۔ اور میرے شیونگ برش کو بار بار اُٹھا کر دیوار پہ دے مارا۔ حتیٰ کہ اُس کے خول کا کرومیم نما چھلا ٹوٹ گیا۔ اور میرے شیونگ برش کے سارے خوبصورت بال زمین پر گر گئے۔ بڑی مشکل سے ہمارے بہت سے ساتھیوں نے اُسے تھاما اور اُسے پکڑ کر وارڈروں کے حوالے کر دیا۔

اگر شیونگ برش اس قدر خوبصورت اور کارآمد نہ ہوتا۔ تو کسی کو اُس سے ہمدردی نہ ہوتی۔ مگر میرا شیونگ برش خوبصورت اور کارآمد ہونے کے علاوہ بے قصور بھی تو تھا۔ اس لیے کسی نے اُس کا ٹوٹا ہوا چھلا اُٹھایا۔ کسی نے اُس کا لکڑی کا خول ـــ دو تین آدمیوں نے مل کر اُس کے نرم اور ملائم بال چُن کر جمع کئے۔ ایک وارڈر نے بالکل اسی سائز کا پیتل کا چھلا مجھے دینے کا وعدہ کیا۔ دو تین دن کی سرجری اور مرہم پٹی کے بعد میرا شیونگ برش پھر اپنے محاذ پہ موجود تھا۔ اُس کے جسم پر بہت سے زخموں کے نشان تھے اور اس کے سر کے کچھ بال بھی غائب تھے۔ اور نصف سے زیادہ اُس کا پالش بھی نکل گیا تھا۔ اور اس کی چوبی ہتّی پر کرومیم کے بجائے پیتل کا ایک بدنما چھلا تھا۔ مگر وہ پھر سے کام کر رہا تھا۔ اور اپنی زندگی، افادیت اور شخصیت کا ثبوت دے رہا تھا۔ گو وہ اب جوان نہ رہا تھا۔ خوبصورت نہ تھا۔ بلکہ کسی قدر عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اور بہت مدّت کے بعد مجھے اُس کے لہجے میں شکایت سی محسوس ہوئی۔

تم اپنے دوستوں کو برتنا نہیں جانتے ہو! وہ بولا۔ اُس کم بخت بھگیلو کے بال بڑے سخت ہیں۔ اُسے میرا ایسا برش چاہیئے؟ سؤر کے بالوں والا برش چاہیئے۔ تم نے مجھے اُس کے حوالے کیوں کیا۔ میں ایسے سخت بالوں اور کرخت رخساروں پر کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دوستی وہیں مضبوط ہوتی ہے۔ جہاں شدید اختلاف کے باوجود کچھ قدریں مشترک ہوں۔ تم نے میرے اور بھگیلو کے درمیان کونسی قدر مشترک دیکھی؟ دوست کو غلط ہاتوں میں نہ دینا چاہیئے۔ یہ دوستی کی توہین ہے!

اتنے رئیس مت بنو۔ مت بھولو کہ تم ایک غریب آدمی کے برش ہو۔ اور بھگیلو بھی ایک غریب آدمی ہے۔ اور یہی غریبی ہی تم دونوں میں مشترک ہے

لیکن میرا قصور کیا تھا؟ برش نے پوچھا۔

تم بے گناہ تھے۔ اس سے بڑا قصور اس دُنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے برش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بھگیلو بھی تمہاری طرح بے قصور ہے۔ اُسے غصہ آ گیا تھا۔ کیونکہ جب سے وہ جیل میں آیا ہے۔ اُس کی بیوی بھاگ گئی ہے۔ اُس کے چچا نے اُس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اُس کی ماں کنوئیں میں گر کر مر گئی ہے۔ ان حالات میں کوئی شخص بھی پاگل ہو سکتا ہے۔

تم میرے مالک تھے۔ برش نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ تم میری جان بھی لے لیتے تو مجھے غم نہ ہوتا۔

میرے دوست! میں تمھیں امریکی شاعر وِٹمن کے دو مصرعے ترجمہ کر کے سُناتا ہوں "وہ چیز جو سب کی ہے اُس کا کوئی ایک مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ جسے سب استعمال کرتے ہیں اُسے کون مار سکتا ہے؟؟" اگر تم نے دو دن پہلے کا وہ منظر دیکھا ہوتا جب دو درجن ہاتوں نے تمہاری زندگی ریزہ ریزہ کر کے جیل کے فرش سے اُٹھالی اور اُسے از سرِ نو ترتیب دیا، تم بھگیلو کو یقیناً معاف کر دیتے..... کیونکہ کسی ایک شخص کی زندگی صرف اُس کی اپنی نہیں ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں سیکڑوں لوگ، ہزاروں حالات اور لاکھوں، کروڑوں خلیے حصہ لیتے ہیں۔ پھر تم صرف اپنے کیسے ہو سکتے ہو۔ یا صرف میرے کیسے؟

جیل سے رہا ہو کر میں اپنے شہر میں واپس آ گیا۔ اور دفتر دفتر ملازمت ڈھونڈنے لگا۔ ملک آزاد ہو چکا تھا اور اس کی آزادی کی جدوجہد کا ایک چھوٹا سا حلیہ میں بھی تھا۔ اور بھگیلو اسیر بھی اور ہماری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ جن کے نام تاریخ کے کسی صفحے

اور سڑک کے کسی کھمبے پر نہ ہوں گے۔ کیونکہ لوگ ہمیشہ پھولوں کو دیکھتے ہیں۔ کھاد کی طرح گندے میلے کچیلے غلیظ غریب آدمیوں پر کس کی نظر جاتی ہے۔

اور تین ماہ کی کاوش کے بعد مجھے ایک دفتر میں ایک سو چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔ نوکری ملنے کے چند دن بعد مجھے اپنے دوست کا مکان چھوڑ دینا پڑا۔ کیونکہ اس کی بیوی میکے سے آنے والی تھی۔ اس لیے میں اپنا سوٹ کیس لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کسی کھولی کی تلاش میں۔ اور سب سے پہلے میرے ذہن میں اپنے پہلے گھر کا خیال آیا۔ ممکن ہے وہ خالی ہو۔ مگر اتنے عرصے تک اتنے بڑے شہر میں کوئی گھر خالی کیسے رہ سکتا ہے؛ مگر اس کے باوجود میرے قدم مجھے اُسی پرانے گھر کی طرف لے گئے۔ ممکن ہے اُسی بلڈنگ میں کوئی دوسری کھولی خالی ہو۔ مالک مکان سے میرے مراسم اچھے تھے۔ ممکن ہے وہ کوئی انتظام کر دے۔

لیکن اُس بلڈنگ کے اندر پہنچ کر میں مالک مکان کے دفتر میں نہیں گیا۔ جو گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ بلکہ دو منزل سیڑھیاں چڑھ کر اپنے پرانے گھر کو دیکھنے گیا۔ دروازے پر تالا نہ تھا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور برتنوں کے کھنکنے کی آواز کہیں اندر سے آرہی تھی۔ میں نے بے اختیار دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھولا۔

میں نے دیکھا۔

دروازے پر سوتی کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ آگے بڑھ کر اُس نے میرا سوٹ کیس میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور مجھے کھینچ کر اندر لے گئی۔ اور دروازہ بند کرتے ہی میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی "دو سال سے میں نے اس گھر کو تمہارے لیے تیار رکھا ہے۔ میرا خیال تھا کبھی نہ کبھی تم ضرور آؤ گے۔ آؤ۔ دیکھو، اپنا گھر۔۔۔!"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں نے زور سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور چند لمحوں کے مکمل سنّاٹے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے لگے لگے کانپتے رہے۔ پھر اُس نے آہستہ سے اپنے سر کو میرے سینے سے ذرا سا ہٹا کر مجھے دو تین بار زور سے سونگھا اور مسکرا کر بولی "ہائے تمہارے سینے سے کیسی کوڑے گھڑے کی کچی کچی خوشبو آتی ہے!

ہر ڈال میں پھول آتے ہیں اور ہر خلا ستاروں سے بھر جاتی ہے۔ میری زندگی بھی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے بھرنے لگی، اور اُس نیم تاریک کھولی میں بھی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ننھے ننھے دیئوں کی طرح جگمگانے لگیں۔ دو سال کے بعد میرے گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ وہ میری گود میں بیٹھ جاتی تھی اور غوں غاں کرتے ہوئے ایک عجیب زبان میں میرا اخبار پڑھتی تھی کبھی کبھی اپنا پورا ہاتھ منہ میں ڈال کر میری زبان پکڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور میری ٹائی پکڑ کر اُس سے جھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ اُسے میرا شیونگ برش بھی بہت پسند تھا۔ وہ اکثر میری نقل کرتے ہوئے شیو کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور کئی بار اُس نے صابن کے جھاگ سے اپنا چہرہ بھر لیا۔ اور تالی بجا کر کہنے لگی "آہا۔ میں پپا ہوں۔ ممی دیکھو۔ میں پپا ہوں!"

میں اپنی بچی کے لیے ایک خوبصورت پنگوڑا لایا۔ اور سوتی نے اُس کے لیے بڑے خوبصورت فراک سیئے۔ اور میں نے شدید جدوجہد کے بعد سوا دو سو روپے کی ایک بہتر ملازمت بھی حاصل کر لی۔ کیونکہ اُس بچی کے لیے میرے حوصلے اور میرے عزائم بلند ہو چلے تھے۔ میں اپنی بچی کو بہترین کھانا دوں گا۔ بہترین کپڑے۔ اور بہترین تعلیم۔ اور وہ شادی کے بعد کسی کھولی میں نہیں بلکہ پانچ کمروں والے جگمگاتے ہوئے کسی عمدہ فلیٹ

میں جائے گی۔ اسی طرح ماں باپ خواب دیکھتے ہیں۔

ایک دن جب میں شیو کی تیاری کر رہا تھا۔ اور شیونگ برش کو صابن کی ٹکیہ سے رگڑ کر جھاگ پیدا کر رہا تھا۔ میری بیوی ایک کونے سے چلائی "دیکھو تو آشا کو کیا ہو گیا ہے"۔

اُس کے چہرے پر وحشت اور خوف کا شدید تاثر تھا۔ میں نے صابن سے تھڑے ہوئے شیونگ برش کو وہیں چھوڑا۔ تولیے سے اپنے منہ کو صاف کیا۔ اور آشا کی طرف بڑھا۔ اور اُس کا منہ کھول کر غور سے اندر دیکھنے لگا۔

بچی کا منہ اندر سے سوجتا جا رہا تھا۔ اور اُسے سانس لینے سے بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ میں فوراً اُسے گود میں اُٹھائے اُٹھائے سیڑھیوں کے نیچے بھاگا۔ اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوا اور انجکشن دیتے ہوئے بتایا۔ کہ بچی کو ڈپتھریا (DIPTHERIA) ہو گیا ہے۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بچی چل بسی۔

تین دن تک میں دفتر نہیں گیا۔ کپڑے نہیں بدلے۔ شیو نہیں کیا۔ اپنی کھاٹ پر لیٹے لیٹے چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک کونے میں کھونٹی سے لٹکا پڑا تھا۔ اور اُس پر بچی کے فراک پڑے تھے جو ابھی ابھی دھوبی سے دُھل کر آئے تھے۔ کیا جس طرح سے میری بچی کے فراک دھوبی سے دُھل کر آتے ہیں۔ کیا اسی طرح میری بچی مرگھٹ سے واپس نہیں آ سکتی؟ سونی نے روتے روتے مجھ سے پوچھا۔ اور میں نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ میں کیا جواب دوں۔ میں کوئی خدا ہوں؟

چوتھے روز سونی نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بستر سے اُٹھایا۔ کیا اسی کھاٹ پر لیٹے لیٹے مر جانے کا ارادہ ہے۔ دفتر نہیں جاؤ گے۔ اُٹھو شیو کرو۔ کپڑے بدلو۔ اور کام پر جاؤ۔

میں شیو کرنے لگا۔ معلوم ہوا۔ کہ شیونگ برش اُس وقت سے صابن میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ جس وقت میں پلٹ کر بچی کا منہ دیکھنے کے لیے مڑا تھا۔ صابن کا جھاگ اُس کے بالوں میں سوکھ گیا تھا۔ اور وہ اُن سفید سفید بالوں میں بہت بڈھا اور سوکھا ہوا اور غمزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر باتھ روم میں اُس کے بالوں سے سوکھا ہوا صابن چھڑایا۔ اور اُسے اچھی طرح سے صاف کر کے جب شیو کرنے لگا۔ تو مجھے اس کا لمس بے حد ملائم مکھن کی طرح نرم اور ربالائی کی طرح ریشمیں معلوم ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو مجھے ایسا لگا گویا یہ برش کے بال نہیں ہیں، میری بچی کی ننھی ننھی انگلیاں ہیں جو بڑے پیار اور محبت سے میرے رخساروں سے کھیلتی ہوئی صابن کے جھاگ کی دھاریاں بکھیر رہی ہیں۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہ نکلی۔ اور آنسو میرے رخساروں پر بہ بہ کر صابن کے جھاگ میں ملنے لگے۔ اور مجھے ایسا لگا، جیسے میرا شیونگ برش بھی میرے ساتھ رو رہا ہے اور انتہائی رفاقت سے بہے بہے میرے رخساروں کو تھپک رہا ہے۔

ڈیڑھ سال کے بعد ہمارے ہاں ایک اور بچی پیدا ہوئی، لیکن مری ہوئی، پھر تیسرے برس ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن وہ بھی مرا ہوا۔

اس واقعے کے چند ماہ بعد سونی اچانک مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اُس نے مجھے کچھ بتایا نہ کہا۔ نہ میرے لیے کوئی خط چھوڑا۔ چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی۔ بہت جگہوں پر میں نے اُسے ڈھونڈا۔ اور بہت عرصے تک میں نے اُس کی تلاش کی۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ اور میں پھر اپنی کھولی میں اکیلا رہ گیا۔

اب مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے میں اپنے شیونگ برش سے کہتا ہوں، کیونکہ آدمی صرف نفرت کرنے والا صرف لڑنے جھگڑنے والا

صرف کام کرنے والا انسان نہیں۔ وہ محبت کرنے والا انسان بھی ہے۔ اور جب انسان اُس کی بات نہ سُنیں تو وہ کسی سے تو اپنے دل کا درد کہے گا۔ چاہے وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔

آٹھ سال سے میں اور میرا شیونگ برش اس کھولی میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ میرا شیونگ برش بہت بڈھا ہو چلا ہے۔ بُری طرح اُس کے سر کے بہت سے بال جھڑ گئے ہیں۔ لکڑی کے دستے کا سارا پلستر اکھڑ چکا ہے۔ اور لکڑی میں بھی گہری گہری دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں۔ اور اُس کا بدنما پیتل کا خول جگہ جگہ سے یوں ہلتا ہے جیسے بڈھے کے منہ میں دانت ہلتے ہیں۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ وہ بہت سیانا اور دانا ہو گیا ہے۔ میں گھنٹوں اُس سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور اُس کی باتیں سُنا کرتا ہوں۔ جو اُس کے لکڑی کے دستے نے کبھی جنگل کے درختوں سے سُنی تھیں۔ جو اُس کے بالوں نے غیر پالتو جانوروں سے مستعار لی تھیں۔ قدرت کا قانون۔ جانور کا سلیقہ اور انسان کی ہوشمندی اور زندگی کا گہرا دردناک تجربہ بھی اس میں شامل ہیں۔

آٹھ برس کے بعد آج مجھے سوتی کا خط ملا ہے۔ سوتی مجھے واپس بُلا رہی ہے۔ سوتی نے دُوسری شادی کر لی تھی۔ اُس شادی سے اُس کے دو بچے پیدا ہوئے۔ دونوں لڑکے۔ دونوں زندہ ہیں۔ ایک کی عمر سات سال کی ہے۔ دوسرے کی پانچ سال کی۔ سوتی کا دوسرا شوہر مر چکا ہے۔ اور اب سوتی اپنے دونوں بچوں کو لے کر بھی اکیلی ہے۔ شاید وہ تو اب اپنی باقی زندگی کسی شوہر کے بغیر بسر کر سکتی ہے۔ لیکن اُس کے بچوں کو ایک باپ کی شاید ضرورت ہے!

تمھیں جانا چاہئے۔ شیونگ برش نے دوسرے دن مجھے صلاح دی۔

میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ سوتی نے مجھے دھوکا دیا۔ بے وفا نکلی۔

وہ تم سے بے وفا نہیں تھی۔ اپنی کوکھ کی وفادار تھی۔ ہر عورت اپنی کوکھ کی عزت کی محافظ ہوتی ہے! برش نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جب دو مرے ہوئے بچے پیدا ہوئے تو سوتی کو ایسے لگا جیسے کسی نے اُس کی کوکھ کو کالکھ لگائی ہے اور کوئی با عزت عورت اس کالکھ کو چھٹائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ تو زندگی کا قانون ہے کہ ہر جاندار اپنی زندگی اور تخلیق کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے پھر وہ جس کا رویاں رویاں سراسر تخلیق ہو اپنے حق سے باز کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے وہ چلی گئی کیونکہ اُسے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ اس میں تمہارا قصور تھا۔ نہ اُس کا...... اس دنیا میں کتنے ہی درد ایسے ہوتے ہیں جن کا الزام کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

مگر میں اُس کے بچوں کو اپنا بیٹا سمجھ سکتا ہوں؟ وہ میرے اپنے بچے نہیں ہیں!

اس دنیا میں کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا۔ اپنا بنایا جاتا ہے۔ برش نے جواب دیا۔

اپنائیت ایک رشتہ ہی نہیں ہے ایک عمل بھی ہے۔

بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ۔ میں نے غصّے سے جھلاتے ہوئے کہا۔ میں اُس کُتیا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ہرگز ہرگز اُس کے بیٹوں کا باپ نہیں بنوں گا۔

شرم نہیں آتی تمھیں ایسی باتیں کہتے ہوئے۔ مجھے اُس بڈھے برش کے سر کا ایک ایک بال غصّے سے تنتا ہوا معلوم ہوا۔ اگر ایک جنگلی بھیڑیئے کی ماں انسان کے بچے کو اپنا بیٹا بنا سکتی ہے تو تم انسان ہو کر کسی دوسرے انسان کے بچوں کو اپنا بیٹا نہیں بنا سکتے؟ بس اتنی ہی ہے تمھاری تہذیب؟......!

یکایک میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کیونکہ اس کی منطق کے اندر مجھے ایک گہری اور وسیع حقیقت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میرا تیرہ وتند

لہجہ خود بخود دھیما پڑ گیا۔ اور آئینے میں دیکھ کر اور احساسِ ندامت سے مجبور ہو کر میں نے آہستہ سے کہا۔ اچھا اچھا۔ میں اُسے کل خط لکھوں گا۔

کل پر مت ٹالو۔ کل تک شاید تمہارے خلوص کی گرمی ٹھنڈی ہو جائے۔ ابھی لکھو۔ اس وقت!

اچھا لکھتا ہوں۔ میں نے آئینے میں اپنی مجوب صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر میں خط لکھنے کے لیے پلٹا ہی تھا۔ کہ میرا پاؤں فرش پر پھسل گیا۔ اور شیونگ برش میرے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب کی دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا۔ اور پھر فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں خود بھی بچتے بچتے دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اور پھر سنبھل کر گھٹنوں کے بل اُٹھتے ہوئے کپڑے جھاڑتے ہوئے جو سیدھا ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ فرش پر میرے شیونگ برش کی لاش پڑی ہے۔ سر کہیں۔ دھڑ کہیں پاؤں کہیں۔ اور اس کا چہرہ ایک ایسے بوڑھے آدمی کے کھلے ہوئے منہ کی طرح بھیانک تھا۔ جس کے اندر ایک دانت باقی نہ رہا ہو۔ لکڑی کی ہتی کے چھوٹے چھوٹے درجنوں ٹکڑے ہو چکے تھے۔ پیتل کا خول ریزے ریزے ہو گیا تھا۔ اور شیونگ برش کے چند بال جو اُس کے سر پر باقی رہ گئے تھے عجب منتشر شدہ حالت میں فرش پر ادھر اُدھر خاک میں بکھرے پڑے تھے۔ یکایک کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور فرش کے گرد و غبار میں اُس کے بال اُڑ اُڑ کر فضا میں بکھرنے لگے۔

تو یہ موت ہے! موت جس کا کوئی اپریشن نہیں ہوتا۔ جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ جو بالآخر کسی طرح سے ٹالی نہیں جا سکتی۔

میرے سینے سے دبی دبی اک آہ سی نکلی۔

اس دوست نے اٹھارہ برس تک میرا ساتھ دیا۔ اس نے میری ہر کمینگی برداشت کی اور میرا ہر دُکھ جھیلا۔ یہ میرے ساتھ جیل گیا۔ اور اس اندھی کھولی میں رہا اور جب سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ تو یہ میرے ساتھ رہا۔ اُس نے ہر مصیبت کا وار ہنس ہنس کر خالی دیا۔ اور جب کسی نے مجھے زخم دیے اس نے اک دردمند مسکراہٹ سے اس پر صابن کا نرم نرم جھاگ رکھ دیا۔

غم موت کا نہیں ہے!

غم اُس جانی پہچانی شکل و صورت کا ہے جو اب کبھی دکھائی نہ دے گی۔ غم شخصیت کی اُس ادا کا، حُسن کی اُس ترتیب کا ہے جو آج ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔

غم موت کا نہیں ہے!

غم اُس مخصوص اور مانوس رشتہ کا ہے جو آج ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ننگے پاؤں سے فرش پر چلتا ہوا، میں اس کے قریب پہنچا۔ اور فرش پر بیٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے یوں چننے لگا جیسے کوئی جلی ہوئی چتا سے اپنے کسی پیارے کے پھول چُنتا ہے۔

چند دن تک میں نے شیو نہیں کیا۔ یونہی ڈاڑھی بڑھائے ادھر اُدھر ایک عجب بے کلی سے گھومتا رہا۔ چند لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کوئی قریبی رشتے دار مر گیا ہو۔ لیکن جب انھوں نے میرے غم کی وجہ پوچھنا چاہی تو میں اُنھیں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ کس سے کہتا کہ میرا شیونگ برش مر گیا۔ اس دنیا میں جہاں آج کوئی ایک انسان کا رشتہ ماننے کو تیار نہیں ہے۔ ایک انسان کا ایک شیونگ برش سے رشتہ کون تسلیم کرے گا؟ مجھے معلوم ہے کہ غریب ماؤں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بیٹے اور کانچ کے دریچوں پر رکھے ہوئے شیونگ برش ہمیشہ بِکتے جائیں گے لیکن اُن کی رُوح کا درد کون دیکھے گا!

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائلپور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائلپور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ اُن دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے۔ اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے۔ اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے۔ اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائلپور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی، اس لیے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائلپور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں۔ جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔

زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ دن بھر میں ایک آدھ روٹی نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ میسر آ جائے تو مزید نقدی کس کام آتی ہے؟ یہ فلسفہ ساری عمر ماں جی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالے سے رخصت ہو رہی تھیں، ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو وہ اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ بھی جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے۔ ایک جوڑا دیسی جوتا۔ ایک جوڑا ربڑ کے چپل۔ ایک عینک۔ ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز۔ ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن۔ دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اُونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے، نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی گھنٹوں میں زندگی کے سب سے آخری اور سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقعہ کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ پاؤں چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے.....

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا سب کے بعد ہمارا بھی بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انھوں نے

براہ راست کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روائی کے لیے۔ انھیں اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال ہی کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انھیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔ جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائلپور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں۔ تو انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا۔ جو کہیں سرِ راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائلپور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پہ انھیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھوس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انھی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے پر اپنے چھوٹے بھائیوں کو چسُاتی جائیں۔ اس طرح چلتے چلتے وہ چک نمبر ۵۰ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توڑیے اور کلفے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھا لیا۔ جب پک کر تیار ہو گیا۔ اور ساگ کو اٹن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے

کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۷۰۵ نانا جی کو خوب راس آیا چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین بھی مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور دو تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس زنانہ ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں وہ بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انھیں مجبوراً ایرکنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں۔ اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیے۔ دعوتیں ہوئیں۔ اور پھر ماں جی کے لیے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائلپور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ اور ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انھیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں " اُن دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔"

"ماں جی، آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے تھے۔

" توبہ توبہ پُت" ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کی چشم و چراغ تھے۔ لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے۔ اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اُٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گرو نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے

میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اوّل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سر سیّد کے کانوں میں بھی پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بُلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا۔ اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لکچرر ہو گئے۔

سر سیّد کو اس بات کی دُھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادتمندی آڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سر سیّد کو بے حد غصّہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سر سیّد نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سُن کر سر سیّد آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انھوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکّوں، تھپیڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا، اور پھر کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا: "اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سُن سکوں۔"

عبداللہ صاحب جتنے سعادتمند بیٹے تھے اتنے سعادتمند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دُور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ جب اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟" عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

"اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوادوں گی۔" ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ۔ وسیع باغ۔ نوکر چاکر۔ دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو ان کو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر ایک خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انھوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا "تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی ویسے گزر گئی ہے۔ اب اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا۔ سینا پرونا۔ برتن مانجھنا۔ کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا "مسٹر گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں۔ براہ مہربانی میری طرف سے آپ اس کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا "اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں" ماں جی تنک کر بولیں "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا "میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمھیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا۔ جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا۔"

ماں جی پر ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار۔ صرف ایک بار۔ ماں جی بھی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا "بھاگوان یہ تمھارا

نام تھوڑا سا ہے۔ گورنری تو دراصل تمھارے ہی دکھ سے ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر گھلنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا دکھ سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا اُفتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو" مہارانی نے کہا "کبھی ہمارے لیے بھی دُعا کرنا۔"

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔ ماں جی خود تو یہی کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اُتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دُکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہوگئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا۔ اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر اُن کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے۔ اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہوگئے۔ اور کہنے لگے "بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمھیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہوگئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال اُمڈ آئے۔ "ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے اس پر میں نے تمھارے پاؤں دھو کر پیئے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمھیں پہنائی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے

میرے سرتاج ....

لیکن قضاو قدر کے ہی کھاتے میں وقت آچکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اُٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لیے گاؤ تکیے پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا۔ بلایا۔ چمکارا۔ پکارا۔ لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقیماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی "بچہ۔ رونا مت۔ تمہارے ابا جس آرام سے رہتے تھے اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

کہنے کو تو ماں جی نے کہدیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روتی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انھیں ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے "گورنری" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لاکر نہیں بٹھائی ......

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں جو قیامت تک انھیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے آگے ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا مُلا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں تو پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رو یا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا ....

پھول کی چھڑی

علی عباس حسینی

لچھمن سچ مچ بڑے ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ وہ ہر ایک سے ہنس کر بولتا، جھک کر ملتا۔ قصبے کا سب سے بڑا پہلوان ہونے پر بھی نہ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا اور نہ بات بات پر لڑائی دنگے سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتا، دو چار نوجوانوں کو زور کرا دیتا، پھر سیر ڈیڑھ سیر تازہ دودھ پی کر، بھیگا چنا چباتا اپنی بھینسوں گایوں کو چرانے سبزہ زاروں میں نکل جاتا۔ جب تک اس کا باپ موہر زندہ تھا لچھمن کا بس اتنا ہی کام تھا۔ صبح شام ورزش، مویشی چرانا، اور اکیلے میدانوں میں "برہا، برکی" گاتے پھرنا۔ جب سے موہر مرا تھا کھیت کھلیان بھی اسے دیکھنا پڑتا تھا۔ اس نے اس بار کو بھی خوشی خوشی سنبھال لیا تھا۔ دودھ دہی بیچنا، غلہ کوٹھیوں میں رکھنا، ٹھاکر کا لگان ادا کرنا پہلے بھی یہ کام ماں باپ کرتے تھے۔ اب بھی اس کی بوڑھی "ماتا" اسے انجام دیتی تھی۔ ذات برادری کی رسم کے مطابق اس کا بیاہ سات ہی برس کے سن میں ہو چکا تھا مگر وہ اب تک "گونا" کر کے اپنی دلہن کو گھر نہ لایا تھا۔ ماں بار بار گونے پر زور دیتی تو وہ کہتا "گونا جب ہی کراؤں گا جب کسی بڑے دنگل میں کسی بڑے پہلوان کو مار لوں گا!" سسرال والوں کو بھی کوئی جلدی نہ تھی۔ جوان بیٹے اپنا اپنا گھر کر کے الگ ہو گئے تھے۔ بوڑھے ماں باپ کے سارے کاموں کا بوجھ یہی جوان بیٹی اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھائے تھی۔ جتنی دیر میں لچھمن کا یہ پہلوانی کا شوق پورا ہو اتنا ہی اچھا۔

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ بنارس کے ایک کل ہند دنگل میں بھارت کے نمبر ۲ پہلوان ہیکڑ سنگھ سے لچھمن کی کشتی ہوئی اور اس نے ہیکڑ کو چند ہی منٹ میں پچھاڑ دیا۔ قصبے کے سینکڑوں آدمی یہ کشتی دیکھنے گئے تھے۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لچھمن نے گویا ان کے قصبے کو اپنی اس جیت سے ایک تاریخی قصبہ بنا دیا تھا۔ وہ اسے شہر اور قصبے میں دو دن تک کندھوں پر بٹھائے بٹھائے چیختے اور اچھلتے پھرے۔ بچہ بوڑھا سب ہی خوش تھا، صرف ناخوش تھے تو ٹھاکر دھنپت سنگھ۔

انگریزی راج میں دھنپت سنگھ دس بارہ گاؤں کے مالک تھے۔ جب ملک کو آزادی ملی اور اتر پردیش میں زمینداری توڑ دی گئی تو دھنپت سنگھ کے پاس سوائے خود کاشت اور سیر کے کھیتوں اور آم و امرود کے باغوں کے کچھ نہ رہا۔ مگر جس نے چالیس برس تک "ان داتا" اور راجا کی طرح دس بارہ گاؤں پر راج کیا ہو، وہ لچھمن کو کیا خاطر میں لا سکتا تھا۔ دھنپت سنگھ سورج بنسیوں سے ناطہ جوڑتے تھے۔ لچھمن ضلع کا سب سے بڑا پہلوان سہی مگر تھا تو اُن کا کچھ ہی برس پہلے "پرجا" اور ذات کا اہیر۔ اور اس ذات کے بارے میں دھنپت سنگھ کے بزرگوں کے سمے سے یہ کہاوت چلی آتی تھی "اہیر، بھیر، بن بکرا۔ ہوت بھان کھائیں چار لکڑا!" اور اس "اہیر کے بچے" نے یہ بدتمیزی

کی کہ وہ دنگل جیتنے کے بعد گڑھی پر سلام کرنے تک حاضر نہ ہوا۔ وہ یہ بھول گیا کہ اس کے باپ دادا گڑھی کے ٹکڑوں پر پلے تھے۔ قصبہ کی یہ ریت بھی تھی کہ رعایا پرجا میں سے جب بھی کسی کے ہاں کوئی خوشی کی بات ہوتی — شادی، بیاہ، گونا — تو خوشی منانے والے ٹھاکر صاحب کو سلام کرنے ضرور جاتے۔ زمینداری چھن جانے کے بعد دھنپت سنگھ کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی کہ پرانے رکھ رکھاؤ میں فرق نہ آنے پائے۔ وہ مجبور رعایا تھے، خودسر ہو کر "من مانی" نہ کرنے پائیں۔ اس لیے اگر اس میں کوئی فرق آجاتا تو وہ حد درجہ خفا ہو جاتے تھے اور ان کا خفا ہونا اب بھی اثر رکھتا تھا۔ ضلع کے حاکم اب بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ اب بھی اس مرے ہوئے ہاتھی کا وزن جھنگے کسانوں کے مقابلے میں کئی ہزار گنا زیادہ تھا۔ وہ اب بھی اپنے کھیت بٹائی پر اٹھاتے تھے اور بڑی بڑی نذریں لے کر ایک سے کھیت نکال کر دوسرے کو دے دیتے تھے۔ ان کے پاس اب بھی لاٹھی چلانے والے کارندوں کی فوج تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کر سکتا۔

مگر جیسے جیسے لچھمن کی شہرت بڑھتی گئی، اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ قصبے کے آپس کے جھگڑوں میں جن کا فیصلہ گڑھی میں ہمیشہ غصے اور غم سے سنا جاتا تھا، اس کے ہنستے ہوئے چند فقروں پر مدعی اور مدعا علیہ دونوں خوش خوش گھر واپس چلے جاتے تھے۔ یہ صاف ٹھاکر دھنپت سنگھ کی حکومت میں مداخلت تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہوا کہ ان کے کھیتوں کے بندوبست میں مقابلہ کرنے والوں کی کمی ہونے لگی اور اس طرح نذر کی مجموعی رقم بھی گھٹنے لگی۔ پرانے کسانوں سے کھیت چھیننے کے لیے نیا دعویدار مشکل ہی سے تیار ہوتا۔ گرو لچھمن کے خفا ہو جانے کا ڈر جو تھا!

اتفاق یہ ہوا کہ ایسا ہی ایک معاملہ دنگل کے چوتھے ہی دن پیش آگیا۔ ٹھاکر صاحب کے ایک کھیت کے دونوں حریف لچھمن کے چیلے تھے۔ ایک کئی برس سے وہ کھیت جوت رہا تھا۔ دوسرا للچائی نظروں سے اسے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اب کے ٹھاکر کے کارندوں نے اس سے کچھ نذر لے کر اسے کھیت دلوانے کا وعدہ کیا۔ لچھمن کو دو دن پہلے خبر معلوم ہو گئی۔ اس نے کھیت کے نئے طلبگار کو سمجھایا "بری بات ہے۔ دونوں ایک ہی اکھاڑے میں لڑتے ہو، آپس میں یہ پھوٹ کیسی؟" چنانچہ اس نے ٹھاکر صاحب کو نذر دینے اور کھیت لینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے کارندوں میں سے ایک کو حکم دیا "تم خود کھیت جوت لو!"

پرانے کاشتکار نے یہ حکم جو سنا تو منہ اندھیرے کھیت پر ہل چڑھا دیا۔ ٹھاکر صاحب کو جیسے ہی خبر معلوم ہوئی انھوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "اسے مار کر کھیت سے باہر نکال دو۔" اس نے اپنے گرو کے پاس فریاد کہلا بھیجی۔ لچھمن اسی وقت کئی چیلوں کو زور کرا کے اکھاڑے سے نکلا تھا۔ وہ جسم جھاڑتا لپکا ہوا کھیت پر پہنچا۔ خیال تھا "اپنے قصبے ہی کے لوگ ہیں۔ میری بات نہ ٹالیں گے۔ جھگڑا چکا کے چلا آؤں گا۔" مگر وہاں جو فریق مخالف نے اسے نہتا دیکھا تو لاٹھیاں لے کر پل پڑے۔ وہ "ہائیں ہائیں!" کرتا ہی رہا کہ دو ایک لاٹھیاں اس کے پڑ گئیں۔ اب اس نے اپنے کو بچانا ضروری سمجھا۔ اس نے ایک وار کو جھکائی دے کر خالی دیا اور مخالف کی کلائی مروڑ کر لاٹھی چھین لی۔ اور صرف ڈرانے کے لیے دو ایک ہاتھ گھما دیے۔ مگر اسے خود بھی غالباً اپنی قوت کا اندازہ نہ تھا۔ لاٹھی جسے بھی چھو گئی، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر باقی بھاگ نکلے۔

ٹھاکر صاحب نے فوجداری میں مقدمہ دائر کیا۔ ان کے آدمیوں پر لچھمن نے زبردستی حملہ کر کے انھیں زخمی اور مجروح کیا اور ان کے کھیت پر قبضہ کر لیا۔ عدالت میں خود ذاتی طور پر حاضر ہوئے اور چشم دید گواہ بنے۔ لچھمن بجائے اس کے کہ گونا کرا کے بیوی گھر لاتا، خود ایک سال کے لیے جیل جا بسایا۔ یہیں اس ٹھنڈے مزاج کے لچھمن میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔ اس کا سینہ غصے اور نفرت کی ایک

دہکتی بھٹی بن گیا۔ وہ جس نے کبھی کسی کے لیے کوئی بُرائی نہ سوچی تھی اب ہر وقت ٹھاکر صاحب کو طرح طرح سے اذیتیں دینے کی صورتیں سوچنے لگا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا وہ قید سے چھوٹتے ہی سیدھا گڑھی جائے گا اور ٹھاکر کو گھسیٹتا باہر لائے گا۔ پھر اس کے جھوٹ، اس کی بے ایمانی کی پورے قصبے کے سامنے اسے سزا دے گا۔ وہ دانت پیس کر کہتا "میں ٹھاکر کو اس کی بے ایمانی کا مزہ چکھا کر چھوڑوں گا! اس کی ٹھکرائی بھلا دوں گا!"

دوسرے قیدی اور جیل کے اہل کار اس کی عزت اور اس کا خیال کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کے لیے اپنی ورزش جاری رکھنے کا خاص انتظام کر دیا تھا۔ اسے جو بھی کام دیا جاتا اسے پوری تندہی سے انجام دیتا۔ دوسروں کے لیے اس کی مسکراہٹ اور اس کی ہنسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس لیے جس دن میعاد پوری ہوئی اسے رہائی کا حکم نو دس ہی بجے مل گیا، لیکن وہ چھوٹا شام کے قریب۔ قصبہ چھ میل پر تھا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ادھر چلا۔ ٹھاکر سے بدلہ لینے اور اس سے نفرت کی بھٹی دل میں جل رہی تھی۔ بس یہی فکر تھی کسی طرح قصبہ آئے تو میں گڑھی میں گھس کر اس کی گت بنا لوں، پھر گھر جا کر منہ ہاتھ دھوؤں، ماں کے پاؤں چھوؤں اسے مزا چکھاؤں تو دل میں لگی آگ ٹھنڈی پڑے۔

اسی دھن میں اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سورج کب ڈوبا، دھندلکا اندھیرے میں کب بدلا اور شام نے رات کی سیاہ ساڑی اپنے بدن پر کب لپیٹنا شروع کر دی۔ سڑک گو کچی تھی مگر کشادہ تھی۔ راستہ سمجھا ہوا تھا۔ قدم بے کھٹکے اٹھ رہے تھے۔ ماں سے، دوستوں سے ملنے کے شوق سے زیادہ نفرت کی گیس اسے تیز قدم بنائے ہوئے تھی کہ قصبے کی طرف سے روشنی اس کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے غور سے دیکھا کہ کوئی لالٹین لیے چلا آ رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ سُرخ بانات سے ڈھکا ہوا "چوپالا" چار کہار کندھوں پر اٹھائے لا رہے ہیں۔ دو پیادے لاٹھیاں لیے اس کے ساتھ ہیں۔ اس طرح کے ڈولے، اتنے اہتمام کے ساتھ سوائے رئیسوں، امیروں کے اور کسی کے نہیں آتے جاتے ہیں۔ خیال آیا راجکماری میکے آ رہی ہو گی "بارا" ہو کر سسرال واپس جا رہی ہوں گی۔ بیٹی کا خیال کرتے ہی اس کا باپ، ٹھاکر دھنپت یاد آ گیا اور غصہ اور انتقام کے بخارات سینے سے اس طرح اٹھے کہ سر میں ٹیس سی بیدار ہو گئی — وہ سوچنے لگا ٹھاکر سے بدلہ لینے کا اس سے اچھا اور کیا موقع مل سکتا ہے؛ اس کی ساری عزت خاک میں ملائی جا سکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا سارا نگر تھوکے گا لچھمن پہلوان کا ٹھاکر سے تو کچھ بس نہ چلا۔ اس نے ایک کمزور عورت پر ہاتھ اٹھایا۔ نہیں، نہیں، یہ تو جگ ہنسائی کی بات ہو گی! اسے تو بدلہ لینا ہے ٹھاکر ہی سے اور اس کے ان پیادوں سے جنھوں نے گنگا جل اٹھا کر اس پر جھوٹا الزام لگایا۔

وہ یونہی اپنے جذبات سے لڑتا آگے بڑھتا گیا۔ کہاروں کی "ہوں، ہاں، نیچا اونچا دیکھ کر" ہلکی ہلکی سنائی دینے لگی۔ آدمیوں کی پرچھائیاں بھی لالٹین کی روشنی میں کبھی کبھی لمبی لمبی چھلکنے لگیں۔ دفعتہً ایک پیڑ کی آڑ سے کچھ اور سائے بڑھے۔ لالٹین زمین پر رکھ دی گئی۔ کچھ شور سا ہوا۔ جیسے آپس میں کچھ لوگوں میں جھگڑا سا ہو رہا ہے۔ لچھمن نے قدم اور تیز کیے۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ چار آدمی منڈاسے کسے ہوئے دونوں پیادوں کو گھیرے ہیں اور اُن سے لاٹھیاں چل رہی ہیں اور کہار غائب ہیں۔ وہ للکارتا ہوا اُدھر جھپٹا ہی تھا کہ چوپالے کے ساتھ کے سپاہیوں میں سے ایک گھائل ہو کر گر پڑا۔ اور دوسرے پر بُری طرح لاٹھیاں برسنے لگیں۔ لچھمن بالکل نہتا تھا۔ مگر وہ اس طرح دھاڑتا ہوا جھپٹا کہ ڈاکو ڈگمگاتے ہوئے پیادے کو چھوڑ کر اس کی طرف پلٹ پڑے۔ لچھمن نے قریب ترین ڈاکو کا وار خالی دے کر اسے گود میں اٹھا کر دوسرے پر پھینک دیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ سے لاٹھی گر پڑی۔ لچھمن نے اسے پھرتی سے اٹھا لیا۔ پھر کیا تھا، چند ہی منٹ

میں دو ڈاکو ڈھیر ہوئے اور دو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔

لچھمن نے لالٹین اُٹھا کر پیادوں کی صورت دیکھی۔ دونوں وہی تھے جنھوں نے جھوٹی گواہیاں دے کر اسے جیل کی ہوا کھلوائی تھی۔ وہی جن سے ٹھاکر کے ساتھ ساتھ وہ بدلہ لینے کے منصوبے ایک سال سے بنا رہا تھا۔ جی چاہا ان دونوں بیہوش پیادوں کو ایک ایک لاٹھی اپنی طرف سے مار دے تو اس پر کوئی الزام بھی تو نہیں آسکتا۔ لوگ یہی سمجھیں گے ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔ اس نے لاٹھی تانی۔ مگر معلوم ہوا جیسے کسی نے تھپکی دے کر ہاتھ کا رُخ بدل دیا۔ اس نے پاس والے درخت کے تنے پر اتنے زور سے لاٹھی ماری کہ وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ وہ کانپنے لگا۔ اس نے جھک کر لاٹھی کا ایک ٹکڑا اُٹھا لیا اور اسے اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے اس طرح توڑتا پھاڑتا رہا جیسے کہ وہ پیادوں کی زندگی کے ورق پرزے پرزے کر رہا ہے۔ وہ ایک منٹ ہاتھی کی طرح جھومتا دُور اندھیری فضا میں گھورتا رہا۔

دفعتہً زخمی پیادوں میں سے ایک نے کراہ کر اسے چونکا دیا۔ وہ اس پر جھک پڑا۔ اس نے پکارا "امراؤ کاکا! امراؤ کاکا!"—
امراؤ نے آنکھ کھولی۔ مگر اسے بالکل نہ پہچانا۔ اس نے آخری ہچکیوں کے ساتھ حق نمک ادا کیا۔ وہ رُک رُک کر بولا "چوپالا!..... بٹیا رانی!" اور اس کا منکا ڈھل گیا۔

لچھمن نے جلدی سے چوپلے کے پاس جا کر پکارا "بٹیا رانی! بٹیا رانی!"

جواب ملا "کون؟"

لچھمن نے کہا "نام پوچھ کے کیا کیجئے گا۔ یہ بتایئے کہ آپ چوپلے میں اکیلی بیٹھی رہیئے گا کہ میرے ساتھ قصبے چلئے گا۔ کہار سب بھاگ گئے!"

راجکماری نے پردہ اُلٹ دیا۔ حُسن کی دیوی سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ سسرال سے میکے آئی تھی۔ اب واپس جا رہی تھی۔ جو کچھ پہن کر آئی تھی اس میں باپ نے کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ ساٹھ برس کے دھنپت سنگھ کے بعد سب کچھ اسی اکیلی کا تھا۔

لچھمن نے راجکماری کو بارہا دیکھا تھا۔ ٹھاکر کے ہاں زیادہ پردہ نہیں تھا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ جب بھی کھیتوں، باغوں میں صبح شام گھومنے ٹہلنے نکلتے تو رانی بٹیا کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ دو لڑکے جوان ہو کر مر گئے تھے۔ یہی ایک بیٹی رہ گئی تھی۔ اسی کو سب کچھ ایک دن ملنے والا تھا۔ اسی لیے وہ اسے ہر چیز دکھا دینا چاہتے تھے اور بٹیا رانی کی مختلف صورتیں لچھمن کی نظر میں اس وقت پھر گئیں۔

وہ بھی جب وہ صندلی پاؤں پر لُد پھُد لُد پھُد چلتی تھی، وہ بھی جب وہ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر اس کے لمبے تڑنگے ڈیل کو اس طرح دیکھتی تھی جیسے وہ آدمی نہیں کوئی دیو ہے۔ وہ بھی جب اُس نے تیرہ برس کے سن میں لچھمن کے سلام کرنے پر حقارت سے ہونٹ ٹیڑھے کر کے اس پر چھچھلتی نظر ڈالی تھی۔ گویا ان جیسوں کے سلام کا جواب نہ دینا ہی ان کے مرتبوں کے فرق کی خاص پہچان ہے۔ اور اس وقت کچی سڑک پر، درختوں کے نیچے، رات کے اندھیرے میں، صرف ایک جھلکتی ہوئی لالٹین کی دھوئیں والی روشنی میں، وہ ایسی دکھائی دی جیسے وہ کوئی اپسرا ہے، خوابوں میں آنے والی کوئی پری یا راہو کے مُنہ سے چھُوٹتا ہوا چاند—

اس کے دل میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ وہ جس کا باپ اس کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا تھا۔ وہی جو لچھمن کو "اہیر کا بچہ" کہا کرتا تھا وہی جو اپنے کو سورج کی اولاد سمجھتا تھا۔ اسی کی چاند سی بیٹی، وہی بیٹی جو اس کے سلام کا جواب سلام سے دینا اپنی توہین سمجھتی تھی، وہی

"بٹیا رانی"، وہی راجکماری اپنے قبضے میں تھی۔ رگ رگ میں آگ سی دوڑی، کنپٹیاں دھمکنے لگیں۔ مگر خیال آیا، عورت پر، کمزور پر، آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا۔ جو سُنے گا کیا کہے گا! وہ پھر کانپنے لگا۔

ادھر غریبے، زخمی پیادہ کراہا۔ راجکماری جلدی سے لالٹین اٹھا کر اس کی طرف مڑ گئی۔ اور اس کا چہرہ خون میں بھرا دیکھ کر "ہائے رام! ہائے رام" کہہ کر زمین پر بیٹھ کر اُسی کے "انگوچھے" سے اس کا خون پونچھنے لگی۔ لچھمن نے ایک لمبی سینے میں کھٹکتی سانس لی۔ اور آگے بڑھ کر غریبے کی پگڑی پھاڑ کر اس کا سر کس کر باندھ دیا۔ پھر اُسے اٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔

راجکماری نے پوچھا "اور امراؤ؟"

لچھمن نے کہا "وہ مر گیا!"

راجکماری پھر "ہائے رام ہائے رام" کہہ کر رونے لگی۔

لچھمن نے پوچھا "چوبارے میں کوئی گہنے کا صندوق ہے؟"

اس نے سسکتے ہوئے سر ہلا کر کہا "ہاں"

لچھمن نے وہ بھی بغل میں دبا لیا اور لالٹین ہاتھ میں لے کر کہا "آؤ چلو، رانی بٹیا!"

اور وہ دونوں گڑھی کے پھاٹک تک پہنچے۔ پھاٹک بند تھا۔ لچھمن نے کنڈی کھٹکھٹائی، آواز دی۔ غریبے کو کندھے سے اتار کر زمین پر لٹا دیا۔ لالٹین اور صندوق وہیں رکھا۔ پھر وہ بولا "اب ہم گھر جاتے ہیں"

راجکماری نے کہا "ارے تم کون ہو بھیا؟ نام تو بتاتے جاؤ!"

اس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولا "وہی لچھمن اہیر جسے ٹھاکر صاحب نے بے قصور قید کرا یا تھا!" اور وہ تیزی سے مڑ کر جانے لگا۔ راجکماری جھپٹ کر سامنے آ گئی۔ اور اس نے جھک کر لچھمن کے پاؤں چھو لیے۔ پھر وہ ہاتھ جوڑ کر بولی "چھما کر دو بھیا! بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اب پتاجی! تم ان کے بیٹے سمان ہو!"

لچھمن کھڑے کھڑے اس طرح ہلنے لگا جس طرح سخت طوفان میں جہاز کا مستول ہلتا ہے یا تاڑ کا درخت۔ اس نے اپنا کانپتا ہاتھ راجکماری کے سر پر رکھ دیا۔ اسے تھپتھپایا۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولا "اچھا اچھا، تمھارے نالطے!"

راجکماری کے میٹھے بول نے فولاد کو موم بنا دیا! پھول کی چھڑی نے لوہے جیسی لاٹھی توڑ دی! راجکماری پھر اس کے پاؤں کی طرف جھکنا چاہتی تھی کہ زنجیر کھٹکنے کی آواز آئی۔ ہنس مکھ پہلوان سسکتا ہوا بھاگا!

(طنزیہ)

سٹاف آرٹسٹ

(نارتھ کوٹ پارکنسن سے معذرت کے ساتھ)

ممتاز مفتی

جو شخص فنکارانہ ذہنیت کا حامل ہونے کے باوجود گورنمنٹ سروس میں لے لیا جائے، اُسے سٹاف آرٹسٹ کہتے ہیں۔ حالانکہ علم نفسیات کی رو سے فنکارانہ ذہنیت گورنمنٹ سروس کے لیے قطعی طور پر ناموزوں ہوتی ہے۔

برطانوی راج کے اوّلیں دَور میں، فنکارانہ ذہنیت کی مناسب چھان پھٹک کے بعد، برطانوی ماہروں نے حتمی فیصلہ کر دیا تھا کہ فنکارانہ ذہنیت نوکرشاہی کے لیے نا اہلی کی مظہر ہے۔ اور ایسے اوصاف کی حامل ہے جو ایڈمنسٹریشن سے متعلقہ ذمہ دارانہ فرائض کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہے۔

فنکار شاید برطانوی ماہروں کے اس فیصلے سے اتفاق نہ کریں لیکن نظم و نسق سے متعلقہ حضرات اس حقیقت کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔

فنکارانہ ذہنیت کئی ایک اجزاء سے مرتب ہوتی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا جزو اعظم SENSITIVITY یا شدّتِ احساس ہے۔ شدّتِ احساس کے بل بوتے پر آپ ایک پُر اثر نغمہ تخلیق کر سکتے ہیں ایک نظم یا غزل کہہ سکتے ہیں۔ رنگ اور خطوط سے مرتب طوفان بپا کر سکتے ہیں۔ الفاظ کی مدد سے زندگی کی نقاشی کر سکتے ہیں یا ہیر رانجھا کی محبت رچا سکتے ہیں۔ لیکن نظم و نسق کے ذمہ دارانہ فرائض ادا نہیں ہو سکتے۔

ظاہر ہے کہ اگر سرجن محسوس کرنا شروع کر دے تو وہ کیا اپریشن کر سکے گا؟ اگر جج محسوس کرنا شروع کر دے تو کیا وہ کوئی صحیح فیصلہ کر سکے گا؟ اس کے محسوسات قاتل کو کس طرح پھانسی کی سزا دے سکیں گے؟

ملک کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے یہ احتیاط از بس ضروری ہے کہ ایڈمنسٹریشن میں کوئی رقیق القلب قسم کا شخص نہ آ گھسے یعنی ایسا فرد شامل نہ ہو جائے جو فنکارانہ ذہنیت کا مالک ہو۔

یہ تو طے شدہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کی بہبود، امن، ترقی اور خوشحالی کا تمام تر انحصار اس ملک کے نظم و نسق پر ہوتا ہے۔ اور اگر ملک نوزائیدہ ہو اور عوام میں احساس قومیت نے ابھی جڑ نہ پکڑی ہو تو یہ حقیقت اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں خود مختاری ملنے پر یہ سوال پیدا ہوا کہ غیر ملکی حکومت کے ہٹنے اور حصول آزادی کے بعد کیا حکومت کی پالیسی

بدلنے کی ضرورت ہے ؛ اگر ہے تو کس حد تک اور کیوں ! اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لیے ارباب بست و کشاد نے سمجھدار سنجیدہ اور تجربہ کار اہلکاروں کا ایک کمیشن قائم کیا۔ جنھوں نے مناسب تحقیق کے بعد اپنی سفارشات پیش کر دیں۔ اس کمیشن کا نام ایڈ منسٹریٹو پالیسی ریویژن کمیشن تھا۔ کمیشن کی جملہ سفارشات کا تو علم نہیں ہو سکا لیکن فنکارانہ ذہنیت کے متعلق اُن ذمہ دار اور صاحب نظر افراد کا فیصلہ یہ تھا کہ اس ضمن میں برطانوی فیصلے کو برقرار رکھا جائے چونکہ اس نوزائیدہ ملک کی بقا اور بہبود کے لیے یہ اصول پہلے کی نسبت اور بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے۔

کمیشن کا یہ فیصلہ ٹھوس حقائق اور سوجھ بوجھ پر مبنی تھا۔ اس ضمن میں ان کی سفارشات مختصر مگر جامع تھیں :-

(۱) شدتِ احساس کی وجہ سے فنکارانہ ذہنیت ۔ نسوانی ذہنیت کے قریب ہوتی ہے ۔ ملک کا نظم و نسق عورتوں کے ہاتھ میں دے دینا دانشوری نہیں۔

مندرجہ بالا حقیقت ناقابلِ تردید ہے ۔ عورت کی طرح فنکار کا نقطہ نظر بھی خارجی نہیں بلکہ داخلی ہوتا ہے اور نظم و نسق کے فرائض ادا کرنے کے لیے خارجی اور جذبات سے عاری زاویہ نظر اشد ضروری ہوتا ہے۔ اگر نظم و نسق عورتوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو بے شک بچوں کو محبت بھری گود دستیاب ہو جائے گی لیکن زندگی کو (جو تلخ حقائق سے عبارت ہے) بسر کرنے کی اہلیت پیدا نہ ہو سکے گی ۔

نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے قدرت نے باپ کی تخلیق کی ۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے آدم کی تخلیق کی اور بعد میں اماں حوّا کو پیدا کیا۔ یہ حقیقت اس امر کی شاہد ہے کہ خالق ارض و سما کی نگاہ میں نظم و نسق، احساس اور محبت سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔

ممکن ہے ادیب اور فنکار کمیشن کے اس فیصلے پر احتجاج کرتے لیکن اراکین نے پہلے سے ہی اس بات کا خیال رکھا تھا انھوں نے اپنی سفارشات میں ادیبوں کی اپنی تحریروں کے اقتباسات حوالے کے طور پر دیے تھے اور دوسری شق میں اپنی دلیل کی وضاحت کی تھی۔

(۲) اپنے ادب پاروں میں ادیبوں نے جگہ جگہ فرض اور جذبے کی کشمکش کا اظہار کیا ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ احساس یا جذبہ فرض کی ضد ہے جو بسا اوقات فرض پر غالب رہتا ہے اور ہمیشہ انسان میں تذبذب پیدا کرتا ہے۔ تذبذب فیصلہ کرنے کی قوت کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور جس شخص میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو وہ ایڈ منسٹریٹر نہیں بن سکتا۔

اس حوالے اور دلیل سے انھوں نے یہ امکان ہی ختم کر دیا تھا کہ فن کار ان کی سفارشات کے خلاف آواز اٹھائیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ رکھے تھے۔ لہٰذا کس منہ سے بات کرتے۔

کمشن کی تیسری دلیل اس سے بھی زیادہ جامع تھی۔

(۳) فنکار صرف خود ہی شدتِ احساس کے مرض میں مبتلا نہیں بلکہ عوام کے دلوں میں بھی احساس پیدا کرنے کے خبط میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ خود مریض ہیں اور قوم کے لیے وبائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا وجود اور بھی خطرناک ہے۔

فنکار کمیشن کی اس دلیل کو بھی رد نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ فن کی غایت تاثر پیدا کرنا ہے خوابیدہ

احساسات کو جگانا ہے۔ ہر فن پارے کی حیثیت خمیر کی سی ہوتی ہے۔ سیدھے سادے دلوں میں خمیر چھڑک کر اُبال پیدا کرنا صحت مند عوام میں احساس کے جراثیم پیدا کرنا۔ ساکن دلوں کی تاروں کو چھیڑنا۔ داخلیت کے انجکشن لگانا۔ اور اس طرح قوم کا نفسیاتی توازن تباہ کرنا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بیان بھی کر دیا جائے کہ ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن کی اس دلیل کو دیکھ کر محکمہ کارِ خاص کے کان کھڑے ہو گئے۔ محکمہ کارِ خاص ایک فرض شناس اور اولعزم محکمہ ہوتا ہے چونکہ ملک کی سالمیت اور اندرونی تحفظ کی حفاظت اس کے فرائض میں داخل ہوتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے مناسب کارروائی شروع کر دی۔

مزید تحقیقات کے بعد ان پر منکشف ہوا کہ فنکارانہ ذہنیت کے حامل لوگ صرف احساس کا خمیر ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ اس کے علاوہ مروّجہ اور مستند خیالات سے ہٹ کر سوچتے ہیں اور لوگوں کو سوچنے پر اُکساتے ہیں۔ مروّجہ اور مستند باتوں کا تمسخر اڑانا درحقیقت درپردہ باغیانہ روش پیدا کرنا اور اسے شہہ دینا ہے اس حقیقت کے انکشاف کے بعد محکمہ نے فیصلہ کیا کہ اس باغیانہ ٹولے پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے اور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں محکمہ والوں کو اندراجات کا ایک نیا سلسلہ کھولنا پڑا جس کا نام انھوں نے بستہ ب رکھا۔

کارِ خاص کا کام صرف اندراجات ہی نہیں ہوتا۔ انھیں فیلڈ ورک بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ادیبوں کی عادت ہے کہ ہر جگہ جم گھٹا لگا بیٹھتے ہیں، پان کھوکتے ہیں، سگریٹ جلاتے اور شعر پڑھتے ہیں۔ لہٰذا محکمہ کو کثیر تعداد میں سفید پوش پیادے بھرتی کرنے پڑے تاکہ وہ ہر ایسی ادبی محفل پر کڑی نظر رکھیں اور نتیجتاً اندراجات کا سلسلہ احسن طریق پر قائم رکھا جا سکے۔

کارِ خاص کے اس اقدام پر ادیبوں نے سخت احتجاج کیا۔ انھیں یہ اعتراض نہ تھا کہ ان پر کڑی نگاہ کیوں رکھی جا رہی ہے۔ انھیں یہ شکایت تھی کہ ان کی تخلیقات کو جانچنے کے لیے اَن پڑھ پیادے کیوں مقرر کیے گئے جو ادب پاروں کے محاسن اور بلند خیالی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس احتجاج سے ادیبوں اور فنکاروں نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ان کا نقطۂ نظر جذباتی ہے اور وہ خارجی نگاہ سے حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اُلٹا یہ اقدام تو کارِ خاص کی سوجھ بوجھ کا غماز تھا۔ اگر پیادوں کی جگہ پڑھے لکھے لوگ مقرر کر دیے جاتے تو وہ ادیبوں کی تخلیقات پر کڑی نگاہ رکھنے کے بجائے ان سے اثر قبول کرنا شروع کر دیتے۔ اس طرح مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

تجربے کے بعد ان پیادوں نے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کو جانچنے کے متعلق ایک اچھا خاصا قابلِ عمل طریق کار وضع کر لیا۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے خام سمجھیں۔ شاید یہ درست ہو کہ وہ مناسب طور پر مکمل اور جامع نہیں لیکن جہاں تک PRACTICAL WISDOM کا تعلق ہے وہ کافی موزوں اور قابلِ عمل ہے۔ طریق کار یہ ہے کہ پیادہ، ادیب کے مقالے مختصر افسانے غزل یا نظم کو غور سے سنتا ہے اور احتیاط سے الفاظ کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر ادب پارے میں بار بار مزدور یا ہڑتال یا سُرخ یا سویرا کا نام آئے تو وہ ادیب کمیونسٹ ہے اور ادب پارہ ایک سُرخ تحریر ہے۔ اگر عورت، جسم یا محبوب کی تکرار ہے تو مصنف جنس زدہ ہے اور تحریر فحش ہے۔ اگر اللہ، رسول، سنّت یا اسلام کا تذکرہ ہو تو مصنف مذہبی دیوانہ ہے اور اس پر مزید کڑی نظر رکھنے کی ضرورت

ہے۔ اس طریق کار کے مطابق سفید پوش پیادے پر فرض عاید ہوتا ہے نہ وہ مزدور ہڑتال حکومت عورت جسم اور اسلام کے الفاظ سے واقف ہو اور ایک سے سو تک گنتی جانتا ہو اور احساس، جذبہ، تاثر وغیرہ سے قطعی بے گانہ ہو۔

تعلیم اور احساس کا مسئلہ صرف ٹیڑھا ہی نہیں بلکہ پرانا بھی ہے۔ اس پرابلم کو سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی تاجروں نے محسوس کیا تھا۔ کمپنی کے دور حکومت سے پہلے مغل اور پٹھان غیر ملکی بادشاہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ تعلیم احساس اور جذبہ انسان کے اعلیٰ اوصاف ہیں۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اس حقیقت کو فراموش کیے چکے تھے کہ وہ غیر ملکی ہیں۔ اور اس ملک کو اپنا ملک سمجھنے لگے تھے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ تاجر نہیں تھے بلکہ بادشاہ تھے۔ بہرصورت ان کے دور میں تعلیم یافتہ اور احساس سے سرشار لوگوں کی قدر و منزلت تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی نااہلی کی وجہ سے فنکار قسم کے لوگوں کو نورتن بنا کر سر چڑھا رکھا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے آتے ہی یہ محسوس کیا کہ انھیں ملک کا نظام اور اپنا کاروبار چلانے کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو شدتِ احساس سے خالی ہوں۔ تعلیم اور احساس کا ساتھ ایک قدرتی امر ہے۔ یہ ایک بہت بڑی مشکل تھی اگر کمپنی مشرقی ذہنیت کے حامل ہوتی تو غالباً وہ قدرت کے اصولوں میں دخل دینا پسند نہ کرتی۔ لیکن وہ تو مغربی نقطہ نظر کے حامل تھے لہذا ان کا ایمان تھا کہ انسانی ذہن کی عظمت اس بات پر موقوف ہے کہ قدرت کو اپنے ڈھنگ پر لایا جائے اور اپنے کام میں لایا جائے۔

اس پرابلم کو حل کرنے کے لیے کمپنی نے حسبِ دستور ایک بورڈ قائم کیا۔ بورڈ نے متعلقہ امور پر بڑی کاوش سے تحقیق کی۔ متواتر اجلاس کیے۔ اور بالآخر پورے غور و خوض کے بعد اعلان کر دیا کہ یہ پرابلم ناقابلِ حل ہے۔ تعلیم کا ایسا طریق وضع کیا جا سکتا ہے کہ فارغ التحصیل جوان پڑھے لکھے تو ہوں لیکن تعلیم یافتہ نہ ہوں اور احساس اور جذبات سے کورے ہوں تاکہ ملک کا نظم و نسق ان کے سپرد کیا جا سکے۔

انسانی ترقی کی راہ میں یہ ایک عظیم قدم تھا۔

بورڈ کی سفارشات کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کئے گئے اور بہت جلد یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا کہ بورڈ کے فیصلوں پر عمل کرنے سے خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

فارغ التحصیل جوانوں کی پہلی کھیپ میں انگریزی تہذیب سے لگاؤ تھا اور آثار غالب تھے کہ یہ لگاؤ جنون بنے گا۔ ان میں خارجی نقطہ نظر حاوی تھا۔ بات سمجھنے اور تولنے کی قابلیت تھی۔ تقلید کی صلاحیت تھی۔ احکامات سمجھنے اور ان پر بے چون و چرا عملدرآمد کرنے کی صلاحیت تھی۔ ذہانت کی چمک تھی۔ یعنی تیار شدہ مال ہر لحاظ سے حوصلہ افزا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ذہانت کی تیسری سمت یعنی گہرائی جسے احساس اور جذبہ کہا جاتا ہے مفقود تھی۔

ایڈمنسٹریٹر کی اس تخلیق پر بورڈ کے جملہ ممبران کو سرکار کی طرف سے اعزاز دیے گئے۔ اور چیئرمین کو سر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

اس نئی تخلیق پر ہم سب ناز کر سکتے ہیں۔ چونکہ مشکل کے وقت ملک کی خدمت ایڈمنسٹریٹر ذہنیت کے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ایچ۔ جی ویلز، آلڈس ہکسلے اور دیگر مشاہیر نے پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں سائنس اس حد تک ترقی کر جائے گی کہ ملکی ضروریات

کے مطابق حسب ضرورت نفسیاتی لیبارٹری میں، مزدور، دستکار یا حاکم افراد کی تخلیق کی جا سکے گی۔

ان مشاہیر کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ رہی کہ برطانوی پائنیرز، نوآبادیات میں ایسے تجربات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ دور رس نگاہ بسا اوقات قریب کی چیزوں کو نظر انداز کر جاتی ہے۔

(۴) تقسیم کے بعد کی ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن نے اپنی رپورٹ کی چوتھی شق میں اس امر کے متعلق وضاحت کر دی تھی:۔

یہ درست ہے کہ برطانوی سامراج کے ختم ہونے پر پاکستان ایک خود مختار ملک بن چکا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک مملکت ہے اور کوئی مملکت نظم اور تنظیم کے بغیر چل نہیں سکتی۔ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ حصول خود مختاری کے بعد یہ مملکت ایک نوزائیدہ مملکت بن گئی ہے اور اب اس کے بقا اور تحفظ کے لیے نظم اور تنظیم کی پہلے کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ لہٰذا ہمیں زیادہ تعداد میں ایڈمنسٹریٹرز پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا طریقہ تعلیم بدلنا ملک کے مفاد کے منافی ہو گا۔ اُلٹا پرانے طریق تعلیم کو از سر نو استوار اور مضبوط کیا جائے۔

ان کی اس سفارش پر تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کو گشتی مراسلات جاری کئے گئے اور ان پر واضح کر دیا گیا کہ تعلیم کو برطانوی دور میں قائم کئے ہوئے طریقے پر چلایا جائے۔ بلکہ مزید طریق کار ایجاد کئے جائیں جو مغربی رنگ کو اور بھی شوخ کریں۔

ممتحنوں کو ہدایات جاری کی گئیں کہ ایسے سوالات پوچھے جائیں جو رٹا یا روٹ سسٹم کو اور بھی تقویت دیں اور سمجھنے یا سوچنے کی بدعت کو روکیں۔ اگر امتحان میں یہ سوال پوچھا جائے کہ ٹامس ہارڈی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے تو ان امیدواروں کو سب سے زیادہ نمبر دیے جائیں جو کسی مشہور نقاد کی رائے حرف بحرف نقل کر دے۔ اگر کوئی امیدوار اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی جرأت کرے تو اسے کم سے کم نمبر دیے جائیں تاکہ سکہ بند خیالات سے انحراف کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔

گمان غالب ہے کہ جدید تعلیمی اصلاحات انہی گشتی مراسلات اور ہدایات کا نتیجہ ہیں۔ جدید تعلیمی اصلاحات کا مقصد تو یہی ہے تاکہ ہماری تعلیم مغربی تعلیم کے خطوط پر استوار ہو اور اس سے مزید ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

(۵) کمیشن کی رپورٹ کی پانچویں شق میں کمیشن نے تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی تھی جسے عرف عام میں انصاف کہا جاتا ہے جس کے چند متعلقہ اور موزوں حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ا۔ یہ امر تشویشناک ہے کہ عوام میں انصاف کے متعلق عجیب و غریب قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے واقف نہیں اور اپنے "وشفل تھنکنگ" کے مطابق اس لفظ کو جذبہ اور احساس کے رنگ میں رنگ رہے ہیں۔ یہ رجحان نظم و نسق کے حق میں سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ب۔ انصاف کا تخیل دراصل پرانے زمانے کے بادشاہوں کی غلط کاریوں اور کوتاہ بینیوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جہانگیر نے عدل و انصاف کی زنجیر لٹکا کر عوام میں یہ قبیح عادت ڈالی کہ جب بھی وہ چاہیں گھنٹی بجا کر شاہ کو اپنے حضور میں بلا لیں اسے اپنی کتھا سُنانے پر مجبور کریں۔ اور عدل و انصاف کا مطالبہ کریں۔

ج۔ دورِ حاضر میں انصاف کے اس غلط تخیل کو فنکار اور مذہبی دیوانے ہوا دے رہے ہیں۔ جن پر کڑی نگاہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رپورٹ کی پانچویں شق ایک قابلِ قدر چیز ہے تو شاید اہلِ اسلام اہلِ فن اور عوام بدظن ہو جائیں گے۔ بہرصورت یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے اور ملک کی بہبود کی خاطر اس پر جوش میں آئے بغیر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

سب سے پہلے اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور فرمائیے۔

ملاؤں نے مشہور کر رکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ انصاف کو محبوب رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالےٰ انصاف کو محبوب رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کائنات عدل و انصاف کے اصولوں پر چلتی ہے۔ اللہ تعالےٰ رب العالمین ہیں۔ وہ ظالم اور مظلوم دونوں کو رزق پہنچاتے ہیں۔ سب کے پالن ہار ہیں، چاہے وہ سور ہو بکرا ہو یا بچھو۔ سب کے حاجت روا ہیں چاہے کوئی زانی ہو یا عابد ہو یا سیہ کار۔ ایذا دہی کے مشتاق کو ایذا دہی کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ غم خور کو غم کی نعمت بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر قدرت کا نظام عدل و انصاف پر مبنی ہوتا تو دنیا کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ اگر دنیا میں عدل و انصاف حاوی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو قیامت برپا کرتے۔ مُردوں میں دوبارہ جان ڈالتے اور روزِ حساب، اعمال کا جائزہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔

پھر ادیبوں نے مکافاتِ عمل کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو حاکموں سے بدظن کیا جائے اور انتشار پھیلایا جائے۔

ادیبوں کی اصلاحی کہانیاں خرافات سے بھری ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت ایسپ نے اپنی کہانی میں خرگوش اور کچھوے کا دوڑ میں مقابلہ کروا دیا ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انجام کار کچھوے کی جیت دکھائی ہے۔ ادیبوں کا اس قسم کی کہانیاں لکھنا حقائق سے گریز کرنے کے لیے پرچار ہے۔ ان سے پوچھا جائے کہ سچائی کا بول بالا اور بدی کا منہ کالا دکھانے سے آپ کا مقصد کیا ہے تو وہ بڑی معصومیت سے جواب دیں گے کہ ان کا مقصد نیکی کا پرچار ہے اور بچوں کو اچھے سبق سکھانا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا دورِ حاضر کا کوئی بچہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ کے قصے کو سچ مان سکتا ہے اور اس کہانی سے مسلسل محنت اور کوشش کا سبق سیکھ سکتا ہے؟

سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں جب ایک اتالیق جماعت کو خرگوش اور کچھوے کی کہانی پڑھا رہا تھا تو ایک کچھوا جماعت میں داخل ہوا۔ اور اتالیق سے مخاطب ہو کر چلّایا "شرم کرو شرم کرو۔ کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ کیوں ان معصوم بچوں کے دلوں میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہو جن کی وجہ سے ان کی زندگی تلخیوں سے بھر جائے گی۔ کبھی مجھے بھی یہی سبق پڑھایا گیا تھا۔ میں بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ کہ مسلسل دوڑنے سے میں خرگوش سے جیت سکتا ہوں۔ مگر آج تک مجھے کوئی ایسا خرگوش نہیں ملا جو مقابلے کی دوڑ میں لیٹ کر سو گیا ہو اور اس وقت تک بیدار نہ ہو جب تک میں منزل پر نہ پہنچ جاؤں۔ سچی بات یہ ہے بچو" خرگوش نے بچوں سے مخاطب ہو کر کہا "خرگوش خرگوش ہے اور کچھوا کچھوا ہے"

بے شک حاکم حاکم ہے اور محکوم محکوم ہے۔ بے شک نظامِ حکومت چلانے کے لیے صرف حاکم ذہنیت کے لوگوں کو ایڈمنسٹریشن میں بھرتی کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ خربوزہ چاہے کڑوا ہو یا میٹھا وہ خربوزہ ہے۔ حاکم چاہے اچھا ہو یا بُرا بہرصورت وہ حاکم ہے اور اس کے منصب کی عزت کرنا اور اس کے احکامات کو بجا لانا ضروری ہے۔

زندگی یا کسی نظام میں انصاف نہیں بلکہ قانون اہم ہے۔ انصاف ایک انفرادی چیز ہے نہ وہ قوم پر لاگو ہو سکتا ہے

نہ سماج پر۔ قانون چاہے انصاف پر مبنی ہو یا نہ ہو بہرصورت ہمیں قانون کا احترام کرنا چاہیئے۔ ورنہ ہم میں فوقیت پیدا نہ ہوسکے گی۔ اور یہی ایڈمنسٹریشن کا راز ہے۔ قانون کی اہمیت صرف ایک ایڈمنسٹریٹر ہی سمجھ سکتا ہے۔

ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے کے ہیڈ ماسٹر اپنی جماعت کو پڑھانے میں مصروف تھے تو ان کے افسرِ اعلیٰ ڈائرکٹر صاحب ناگہانی دورے پر تشریف لائے۔ جماعت میں داخل ہوئے تو ان کی آمد پر ہیڈ ماسٹر تعظیماً کھڑے نہ ہوئے۔

تخلیے میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے رویّے کی معذرت چاہی کہنے لگے۔ اس سکول کے بچّے مجھے ہر بات میں سند سمجھتے ہیں اور میرے ہر حکم کو آخری فیصلہ سمجھ کر مانتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ میرے اُوپر بھی کوئی افسر ہے تو ان کا مجھ پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا اور سکول کا نظم و نسق تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ کی آمد پر میرا تعظیماً کھڑے ہونا مناسب نہ تھا۔

اگر گاؤں والے سچّے دل سے یہ بات تسلیم کر لیں کہ وہی عدل و انصاف ہے جو علاقے کا تھانیدار عمل میں لاتا ہے تو ملک کا نظم و نسق نہایت اعلیٰ اور مستحکم ہو جائے۔

اربابِ بست وکشاد اس حقیقت سے پورے طور پر واقف ہیں کہ نظم و نسق چلانے کے لیے صرف قانون بنانا ہی کافی نہیں۔ بلکہ مناسب وقت پر بنے ہوئے قانون کی مناسب تاویل کرنا، اس میں سے مناسب معانی اخذ کرنا بے حد ضروری ہے۔ یقین جانیے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے خصوصی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر اچھے ایڈمنسٹریٹر میں یہ قابلیت ہونا ازبس ضروری ہے۔

ایڈمنسٹریٹیو پالیسی ریویژن کمیشن کی سفارشات میں مندرجہ بالا ئے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کمیشن کو اس کا احساس نہیں تھا چونکہ رپورٹ ایک ٹاپ سیکرٹ چیز تھی۔ اور قانون اور عمل کی COORDINATION کا مسئلہ باقی سفارشات کی نسبت زیادہ خفیہ نوعیت کا تھا اس لیے گمان غالب ہے کہ اسے حذف کر دیا گیا۔

کبھی کبھار سہواً اچھے ایڈمنسٹریٹر اس خفیہ شق کا حوالہ دے دیتے ہیں اور اپنے نائب کو حکم دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس شخص کو سزا ملنے کی بجائے انعام کے طور پر ایک خصوصی سالانہ ترقی ملے۔ جاؤ اس مقصد کے لیے مناسب قانون تلاش کرو۔"

کبھی کبھار اتنی احتیاطوں کے باوجود کوئی فنکارانہ ذہنیت کا فرد اپنی چالاکی یا متعلقوں کی غفلت کی وجہ سے سپیریئر ایڈمنسٹریٹیو سروسز میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اعلیٰ افسر بن جاتا ہے۔ ایسے سٹاف آرٹسٹ تعداد میں بہت کم ہیں۔

خیر ہر اصول کے ساتھ مستثنیات کی کلیاں تو ہوتی ہی ہیں۔

دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی خصوصی محکمہ میں جان بوجھ کر سٹاف آرٹسٹ بھرتی کرنے پڑ جائیں۔

یہ مشکل برطانوی راج میں تقسیم ہند سے کچھ سال پہلے پیدا ہوئی جب حکومت کی پبلسٹی کے لیے ریڈیو کا محکمہ ترتیب دینا ناگزیر ہو گیا۔ یہ ایک ایسا محکمہ تھا جس میں فنکاروں اور ادیبوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔

برطانوی حکومت کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مشکلات سے ڈرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے کی قائل تھی۔ لہٰذا حسبِ دستور تجربہ کار اور جہاں دیدہ افسروں کو اکٹھا کیا گیا اور معاملے کی اہمیت اور نزاکت بیان کرنے کے بعد حل کرنے کے لیے

یہ مسئلہ انھیں سونپ دیا گیا۔

برطانوی حاکم بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور غالباً اسی وجہ سے سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب جو سورج غروب ہونے لگا ہے تو یہ برطانوی مدبروں کے ذہنی انحطاط کی دلیل نہیں۔ ان کی عقل و فراست اسی طرح چاک و چوبند ہے۔ اس میں سورج کا بھی قصور نہیں۔ جہاں تک جیمز جینز کی تحقیق کا تعلق ہے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ سورج کو برطانیہ سے لاگت ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی مدبروں نے خود بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ حالات حاضرہ کے پیش نظر یہ بہتر رہے گا کہ سورج کو سلطنت انگلشیہ پر غروب ہونے کی اجازت دے دی جائے۔

براڈ کاسٹنگ کے اجرا سے پہلے برطانوی افسروں نے اپنے مقاصد کے پیش نظر اس ملک کے عوام، تہذیب، تمدن، کئی لوگوں کی ذہنیت اور ادیبوں کی نفسیات کا پورے طور پر جائزہ لیا۔

اس مسئلہ کو حل کرنے میں سب سے بڑی مشکل ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیادی سفارشات تھیں جن میں واضح طور پر متنبہ کیا گیا تھا کہ فنکارانہ ذہنیت کے لوگوں کو ایڈمنسٹریشن میں لینا حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ ایسے لوگوں کو عہدے نہ دیے جائیں بلکہ اس کے علاوہ کوشش کی جائے کہ :۔

ا۔ ایسے اصحاب مجلسی زندگی میں وقار حاصل نہ کر سکیں۔

ب۔ ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اقتصادی بحران کا شکار رہیں۔

ج۔ وہ اہل کار جنھیں بڑی کاوش سے برطانوی رنگ میں رنگا گیا ہے اور برطانوی مفاد کے پیش نظر کنڈیشن کیا گیا ہے ان کے دلوں میں ان لوگوں کے لیے نفرت پیدا کی جائے۔

د۔ ایسے حالات پیدا کرنا مناسب ہوگا کہ فنکارانہ ذہنیت کے لوگوں کی اپنے دلوں میں اپنی عزت نہ رہے۔

نوٹ:۔ مندرجہ بالا مقصد کے حصول کے لیے سائیکولاجیکل وارفیئر یونٹ کی سفارشات کی پندرھویں شق اور اس کی کے سے ٹی تک جزویات اور فٹ نوٹ (i)، (ii)، (iv) پر عمل کیا جائے۔ اس طرح ان لوگوں کے دلوں میں کمتری کے جذبات پیدا ہوں گے اور ان کی ازلی اور طبعی غم خوری کی شدید خواہش کی وجہ سے یہ مقصد احسن طریق سے پورا ہوگا۔

نوٹ:۔ (i) کمپنی حکومت کے لیے مندرجہ ذیل حضرات باعث خطرہ ہیں۔

(ا) وہ لوگ جن میں انفرادی سوچ بچار کی صلاحیت ہو۔

(ب) جو ملکی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا جذبہ رکھتے ہوں۔

(ج) اور یا جو برطانوی رنگ کی تشہیر میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ذہنی یا عملی طور پر مصروف کار رہنے کے خواہاں ہوں۔

نوٹ:۔ (ii) کوتاہ بینی یا شاہانہ بے نیازی کی وجہ سے شاہان مغلیہ نے ادیبوں اور فنکاروں کو مراتب بخش کر اور انھیں دربار کے نورتن ستارے بنا کر جو سر چڑھا لیا ہے۔ ان نورتنوں کی چمک کو دھندلانا اشد ضروری ہے۔ برطانوی مدبروں اور اعلیٰ افسروں نے کمپنی کی بنیادی تجاویز کا بہ نظر غور مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ متعلقہ امور اور اشاروں پر از سر نو نگاہ ڈالی اور پھر سوالناموں، تحقیق اور وسیع قسم کی گفت و شنید کے کئی ایک مراحل طے کر کے فیصلہ کیا کہ:۔

(۱) محکمہ نشرو اشاعت بذریعہ ریڈیو، اس کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ اسے چلانے کے لیے ادیبوں، فنکاروں، گویوں اور مصنفوں کی امداد کے بغیر چارہ کار نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ محکمہ کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ فنکاروں اور ادیبوں کی حیثیت ثانوی رہے اور ایڈمنسٹریٹروں کی حیثیت اوّلیں رہے۔

(۲) گورنمنٹ سروس کی ایک ایسی خصوصی قسم بنائی جائے جس کی رُو سے ادیب اور فنکار اپنے آپ کو گورنمنٹ سرونٹ تو سمجھیں لیکن درحقیقت وہ سروس میں شامل نہ ہوں۔ اور گورنمنٹ سروس کی مراعات کے حقدار نہ ہوں۔

(۳) محکمہ کا طریق یوں وضع کیا جائے کہ فنکار یہ محسوس نہ کرنے پائے کہ محکمہ کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کے برعکس وہ یہ محسوس کرے کہ محکمہ اس کی اعانت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

حصولِ خود مختاری کے بعد ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن کی سب کمیٹی (ج) کو یہ موضوع سونپا گیا۔ سوال یہ تھے کہ:۔

(۱) سیاسی حالات کی تبدیلی کے بعد کیا ریڈیو پاکستان کے طریقِ کار یا تشکیل میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اگر ہے تو کیوں اور کس حد تک اور اس کی نوعیت کیا ہو؛

(۲) کیا فنکارانہ ذہنیت کے لوگوں کی خدمات کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے؛

(۳) کیا سٹاف آرٹسٹ ٹھیکے کی نوکری سے غیر مطمئن تو نہیں۔ اور اگر ہیں تو کیا ان کی بے اطمینانی سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا احتمال تو نہیں؛

ریڈیو کے محکمے کی تنظیم بڑی سادہ ہے۔

وہاں کا عملہ دو قسم کا ہے (۱) انتظامیہ (۲) سٹاف آرٹسٹ، سٹاف آرٹسٹ دو قسم کے ہیں (ا) وہ جو روزانہ اُجرت پر کام کرتے ہیں اور (ب) وہ جو ماہانہ تنخواہ پر ملازم ہیں۔

انتظامیہ کا کام یہ ہے کہ آرٹسٹوں سے کام کرائے اور انھیں معاوضہ دے۔

اس محکمہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آرٹسٹوں میں پچاس روپے بانٹنے کے لیے انتظامیہ کو دو سو پچاس روپے دیے جاتے ہیں۔ یعنی دھیلے کی گڑیا ٹکہ سر مُنڈائی۔

ماڈرن بیورو ریسرز سے تفصیلی تحقیق کے بعد اس امر کا انکشاف ہوا کہ دورِ حاضر میں جس قدر کم تر گڑیا ہوگی اتنی ہی اس کی سر منڈائی گراں تر ہوگی۔ اگر وہ دھیلے کی ہو تو ٹکہ اگر دمڑی کی ہو تو آنہ۔ اس لیے یہ مثل تو محض مضحکہ خیز ہے چونکہ تہذیبِ نو کا یہ اہم اصول ہے۔ رہا سوال پچاس اور دو سو پچاس روپے کا، تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس محکمہ میں انتظامیہ کو جان بُوجھ کر مضبوط کیا گیا ہے چونکہ اہلکار متوازن ذہنیت کے حامل نہیں اور اپنی رقیق القلبی اور شدتِ احساس کی وجہ سے غیر ذمہ دارانہ حرکات کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ایک ہزار روپیہ تنخواہ پانے والے آرٹسٹ کو بھی ایک سو اسی روپے تنخواہ پانے والے رکن انتظامیہ کے احکامات پر چلنا پڑتا ہے۔

یہ اعتراض بے حد بودا ہے۔ صلاحیت ایک چیز ہے تنخواہ دوسری چیز ہے۔ دنیا میں کئی ایسے افراد ہیں جن کی کوئی آمدنی

نہیں لیکن ان میں لیڈرشپ کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے پھر ایسے کروڑپتی بھی ہیں جو فقط جی حضور ہی جی حضور ہیں۔

سپیریر سروسز کا ایک نیا بھرتی شدہ افسر ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہے لیکن کلاس ٹو کے ایک تجربہ کار افسر جس کی تنخواہ نو سو روپیہ ہے اس کے کام کی پڑتال کرنے کا فرض ادا کرتا ہے۔ اس کی رپورٹ لکھتا ہے۔ اسے سزا دلا سکتا ہے۔ اس کی ترقی روک سکتا ہے۔

پاکستان ٹائمز اور سول ملٹری گزٹ کے کالموں میں ننھے نے کئی ایک بار اس کے خلاف احتجاج کیا ہے کہ ۹۰۰ روپے تنخواہ پانے والا کلاس ٹو افسر اگر ۳۵۰ روپے تنخواہ پانے والے اعلیٰ افسر کی دعوت کرے تو وہ اسے نامنظور کرنے پر مجبور ہوگا چونکہ اعلیٰ افسر کو اپنے جیسے اعلیٰ افسروں سے میل جول رکھنا چاہیے۔

یہ حقیقت سب سے پہلے آریہ لوگوں نے اپنائی تھی۔ وہ دراوڑوں سے میل جول نہیں رکھتے تھے چونکہ وہ اعلیٰ نسل سے تھے اور زیادہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی ناکیں اونچی تھیں۔ جبھی عورتوں نے ناک میں زیور پہننے کی رسم ڈالی۔ مطلب تھا میری ناک ملاحظہ ہو۔ اونچی ہے۔ میں اعلیٰ نسل کی ہوں اور قابلِ التفات ہوں۔

ننھے نے چند اور تفاصیل بھی پیش کی تھیں مثلاً کلاس اول افسروں کے بیٹے کلاس دوم کے بیٹوں سے نہیں کھیلتے۔ کلاس اول کی بیگمات کلاس دوم کی بیگمات سے توقع رکھتی ہیں کہ وہ انہیں کورنش بجا لائیں، ادب سے بات کریں اور زیادہ راہ رسم اور بے تکلفی بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔

ننھے کے یہ احتجاج اگر سنجیدہ قسم کے ہوتے تو لازماً انتظامیہ کی طرف سے کوئی اعلان جاری کیا جاتا۔ لیکن وہ تو محض تفننِ طبع قسم کی چیز تھی۔ افسرانِ اعلیٰ نے انہیں دیکھا اور اخلاقاً ہنس دیے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ محظوظ ہوئے اور ننھے کے خالق کی صلاحیت کو آپس میں سراہا مگر اپنے اصول سے پیچھے نہ اترے۔

ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن کی سب کمیٹی ج نے اپنی رپورٹ کی ابتدا میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ :۔

حصولِ آزادی کے بعد حالات قطعی طور پر بدل چکے ہیں۔ ہمیں اس آزادی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔ ملک میں احساسِ قومیت پیدا کرنا ہے۔ اور ملک اور قوم کی محبت کو عوام کے دلوں میں جاگزیں کرنا ہے۔ اس اہم کام میں ہمارے ادیب فنکار مصنف کئی ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں اور قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ہمارے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم پرزور سفارش کرتے ہیں کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ ادیبانہ اور فنکارانہ صلاحیتیں اور بھی بیدار ہوں۔ فنکاروں میں شدتِ احساس بڑھے تخلیق کا جذبہ اور بھی ابھرے اور فنکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس مقصد کے لیے مناسب تحقیق کے بعد ہم سب متفق طور پر مندرجہ ذیل سفارشات پیش کرتے ہیں :۔

(۱) اس ضمن میں سب سے اہم چیز SEUSE OF SECURITY ہے۔ اگر فنکاروں کو SECURITY کا احساس دے دیا جائے تو وہ لازماً ان میں جمود کی کیفیت پیدا کرے گا۔ ایک آرٹسٹ کے لیے جمود موت کے مترادف ہے۔

لہٰذا سٹاف آرٹسٹ کو PERMANENT گورنمنٹ سروس دینا۔ ایک فاش غلطی ہوگی۔ اس سے اس کی قوتِ تخلیق پر اثر پڑے گا اور وہ اپنی صلاحیت کو آہستہ آہستہ مگر یقیناً کھو بیٹھے گا۔

آرٹسٹ کا اپنا اور ملک کا مفاد اسی بات میں ہے کہ وہ ٹھیکے کی نوکری کرے چاہے اسے یومیہ اُجرت دی جائے یا ماہانہ البتہ اسے ایک ماہ کی SECURITY دینا ضروری ہے۔ لہذا اُسے حسب دستور سابق ایک ماہ کا نوٹس دینا ضروری ہوگا۔

(۲) فنکارانہ صلاحیت ایک خصوصی چیز ہے اور وہ خصوصی حالات میں نکھرتی ہے۔ سپاہی کو پیٹ بھر کر کھلا دو تو وہ بہتر طور پر لڑ سکتا ہے۔ لیکن فنکار کا پیٹ بھر دیا جائے تو وہ بے کار ہو جاتا ہے لہذا فن اور ادب کی بہبود اسی میں ہے کہ فنکار اور ادیب کو "تنگ بخشی" سے نوازا جائے تاکہ ان کا احساس کند نہ ہو۔ اور غم خوری کے مواقع بڑھائے جائیں تاکہ ان کی تخلیقات کی دھار اور بھی تیز ہو۔ لہذا انھیں باقاعدہ انکریمنٹ نہ دیے جائیں۔

(۳) عام حالات میں گورنمنٹ کے ملازم کو بڑھاپے میں پنشن دینا ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کسی فنکار کو پنشن دی جائے تو اس کی عمر کا وہ حصہ تخلیق سے خالی رہ جائے گا جس میں وہ عمر بھر کے تجربے اور مشق کے بل بوتے پر بہترین تخلیقات سے قوم اور ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔ لہذا اسٹاف آرٹسٹوں کو پنشن نہ دی جائے۔

(۴) اس کے علاوہ انھیں چھٹی پر جانے کی عادت نہ ڈالی جائے لہذا چھٹی کے سلسلے میں انھیں وہ مراعات نہ دی جائیں جو دوسرے ملازمین کو دی جاتی ہیں۔

(۵) اگر انھیں عام میڈیکل سہولتیں دی گئیں تو یہ خطرہ لاحق ہو جائے گا کہ وہ بار بار بیمار پڑیں گے جو قومی نقصان کا باعث ہوگا۔

(۶) انھیں یہ ذہن نشین کرا دیا جائے کہ جب ان کے افکار اپنی تازگی کھو دیں گے تو ان کی خدمات کی ضرورت نہیں رہے گی انھیں چاہیے کہ وہ اپنے خیالات تحریر اور فن میں تازگی پیدا کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف رہیں۔

واضح ہو کہ محکمے کا مقصد فن کی اعانت کرنا ہے فنکار کی نہیں اگر فنکار کی دلجوئی شروع کر دی جائے تو وہ افراد کی اعانت کے مترادف ہو گی۔ اور افراد کی اعانت قوم کے مفاد کے منافی ہے۔

سٹاف آرٹسٹ جذباتی ہونے کی وجہ سے اس نقطے کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اور نتیجہ کے طور پر ان میں FRUSTRATION پیدا ہو رہی ہے لیکن نفسیات کی رُو سے یہ ایک نیک فال اور اچھی علامت ہے۔ کیونکہ فنکار میں جتنا اضطراب پیدا ہوگا اتنا ہی ان کی تخلیقات میں خونِ دل کا رنگ جھلکے گا۔

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز

ل۔ احمد

[۴۲ء میں میرا ایک پارہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" بصورت مکتوب نگار میں شائع ہوا تھا۔ یہ پارہ میں نے اس مکتوب کے جواب کی صورت میں لکھنا چاہا مگر نامکمل رہ گیا تھا۔ اور دوسرے نامکمل پاروں کے ساتھ یہ پارہ بھی حال میں مکمل کیا ہے۔] (ل۔ احمد)

اچھی نوشابہ!

تمہارا خط ملا، اسے خط کہوں یا بلبل کی صدا جسے کوئی نغمہ کہتا ہے کوئی نالہ و فریاد!

میرے خط میں ایسی تو کوئی بات تھی نہیں جسے تم میرے دل کی کراہ کہہ سکو۔ ہاں، دو ایک باتیں نوک قلم سے ایسی ضرور ٹپک پڑی تھیں جو کائناتی حقیقت ہیں اور عورت کی زندگی پر منطبق ہو جائیں گی۔ کون دعوے کر سکتا ہے کہ مسرّت و خوشدلی بالذات کوئی شے ہے؟ کون انکار کرے گا کہ اس دنیا میں غم ہی غم نہیں ہے؟ مسرّت و غم کو میں تو اعتباری چیزیں کہتی ہوں۔ ایک محبت کر کے ہدفِ بلا ہے تو دوسرا اسے کھو کر! کوئی دولت پا کر مبتلائے تفکرات ہے تو کوئی اسے گنوا کر! فرق و اختلاف اس بات میں ہوتا ہے کہ آیا شئے مطلوبہ حاصل کرنے کی سعی و کاوش میں زیادہ لذّت تھی یا کامرانی کی طلسم شکنی کے بعد مایوسی ہیں؟

نوشابہ۔ فلسفہ ایک ہی ہے اور وہ غم کا فلسفہ ہے۔ وہ بھی جو مسرّت کی تلاش کرتا یا اسے حاصل کر لیتا ہے، اصل میں خوگرِ الم ہے، اور اس کی یہ عادت ہی لذّت و مسرّت کا مفہوم رکھتی ہے! مگر غم سے میری مراد روزمرّہ زندگی کے دُکھ درد یا مادی محرومیاں ہرگز نہیں ہیں، بلکہ میرے نزدیک غم کا مفہوم احساس کا مجروح ہونا ہے! قدرت کی ستم ظریفی کا شاہکار یہ ہے کہ انسان مجلسی حیوان ہے مگر دوسرے انسان کو سمجھنے سے معذور ہے! ایک آدمی دوسرے کے محسوسات کو ایک معمولی لفظ سے مجروح کر دیتا ہے، اور تم جانتی ہو کہ دل کے آبگینے میں بال آیا تو پھر مٹانے سے نہیں مٹتا!

خیر، اسے ایک جُملہ معترضہ سمجھو! میں کہتا تو یہ چاہتی تھی کہ میری تحریر تمہاری اذیتِ احساس کا سبب بن گئی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ لیکن میں اس لیے خوش بھی ہوں کہ اس سبب سے تم بولیں تو سہی! غرض جس طرح میرے خط نے تمہیں بے تابِ گفتگو کر دیا ویسے ہی تمہاری داستانِ دل نے میری جراحتِ قلب کو گریاں کر دیا ہے، اور اب میں اپنی داستانِ غم سنانے کو بے تاب ہوں!

میرے حالات کا علم ہونے کے مفہوم میں تمھیں میرے انیسویں برس تک کا حال معلوم ہے جبکہ میں ایم اے کرنے بمبئی گئی ہوئی تھی اور تعلیم شروع ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے کہ یکایک حیدر آباد بلالی گئی تاکہ میرا ہاتھ ایک ایسے شخص کو پکڑا دیا جائے جو میرے والد سے بھی دو چار سال بڑی عمر کا ہے۔

اب چونکہ میرے آنسوؤں کی تحریک کا موجب تمھاری تحریر ہے، اس لیے سنتے سنتے اُکتا نہ جانا۔ بہت مختصر کروں گی تب بھی ان کڑیوں کا سلسلہ تو ملانا ہی پڑے گا جن کے بغیر افسانے کا سر پیر ہی نہ مل سکے! چنانچہ نہ پوچھو کہ شادی کی رسمیں کیونکر ادا ہوئیں اور اس وقت میرا حال کیا تھا۔ میں اس بات پر صبر کر سکتی تھی کہ میری مرضی بھی معلوم نہیں کی گئی، اگر اس کے ساتھ اتنا لحاظ رکھا گیا ہوتا کہ میں نو عمر تھی اور مجھے جدید قسم کی تعلیم دی گئی تھی۔ اس لیے کہ میرا پختہ خیال یہ ہے کہ اگر جذبات کسی ذات خاص پر منحصر نہ ہو چکے ہوں تو کسی ایسی ہستی کے ساتھ وابستہ کئے جا سکتے ہیں جس کے اندر کوئی بات خلاف طبیعت نہ ہو، اور اگر فریقین میں کوئی ایک بات بھی مشترک ہو تو اس وابستگی میں شاید ارادے اور کوشش کی مدد بھی درکار نہ ہو گی! میں یہ بھی بلا شرط مان سکتی ہوں کہ اگر جانبین کی عمروں میں مناسبت ہو تو متضاد طبع و مزاج کے باوجود وہ ایک دفعہ تو مانوس ہو ہی سکتے ہیں، اور ایسا ہو سکے تو بالآخر ساتھ رہنے کی عادت ایک زبردست تعلق خاطر کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اور اگر فریقین میں ایک دوسرے کی حالتوں کو سمجھ سکنے کی اہلیت بھی ہو اور مزاجوں میں ذرا سی رعایت روا رکھنا پیدا ہو سکے تو موانست کی اس عادت کو محبت کی صورت بھی مل جا سکتی ہے!

غرض، نوشابہ، اس وقت تو میرا یہ خیال نہیں تھا مگر آج میرا یہ عقیدہ ہے کہ "محبت" کا لفظ اسم بے مسمیٰ ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس لفظ میں "بے معنی" مفہوم کیونکر پیدا ہو گیا! اس لیے کہ ہم جس شے سے واقف نہ ہوں، جو چیز ہمارے تصور میں نہ آ سکے، اس کے لیے ہم نام کس طرح وضع کر سکتے ہیں؛ اور جو شے ہمارے ذہن و تصور میں آ سکتی ہے اس کا وجود میں آ جانا بھی لازمی ہے! اور زندگی کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ "عملی" محبت کامران ہو جانے کے بعد تھکا فرنی بھی بن گئی ہے۔ اِلّا ما شاء اللہ کی بات دوسری ہے۔ خیر، چھوڑو اس بحث کو۔ میں کہنا کچھ اور چاہتی تھی مگر اُلجھ گئی ایک بحث میں۔

ہاں، تو میری شادی ایک جاگیردار صاحب کے ساتھ کر دی گئی جو ہر اعتبار سے میرے لیے ناجنس تھے۔ صورت دیکھو تو ماشاء اللہ اور سیرت پرکھو تو سبحان اللہ! تعلیم کے نام سے کریما مقیماں کے ڈاکٹر اور تمیز تہذیب کا حال یہ کہ منہ ہر وقت اُگالدان بنا رہے! ڈکاریں لے لے کر کھانا ہضم کریں اور خراٹے ایسے کہ آس پاس کوئی سو نہ سکے! میں ان کی کس کس خوبی کو بیان کروں؟ عہد عروسی کا بس ایک واقعہ سُن لو اور اس پر سے قیاس کر کے ایک کتاب لکھ ڈالو:۔

میں کسی ضرورت سے ڈیوڑھی کی طرف جا رہی تھی اور نواب صاحب دیوان خانے سے اُٹھ کر آ رہے تھے۔ تم اسے میرے جذبات کی بے غیرتی کہہ لو کہ اس ناجنسیت سے اپنی بیزاری کے باوجود نجانے اس وقت جی میں کیا آ گئی کہ جب ہم دونوں برابر آئے تو چلتے چلتے میں نے کہنی کا ایک ٹھوکا دے دیا۔ اس پر ارشاد ہوتا ہے:۔

"اوہو! آپ ہم سے چھیڑ خانی بھی کرنے لگیں!"

سچ کہو نوشابہ۔ کہ شوہر کے منہ سے یہ سُن کر کسی جوان عمر بیوی کے دل میں کیا زندگانی کا حوصلہ باقی رہ سکتا ہے؟ تم شاید میرے اس وقت کے محسوسات کا اندازہ کر سکو گی۔ اس دن کے بعد سے میں نے اپنے شباب کی ساری آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا، اور ہر وقت

اس کوشش میں رہی کہ زندگانی دُوں کے مفہوم کو یکسر بھلا دوں، اپنی کتابِ زندگی سے اس باب ہی کو محو کر دوں، لیکن نوشابہ ایسا کرنے میں مَیں ایک منٹ کے لیے بھی تو کامیاب نہ ہو سکی! میری خلاقِ آرزو نے اُلٹا میری ایسی کوششوں کا مذاق اُڑایا!

میں نوشابہ اس خیال کی ہوں کہ جب عورت اور اس کا دل ہم ساز و ہم نوا ہو جاتے ہیں تو اس کا صبر و سکون خطرناک ہوتا ہے اس کے برخلاف مرد کے باب میں یہی بات دانشمندی کا ثبوت مانی جاتی ہے۔ الغرض میرے قلبِ آرزومند کی مایوسی اور حرماں نصیبی معمولی سماجی مشغلوں میں صرف ہونے لگی۔ اس وقت اگر میں کسی قطعی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تو اس کے معنی تھے کہ مجھے اپنی ہستی کے اندر ایک خوفناک خلا کا احساس ہوتا، اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے میرے پاس وہی آرزوئیں تھیں جن کے لیے میرا وجود طلب و تمنا کا مترادف بنا ہوا تھا!

لیکن نوشابہ جانتی ہو کہ آدمی اپنے آپ کو کس کس صورت میں فریب دیتا ہے؛ یہ میری سماجی مصروفیتیں فی المعنی تلاشِ مقصود کے لیے تھیں جیسے میں اپنی سادہ لوحی سے دھیان بٹانے کی کوشش سمجھ رہی تھی وہ اصلاً خود فریبی تھی۔ ہر چند اس وقت میں اپنے تحت الشعور کے اس مشغلے کو بالکل نہ سمجھی تھی۔

تو ایک روز میں اپنے باغ میں جا پہنچی جو ہے تو مکان ہی کا حصہ، اسی لیے پائیں باغ کہا جاتا تھا۔ لیکن اتنا بڑا تھا کہ اسے رمنہ کہنا درست ہوگا۔ غرض میں اس چھوٹی سی جھیل کی طرف بڑھی جو ہماری اس عروسِ چمن کی آرسی تھی، تو جھیل کے کنارے کسی کو پڑے دیکھا۔ پہلا خیال مالی والی کی طرف گیا مگر فوراً لباس کے خیال نے اصلاح کر دی، پھر نواب صاحب کا گمان ہوا مگر پاس ہی ایک کتاب پڑی دیکھی۔ نواب صاحب کو بھلا کتاب سے کیا واسطہ! اور جب یہ خیال ہوا کہ وہ نہ مالی ہے نہ "حضورِ معلیٰ" ہیں تو معاً میرے اندر ایک جھجک پیدا ہو گئی کہ وہ کوئی غیر آدمی ہے۔ مگر نوشابہ فطری جھجک کبھی جستجو کی حریف ہو سکتی ہے؛ اب وہ سونے والا میرے خیال میں ایک طلسمی مخلوق بن گیا اور مجھے اس کتاب کا نام معلوم کرنے کے لیے بے تابی محسوس ہوئی۔ لیکن یہ بھی فریب تھا۔ بے تابی مجھے کتاب کے لیے نہیں، کتاب والے کے لیے ہو رہی تھی!

تم اندازہ نہیں کر سکتیں نوشابہ! ہم سب کتنے بڑے خود فریب ہیں! خود کو فریب دینے میں کتنا مزا ملتا ہے!

مختصر یہ کہ بہت آہستہ آہستہ بڑھ کر میں نے وہ کتاب اُٹھا لی۔ یہ دیوانِ غالب تھا۔ اب میں بتا نہیں سکتی نوشابہ کہ اس کتاب کا دیوانِ غالب ہونا میرے لیے کتنی بڑی خوشدلی کا موجب تھا! تم بے چین ہو گی کہ میں کتاب والے کے ذکر کو ٹہلائے دے رہی ہوں، نہیں، ایسا نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب کے ایک دیوان ہونے نے مجھے کتاب والے کی طبع و مزاج کی طرف سے مطمئن کر دیا تھا!

بہر صورت، وہ کتاب والا کوئی شہزادۂ گلفام تو نہیں تھا لیکن اس خصوصیت کا مالک تھا جو عموماً ہر مرد کو کسی نہ کسی کا گلفام بنا دیتی ہے۔ اس کا عہدِ شہزادگی!

اس کے بعد کی داستان وہی ہے جو تخلیقِ آدم کے بعد سے برابر دہرائی جا رہی ہے۔ البتہ نواب صاحب قبلہ سے رہائی پانا ہفتخواں طے کرنا ثابت ہوا اور اس کا بیان قصہ ہوشربا ہے۔ انھوں نے جب مجھ سے سوا لاکھ روپے مہر کی فارغ خطی لکھوالی تب طلاق دی!

اب تم پوچھو گی کہ میری فردوسِ آرزو کیسی ہے، میں اپنی حیاتِ معاشقہ کیسے گزارتی ہوں تو سنو، انسان کسی حال میں مطمئن نہیں رہ سکتا مگر رہتا ہے! ایک ہی بات کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور شاید یہی وہ مسالا ہے جو زندگی کو کیف آور بنائے ہوئے ہے!

اچھا تو سردست، خدا حافظ

تمہاری نازلہ

سُوکھے پتے

حجاب امتیاز علی

تعارف

ان کی کائنات میں زندگی کی شام ڈھل چکی ہے۔ جادۂ حیات کے دو تھکے ماندے مسافر ایک دوسرے کا بازو تھامے زندگی کے ڈھلوانوں سے نیچے اتر رہے ہیں۔ ان کے نحیف پیکروں کو دیکھ کر، دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خزاں کے دو سوکھے پتے کسی دشتِ نامعلوم کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔

بہاریں گزر چکیں اور رُتیں آئیں ہیں مگر انھیں اس بات کا یقین نہیں کہ بہاروں کو گئے اتنی مدت گزر چکی ہے جس میں ویرانیاں آبادیاں اور آبادیاں ویرانیاں بن جاتی ہیں۔ ان کی کائنات کی ہر چیز پرانی اور بوسیدہ ہو چکی ہے۔ رستے، شاہراہیں، زمین و آسمان غرض کائنات مر چکی ہے۔ اس کائنات کی ایک چیز اب بھی زندہ ہے یعنی زندگی کے قبرستان پر محبت کا سورج اب تک دمک رہا ہے۔ نہایت تاباں، نہایت درخشاں!

[ٹرین کے گزرنے کی آواز آ رہی ہے]

بوڑھی زیتون :- اسٹیشن ابھی کتنی دور ہے؟

بوڑھا احمد :- بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ ریل کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے۔

زیتون :- فرخ ہمارے لیے بے چین ہوگا۔

احمد :- اور جانے کب سے اسٹیشن پر ہماری راہ تک رہا ہوگا۔

زیتون :- میرا بچہ ——!

احمد :- اس کا بچپن اب تک میری آنکھوں میں ہے حالانکہ اب وہ پچیس سال کا ہو چکا ہے۔

زیتون :- (ذرا ہنستی ہے) یاد ہے تمہیں اس کا وہ گھروندوں والا کھیل؟ تمام تمام دن باغ میں بیٹھا مٹی کے گھروندے بنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا "امی! جب میں بڑا ہوں گا تو ایک اتنا بڑا گھر بناؤں گا کہ تم اور ابا بڑے آرام سے اس میں رہ سکو گے"۔

احمد :- (خوشی سے ہنستا ہے) اور آج ہم اسی کے بنائے ہوئے گھر جا رہے ہیں۔

زیتون :- (بے حد خوش) کتنا خوش ہوگا آج میرا بیٹا ہمیں دیکھ کر!

(ٹرین آہستہ آہستہ رکتی ہے)

احمد :- لو آگیا اسٹیشن!

زیتون :- (بے چینی سے) اسے کھڑکی کھول کر باہر تو دیکھو! فرخ کھڑا ہوگا۔

احمد :- (کھڑکی کھول کر دیکھتا ہے) بڑی بھیڑ ہے۔ فرخ کہیں نظر نہیں آ رہا۔

زیتون :- (خوشی سے لرزاں آواز میں) ریل کے ایک ایک ڈبے میں ہم بڈھوں کو تلاش کر رہا ہوگا غریب! تم خود اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو احمد، پر جلد آنا ———

احمد :- ابھی آیا ——— سامان کے تھیلوں سے پرے تم اُدھر چل کر بیٹھو۔

(بوڑھی زیتون ریل سے اتر کر ایک طرف کو بیٹھ جاتی ہے اور احمد بیٹے کی تلاش میں بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے)

احمد :- (واپس آکر) فرخ کہیں بھی نہیں ملا۔

زیتون :- (پریشان ہو جاتی ہے) خدا کرے خیریت سے ہو میرا بچہ۔ احمد! تم نے اسے اچھی طرح سمجھا کر لکھ دیا تھا نا کہ ہم شام کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں؟

احمد :- ہاں ہاں! بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ آج کل تمہاری طبیعت اچھی نہیں رہتی اس لیے ہمیں لینے کے لیے وہ اپنی کار لے آئے ورنہ چھ میل کی مسافت کرائے کی گاڑی میں ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہوگی۔

زیتون :- اسے ہے میری طبیعت کا خواہ مخواہ لکھ دیا تم نے احمد! جانتے بھی ہو کس دل کا بچہ ہے، ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتا ہے۔

احمد :- میں نے اسے تمہاری بیماری کی نوعیت سے تھوڑا ہی آگاہ کیا ہے۔ بس صرف اتنا لکھا تھا کہ ان دنوں تم کچھ اچھی نہیں رہتیں۔

زیتون :- خدا خیریت رکھے۔ میرا دل مٹھی میں ہے۔ اب تک نہیں آیا۔ اس کی دلہن کے ہاں بال بچہ بھی ہونے والا تھا۔

احمد :- اسے تم وہم نہ کرو زیتون! انتظامات میں دیر لگ گئی ہوگی۔ ہم اس کے پاس جا بھی تو پہلی دفعہ رہے ہیں۔

زیتون :- (پھر خوش ہو جاتی ہے) ہاں پہلی دفعہ جا رہے ہیں ——— بوڑھی ماں اور بوڑھا باپ!

احمد :- لیکن ہمارے لیے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں کرنا چاہیے۔

زیتون:۔ کھانے پر تکلف کرنے کا اسے بڑا شوق ہے۔ ہمارے لیے سوئیوں کا زردہ ضرور پکوایا ہوگا۔ وہ جانتا ہے بالائی کے ساتھ تم کس شوق سے کھاتے ہو۔

احمد:۔ (مسکراتا ہے) اس کی بیوی بھی بڑی نیک طبیعت کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ شادی کے بعد صرف ہفتہ بھر ہی تو ہمارے ہاں رہی لیکن اس کی طبیعت کا اندازہ مجھے ہو گیا تھا۔

(لمحہ بھر کو خاموشی جس میں دونوں بیٹے کے لیے چشم براہ ہیں)

زیتون:۔ (وقفہ کے بعد) طرح طرح کے وہم مجھے ستا رہے ہیں احمد! اب تک آیا کیوں نہیں فرخ؟

احمد:۔ (تسلی دیتا ہے) آرام سے بیٹھ جاؤ۔ آ ہی رہا ہوگا۔ طبیعت تو اچھی ہے نا تمھاری؟

زیتون:۔ آج درد میں کمی ہے۔ نہ جانے یہ کیا مرض لگ گیا ہے مجھے۔ شانے میں بعض وقت برچھی سی اترتی محسوس ہوتی ہے ساتھ ہی بے حد ہکان سی ہو جاتی ہے...... لیکن آج بیٹے سے ملنے کی خوشی میں مجھے اپنا درد بھی یاد نہیں رہا۔

احمد:۔ (مغموم، ہلکی آہ) ہوا بڑی تیز چل رہی ہے، لاؤ میں تمھیں چادر اوڑھا دوں۔ ٹھنڈ نہ لگ جائے۔

زیتون:۔ اب تو اس چادر میں گرمائی بھی نہیں رہی۔

احمد:۔ (چادر اوڑھاتے ہوئے) جبھی تو کہتا تھا کہ نئی چادر لے لو۔ تم نہ مانیں۔

زیتون:۔ اپنے لیے نئی چادر لے لیتی تو فرخ کے منّے کی سالگرہ پر اسے نیا جوڑا کیسے دیتی؟

احمد:۔ تمھارے سینے میں ماں کا دل ہے۔ ماؤں کو نہ سردی محسوس ہوتی ہے نہ گرمی۔

زیتون:۔ (ہنستی ہے) زندگی رہی تو اپنے لیے آتے سال نئی چادر لے لوں گی۔

احمد:۔ (یکایک بے چین ہو جاتا ہے) آتے سال؟ ——— (مغموم ہو جاتا ہے) ہوں ——— بڑی دور کی بات ہے زیتون!

(لمحہ بھر کے لیے دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ وقت کی رفتار کو دیکھنے لگتے ہیں)

زیتون:۔ شام پڑ گئی ——— کتنی دور ہوگا فرخ کا گھر یہاں سے؟

احمد:۔ (متفکر) بڑی دور ہے۔

زیتون:۔ شانے اور پیٹھ کے درد کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم خود ہی چلے چلتے ——— جانے یہ کیسا مرض ہے میرا۔ ہڈیاں نکل آتی ہیں اور سینے میں درد کی برچھی چبھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر کیا کہتا ہے میرے متعلق؟"

احمد:۔ (دھیمے اداس لہجے میں) کہ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔

زیتون:۔ لیکن مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ ناامید سا ہو گیا ہے۔

احمد:۔ (مغموم) ارے وہم نہیں کیا کرتے۔

(لمحہ بھر کو وقفہ)

زیتون:۔ (اچانک) احمد! اس اسٹیشن کا نام کیا ہے؟

احمد:۔ ارے پہچان نہیں سکیں زیتون؟ ——— بستی پالکول کا اسٹیشن ہے پالکول کا۔

زیتون :۔ (یکلخت چونک پڑتی ہے) ہائیں —؟ کیا کہا؟ پاکول کا اسٹیشن؟ — (چپ ہو جاتی ہے)

احمد :۔ کس سوچ میں پڑ گئیں؟

زیتون :۔ (متاثر) پاکول! میرے ارمانوں کی وادی! — میں سوچ رہی تھی احمد! پاکول کے نام کے ساتھ ساتھ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں ہائے ہائے!

احمد :۔ (لمبی سانس) ہوں!

زیتون :۔ یہاں آکر گزری بہاروں کی یاد نہیں ستا رہی تمہیں؟

احمد :۔ (متاثر) یہ مجھ سے پوچھتی ہو زیتون؟ — انھیں گزری بہاروں کی یاد سے آج ہماری زندگی کی خزائیں سلامتی سے گزر رہی ہیں

ع نہ وہ خزاں رہی باقی نہ وہ بہار رہی!

زیتون :۔ (بے چین ہوکر) یاد کرو وہ زمانہ — وہ ہماری عمریں، وہ وقت، وہ ولولے! آج سے برسوں پہلے اسی پاکول کے اسٹیشن پر ہماری تمہاری پہلی ملاقات ہوتی تھی۔ یاد ہے کچھ؟

احمد :۔ (جیسے سہانا خواب دیکھ رہا ہو) ہاں — آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کائنات میں ایک دفعہ بہار آئی تھی۔

زیتون :۔ ایسی بہار پھر نہیں آئی۔

احمد :۔ وہ ہماری جوانی کی بہار تھی۔

زیتون :۔ دلوں میں تڑپ تھی۔

احمد :۔ اور مزاجوں میں دیوانگی۔

زیتون :۔ کیا دن تھے احمد!

احمد :۔ اور کیا راتیں زیتون!

زیتون :۔ اندھیری راتیں چاندنی راتوں سے زیادہ روشن معلوم ہوتی تھیں۔

احمد :۔ اور چاندنی راتیں اندھیری راتوں سے زیادہ دلچسپ اور پُراسرار۔

زیتون :۔ ہائے کہاں گئے وہ دن اور وہ راتیں —؟

احمد :۔ اور وہ ولولے، وہ امنگیں —؟

(لمحہ بھر کو وقفہ جس میں دور سے کسی ٹرین کے گزرنے اور سیٹی بجنے کی آواز آتی ہے)

زیتون :۔ مگر احمد!

احمد :۔ ہاں زیتون؟

زیتون :۔ یہ پاکول ہی کا اسٹیشن ہے؟

احمد :۔ (ہنستا ہے) وہ دیکھتی نہیں سامنے تختے پر اتنے موٹے موٹے حروف میں کیا لکھا ہے؟

زیتون :۔ مگر مجھے یہ جگہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کے اسٹیشن کی وہ پرانی زنگ آلودی لالٹین اس کے سایے میں سونے والا وہ

مریض کتّا۔ کھڑکی کے اندر بیٹھا ہوا وہ گاؤ تکیے جیسا موٹا مسٹر اکمٹ بابو، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ بالکل کا اسٹیشن کیسے ہو گیا۔

احمد :۔ (متاثر) زمانے کی آندھی ان سب کو لے اُڑی زیتون۔ تم پچاس سال پرانے ماضی کو آج ڈھونڈ رہی ہو؟ وہ کتا، وہ ٹکٹ بابو، وہ رنگ اڑی لالٹین۔ وقت کی کتاب کے پچاس سال اُلٹ چکے ہیں۔

زیتون :۔ (حیران، ششدر) پچاس سال!؟ ——— (خوف زدہ ہو جاتی ہے) ہائے نہیں نہیں (روتے ہوئے ہیں) مجھے تو یہ بالکل کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

احمد :۔ (مغموم) ہاں! ٹھیک کہتی ہو۔ ہم کل کی بہاروں کے دو خشک پتے ہیں جو زمانے کی تیز ہوا میں جانے کس دشتِ نامعلوم کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔

زیتون :۔ (گھبرا سی جاتی ہے) خشک پتے؟ ——— نہ نہ۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں تو مجھے کونپلیں ہی کونپلیں نکلی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ چاروں طرف ناشگفتہ کلیاں ہی کلیاں مہک رہی ہیں۔

احمد :۔ کونپلیں اور کلیاں۔ سچ کہتی ہو زیتون ——— اس زمانے میں تم بھی ایک کونپل تھیں۔ ایک ناشگفتہ کلی ——— جس کی ہوشربا مہک پر میں بھونرے کی طرح اڑتا ہوا آ پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر آج مجھے پھر تم وہی الھڑ لڑکی معلوم ہو رہی ہو۔

زیتون :۔ اور تم؟

احمد :۔ (ہنستا ہے) یہ تم بتاؤ۔

زیتون :۔ ایک جوانِ رعنا! ——— احمد لو میرا ہاتھ پکڑو۔ مجھے باہر لے چلو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں ان بیتی بہاروں کی پرانی یادگاروں میں سے یہاں کوئی چیز باقی بھی ہے؟

احمد :۔ صرف دو سوکھے پتے!

زیتون :۔ (کھڑی ہو جاتی ہے اور احمد کے الفاظ سنتی ہے) آؤ احمد باہر چل کر دیکھیں پرانی یادوں کی گرمیں سے اس مقام کی چہل پہل دلفریبیاں اور رنگینیاں جھلکا کرتی تھیں ان کا اب یہاں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

احمد :۔ وقت کی ریت پر سے پرانے قدموں کے نشان تک مٹ چکے ہیں زیتون۔

زیتون :۔ یکلخت آسمان کی طرف دیکھ کر چلاتی ہے) پر دیکھا احمد! وہ وہ.... صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔

احمد :۔ (مغموم) کیا؟

زیتون :۔ افق کے شفق زاروں میں دہکتا ہوا پرانا سورج! برسوں پہلے بھی وہ بالکل اسی طرح، اسی عقب میں شفق کے خونچکاں دریا میں ڈوبا کرتا تھا۔ یہ وہی سورج ہے احمد۔ وہی پرانا سورج!

احمد :۔ (گہرا سانس ——— متاثر) ہوں ——— چاند ہو یا سورج اپنے وقت پر ڈوبتا اور اپنے وقت پر ابھرتا ہے۔ خواہ وہ انسانی آبادیوں پر ڈوبے یا ویرانوں پر ابھرے۔ اسے انسان کے ماضی و مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں زیتون۔

زیتون :۔ ادھر اُدھر دیکھتی ہے پھر یکایک ایسی گرمجوشی سے جیسے کوئی پرانا دوست نظر آ گیا ہو خوشی کے لہجے میں کہتی ہے) احمد احمد! وہ دیکھو۔ وہ رہا وہ ہمارا پرانا تاڑ کا درخت۔ وہ اس ڈھلوان پر جوں کا توں کھڑا ہے ——— (پھر غمگین ہو جاتی ہے) اور یوں

معلوم ہوتا ہے جیسے گزرے وقتوں پر ماتم کر رہا ہو۔

احمد :- (آہ سرد) ہر چیز پرانی ہو چکی ہے۔ رستے شاہراہیں، زمین، آسمان، کائنات مر چکی ہے مگر زندگی کے اس قبرستان میں صرف ایک چیز اب تک زندہ ہے۔ نہایت تاباں، نہایت درخشاں، جانتی ہو کیا؟

زیتون :- (آہستہ) کیا؟

احمد :- (کچھ دیر چپ رہتا ہے پھر مدھم مگر موثر لہجے میں کہتا ہے جیسے کوئی سسکی لے رہا ہو) محبت!

زیتون :- محبت! انسان کی محبت زندہ ہے تو پھر کائنات مر نہیں سکتی۔ پھر تو ہر چیز زندہ ہے۔

احمد :- (جوان اور رجز بھری آواز میں ہنس پڑتا اور رکتا ہے) ہاں! ہاں! محبت زندہ باد! ——— آؤ زیتون اعصائے محبت کا سہارا لے کر ارمانوں کے ان اجڑے کھنڈروں میں جوانی کے نقش قدم کو ڈھونڈ نکالیں جو یہاں کی مٹی پر کندہ ہیں۔ آؤ میرا سہارا لو اور قدم آگے کو بڑھاؤ ———!

زیتون :- آگے کو؟ ان پگڈنڈیوں پر چلتے اب اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اب یہ شاہراہیں بن گئی ہیں۔

(دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیے ڈوبتی شام کے سایوں میں آگے بڑھتے جاتے ہیں)

یہاں کی خاک پاک کا ذرہ ذرہ ——— یہاں کے طلوع، یہاں کے غروب غرض یہاں کی ہر چیز مانوس سی ہے۔

احمد :- ماضی ہمیں اپنی پچھلی رعنائیوں کی قسم دے دے کر اپنی طرف بلا رہا ہے۔ یہاں کی ایک ایک چیز جانی پہچانی ہے ——— اور آگے چلو ———

زیتون :- (چونک پڑتی ہے) ارے ذرا سننا احمد ———!

(شام کے سناٹے میں دور سے کسی کارخانے کی دھک دھک کی آواز سنائی دے رہی ہے)

زیتون :- سُنا تم نے؟ پن چکی کی کوکوکو؟

(آواز مسلسل اور آہستہ آہستہ آ رہی ہے)

احمد :- (غور سے سنتا ہے) ارے کہیں وہی پرانی پن چکی تو نہیں زیتون جس کی آواز ہم دن رات سُنا کرتے تھے مجھے یاد ہے اسٹیشن سے باہر نکل کر جونہی ہم اس چڑھائی پر چڑھتے تھے وہ سامنے نظر آجایا کرتی تھی۔

زیتون :- کیسے کیسے وقتوں میں اس کی آواز سُنی ہے احمد!

احمد :- ہاں ——— بہار کی دھکتی ہوئی دوپہروں میں، خزاں کی دھندلی شاموں میں ——— اور گرمیوں کی اداس راتوں میں ———!

زیتون :- مگر آہ ——— یہ تو اس سامنے والے کارخانے کی دھک دھک ہے وہ دور دیکھو۔ کارخانے کے روزن میں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ وہ پرانی پن چکی اب کہاں ———! (یکلخت بے اختیار کراہتی ہے)

احمد :- (گھبرا کر) کیا ہوا؟ کیا ہوا؟

زیتون :- ٹیس سی اٹھنے لگی ہے سینے میں۔ خدا جانے یہ کیا بیماری لگ گئی ہے مجھے۔ برچھی کی سی چبھن محسوس ہوتی ہے..... (کچھ دیر بعد) احمد!

سچ بتاؤ، میں تندرست ہو جاؤں گی؟

احمد :۔ (بے حد غمگین) کیوں نہیں زیتون! ـــــــ (پھر اسے بہلانے کے لیے) بیٹے کے پاس جا رہی ہو۔ اس کے گھر پہنچتے ہی اپنی ساری تکلیفیں بھول جاؤ گی۔

زیتون :۔ لیکن فرخ ہمیں لینے آیا کیوں نہیں؟

احمد :۔ چلو اس کے انتظار میں اس سامنے کی ٹیلیا پر بیٹھ جاتے ہیں تم تھک گئی ہو، کچھ دیر آرام کر لو۔

زیتون :۔ ٹیلیا ٹھیک نہیں۔ وہ ہمارا پرانا ٹھکانا "گل رنگ" کتنی دور رہ ہوگا؟ وہیں چل کر بیٹھیں گے اور فرخ کا انتظار کریں گے۔

احمد :۔ (بیتاب ہو جاتا ہے) گلرنگ! ہائے ہائے یہ تم نے کیا یاد دلا دیا زیتون ـــــــ یاد ہے اس چھوٹی سی سرائے میں ہم نے کیسی کیسی شامیں کبھی گزاری تھیں؟

زیتون :۔ (آہ بھرتی ہے) کچھ نہ پوچھو۔

احمد :۔ اس زمانے میں جو اکا دکا مسافر پالکول آتا تھا اس کا واحد ٹھکانہ گلرنگ ہی ہوتا تھا۔ وہ دیکھنا۔ وہ سفید دیواریں اسی کی تو نہیں؟

زیتون :۔ یہ تو کوئی بہت اونچی عمارت ہے۔

احمد :۔ (مایوس) ہاں گلرنگ تو ایک چھوٹی سی سرائے تھی۔

زیتون :۔ مگر کیا معلوم ـــــ یہ شاندار عمارت اسی چھوٹی سی سرائے کی قبر پر کھڑی ہو!

(لمحہ بھر کو وقفہ۔ پھر دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آنے لگتی ہے
پھر مردانہ آواز میں کسی کے آہستہ آہستہ گنگنانے کی آواز آتی ہے)

احمد :۔ غضب کی آواز ہے اکون گا رہا ہے......!

زیتون :۔ کوئی شکاری چلا آ رہا ہے۔

احمد :۔ (پلٹ کر ڈھلوان کی طرف دیکھتا ہے) شکاری! (ٹاپوں کی اور گنگنانے کی آواز قریب آنے لگتی ہے) آواز میں رس ہے اور ـــــ دیکھنا زیتون! کیسا بانکا سجیلا ہے۔

زیتون :۔ کوئی جوان بے پروا معلوم ہوتا ہے۔ گا رہا ہے اور چلا آ رہا ہے۔

احمد :۔ یوں سینہ تانے چلا آ رہا ہے جیسے زمانے کی آندھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

زیتون :۔ اور جیسے حسن و شباب کا آفتاب اس پر کبھی غروب ہو ہی نہیں سکتا۔

احمد :۔ انسان یونہی سوچتا ہے ـــــ کبھی میں بھی یہی سوچتا تھا!

زیتون :۔ ہاں! اور اسی طرح تم بھی کبھی محبت کے رسیلے گیت گایا کرتے تھے۔

احمد :۔ (مغموم) ہوں! .... یہ زندگی ایک خواب ہے زیتون۔ نجانے کب آنکھ کھلے اور ہم کب جاگ جائیں۔

(اب گنگنانے کی اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بہت ہی قریب آ گئی ہے)

زیتون :۔ وہ اِدھر ہی کو چلا آرہا ہے۔ اسی سے ''گلرنگ'' کا پتہ پوچھو۔

نوجوان :۔ (قریب آگیا ہے اپنے خیالوں میں گم مزے سے گا رہا ہے۔ شاید محبت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ گھوڑے کے آہستہ آہستہ ٹاپوں کی آواز اس کے گانے کی سرگم بن گئی ہے) ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا ' غمِ روزگار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے......

(زیتون اور احمد اسے بغور دیکھنے لگے)

(دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک تر و تازہ پھول کے آگے دو خشک پتے گھاس پر پڑے ہوں)

احمد :۔ (گلا صاف کر کے) ذرا سننا' میاں صاحبزادے!

نوجوان :۔ (تان لگاتا ہے' بوڑھے کی آواز نہیں سنتا) ؎ کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

احمد :۔ (آگے کو بڑھ کر) میری بات سننا نوجوان! یہاں ''گلرنگ'' نامی چھوٹی سی سرائے تھی' کدھر کو ہے؟

نوجوان :۔ (گانا بند کر کے بے پرواہی سے) مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو؟

احمد :۔ میں نے کہا بیٹے! یہاں ایک چھوٹی سی سرائے تھی گلرنگ۔ کدھر کو ہے؟

نوجوان :۔ گل رنگ؟ ——— نام تو بڑا بانکا ہے مگر بڑے میاں اس نام کی یہاں کوئی سرائے نہیں ہے۔
(گنگناتے ہوئے پھر گھوڑے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے)

احمد :۔ ذرا رکنا صاحبزادے! گلرنگ تو بہت مشہور سرائے ہے۔ تم یہاں اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ اس پہاڑ کی ڈھلوان کے ختم ہوتے ہی یہاں گلرنگ کی دیوار نظر آجاتی تھی۔

نوجوان :۔ (ہنستا ہے) ہی ہی ہا ——— ارے بڑے میاں! خواب تو نہیں دیکھ رہے؟

احمد :۔ نہیں بیٹے! میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

نوجوان :۔ کب کی باتیں کر رہے ہو؟

احمد :۔ ابھی چند ہی سالوں کی۔

زیتون :۔ شادی کے بعد ہم دونوں چند روز اسی سرائے میں رہے تھے۔

نوجوان :۔ (قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا ——— ایک صدی پرانی چیز کو آج ڈھونڈنے نکلے ہو؟

؎ وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

(قمقمہ لگاتا ہوا روانہ ہو جاتا ہے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز مدھم پڑتی جاتی ہے
دونوں میاں بیوی ششدر و حیران شام کے دھندلکے میں کھڑے ہیں)

زیتون :۔ (مغموم) چلا گیا ——!

احمد :۔ (مغموم) یوں نکل گیا جیسے وقت گزر جاتا ہے ——!

(تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ——!)

زیتون :۔ احمد!

احمد :۔ (جیسے خوابوں سے چونک پڑا ہو) ہوں!

زیتون :۔ اس نوجوان کے قہقہے سے پہلے —— یعنی آج سے پہلے مجھے اس بات کا احساس تک نہ ہوا تھا کہ زندگی کی بہار کو گزرے اتنی مدت ہو چکی ہے۔

احمد :۔ (اب تک مغموم) ہو——ں!

(گہرا سناٹا۔ پھر یکایک کسی پرندے کے پروں کو پھڑپھڑانے کی آواز آنے لگتی ہے)

زیتون :۔ ایں! یہ کیسی آواز ہے!

احمد :۔ (مغموم) ابابیل ——

زیتون :۔ ابابیل؟ —— ارے دیکھنا احمد! وہ آہیں بھرتی ہمارے سروں پر سے اڑ گئی۔

احمد :۔ (اداس) ہاں! اور شفق کے خونچکاں دریا میں جا کر ڈوب گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

زیتون :۔ (گھبراجاتی ہے) وقت کے پر نہیں ہوتے —— پھر بھی وہ کس تیزی سے پرواز کر جاتا ہے احمد!

احمد :۔ ہاں! اس ابابیل کی طرح ——

زیتون :۔ اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی!

(خاموشی گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر آہستہ سے دو دفعہ ٹک ٹک کی آواز آتی ہے)

زیتون :۔ یہ کیسی آواز تھی احمد؟

احمد :۔ دو خشک پتے درخت سے ٹوٹ کر ہمارے سامنے آگرے ہیں۔

زیتون :۔ رستہ اور بھی ویران معلوم ہونے لگا ——!

احمد :۔ نئے رستوں پر پرانے مسافروں کا کیا کام زیتون؟

زیتون :۔ (خوف زدہ) واپس لوٹ چلو۔

احمد :۔ چلو ——!

زیتون :۔ مگر —— ذرا ٹھہرو۔ جانے فرخ کس رستے آئے۔

احمد :۔ رستہ ایک ہی ہے۔ اس کی پگڈنڈیاں مختلف منزلوں پر جا نکلی ہیں۔

(دونوں واپس جانے لگتے ہیں کہ یکایک ایک نو دس سال کے لڑکے
کے گانے کی شگفتہ آواز ان کے کانوں میں پہنچتی ہے)

لڑکا :۔ (گا رہا ہے) ـــ

شبِ غم سے صبحیں تراشوں گا میں
چٹانوں میں راہیں نکالوں گا میں
زمانہ مری کامرانی کا نقش!
اسے جس طرح چاہوں ڈھالوں گا میں
چٹانوں میں راہیں نکالوں گا میں

احمد :۔ (مدھم لہجہ) سُنا تم نے؟

زیتون :۔ کیا؟

احمد :۔ انساں کے ارادے!

زیتون :۔ ہوں ———

احمد :۔ یہ ننھا سا لڑکا ——— دیکھا تم نے کس بے فکری سے مستقبل کے ارادوں کے گیت گا رہا اور یہ بیری تلے پکے پکے بیر چُن رہا ہے۔

زیتون :۔ ابھی اس نے زندگی کی دہلیز میں قدم رکھا ہی ہے ———

احمد :۔ (یکایک بیساختہ چلّاتا ہے) امجد! او امجد!

زیتون :۔ (گھبرا جاتی ہے) ارے! کس امجد کو بلا رہے ہو؟ کون امجد؟

احمد :۔ (شرمندہ ہو کر ہنستا ہے) میں بھی کیا دیوانہ ہوں ——— ماضی کو حال سمجھ بیٹھا۔ اس کنوئیں کی بیری مجھے بیتے دنوں میں گھسیٹ لے گئی۔ اس نو دس سال کے معصوم لڑکے کی سُرخ دھاری دار واسکوٹ کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے امجد کا دھوکا ہو گیا۔

زیتون :۔ (حیران) امجد کون؟ کس امجد کا ذکر کر رہے ہو؟

احمد :۔ (دردناک ہنسی) میرے بچپن کا ہم مکتب امجد ——— میں نے بارہا تم سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی سُرخ واسکوٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ مدرسے سے بھاگ کر ہم دونوں کنوئیں کی بیری تلے پہنچ جایا کرتے تھے۔ نہ وقت کی رفتار کا دھڑکا ہوتا تھا نہ مستقبل کا اندیشہ۔ اپنے حالوں میں مگن تمام تمام دوپہر کھٹے میٹھے بیر چنتے آپس میں لڑتے جھگڑتے، محبت کرتے، پیار کرتے، روٹھتے منتے ——— وقت گزارا کرتے تھے۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وقت کے گھوڑے کی باگ ہمارے ہاتھوں میں ہے ...... جیسے بیری تلے بیر چننا ہی وقت کا مقصد ہے ...... بالکل اسی طرح ..... جیسے یہ لڑکا اس وقت مشغول ہے ——— ہماری مائیں گھروں پر ہماری راہ تکا کرتیں۔ شام کو ہمیں سزائیں بھی ملتی تھیں مگر پھر صبح اٹھ کر ہم اسی شغل میں لگ جاتے تھے۔ زیتون! کیا وقت تھا اور کیا ولولے! کسی کی ناراضی کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے! ——— حالانکہ امجد کو اس دنیا سے گزرے پندرہ سال گزر چکے ہیں ——— وہ اپنی ملازمت کی مدت ختم کر کے

پنشن لے کر واپس آرہا تھا کہ ریل کے حادثے میں ——— (آہ بھرتا ہے) مگر تعجب اس بات کا ہے کہ نصف صدی گزرنے کے بعد آج بھی میرے تصور میں امجد وہی دس بارہ سال کا بے فکر لڑکا ہے جو سکول سے چھٹی ہوتے ہی گھر جانے کی بجائے رستے ہی میں سے بھاگ کر پیچھے پیچھے بیر توڑنے آ گیا ہے۔ اس کم سن لڑکے کو بیری تلے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہی زمانہ ہے اور وہی ہماری عمریں۔ (آواز دیتا ہے) میاں لڑکے! ادھر تو آنا ———

لڑکا :- (چونک پڑتا ہے) مجھ سے کچھ کہا؟

احمد :- (گھری دلچسپی لیتے ہوئے) کیا کر رہے ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟

لڑکا :- (خوف زدہ ہو جاتا ہے) یقین کرو بابا! مدرسے سے بھاگ کر نہیں آ رہا۔ چھٹی ہو گئی تھی۔ گھر جاتے جاتے ذرا بیری تلے رک گیا۔

احمد :- ڈرو نہیں بیٹے! میں تمھیں برا بھلا کہنے نہیں آیا۔

لڑکا :- (اب تک خوف زدہ) آپ ہمارے مدرسے کے ماسٹر تو نہیں ہیں؟

احمد :- (ہنستا ہے) نہیں بیٹے! میں بھی تمھاری طرح کا ایک طالب علم ہوں۔

لڑکا :- (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) ہی ہی ہی ہی ——— اس عمر میں آپ طالب علم ہیں؟ ہی ہی ہی!

احمد :- (سنجیدہ اور موثر لہجہ) ہاں! زندگی کا! میں ہمیشہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ——— کبھی میں بھی تم جتنا لڑکا تھا اور تمھاری طرح مدرسے سے بھاگ کر یہاں بیر چننے آیا کرتا تھا۔

لڑکا :- (ہنس پڑتا ہے) کبھی تم بھی چھوٹے تھے بابا؟

احمد :- (دردناک خیالات میں گم) ہوں ——— ہاں! کبھی آتش جوان تھا۔

(شام اور بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ ہر طرف اداسی اور خاموشی مسلط ہے)

احمد :- (لمبی سانس۔ پھر زیتون کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے) دیکھا تم نے زیتون! اس رستے پر سے ایک امجد گزر جاتا ہے تو دوسرا نمودار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی پگڈنڈیاں کبھی خالی نہیں رہتیں۔ (وقفہ۔ اداس لہجہ) میاں لڑکے! اب گھر لوٹو۔ تمھاری ماں راہ تک رہی ہوگی۔

لڑکا :- وہ تو ہمیشہ ہی ہماری راہ دیکھتی رہتی ہیں۔

احمد :- ہمیشہ؟! ارے نہیں۔ یہ تمھاری بھول ہے۔ کوئی ہمیشہ کسی کی راہ نہیں دیکھتا۔ وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے ——— وہ دور دیکھو۔ دھان کے ہرے ہرے کھیتوں پر پیلی دھوپ دم توڑ رہی ہے۔ سائے بڑھتے ہی جاتے ہیں اور یہ شام اب ڈھل چکی ہے۔

زیتون :- ہاں ——— اور تھوڑی دیر بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔

احمد :- ہاں! اندھیرا ہی اندھیرا ——— آہ!

(لمحہ بھر کو وقفہ۔ پھر دور سے ایک نوجوان اور ایک لڑکی کے گانے کی آواز آنے لگتی ہے)

نوجوان لڑکا :۔ (گا رہا ہے) ؎

اپنے قابو میں نہ دن اور نہ رات

لڑکی :۔ (گاتی ہے) ؎ اب کے آئی ہے غضب کی برسات

لڑکا :۔ (گاتا ہے) ؎ آمدِ فصلِ بہاراں کے طفیل

لڑکی :۔ (گاتی ہے) ؎ دے دیا ہم نے ترے ہاتھ میں ہات

لڑکا :۔ (گاتا ہے) ؎ اپنے قابو میں نہ دن اور نہ رات

لڑکی :۔ (گاتی ہے) ؎ اب کے آئی ہے غضب کی برسات

احمد :۔ وہ دیکھنا زیتون ——— ڈھلوان پر ایک نوجوان اور اس کی محبوبہ ——— ہنس کے جوڑے کی طرح حسین!

زیتون :۔ اور کنول کے پھولوں کی طرح تر و تازہ۔

احمد :۔ ان دونوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے گزرا وقت لوٹ کر آگیا۔

زیتون :۔ ارے وہ تو ہماری طرف آ رہے ہیں۔

لڑکا :۔ (قریب پہنچ کر) بڑے میاں! یہ رستہ کدھر کو جاتا ہے؟

احمد :۔ ایک ایسی شاہراہ کی طرف ——— جہاں سے پھر واپس آنا پڑتا ہے۔

لڑکی :۔ (شوخی سے ہنس پڑتی ہے) کیا کہا؟ واپس آنا پڑتا ہے؟ ہی ہی ہی ہی ———

احمد :۔ جس رستے کو چھوڑ کر جا رہے ہو ایک دن گھوم گھام کر پھر اسی پر لوٹ آؤ گے۔

لڑکا :۔ تم فلسفے کے طالب علم معلوم ہوتے ہو۔

احمد :۔ ہاں! میں نے زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔

لڑکی :۔ (اشتیاق سے آگے کو بڑھتی ہے) مجھے بتاؤ، تم نے زندگی سے کیا سیکھا؟

احمد :۔ یہ ——— کہ زندگی میں ایک دفعہ محبت ضرور کرو، خواہ چند لمحوں کے لیے سہی۔

لڑکی :۔ (بے ساختہ) ہائے تم کتنے اچھے ہو بابا!

لڑکا :۔ اور بڑے میاں! محبت کی جنگ میں اگر جان و دل کی بازی لگانا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے نا؟

احمد :۔ قطعاً نہیں۔ قطعاً نہیں ——— سُنا نہیں تم نے؟ ؎

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

لڑکا اور لڑکی :۔ (دونوں مل کر گاتے ہوئے ڈھلوان کی طرف چلے جاتے ہیں) ؎

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

(آواز رفتہ رفتہ شام کے سناٹے میں ڈوب جاتی ہے)

احمد :- (ان دونوں کے جانے کے بعد خالی رستے کو تک رہا ہے) ہا —— ہا ——! ان دو وارفتگانِ محبت کو دیکھ کر مجھے برسات کی ایک گئی گزری پرانی شام یاد آگئی۔

زیتون :- احمد! یاد ہے تمہیں، ہماری پہلی ملاقات بھی ایک برسات کی شام ہی میں ہوئی تھی۔

احمد :- اسی کو تو یاد کر رہا ہوں زیتون —— یاد ہے وہ برسات کی دھلی دھلائی سونے کے رنگ کی شام! دن بھر برستا رہا تھا اور شام کو بادل چھٹ رہے تھے اور سورج کی طلائی کرنیں جنگل میں آگ لگا رہی تھیں۔

زیتون :- اور ساری کائنات سوسن کے شگوفوں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔

احمد :- تم اور تمہاری سہیلی عائشہ گرمیوں کی چھٹیوں میں پالکوں آ رہی تھیں۔

زیتون :- اور اتفاق سے تم بھی اسی گاڑی میں سوار تھے۔

احمد :- اور تمہیں یاد ہے ریل کس تیزی سے اڑی جا رہی تھی؟

زیتون :- (خوابناک آواز) ہاں —— شاید وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیز!

احمد :- اور جب ریل عمرِ رواں کی طرح سفر کاٹتی اپنی منزل پر آکر رکی اور پالکوں کا اسٹیشن آگیا تو میں کسی ضرورت پر تمہارے ڈبے کے قریب سے گزرا تھا۔

زیتون :- (ذرا ہنستی ہے) اس کے بعد تم بار بار میرے ڈبے کے سامنے سے گزرنے لگے —— یہاں تک کہ ——

احمد :- (ہنس کر) تم نے مجھے غنڈا سمجھ لیا۔

زیتون :- (ہنستی ہے) نہ صرف میں نے بلکہ عائشہ نے بھی!

احمد :- کیسے نہ گزرتا۔ میں پہلی ہی نظر میں تمہارے تیرِ نظر کا گھائل ہو گیا تھا۔

زیتون :- (پُرشوق لہجہ) اور یاد ہے تمہارے بار بار چکر لگانے سے میں اور عائشہ کس قدر گھبرا گئی تھیں۔

احمد :- (بالکل نوجوانوں کی طرح ہنس پڑتا ہے) اور یہ بھی یاد ہے تم دونوں نے مجھے بدمعاش سمجھ کر پکڑوا دینے کی صلاح کی تھی۔

زیتون :- (الھڑ لڑکی کی سی آواز میں ہنس پڑتی ہے) تمہاری حرکات ہی ایسی تھیں۔

احمد :- اور وہ بوڑھے کا بورا، اسٹیشن ماسٹر الیاس! یاد ہے ہماری محبت سے واقف ہونے کے بعد ہم سے کس قدر متنفر اور بدگمان رہنے لگا تھا۔

زیتون :- (شگفتہ آواز میں) بھلا الیاس کو میں بھول سکتی ہوں! نفرت تھی مجھے اس سے۔ ایک تو وہ ہم سے جلتا تھا، دوسرے اپنے آپ کو بڑا حسین سمجھتا تھا حالانکہ یہ بڑی بڑی سرمئی مونچھیں تھیں اور پیٹ آگے کو نکلا ہوا۔

احمد :- پہلے ہی دن سے ہم سب کے تعلقات اس سے کشیدہ ہو گئے تھے۔

زیتون :- (لڑکیوں کی سی آواز) جس شام ہماری ٹرین یہاں پہنچی تھی میں اور عائشہ گاڑی سے اتر کر پریشان سی پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں کیونکہ ہمیں لینے کوئی نہ آیا تھا۔ عائشہ دل کی کمزور تھی رونے لگی اور بولی "ہائے زیتون! اب کیا ہوگا؟ ہم گھر کیسے پہنچیں گے؟"

یہاں تو کرایے کی کوئی گاڑی واڑی بھی نہیں ملے گی:

احمد :- (اشتیاق سے) پھر! پھر کیا کیا تم دونوں نے؟

زیتون :- موٹا الیاس کہیں قریب ہی کھڑا کن انکھیوں سے ہمیں بار بار دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کا فقرہ سننا تھا کہ اپنی توند ہلاتا ہوا خراماں خراماں ہماری طرف چلا آیا۔ عاشقانہ انداز سے مسکرا کر کہا کیا ہے (نقل اتارتی ہے) "چمن میں ظالم گلچینوں کا ڈر لگا رہتا ہے حسین لڑکیوں کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے۔" جب ہم نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو ایک ادا کے ساتھ سر جھکا کر گانے لگا:

"نازنینو! غلام حاضر ہے"

احمد :- دل میں کہتا ہوگا ؎ گر بر سر چشم من نشینی ناز ت بکشم کہ نازنینی

زیتون :- نازنینو کے خطاب پر ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی، جی چاہتا تھا مزا چکھا دوں مگر وقت کی نزاکت کا خیال کر کے ضبط کیا اور تحکمانہ لہجہ میں کہا: "آپ اپنی توند لے کر فوراً واپس تشریف لے جائیے اور ہمیں ہمارے حالوں پر چھوڑ دیجئے۔"

احمد :- (قہقہہ لگا کر نوجوانوں کی طرح ہنس پڑتا ہے) ہا ہا ہا ——— تم تھیں بلا کی تیز و طرار۔ شوخی تمہارے قدم چومتی تھی۔

زیتون :- (ذرا افسردہ ہو جاتی ہے) ہاں! اس زمانے میں رگ و پے میں بجلی بھری ہوئی تھی ———

احمد :- اچھا! پھر کیا ہوا تھا ——— ؟

زیتون :- ہونا کیا۔ الیاس صاحب ہمیں قہر آلود نظروں سے گھورتے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے اپنی توند لیے مڑ گئے۔

احمد :- (ہنستا ہے) ہا ہا ہا ——— پھر؟

زیتون :- پھر تھوڑی ہی دیر بعد اناج کی بوریوں سے لدی لدائی ایک بیل گاڑی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم نے سوچا چلو اسی گاڑی میں اناج کی بوریوں پر سوار ہو کر شہر پہنچتے ہیں مگر گاڑی تھی اونچی اس پر چڑھنا آسان نہ تھا اس لیے ہم دونوں چھلانگوں پہ چھلانگیں لگا لگا کر اس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

احمد :- (ہنستا ہے) ہا ہا! بڑا مزا آیا ہوگا۔

زیتون :- خاک مزا آتا۔ چھلانگیں لگا لگا کر ہم تھک کر چور ہو گئیں تو میں نے عائشہ سے کہا۔ اے کاش! وہ پھیلے جیسا اسٹیشن ماسٹر یہاں آ کر کھڑا ہوتا اور ہم دونوں اس کے کندھے کو سیڑھی بنا کر بآسانی گاڑی پر پہنچ جاتیں۔

احمد :- (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) ارے واہ! بھئی خوب سوجھی تھیں۔ واقعی شوخی میں تمہارا جواب نہ تھا۔

(دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ڈھلی ہوئی شام ایک روشن صبح میں تبدیل ہو گئی ہے، عمر رفتہ واپس آ گئی ہے اور بوڑھے میاں بیوی کی بجائے ایک شوخ و شنگ نوجوان جوڑا ہنس بول رہا ہے)

زیتون :- (ہنس رہی ہے اور خوش ہے) موٹا الیاس بیری جھڑکی کھا کر کھسیانی بلی کی طرح دور کھڑا ہماری حرکات کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بات اس نے سن لی۔ بس پھر کیا تھا، چنگھاڑتا ہوا ہماری طرف آیا اور بولا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے نہایت غرور و خشکی سے جواب دیا: "دیکھ رہے ہو کہ کیا ہو رہا ہے؟ چھلانگیں لگا رہے ہیں اور کیا ہو رہا ہے؟" یہ کہہ کر میں نے ایک

اور چھلانگ لگا دی۔

احمد :- ماشاللہ! تم تھیں کافراوا.......

زیتون :- (فقرہ جاری رکھتے ہوئے) الیاس جل گیا۔ کہنے لگا میں ہرگز تم دونوں کو اس پہ چڑھنے نہ دوں گا۔ گستاخ لڑکیاں کہیں کی انہیں خراب ہو جائے گا۔ یہ سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ارے موٹو! عقل ماری گئی ہے۔ بھلا ہمارے بیٹھنے سے اناج کو نقصان پہنچ سکتا ہے؟ ہاں تم دور ہی رہنا۔ تم نے گاڑی کو ہاتھ بھی لگایا تو دونوں بیل کھلے جائیں گے۔

احمد :- (اشتیاق سے سن رہا ہے) اس وقت تک میں تم لوگوں کے درمیان پہنچا نہیں تھا۔

زیتون :- بس اس کے بعد تم پہنچ گئے تھے ——— اور کس شان سے! میری بات سن کر موٹا الیاس کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں کسی نے اچانک پیچھے پولیس کے سپاہی کی ایک زوردار سیٹی بجائی جسے سن کر وہ مارے خوف کے پیچھے ہٹ گیا عین وقت پر پولیس کے سپاہی کی آمد پر میں اور عائشہ پھولے نہ سماتی تھیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو ——— (زور سے ہنس پڑتی ہے)

احمد :- (شوخی سے ہنس کر) تو میں کھڑا تھا ——— ہیں نا؟

زیتون :- واقعی تم نے کمال کر دیا تھا۔ پولیس کے سپاہی کی سیٹی بجا کر دشمن کو بھگا دیا تھا۔

احمد :- (ہنس رہا ہے ہنسے جا رہا ہے) وہ سیٹی میں نے منہ میں انگلی دبا کر بجائی تھی.........اور دشمن ایسا بزدل تھا کہ پہلی ہی سیٹی پر بھاگ کھڑا ہوا.......

زیتون :- میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے تم کھڑے تھے ——— کتنے حسین تھے احمد تم! بلند و بالا قد آنکھوں میں شدید اظہاریت' ہونٹوں پر مسکراہٹ' خوش لباس و خوش ادا۔ ہائے ہائے ——— وہ ہماری پہلی ملاقات تھی احمد!

احمد :- یوں معلوم ہوتا تھا۔ تم پہلی ہی نظر میں مجھے دل دے بیٹھی ہو۔ ہا ہا ہا.........!

زیتون :- (ناز سے) خیر' یوں تو نہیں ہوا تھا ——— یہ بعد کا قصہ ہے۔

احمد :- بیشک' مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ میں پہلی ہی نظر میں تمھیں دل دے بیٹھا تھا زیتون! تم تھیں بھی تو آفتِ جاں! ستاروں کی طرح دمکتی ہوئی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' ہونٹوں پر وہ ساحرانہ مسکراہٹ کہ انسان بھسم ہو کر رہ جائے چال میں وہ متانیت کہ اچھا بھلا آدمی دیوانہ ہو کر رہ جائے.........!

زیتون :- ہاں! اس زمانے میں میں اپنے کالج کی سب سے زیادہ شوخ لڑکی سمجھی جاتی تھی۔

احمد :- اور میں بھی تو کالج ہی میں تھا ——— آخری سال میں تھا اور شاعری پہ ایک بسیط مقالہ لکھ رہا تھا میری زبان پہ ان دنوں غزل کا بڑا اثر تھا چنانچہ یاد ہے تمھیں دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے نکل گیا تھا ع وہ جانِ بہار آ ہی گیا۔

زیتون :- (ہنستی ہے) یاد ہے تم نے مجھے اور عائشہ کو کیا دھوکا دیا تھا ———؟ بڑے شریر تھے تم! ہم بچاری بھولی بھالی لڑکیاں تمھاری باتوں میں آ گئیں۔ عائشہ نے تم سے اتنا پوچھا تھا کہ یہاں کھانے کی کوئی چیز مل جائے گی؟

احمد :- (ہنستا ہے) اس پر میں نے کہا تھا جہاں انسان ہو گا وہاں اس کی خوراک بھی ہو گی۔ چلیے میرے ساتھ۔

زیتون :- تم نے اس دھڑلے سے یہ جملہ کہا تھا کہ ہم دونوں تمھیں کسی ہوٹل کا منیجر سمجھ بیٹھیں اور اسی دھوکے میں تمھارے ساتھ چل پڑیں۔

احمد :۔ (بڑے مزے سے باتیں کر رہا ہے کبھی ہنستا ہے کبھی پرانی یادوں سے متاثر ہو کر مغموم ہو جاتا ہے) پھر میں نے یہ چال چلی کہ فوراً ایک کرایے کی گاڑی منگوائی اور تم دونوں کو ساتھ لے کر "گل رنگ" جا پہنچا جہاں بعد میں ہم نے کئی دفعہ کئی رنگین شامیں گزاریں۔

زیتون :۔ (شگفتہ لہجے میں) وہاں پہنچ کر تم یوں ظاہر کرنے لگے جیسے تم "گل رنگ" کے مالک ہو۔ ہمارے لیے گرم گرم ناشتہ لے آئے۔ انڈے، پراٹھے، کافی.......

احمد :۔ کھا پی کر تم بل ادا کرنے لگیں ——

زیتون :۔ یاد ہے اس پر تم نے کیا شور مچایا تھا —— جونہی میں نے روپے تمہارے آگے رکھے تم ہوٹل کے کنجوس مکھی چوس منیجر کی طرح ایک ایک روپیہ زمین پر مار مار کر دیکھنے لگے پھر آنکھیں نکال کر مجھے ڈرایا اور بولے۔

احمد :۔ (قطع کلام کرتا ہے) یہ سب سکے جعلی ہیں۔ چلیے پولیس اسٹیشن۔

(دونوں زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں)

احمد :۔ (اب تک ہنس رہا ہے) تم کو بڑا غصہ آیا تھا۔ تم بے ضبط ہو کر عائشہ سے کہنے لگیں، کہیں سے ایک موٹا ڈنڈا ڈھونڈھ لاؤ تاکہ اس کنجوس منیجر کو مزا چکھا دوں۔

زیتون :۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے) تم اپنی شرارت سے کب باز آنے والے تھے۔ جھٹ سامنے کے ایک درخت سے ایک لکڑی توڑ لائے۔ بڑے ادب سے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر وہ لکڑی میرے سامنے پیش کی۔

احمد :۔ میری اس حرکت پر تم کو ہنسی آ گئی تھی اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔

زیتون :۔ ہاں تمہاری وہ شوخی مجھے بہت بھائی تھی۔ تم تھے بھی تو حرفوں کے بنے ہوئے!

احمد :۔ پھر کچھ دیر بعد تمہاری سہیلی عائشہ نے کہا تھا کہ اب ذرا پالکول کی سیر کو نکلنا چاہیے۔

زیتون :۔ گویا اس نے تمہارے دل کی بات کہی تھی۔

احمد :۔ ہاں! یہ سنتے ہی میں بھاگ کر ایک کرایے کی گاڑی لے آیا تھا۔ کچھ یاد ہے زیتون! اس موقع پر کیا ہوا تھا؟

زیتون :۔ نہیں تو ——

احمد :۔ یاد کرو۔ بڑا دلچسپ واقعہ تھا۔

زیتون :۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ تم ہی بتاؤ۔

احمد :۔ گاڑی میں اتفاقاً عائشہ میرے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ بات تم کو ناگوار گزر رہی تھی۔

زیتون :۔ کیوں؟ مجھے ناگوار کیوں گزرتی، واہ!

احمد :۔ تم نے اس کے بازو میں چپکے سے ایک چٹکی بھری تھی۔

زیتون :۔ اور یہ سب کچھ تم دیکھ رہے تھے؟

احمد :۔ کن انکھیوں سے۔ تم غصے سے گلابی ہو رہی تھیں اور.......

زیتون :- (ذرا بے چین) ارے چھوڑو - پچاس سال پہلے کے دکھڑے آج لے بیٹھے ہو -

احمد :- انسان کی محبت یا نفرت کو وقت کے کلہاڑے نہیں توڑ سکتے زیتون! تم میں رقابت کا جذبہ شدید تھا - تم بے جھاڑ کر عائشہ کے پیچھے پڑ گئی تھیں - تمھیں شبہ تھا کہ میری توجہ عائشہ کی طرف ہے -

زیتون :- (جیسے نصف صدی پرانا جذبہ زندہ ہو گیا ہو) سچ بتاؤ احمد ——— تمھیں عائشہ سے دلچسپی نہیں تھی؟

احمد :- محض اسی غلط فہمی کے باعث تمھیں ہمیشہ عائشہ بُری لگتی رہی -

زیتون :- (آہ بھرتی ہے) اور اب ...... وہ بچاری بیوہ ایک ہسپتال میں پڑی عمر کے آخری ایام پورے کر رہی ہے ——— میرا دل اس کی طرف سے آئینہ کی طرح صاف ہے -

احمد :- مگر جب تک وہ خوش اور تندرست رہی تم کبھی اس سے صاف دلی سے نہ مل سکیں -

زیتون :- (ذرا ناگواری کے لہجے میں) دراصل یہ تمہاری غلطی تھی - تم اس کے ذمہ دار ہو کہ میرے بار بار پوچھنے پر بھی تم نے اس بات کا کبھی اقرار نہ کیا کہ تمھارے دل میں عائشہ کے لیے محبت نہیں ہے -

(زیتون کی آواز بھرا جاتی ہے)

احمد :- محض اس لیے ——— کہ تمھیں اپنے لیے بے چین کرنے میں مجھے بڑا مزا آتا تھا زیتون!

زیتون :- بڑے ظالم تھے ——— خواہ مخواہ ہم دونوں کے دلوں میں رنجش ڈلوا دی - مجھے عائشہ سے جتنی محبت تھی اس سے کہیں زیادہ نفرت ہو گئی - کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا تھا احمد! کہ عائشہ کسی وبا میں مبتلا ہو کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائے -

احمد :- اور وہ گلابی رخساروں اور سیاہ بالوں والی لڑکی ——— تمھارے دلی جذبات سے بالکل ناواقف تھی اور مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی -

زیتون :- (اچانک سنجیدہ ہو جاتی ہے) تمھیں عائشہ کی گلابی رنگت اور سیاہ زلفیں اچھی لگتی تھیں نا؟

احمد :- تم اب تک بدگمان ہو زیتون!؟ ——— آج اس بیچاری کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ چکا ہوگا اور اس کے بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے ہوں گے -

(لمبی سانس لیتا ہے)

زیتون :- ہائے بچاری ——— جانے کیسی ہے!

احمد :- پچھلے دنوں کسی نے کہا تھا کہ وہ ایک خیراتی ہسپتال میں پڑی ہے -

زیتون :- (گھبرا جاتی ہے) خیراتی ہسپتال!؟

احمد :- ہاں ——— کیونکہ اس کا کوئی گھر نہیں -

زیتون :- لیکن اس کا ایک بیٹا تھا - بیٹے کے ہوتے ہوئے خیراتی ہسپتال میں کیوں پڑی ہے؟

احمد :- گھر پر سوتیلے بیٹے کی بدسلوکیوں سے تنگ آ گئی تھی -

زیتون :- اور بیٹے نے اسے گھر سے اٹھوا کر ہسپتال میں ڈلوا دیا! .... نہ جانے قصور کس کا ہے۔ سوتیلی ماں کا؟ کہ سوتیلے بیٹے کا؟

احمد :- وقت کا! سارا قصور وقت کا ہوتا ہے کہ وہ کیوں آدمی کو ناکارہ کر کے اتنی جلدی گزر جاتا ہے ——— (متاثر ہو جاتا ہے) شام کیسی گہری ہوتی جاتی ہے۔

زیتون :- ہاں! ابھی تو اندھیری رات سامنے ہے!

(تھوڑی دیر گہری خاموشی ——— ! پھر دور سے کوئی تنہا جھینگر اچانک اپنا سُر الاپنے لگتا ہے)

زیتون :- (دھیمے لہجے میں) احمد!

احمد :- ہاں زیتون!

زیتون :- شکر ہے ہمارا کوئی سوتیلا بیٹا نہیں۔

احمد :- ہاں! ورنہ آج یہ خوشی ہمیں نصیب نہ ہوتی۔

زیتون :- فرخ چاہے گا کہ اب ہم ہمیشہ اسی کے پاس رہیں۔ اس سے کبھی جدا نہ ہوں، میرا بھی دل یہی چاہتا ہے۔

احمد :- لیکن یہ میرے اصول کے خلاف ہے زیتون!

زیتون :- اپنے اصول اپنے ہی تک رکھنا احمد! فرخ کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو اسے بڑا صدمہ ہوگا۔

احمد :- میں جانتا ہوں بڑا حساس لڑکا ہے۔

زیتون :- وہ اب ہمیں اپنے سے جدا نہ ہونے دے گا۔ شاید ہماری آخری سانس تک!

احمد :- اور جب غریب کو تمہاری بیماری کا علم ہوگا .... تو تمہاری پٹی سے لگ جائے گا بچارا۔

زیتون :- احمد! مجھے بتاؤ ڈاکٹر نے میرے مرض کے متعلق کیا کہا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟

احمد :- مرض کچھ ہی ہو بیٹے کے پاس جا کر شفایاب ہو جاؤ گی زیتون!

زیتون :- (خوشی سے ہنستی ہے) تم ٹھیک کہتے ہو (یکلخت کراہنے لگتی ہے) ہوں ——— ہوں ——— ہوں ——— ہائے ———

احمد :- (خوف زدہ) کیا ہوا میری زیتون؟

زیتون :- ہائے پھر وہی برچھی پیٹھ میں چبھنے لگی ہے احمد۔ فرخ کیوں نہیں آیا اب تک؟

احمد :- کلرک کی تلاش بے سود ہے۔ فرخ کے آنے تک سامنے کی سرائے میں چل کر آرام کرو۔ بہت تھک گئی ہو۔

زیتون :- مگر جانے وہاں کا کرایہ کتنا ہوگا؟

احمد :- تم فکر نہ کرو۔ چل کر آرام کرو۔ لو اٹھو میری جان! میرا سہارا لو اور قدم آہستہ آہستہ آگے کو بڑھاؤ۔

(لمحہ بھر کو وقفہ ——— جس میں دونوں سرائے کی طرف رواں ہیں۔ وہاں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ زیتون بُری طرح ہانپ رہی ہے)

احمد :- لو اب آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔

زیتون :- کہیں آنکھ نہ لگ جائے میری ——

احمد :- کیا ہرج ہے؟ آرام کی ضرورت ہے تمھیں۔

زیتون :- اور اگر میرے سوتے میں فرخ آ گیا تو؟

احمد :- تو تمھیں جگا دوں گا۔

زیتون :- میں چاہتی تھی جب وہ آئے تو میں جاگ رہی ہوں —— (کراہتی ہے) ہائے! درد بڑھتا جاتا ہے۔

احمد :- سو رہو زیتون! آج تم بہت تھک گئیں۔

زیتون :- (درد کے دوران میں مسکراتی ہے) کوئی بات نہیں۔ فرخ آئے گا تو سارے درد بھول جاؤں گی۔ وہ گرم شال مجھ پر ڈال دو احمد!

احمد :- اب اس پرانی شال میں رکھا ہی کیا ہے۔

زیتون :- مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ سردی کی تکلیف سہ لوں گی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ فرخ کے بچے کو اس کی سالگرہ کے دن نیا جوڑا اپنے ہاتھ سے پہنا سکوں گی۔

(سو جاتی ہے۔ احمد آہستہ آہستہ اٹھتا اور سوئی ہوئی زیتون کے چہرے
کو محبت سے بغور دیکھتا اور آہ بھرتا ہے۔ جیب سے رومال نکال کر
امنڈ آنے والے آنسوؤں کو خشک کر لیتا ہے
اتنے میں دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے)

احمد :- کون؟

آواز :- دروازہ کھولیے۔

احمد :- (دروازہ کھول دیتا ہے) ارے فرخ بیٹے! آ گئے تم۔

فرخ :- آداب عرض ابا جان!

احمد :- (وفورِ محبت سے مسرور آواز) جیتے رہو میرے بیٹے جیتے رہو۔ بڑا انتظار کروایا تم نے۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے تمھاری ماں کی۔ کہاں رہ گئے تھے بیٹے؟

فرخ :- کچھ نہ پوچھیے ابا جان! ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا اور اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

احمد :- (پریشان) خیریت تو ہے؟ پہلے یہ بتاؤ ٹل گئی وہ مصیبت؟

فرخ :- (زور سے ہنستا ہے) میں نے وہ چال چلی کہ اسے ٹلنے کے سوا چارہ ہی نہ رہا۔

احمد :- (اب تک پریشان) کیا تھی وہ مصیبت؟

فرخ :- مہمان —— بوریا بستر لے کر آ گئے تھے۔

احمد :- مہمان ؟؟؟ ——— (وقفہ) مگر بیٹا! مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔

فرخ :- (ہنستا ہے) رحمت! مگر ابا جان! یہ بھی تو سوچئے نا آج کل کے نئی وضع کے گھر کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ ان میں فالتو کمرہ ایک بھی نہیں ہوتا کہ خدا کی اس رحمت کی نذر کیا جائے۔ جدید وضع کے گھروں میں ایک میاں بیوی اور ایک آدھ بچے کے لیے تو جگہ نکل آتی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی آجائے تو رحمت نہیں بلکہ زحمت اور مصیبت بن جاتا ہے۔

احمد :- ہاں ——— نئے معماروں کے دلوں میں جگہ ہوتی ہے نہ ان کے تعمیر کردہ گھروں میں ———

فرخ :- اور پھر ابا جان! ان مہمانوں کی توقعات بھی تو بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ کوئی مریض یہ امید لے کر آتا ہے کہ ہمارے ہاں ٹھہر کر آپریشن کرائے گا۔ کوئی بیماری سے اٹھنے کے بعد محض تفریحاً چلا آتا ہے کہ چلو تھوڑے دنوں کا آرام مل جائے گا۔ پہلے زمانے میں تو یہ ٹھیک تھا اور بہت ٹھیک تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں اس قسم کے دقیانوسی خیالات پریشانی کا موجب بن جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ٹھہرنے کے لیے بڑے بڑے آرام دہ ہوٹل ہیں اور مریضوں کے لیے بیسیوں نرسنگ ہوم اور ہسپتال موجود ہیں۔ نرسنگ ہوم کھلے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں جا کر انھیں پریشان کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ بتائیے ابا جان! میں کچھ غلط کہتا ہوں؟ اب دیکھیے وہ مہمان میاں بیوی پورے دو مہینوں کی نیت بنا کر آ دھمکے تھے۔ بہانہ یہ بنایا تھا کہ منّے کی سالگرہ میں شرکت کے لیے آرہے ہیں۔ بھلا بتائیے، ایک غسل خانہ ہے ..."

احمد :- (نہایت سنجیدہ) کون تھے یہ لوگ؟

فرخ :- (ذرا ہنستا ہے۔ لہجے میں خفیف سی ندامت پائی جاتی ہے) کیا بتاؤں، وہ تھے تو شائستہ کے والدین ہی۔ ـ پر کیا کیا جائے آج کل کے تنگ گھر ——— اس پر شائستہ کے ہاں بچہ بھی ہونے والا ہے۔

احمد :- (ششدر۔ کسی قدر وحشت زدہ) شائستہ کے ماں باپ! ——— یہ تو تم نے اچھا نہ کیا بیٹا! آخر وہ بہو کے ماں باپ تھے۔

فرخ :- مجھے خود احساس ہے ابا میاں! میں نے کوئی قابلِ تعریف کام نہیں کیا لیکن آج کل کے اخراجات بھی تو دیکھیے ان دنوں تو ایک کتے کی معقول پرورش بھی کم بخت ہو پا رہی نہیں۔ منّے کی سالگرہ بھی آرہی ہے۔ شائستہ کی آرزو تھی اس موقع پر منّے کے لیے ایک بچہ گاڑی لے لی جائے مگر کہاں سے لاؤں روپیہ؟ میری تنخواہ ہی کیا ہے۔

احمد :- (ٹھنڈی لمبی سانس) تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ ان دنوں سکونِ قلب کسی کو میسر نہیں مگر فرخ بیٹے! اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ زندگی کے بکھیڑے اور الجھنیں انسان کے ساتھ ہمیشہ یونہی لگی رہی ہیں۔ ہاں ان کی نوعیت بدل ضرور گئی ہے۔ پہلے زمانے کا آدمی ہل چلایا کرتا تھا۔ سوچتا کم تھا، جسمانی محنت زیادہ کرتا تھا اور خوش تھا۔ آج کا آدمی قلم ہاتھ میں لے کر میز پر بیٹھتا اور سوچتا زیادہ ہے، جسمانی محنت بالکل نہیں کرتا اور غم میں ڈوبا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج کے انسان میں زندگی کی الجھنوں کو سہنے کی طاقت گھٹتی جاتی ہے۔ ان مشینوں اور کلوں سے جہاں ہمیں کئی فوائد پہنچے ہیں، وہاں ہماری ذہنی تندرستی کا خاتمہ بھی ہو گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کے ہلانے سے جو دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی اب وہ ایک بوجھ بن کر تہ بہ تہ ہمارے ذہنوں پر مسلط ہو گئی ہے۔

فرخ :- آج کا آدمی زیادہ عقلمند اور زیادہ سوچ بچار کا عادی ہے ابا جان! اس کا مقابلہ آپ پرانے دنیا کے آدمی سے نہ کیجئے!

احمد :- مقابلہ تو میں کسی کا بھی کسی سے کرنے کا قائل نہیں بیٹے۔ میں تو سوچنے کا عادی ہوں۔ میں کہہ رہا تھا پہلے زمانے کا آدمی جسمانی محنت کی وجہ سے چوبند ضرور رہتا تھا، اسے مشینوں اور کلوں کی سہولتیں میسر نہ تھیں، اپنے ہاتھ پاؤں کی توانائی کا قائل تھا، مگر اس پر ذہنی اضمحلال اور محرومی کے احساس کے دورے کم پڑتے تھے۔ جانے کس طرح اس کا ذہن تروتازہ رہتا تھا اور وہ زندگی کی آندھیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا تھا۔ تمھیں یاد ہوگا، تمھارے بچپن کی بات ہے، میری آمدنی ہی کیا تھی؟ تم سے نصف بھی نہ تھی مگر میں نے تمھاری دو پھوپھیوں کی شادیاں کی تھیں، تمھارے دادا اور دادی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ تمھارے چھوٹے ماموں مفلوج و معذور تھے، ان کے لیے باقاعدہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ روپیہ پس انداز کرکے بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ جب ہمارے ہاں آتے تھے تو تمھاری والدہ باوجود خانہ داری کی الجھنوں کے کبھی اپنے بھائی کی تیمارداری سے دریغ نہ کرتی تھیں۔

فرخ :- ٹھیک ہے۔ وہ فراغت کے دن تھے نا ابا جان! —— اب تو ایسے مریضوں کے لیے سوائے ہسپتال کے اور کوئی جگہ نہیں۔

احمد :- (چونک پڑتا ہے) ہسپتال؟

(لمحہ بھر کو خاموشی)

فرخ :- خیر ابا جان! چھوڑیئے ان باتوں کو۔ امی کہاں ہیں؟ آپ نے کبھی ان کے متعلق لکھا تھا کہ وہ آج کل اچھی نہیں رہتیں۔ کیا ہوا انھیں؟

احمد :- (مغموم آواز) دو ہفتے ہوئے میں انھیں ایک ڈاکٹر کے لے گیا تھا، اس نے فیس کے تیس روپے لینے کے بعد ایک نہایت ناخوشگوار خبر سنائی۔

فرخ :- کیا بتایا؟

احمد :- اس کا خیال ہے تمھاری ماں کو سرطان ہو گیا ہے۔

فرخ :- (حیران) کینسر؟

احمد :- (وہی مغموم لہجہ) ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ چند ہی مہینوں کی مہمان ہیں۔ چند مہینے!

فرخ :- کیسی بُری خبر سنائی آپ نے! پھر تو انھیں فوراً ہسپتال میں داخل کرا دینا چاہیے۔

احمد :- (گھبرا کر) نہیں نہیں۔

فرخ :- اور کیا۔ بھلا گھر میں ان کی خاطر خواہ تیمارداری کیسے ہو سکتی ہے ابا جان؟

احمد :- (ضبط کرکے) ٹھیک ہے مگر بیٹے! اس کا ذکر اپنی ماں سے نہ کرنا۔

فرخ :- ڈاکٹر نے کتنا عرصہ بتایا ہے ابا جان؟

احمد :- مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میں تھرامبوسس کا مریض ہوں۔ میرا اسپ حیات بھی اب اتنا تیز ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مدت سے شاید پہلے ہی افقِ حیات کو پھلانگ جائے اور مجھے دنیا میں تمھاری ماں کے جانے کا غم دیکھنا نصیب نہ ہو۔

فرخ :- ایسے حالات میں آپ دونوں کو گھر سے نکلنا نہیں چاہیے تھا — میں حیران ہوں آپ کو گھر سے نکلنے کا خیال آیا ہی کیوں؟

احمد :- (ضبط کرکے) کیوں! — (تمھاری ماں کا خیال تھا — کہ زندگی کے آخری ایام تمھارے پاس گزار دیں۔

فرخ :- (ذرا سے تامل کے بعد فوراً) تو — تو میں پھر انھیں اپنے گھر لے چلتا ہوں۔

احمد :- نہیں بیٹے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمھارے پاس کوئی فالتو کمرہ نہ ہوگا۔

فرخ :- کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا —

احمد :- (مغموم) ہاں! کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔

فرخ :- نہیں نہیں۔ مجھے آپ لوگوں کو ساتھ لے جانے میں بھلا انکار تھوڑا ہی ہے؟ تنگ جگہ ہی ہے کچھ دنوں بسر کر لیں گے جیسے!

احمد :- شائستہ کے ہاں بال بچہ ہونے والا ہے۔ ایسی حالت میں اتنی رات تک تمھارا یوں باہر رہنا ٹھیک نہیں۔ تم ہمارا فکر نہ کرو، گھر لوٹو بیوی بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ سرائے بہت اچھی ہے۔ صبح تمھاری والدہ کو یہاں کے ہسپتال لے جاؤں گا۔ ہو سکے تو تم وہیں مل لینا۔

فرخ :- دفتر سے چھٹی ہوتے ہی وہیں پہنچوں گا۔ میں وہاں کے بڑے ڈاکٹر سے واقف ہوں اس لیے مجھے امید ہے کہ وہاں بہتر نگرانی ہو سکے گی۔

احمد :- میرا بھی یہی خیال ہے — (وقفہ) ہاں بیٹا! یاد آیا۔ تمھاری اماں نے منے کی سالگرہ کے جوڑے کے لیے یہ روپے بچا کر رکھے تھے۔ ہماری طرف سے منے کو خوب پیار کرنا اور دے دینا (جیب سے نکال کر روپے دیتا ہے)

فرخ :- (ذرا ہنستا ہے) ارے خواہ مخواہ —

احمد :- تمھاری ماں کی تمنا تھی کہ اپنے ہاتھ سے جوڑا سی کر منے کو پہنائیں مگر اب اس کا موقع نہیں رہا۔

فرخ :- امی جان جاگ گئی ہیں تو میں ان کا شکریہ ادا کر دوں اور مزاج پرسی بھی کر لوں۔

احمد :- (مصلحتاً نہیں چاہتا کہ ماں بیٹے کی ملاقات ہو) نہیں بیٹے! انھیں سونے دو۔ انھیں آرام کی بڑی ضرورت ہے۔ تم سدھارو رات ہو رہی ہے۔

فرخ :- کچھ دیر انتظار نہ کر لوں؟

احمد :- (بےچین) نہیں وہ جاگیں گی تو میں کہہ دوں گا کہ تم آئے تھے۔

فرخ :- جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اچھا ابا جان! کل ہسپتال میں ملاقات ہوگی۔ میں ٹیلی فون پر صبح صبح ڈاکٹر کو تاکید کر دوں گا — کہ وہ آپ لوگوں کا خاص خیال رکھیں۔ خدا حافظ!

احمد :- (بھرائی ہوئی آواز) خدا حافظ!

(فرخ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

[وقفہ — ہوائیں تیز و تند چلنی شروع ہو گئی ہیں اور درختوں سے سوکھے پتے
بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ زمین پر گر رہے ہیں۔
احمد چپ چاپ دریچے کے آگے کھڑا خوفناک رات کو بے حس آنکھوں سے دیکھ رہا ہے]

زیتون :- (نیند سے چونک پڑتی اور روہا کراہتی ہے) فرخ نہیں آیا ابھی؟
احمد :- (مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہے) نہیں ——!
زیتون :- بھیگ نہ جائے وہ -
احمد :- مگر بارش تو نہیں ہو رہی -
زیتون :- تو پھر یہ آواز کیسی ہے ٹپ ٹپ؟
احمد :- سوکھے پتے شاخوں سے گر رہے ہیں ٹپ ٹپ -
زیتون :- سوکھے پتے ؟ ——!
احمد :- ہوں!
زیتون :- تو پھر کل صبح جنگل کے سارے درخت ننگے اور ویران نظر آئیں گے -
احمد :- فکر نہ کرو - ان کی جگہ نئے پتے اور نئی کونپلیں نکل آئیں گی -
زیتون :- (فرطِ مسرت سے لرزاں آواز) ٹھیک کہتے ہو - کیا معلوم فرخ کے چمن میں بھی آج کوئی نئی کونپل پھوٹ نکلی ہو ——
احمد :- (غمگین) ہاں کیا معلوم —— مگر اس نئی کونپل کو جگہ دینے کے لیے سوکھے پتوں کو شاخ سے گر جانا چاہیے - باغ کا ہر نیا پتا سوکھے پتے کی جگہ لے لیتا ہے ——!

جلدی سے دریچے کی طرف جاتا اور اسے کھول کر باہر اندھیرے کو جھانک کر دیکھتا ہے - رات کالی اور ویران ہے اور خزاں کے پتوں

..... کی مسلسل بارش ہو رہی ہے -

ٹپ - ٹپ - ٹپ!

تہمت

کنہیا لال کپور

ہمارا خیال ہے آپ ہم سے غائبانہ طور پر ضرور متعارف ہوں گے۔ اگر نہیں ہیں تو پھر آپ اس شہر میں نہیں رہتے ہوں گے یا آپ کی واقفیت کا دائرہ ضرورت سے زیادہ محدود ہوگا۔ آخر ہم کوئی معمولی انسان نہیں۔ ہفتہ وار "تہمت" کے ایڈیٹر ہیں۔ ہم نے یہ اخبار کیوں نکالا، یہ مت پوچھئے نہایت دردناک داستان ہے۔ بی۔ اے میں چار بار فیل ہونے کے بعد جب ظالم سماج نے ہمیں چپڑاسی تک کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم نے ہفتہ وار "تہمت" کا ڈیکلیریشن داخل کر دیا۔ پچھلے تین سال سے یہ اخبار نکال رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بڑے آرام سے ہیں۔ اب سوچتے ہیں کہ شروع سے یہ دھندا اختیار کیا ہوتا تو اس وقت ایک ڈی لکس امریکن کار کے مالک ہوتے۔ خیر اب بھی گھوڑا گاڑی غنیمت ہے۔ انشاءاللہ کار اگلے سال خرید لی جائے گی۔

ہمارے اخبار میں صرف تہمتیں چھپتی ہیں۔ تہمت میں یہ خوبی ہے کہ کسی بھی شخص پر لگائی یا چپکائی جا سکتی ہے۔ آخر ذاتِ خدا کے علاوہ کون عیوب سے مبرا ہے؟ بڑے سے بڑے دیش بھگت کو بگلا بھگت ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ صاحب جنھوں نے یتیموں کو پالنے کے لیے یتیم خانہ کھول رکھا ہے، ان کے بارے میں لکھا جا سکتا ہے کہ موصوف خود یتیموں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔ امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم آئے دن کس لیے سنسنی خیز انکشافات کرتے رہتے ہیں لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم محض سنسنی کے لیے سنسنی پھیلاتے ہیں تو یقیناً آپ حق بجانب نہیں۔ اسی طرح اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد لوگوں کو بے نقاب کرنا ہے تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ ہم واعظ ہیں نہ ناصح۔ ہم تو فقط ایک کاروباری آدمی ہیں اور ہر ایک سمجھدار بیوپاری کی طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہمارا نصب العین ہے۔

ہم روپیہ کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجیے۔ اس بڑے شہر میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں، سینکڑوں اشخاص ایسے بھی ہیں جن کے اعصاب پر احساسِ جرم سوار ہے یعنی جنھیں ہر وقت پولیس یا خفیہ پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے اَن داتا ہیں کیونکہ ہم ان کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں۔ آپ شاید ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

چند مہینے ہوئے ہم نے جلی حروف میں ایک سُرخی چھاپی "شہر کے معزز ترین رئیس کی کارستانی۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جعلی رجسٹر" اس سرخی کے تحت ہم نے اپنے خاص نامہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا (یاد رہے کہ ہم خود ہی اپنے اخبار کے خاص نامہ نگار، مینجر اور چیف ایڈیٹر ہیں) ہاں تو ہم نے انکشاف کیا کہ ایک رئیس پچھلے پانچ سال سے محکمہ انکم ٹیکس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے حالانکہ

اس کی آمدنی دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے لیکن اس نے افسروں کو دھوکا دینے کے لیے جعلی رجسٹر بنا رکھے ہیں۔ اس سازش میں اس کی بیوی کے علاوہ اس کا بڑا لڑکا بھی شامل ہے۔ ممکن ہے اس کی بہو کا بھی ہاتھ ہو۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔"

جس دن یہ خبر چھپی خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک درجن دولت مند اخبار "تہمت" کے دفتر میں (کہ جو دفتر ہونے کے علاوہ ہمارا غسل خانہ بھی ہے) ہم سے ملاقات کرنے کے لیے آئے۔ لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے کو معزز ترین سمجھتا تھا۔ قریب قریب ہر ایک نے منت سماجت کے لہجے میں درخواست کی کہ ہم اس کا نام اور پتہ اخبار میں شائع نہ کریں نہیں تو غضب ہو جائے گا اور اس سے پیشتر کہ ہم اس خدمت کے لیے اس سے معاوضہ طلب کرتے اس نے بڑی شرافت سے ایک معقول رقم نذر کرتے ہوئے کہا کہ میری عزت آپ کے یعنی اخبار "تہمت" کے ہاتھ ہے۔

کوئی دو ہفتے کا ذکر ہے۔ ہماری اس سرخی نے قیامت برپا کر دی۔ "نوجوان بہو کو قتل کرنے کی خطرناک سازش" دو کالم کی اس چٹپٹی خبر میں ہم نے ایک فرضی سسر اور ساس کا ذکر کیا جو روپے کے لالچ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بہو کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم نے لکھا "محض اس لیے کہ وہ بدبخت جہیز میں موٹر کی بجائے سکوٹر لائی تھی۔ حریص ساس اور سسر اس کا قصہ تمام کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین تفاصیل کا انتظار کریں۔"

اس خبر کو پڑھ کر ایک سیٹھ صاحب ہانپتے کانپتے ہمارے دفتر میں تشریف لائے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہنے لگے "ایڈیٹر صاحب! خدا کے لیے اس قصے کی تفاصیل چھاپنے سے احتراز کیجیے۔ نہیں تو میری آبرو مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی بہو کو تنگ نہیں کروں گا۔ اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ جہیز میں موٹر کی بجائے سکوٹر لائی ہے تو میں سکوٹر پر ہی قناعت کر لوں گا۔"

ہم نے کہا "یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب اخبار "تہمت" اپنی زبان کھولتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے، آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں نا .... یعنی ...."

"جی ہاں! میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ فی الحال پانچ سو روپے کی حقیر رقم حاضر ہے۔ اگر یہ کافی نہیں تو کچھ اور "دلیس مبلغ پانچ سو اور بھجوا دیجیے۔ معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا۔"

آپ شاید یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے قارئین نے اس قصے کی مزید تفاصیل پڑھنے پر کیوں اصرار نہیں کیا تو صاحب اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اگلے شمارے میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ قصوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک کا عنوان تھا "چار سو بیس کی دلچسپ مثال پنسلین کی بجائے پانی کے ٹیکے" اور دوسرے کی سرخی تھی "افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا استعمال"۔ ظاہر ہے کہ جب قارئین کو بدن کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں پڑھنے کو ملیں تو وہ ساس اور بہو کے جھگڑے میں کیوں دلچسپی لیں گے۔ اپنے خاص الخاص نامہ نگار کی وساطت سے (یعنی اپنی ہی وساطت سے) ہم نے ایک ڈاکٹر کی خباثت کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے لکھا کہ وہ مریضوں کو پنسلین کی بجائے پانی کے ٹیکے لگاتا ہے۔ ہم نے مطالبہ کیا کہ معاملے کی فوری تحقیق کی جائے اور اس بدطینت ڈاکٹر کو فی الفور واقعی سزا دی جائے۔ موخر الذکر خبر میں ہم نے ایک یونانی حکیم کی قلعی کھولتے ہوئے بتایا کہ وہ افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا کہ جن پر اس نے شکر کا غلاف چڑھا رکھا ہے استعمال کراتا ہے۔

اب آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے ڈاکٹر اور حکیم معاملہ طے کرنے کے لیے بھاگم بھاگ ہمارے پاس پہنچے اور کس کس چیز کا واسطہ دے کر انھوں نے درخواست کی کہ ہم ان کے تجارتی رازوں کو فاش کرنے کی مزید کوشش نہ کریں۔ ہم نے انھیں کاروبار جاری رکھنے کی اس شرط پر اجازت دی کہ وہ "تہمت بھونچال فنڈ" میں تین تین سو روپے چندہ جمع کرائیں۔ "تہمت بھونچال فنڈ" ہماری جدت اور ایجاد ہے۔ یہ فنڈ اس بھونچال کے لیے جمع کیا جا رہا ہے جو کبھی آیا ہے نہ آئے گا۔

تو صاحب! یہ ہے ہمارا روپیہ کمانے کا طریقہ۔ آپ کی دعا سے ایسا دماغ پایا ہے کہ ہر روز نئی نئی سرخیاں سوجھتی رہتی ہیں۔ قارئین کو اس قسم کی سنسنی خیز خبریں پڑھنے کا ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ اگر ایک آدھ دن اخبار لیٹ ہو جائے تو کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔ آخر "تہمت" کے علاوہ کونسا اخبار ہے جو انھیں اس پایے کی سرخیاں دے سکتا ہے "ایک کم سن پروفیسر کا تیسرا معاشقہ" "بوڑھے خاوند کی نوجوان بیوی کا پُراسرار فرار" "خادمہ سے محبت کرنے کا شاخسانہ" وغیرہ وغیرہ۔

ہم جانتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لے رہا ہے کہ ہمارا ضمیر ہمیں یہ سب چھاپنے کی اجازت کس طرح دیتا ہے تو صاحب اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرحوم ضمیر کو خدا بخشے ہم کو مدتوں سمجھاتا رہا کہ میاں کیوں خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کرتے ہو لیکن ہم نے اس بھلے مانس کو صرف ایک مصرع سُنا کر خاموش کر دیا یعنی ع اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ ضمیر کی ضرورت سے زیادہ پروا کرتے ہیں۔ عموماً بزدل ہونے کے علاوہ تنگدست بھی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پر بزدلی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی اور ہم نے دین و دنیا میں سے موخر الذکر کا انتخاب کیا ہے اور صاحب ہمارا تو تجربہ ہے کہ آدمی ضمیر کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے مرنے کے بعد سنگِ لحد پر یہ شعر لکھ دیا جائے گا ؎

تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

اچھا صاحب نہ بہی سہی۔ کم از کم آپ یہ تو تسلیم کر ہی گئے کہ بہت اچھا شعر ہے اور اتنے اچھے شاعر کا ہے۔ ہماری مانیے تو لوگوں کو یہ شعر گنگنانے دیجیے اور خود آرام سے قبر میں لیٹیے۔

سکندر نامہ

عرف، قصہ بدایوں والے سکندر کا

سلمیٰ صدیقی

سکندر نام کے ایک بہت مشہور آدمی کا ذکر ہم تاریخ میں پڑھتے آئے ہیں۔ اس نے دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی کیا تھا لیکن قدرت نے اس کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا اور اس سے پہلے کہ وہ دنیا کو جیت سکتا موت نے اس پر فتح پالی۔

اس کی زندگی اور موت کی مختصر سی مدت کا بیان خاصا دلچسپ ہے۔

لیکن میں آج جس سکندر کا ذکر کر رہی ہوں۔ اس نے دنیا کو فتح کرنے کا خواب تو در کنار کبھی دنیا کو سمجھنے تک کا بھی خیال نہ کیا۔ پھر بھی اس کی معمولی سی اس زندگی کی داستان کسی طرح اس سکندر کی زندگی کی کہانی سے کم دلچسپ نہیں جس نے دنیا پر حکومت کرنے کی ٹھانی تھی۔

ہمارے ہیرو سکندر کا جنم اتر پردیش کے ایک ضلع بدایوں میں ہوا جہاں کے پیڑے کسی زمانے میں بہت مشہور تھے لیکن اب سکندر کی شہرت کے آگے پیڑوں کی شہرت ماند پڑ چکی ہے۔ سکندر کا پورا پورا حال جاننے کے بعد آپ کو بھی اندازہ ہوگا کہ نہ صرف بدایوں کے مشہور پیڑوں کی شہرت کو بلکہ دنیا کے بڑے سے بڑے احمق کی شہرت کو بھی سکندر نے ٹھیس پہنچائی ہے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی آپڑتا ہے کہ مانے ہوئے تاریخی بیوقوف کی شہرت کو صرف ٹھیس ہی نہیں گولی لگ جاتی ہے اور بڑے سے بڑا بیوقوف بھی سکندر کی عقلمندی کے سامنے بے بس اور ہکا بکا نظر آتا ہے۔ یوں بھی بے وقوفی اور ہکا بکا پن کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے گو سکندر اور بے وقوفی کا رشتہ چولی دامن کے رشتے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اس لیے کہ چولی اور دامن کپڑے کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور انھیں آسانی سے ناپا جا سکتا ہے لیکن چونکہ بیوقوفی کو ناپنے والا آج تک کوئی فیتہ دریافت نہیں ہو سکا اس لیے سکندر کی حماقتوں کو ہم بھی آسانی سے ناپ تول نہیں سکتے۔

سکندر وہ مخلوق ہیں جن پر پیدا کرنے والے کو اتنا فخر نہیں ہوگا جتنی حیرت ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ سکندر خود اپنی بے مثل صلاحیتوں سے قطعاً ناواقف ہیں اور ہر دم بے حد عقلمند ظاہر ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سکندر کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد کسی کو یقین ہی نہیں آسکتا کہ اس معمولی سے آدمی کے سسٹم میں حماقتوں کے ایسے ایسے کل پرزے چھپے ہوتے ہیں جو وقت آنے پر کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں۔ سکندر کی بے وقوفی کو سمجھنے کے لیے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ ان کی حماقت سستی، گھٹیا، معمولی یا آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی نہیں ہے۔ وہ ایک اس مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں جس پر دل لگا کے ریسرچ کی جائے ——— اور کبھی کبھی خود ریسرچ کرنے والا بھی سکندر کی شخصیت کے آگے سپر ڈال دے یعنی قلم رکھ دے اور عش عش کرنے لگے۔

سکندر کی عقلمندی کی داستان کا آغاز خود ان کی اس کوشش سے ہوتا ہے جو وہ خود کو ہر دم عقلمند جتانے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ خود کو ایک فرد نہیں ایک جماعت تصور کرتے ہیں اور کبھی "میں" نہیں بلکہ ہمیشہ "ہم" کہہ کر بات شروع کرتے ہیں۔ اس "ہم" کا تذکرہ ان گنت بار اس طرح کرتے ہیں کہ ہمیں شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس دنیا میں سکندر ہی سب کچھ ہیں اور "ہم" کچھ بھی نہیں ہیں۔

تقریباً تیئیس چوبیس سال گزرے ایک صبح سکندر ہمارے گھر میں نوکری کے ارادے سے داخل ہوئے تھے اور آج حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ خود ہم لوگ یعنی گھر والے بھی سکندر کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونے کا حق کھو بیٹھے ہیں۔ سکندر بادشاہ کا تو دنیا پہ حکومت کرنے کا خواب پورا نہ ہوا لیکن ایک گمنام سا بیوقوف سکندر آج ایک پورے گھرانے پہ حکومت کر رہا ہے اس لیے کہ اس نے خواب نہیں دیکھا تھا منصوبے نہیں بنائے تھے۔ بستیاں نہیں اجاڑی تھیں۔ قبریں نہیں بنائی تھیں بلکہ محض اپنی بیوقوفی کے بل بوتے پر دنیا کے بازار میں اپنی حماقتیں سجائی تھیں اور اسی لیے فاتح ناکامیاب اور احمق کامیاب ہو گیا۔

اس چوبیس سال کی مدت میں شاید ہی کوئی ایسا روکھا پھیکا دن گزرا ہو جب سکندر سے کوئی نہ کوئی حماقت بڑے پیمانے پر سرزد نہ ہوئی ہو ——— سکندر اور بیوقوفی ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو چکے ہیں کہ دونوں کو الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یوں فن اور فنکار کی اپنی الگ الگ کوئی حیثیت ہی نہیں۔ بڑے آرٹ کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں آرٹسٹ کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ سکندر کا آرٹ اس منزل پہ پہنچ چکا ہے اور کبھی کبھی ان کی احمقانہ حرکتوں سے دل اس قدر جلتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ان کے بڑے آرٹ میں ان کے خون جگر شامل ہونے کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ سیدھے سیدھے اس بڑے آرٹسٹ ہی کا خون کر دیا جائے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی ان کے آرٹ کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑ جاتی ہے یعنی اس وقت جب حالات اور مزاج سازگار نہ ہوں اور سکندر کا احمقانہ آرٹ بھی اپنے عروج پر ہو۔

سکندر جس دن ہمارے گھر ملازم ہوئے اس دن انھوں نے اپنی آمد کے سلسلے میں آتے ہی ایک خوبصورت چائے کے سیٹ کی پیالی توڑ ڈالی اور ٹوٹی ہوئی کرچیں اپنے کرتے کے دامن میں بٹور لائے اور سامنے کھڑے ہو کے بولے :

"یہ دیکھیے کیا ہوا ؟"

"کیا ہوا ؟" ہم لوگوں نے گھبرا کے دریافت کیا۔

"ہونا کیا ؟ آپ کے یہاں کے پانی کے نل نے یہ کر دیا ؟"

"پانی کے نل کا اس میں کیا قصور...... ؟" کسی نے کہا۔

"اور کس کا قصور ہے صاحب ؟ بھلا ہم کیا کرتے...... ہم پیالی دھو رہے تھے کہ نل اس سے ٹکرا گیا... نل بدلوا دیجیے"۔

غصہ تو ان پر بہت آیا۔ چونکہ وہ ان کی پہلی غلطی تھی پھر ان کے بیان کے مطابق قصور ان کا نہیں نل کا تھا اس لیے سب لوگ چپ ہو رہے۔

لیکن اس دن سے آج تک سکندر کی اس پانی کے نل سے دشمنی چلی آ رہی ہے جو کبھی پلیٹ توڑ دیتا ہے کبھی گلاس چکنا چور کر دیتا ہے، کبھی اس قدر سختی سے بند ہو جاتا ہے کہ اسے کھولنے میں سکندر کی انگلیاں ٹوٹنے لگتی ہیں اور کبھی اس طرح کھل جاتا ہے کہ بند کرنے میں سکندر کی کلائی مڑ جاتی ہے۔

سکندر کی زبان بڑی کڑوی ہے۔ اچھا بھلا آدمی ان کے دو میٹھے بول" سن لے تو زندگی بھر کے لیے ان کا دشمن ہو جائے۔

نئے نوکروں کے ساتھ ان کا یہ سلوک گھر والوں کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہا ہے اس لیے کہ سکندر خود کو اب ملازم نہیں بلکہ مالک سمجھنے لگے ہیں اور نوکر کو نوکر کا بھی نوکر سمجھتے ہیں۔ مشکل یہ آ پڑتی ہے کہ ان کے اس طور طریقے کی بنا پر کوئی نیا ملازم ہفتے دس دن سے زیادہ ٹھہرنے پہ آمادہ نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ سکندر نے کوئی ایسی ہی حرکت کی، ایک ملازم کو جو بڑا سیدھا سادا اور رنگ کا چھوکرا تھا، ڈانٹ پھٹکار کر گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑا محنتی نوکر تھا۔ اس کے جانے سے کام کاج میں بڑی رکاوٹ پڑ گئی۔ سکندر سے پوچھا گیا کہ۔

"بھئی تم نے آخر اس اچھے بھلے آدمی کو کیوں نکال باہر کیا۔ تم سے کام ہوتا نہیں۔ دوسروں کو ٹکنے نہیں دیتے ہو، آخر ہمارے گھر کا کام کیسے چلے گا؟"

سکندر نے حسبِ عادت گردن کو جھٹکا دیا اور بولے۔

"اس چھوکرے کو بلائیے اور پوچھئے۔ ہم نے اسے کہا ہی کیا تھا؟ پھر سوچ کے بولے "ہم نے تو اس سے بس یہ کہا تھا کہ بھئی تو ہماری پسند کا کام نہیں کرتا ہے۔ ہم تجھ کو بے حد کرکے "ناپرسند" (ناپسند) کرتے ہیں۔ پھر تیری یہ مجال کہ تو ہمارا مقابلہ کرتا ہے۔ بھلا کہاں تو کہاں ہم —— تو جرور کوئی نیچ جات کا آدمی ہے۔ ہم ٹھہرے جات برادری والے —— ہمیں تو تو کوئی کنجڑا، قصائی، اٹھائی گیرا سا نظر آوے ہے...... چل دور رہو ہماری نظر کے سامنے سے!"

سکندر اب تک حیران ہیں کہ ایسے پیارے پیارے میٹھے بول سن کر آخر وہ 'بیوقوف' چھوکرا بھاگ کیوں گیا.......

ایک بار ایک چھوٹے سے بچے کے لیے آیا کی تلاش تھی۔ کئی آیائیں آئی اور جاتی رہیں —— ایک عورت ذرا ٹھیک نظر آئی اس سے تنخواہ کی بات ٹھیک نہیں ہو پاتی تھی —— سکندر سے کہا گیا کہ الگ لے جا کر اس آیا سے تنخواہ کی بات چیت ٹھیک ٹھاک کر لیں بولے "کیا کہیں ہم اس سے؟"

کہا گیا، کہنا کہ تیس روپے دیے جائیں گے۔ دونوں وقت کا کھانا اور دونوں وقت کی چائے ملے گی۔ اترن ملے گی۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر پچاس روپے خشک ملیں گے۔"

سکندر سر کو جھٹکا دے کر آیا کو باورچی خانے میں لے گئے اور دو ہی تین منٹ میں مع آیا کے واپس آئے اور بولے۔

"یہ لیجئے صاحب سب ٹھیک کر دیا ہم نے........"

پھر آیا کی طرف دیکھ کے مخاطب ہوئے "ہم نے ان سے کہہ دیا ہے کہ دونوں وقت کی چائے ملے گی۔ دونوں وقت کا کھانا ملے گا، پھٹے پرانے کپڑے ملیں گے لیکن پچاس روپے بالکل "خوشک" ملیں گے۔"

سکندر آج تک کنوارے ہیں۔ شادی کا ارمان ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ہر دم، ہر گھڑی، ہر وقت وہ اپنی شادی کے خیال میں گم رہتے ہیں۔ چوبیس سال سے وہ اپنی شادی کی فکر میں مشغول ہیں۔ گھر میں، پڑوس میں، محلے میں یا سکندر کے وطن میں، کوئی بھی کنواری بیاہی، بڑھیا، جوان، خوبصورت، بدصورت عورت ایسی نہیں جس سے وہ شادی کے لیے آمادہ نہ ہو گئے ہوں۔ ان کی اس کمزوری سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا ہے خاص طور پر سکندر کے رشتہ داروں نے انھیں اس سلسلے میں ہمیشہ ستایا اور زیر بار کیا۔ ہزاروں بار ان سے شادی کے وعدے کیے گئے۔ کبھی خود لڑکی نے، کبھی لڑکی کے باپ نے، کبھی کسی دوست نے اور کبھی کسی بالکل اجنبی راہ چلتے مسافر نے —— !! مگر آج تک کسی نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ کسی نے شادی نہیں کرائی۔ کسی نے شادی کرانے کے لیے لی گئی رقم نہیں لوٹائی

کسی نے ایک بار پیسے لینے کے بعد دوبارہ صورت نہیں دکھائی لیکن سکندر کو کسی سے گلہ نہیں ہے۔ گلہ ہے تو اپنی قسمت سے، کہتے ہیں

"وہ بیچارے وہ لوگ کیا کریں۔ جب ہماری قسمت میں کھوٹ ہے تو کوئی کیا کرے!"

رشتے داروں کے سکندر کو لوٹنا بہت آسان ہے۔ کوئی ایک بار اس سے دور کی یا نزدیک کی رشتے داری جھوٹی یا سچی نکال دے سکندر کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ بٹوہ کھل جاتا ہے۔ بے حد شکرانہ نظروں سے ہر طرف دیکھتے ہیں۔ بچھ بچھ جاتے ہیں۔

ہم میں سے کوئی سمجھاتا ہے کہ "بھئی یہ سب لٹیرے ہیں۔ تمہیں لوٹنے کے لیے آ جاتے ہیں" تو سکندر الٹا ہم سے روٹھ جاتے ہیں کہ "صاحب! ہم تو رشتے داروں کو چھوڑیں گے نہیں ہم کماتے کس کے لیے ہیں؟"

اسی رشتے داری کے سبب سے سکندر خود کنگال رہتے ہیں۔ جو کچھ بھی جمع پونجی ان کے پاس ہوتی ہے وہ کوئی نہ کوئی ایرا غیرا رشتے دار کا لیبل لگا کے ان سے جھپٹ لے جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو سکندر خود بھی اپنے رشتے دار کو نہیں پہچان پاتے۔ لیکن یہاں کی مروت اور جذبہ رشتہ داری کے خلاف ہے کہ وہ رشتے کی چھان بین کریں ——— کہتے ہیں۔

"صاحب! ہمارا خیال تو یہی ہے کہ اس آدمی کو ہم نے کبھی اپنے خاندان میں نہیں دیکھا۔ نہ اس کا نام کبھی سنا..... لیکن آخر اس کو کیا پڑی ہے جو خواہ مخواہ ہمیں اپنا رشتے دار کہے گا۔ جرور اس میں کوئی بھید ہے" مطلب یہ ہوتا ہے کہ "جرور اس میں کوئی رشتے داری ہے! اور یہ اس بے غرض' رشتے دار کی جی جان سے خاطر کرتے ہیں۔ اس کو دودھ جلیبی کا ناشتہ کراتے ہیں۔ علی گڑھ کے بسکٹ اس کو تحفے میں دیتے ہیں۔ اس کو ریل کا کرایہ دیتے ہیں، ریل پہ سوار کراتے ہیں اور بس اس سب کے بدلے میں وہ چلتے وقت صرف ایک فقرہ کہہ دیتے ہیں —" وہ جرا ہمارا خیال رکھیے گا..... لڑکی شریف ہو..... کھڑکی دروازے کی جھانکنے والی نہ ہو۔ چٹوری نہ ہو......" رشتے دار بڑے زور و شور سے اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں ان کی شادی کرانے کی شرطیہ قسم کھاتا ہے۔ ریل چلی جاتی ہے سکندر واپس چلے آتے ہیں اور جانے کتنے اگلے ماہ گزر جاتے ہیں وہ رشتے دار پھر کبھی اپنے رشتے دار سے ملنے واپس نہیں آتا ——— لیکن سکندر کا ایمان 'رشتے' کی اہمیت میں اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔

سکندر کو شور شغب، میلے ٹھیلے اور چہل پہل سے بہت دلچسپی ہے۔ تہواروں کا انتظار بڑی بے چینی سے کرتے ہیں۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید اور بڑے دن سب کا انھیں انتظار رہتا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ان تہواروں پر وہ بازار کی دھوم دھام دیکھ سکیں گے۔ تہوار کی اہمیت ان کے نزدیک اتنی ہی ہے کہ اس میں آدمی اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں۔ ناچتے گاتے اور گھومتے پھرتے ہیں۔ ناچ گانے سے سکندر کو حد سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس میں بندر اور ریچھ کے ناچ سے لے کر عورت مرد اور رنڈیوں تک کا ناچ شامل ہے۔ جہاں کہیں کسی ناچنے گانے والی کا پتہ چلے گا سکندر سب کام کاج چھوڑ وہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے خیال میں بازار میں ناچنے گانے والیوں کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ وہ کسی قیمت پر کسی ناچنے یا گانے والی کو گھٹیا یا معمولی ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ کوئی مانے نہ مانے سکندر کو بازاری عورتوں کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی ہے۔ وہ ان عورتوں کا ذکر اس قدر عزت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں جیسے اپنے گھرانے کی بے حد قابلِ عزت اور پارسا عورتوں کا تذکرہ کر رہے ہوں۔ کوئی لاکھ سمجھائے سکندر کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ ان عورتوں کو سماج میں نیچ سمجھا جاتا ہے۔ وہ حیران ہو کے آنکھیں پھاڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ———

"ہم کیسے مان لیں صاحب! اکہ چھپی بائی، گوری جان اور لچھی بائی بری عورتیں ہیں...... ان کے پاس کیا کچھ نہیں ہے.....؟ پھر یہ بھی تو دیکھیے

کہ بچاری، کس طرح آنے جانے والوں کا دل بہلاتی ہیں۔ خاطر مدارات کرتی ہیں، گانا سناتی ہیں۔ ناچ دکھاتی ہیں، پان کھلاتی ہیں اور کتنا خیال کرتی ہیں۔"

مزے کی بات یہ ہے کہ سکندر اس طرح کی تفریح گاہوں میں کسی بری نیت یا برے ارادے سے نہیں بلکہ صرف "آرٹ برائے آرٹ" کی خاطر جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہر چیز پر سیدھی سیدھی سادہ سی اوپری اوپری پڑتی ہے۔ کسی بھی شے کو وہ گہرائی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چونکہ سماج سے لے کر انسان تک دنیا کی ہر شے کی اوپری سطح بہتر اور رنگین نظر آتی ہے۔ اس لیے سکندر کو ہر چیز بہت اچھی اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ نہ وہ سماج کی دکھتی ہوئی رگ چھوتے ہیں۔ نہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کا چھپا ہوا زخم دیکھتے ہیں۔ اس لیے اپنے دل پہ بھی کسی طرح کا بوجھ نہیں رکھتے ہیں۔ شہر کی ہر مشہور اور غیر مشہور طوائف کے آستانے پر وہ اس طرح پابندی سے جاتے ہیں جیسے کوئی مقدس فریضہ ادا کر رہے ہوں۔ وہ عورتیں بھی سکندر کا سواگت اس طرح کرتی ہیں جیسے اپنے کسی باپ بھائی بیٹے یا تیمار دار کا انتظار کر رہی ہوں۔ سکندر ان کا گاہک نہیں، ان کا ایجنٹ نہیں، ان کا پتیا نہیں، ان کا خریدار نہیں، پھر ڈر کاہے کا!! اور جہاں بڑے بڑے دولتمند اور رئیس جاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں وہاں غریب اور مفلس سکندر دھڑلے سے چلا جاتا ہے۔ امیر لوگ تو وہاں جاتے ہیں، اپنا غم ہلکا کرنے، اپنی جیب ہلکی کرنے، سکندر وہاں جاتے ہیں ان عورتوں کا دکھ سننے ان کا غم ہلکا کرنے ——!!

سکندر اس بازار میں صرف گانا سننے ہی تھوڑی جاتے ہیں، وہ تو ان عورتوں سے گھریلو باتیں کرتے ہیں۔ اپنے رشتے داروں کی باتیں کرتے ہیں، اپنے دوستوں کی باتیں کرتے ہیں، مہنگائی کی بات کرتے ہیں، تیوہاروں کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سیاست کی باتیں کرتے ہیں، گانا تو وہ عورتیں خود ہی کبھی کبھار عادتاً سنا دیتی ہیں تو سکندر سن لیتے ہیں ورنہ وہ تو محض ان کے دکھ سکھ کی باتیں سننے گئے تھے، کسی بری نیت سے تھوڑی گئے تھے۔ ایک بار رکشا بندھن کے تیوہار کے موقع پر سکندر صبح سے خلافِ عادت کام کاج بہت تندہی سے کر رہے تھے۔ گھر والے حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ——

"آپ کو نہیں معلوم آج راکھی کا تیوہار ہے —— ہمیں جرا جانا ہے...... ہماری دعوت ہے آج......"

پوچھا گیا "کہاں جانا ہے تمھیں، کہاں دعوت ہے؟"

بہت فخر سے مسکرائے اور بولے ——

"وہ آج جرا مچھی بائی (طوائف) کے ہاں جانا ہے —— راکھی بندھوانے ——"

سکندر ایک دن کمرے کی صفائی کر رہے تھے۔ جھاڑن سے میز کرسیاں پونچھتے پونچھتے ان کی نظر دیوار پر لگے ہوئے ایک کیلنڈر پر پڑ گئی۔ وہ ایک بڑا خوبصورت رنگ برنگا کیلنڈر تھا۔ کسی دریا کے کنارے گھنے گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں پانچ چھ خوبصورت خوبصورت بجی سجائی عورتیں ناچ کا پوز دے رہی تھیں۔ سکندر چپ چاپ اس منظر کی دلکشی میں کھو گئے۔ پھر میری طرف دیکھ کے بولے۔

"دیکھیے ڈینس (ڈانس) ہو رہا ہے۔"

"ہاں!" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک کیلنڈر کو غور سے دیکھتے رہے پھر بولے "میرے خیال میں تو یہ سب بھولیاں (شریف زادیاں) ہیں ——" پھر اس کی وضاحت بڑے احترام سے کرتے ہوئے بولے "طوائفیں ہیں شاید۔"

ایک بار سکندر میرے ساتھ دہلی آ رہے تھے وہ سامان لے کے پہلے ہی سے اسٹیشن جا چکے تھے۔ جب میں اسٹیشن پہنچی تو ٹرین آنے ہی

والی تھی۔ سب نے اِدھر اُدھر سکندر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے سے وہ قلیوں کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی میری طرف بڑھنے لگے۔ جب دس بارہ قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو اچانک ٹھٹھک کے رُک گئے اور برابر میں کھڑی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہوئے ——

"ارے لیلا بائی تم کہاں؟"

میں نے ان خاتون کا جائزہ لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک بڑی لمبی چوڑی بے جھجک جھگڑالو سی عورت نظر آتی تھیں۔ میلی سی پیلی دھوتی پہنے ہوئے تھی اور ایک بیڑی کو اپنے پنجے میں دبوچے ہوئے منہ سے دھواں نکال رہی تھی اتنے میں ٹرین آ گئی تھی۔ جلدی جلدی سامان وغیرہ رکھا گیا اور گاڑی چلی تو میں نے ذرا سخت لہجے میں سکندر سے کہا۔

"یہ کون بیہودہ سی عورت تھی؟"

سکندر نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کے کہا: "ارے! ...... توبہ کیجئے بی بی .... وہ بیہودہ سی عورت کیوں ہونے لگی۔ وہ تو مدار گیٹ (علی گڑھ کا مشہور طوائفوں کا محلہ) کی لیلا بائی تھیں ...... ابھی ابھی چھ مہینے کی جیل کاٹ کے آ رہی ہیں۔"

سکندر کے لہجے میں ایسی عزت تھی مدار گیٹ کی لیلا بائی کی جیسے وہ کوئی بڑی ہی شریف اور باعزت سوشل ورکر تھیں اور قومی خدمات کے سلسلے میں جیل کاٹ کے آ رہی تھیں۔

کبھی کبھار سکندر فلم دیکھنے بھی چلے جاتے ہیں لیکن فلم دیکھنے کا شوق ان کو ذرا کم ہے۔ جب کسی تصویر کی بہت تعریف سنتے ہیں تو جاتے ہیں لیکن جب فلم دیکھ کے آتے ہیں تو دو دن تک اسی فلم کے ماحول اور ڈائیلاگ میں کھوئے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اسی طرح کوئی فلم دیکھ آئے اور صبح سے خلافِ معمول چپ سے تھے۔ ہاں آتے جاتے جھاڑو دیتے دیتے، برتن دھوتے دھوتے کبھی کبھی ہاتھ روک منہ ہی منہ میں کچھ بُدبُداتے کبھی مسکراتے، کبھی افسوس سے سر ہلاتے، کبھی خلا میں اس طرح ہاتھ کو نچاتے گویا جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمے داری ان پر کسی طرح عاید نہیں ہوتی اور جیسے خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہوں ——

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو

جہاں تیرا ہے یا میرا؟

جب سکندر پر یہ کیفیت طاری ہو جائے تو سوچ لینا چاہیے کہ دورہ شدید ہے اور جب تک مریض کا پورا حال نہیں پوچھا جائے گا افاقہ ممکن نہ ہوگا۔ جب سکندر چائے کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں آئے اور بڑے میز پر رکھ کے ایک طرف کھڑے ہو گئے تو میں سمجھ گئی کہ اب کچھ وقت ان کی نذر کرنا ہی پڑے گا ..... میں نے پوچھ ہی لیا۔

"رات کون سی فلم دیکھی؟"

سکندر کھل گئے۔ آگے بڑھ کے اور بڑے گمبھیر لہجے میں بولے۔

"مُرغِ اعظم (مغلِ اعظم) دیکھ آئے ہم۔"

"کیسی لگی تمھیں فلم؟"

"ارے بی بی ..... کیا بتائیں ہم —— عجب فلم تھی ..... وہ جو کسی نے کہا ہے کہ قسمت کا لکھا پورا ہونا ہے تو بچاری انارکلی کا مقدر کا

کھا پورا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"بھئی! یہ انارکلی کون تھی؟" میں نے قصّے کو طول دیتے ہوئے کہا۔

اب سکندر موڈ میں آ چکے تھے۔ آرام سے نیچے قالین پر بیٹھ گئے اور بولے "ارے بی بی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو انارکلی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں اور لوگ باگ تو کہیں ہیں کتابوں میں اس کا قصّہ لکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بھئی! میں ذرا کتاب کم ہی پڑھتی ہوں۔ تم تو بتاؤ یہ قصّہ کیا ہے آخر؟"

"قصّہ صاف ہے۔ مرغ اعظم کے دربار میں ایک باندی تھی۔ مرغ اعظم کی دیکھا دیکھی لوگ باگ اس کو انارکلی کہنے لگے۔ ایک دن وہ سارے عالم (صاحب عالم) کے سامنے پہنچ گئی اور رون سے (اُن سے) محبت کرنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرغ اعظم کے ڈر سے کوئی ڈاکیہ تو اس کا خط، سارے عالم کے پاس پہنچانے پر راضی نہ ہوا ہوگا تو انارکلی اپنا خط لکھ کے ایک پھول میں بند کرکے دربار میں ڈال کے بیٹھ رہی اور گانے لگی کہ ——

'نہ دیکھا نہ بھالا۔ تیری جھوٹی کہانی پہ ہم بہت روئے'

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ سارے عالم کی نظر پڑ گئی پھول پہ اور رونھوں نے (انھوں نے) پھول جو اٹھایا تو اس میں سے نکلا خط، بس پھر کیا تھا سارے عالم اپنے باپ مرغ اعظم کے خلاف ہو گئے۔ اُدھر مرغ اعظم بھی ٹھہرے ایک ہی ضدی آدمی، بس باپ بیٹے کی ٹھن گئی ۔ ۔ ۔ ۔ باپ آپ کو چیخے چلّائے 'بیٹا آپ کو' چیخے بیٹے۔ اُدھر انارکلی اور اس کی ماں نے شور مچا دیا۔ شور غل سے مرغ اعظم کو اور بھی ضد پڑ گئی اور انھوں نے حکم دے دیا کہ انارکلی کو جندی چنوا دیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟" میں نے ذرا حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ارے ہونا کیا صاحب! سارے ناش بین رونے لگے کہ بادشاہوں کے چکر میں بچاری لونڈیا کی جان مفت میں چلی گئی۔ اچھی بھلی شکل صورت کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں دربار میں جا کے سارے عالم کی جان کو آ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کمبخت تو یوں ہی ٹھہری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھلا پوچھو تو سہی تجھے کس نے کہا تھا کہ اپنی جات برادری کو چھوڑ کے دربار میں گھس جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے اپنی جات میں دیکھتی کسی برابر والے کو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی بیاہ بھی ہو جاتا اور جان بھی بچ جاتی مگر وہ جو کہا ہے کسی نے کہ 'عورت جات' تو وہی کرے ہے جو اس کا جی چاہے ہے"!

"پھر؟" میں نے پوچھا" تو پھر کیا انارکلی کو جندی چنوا دیا مرغ اعظم نے؟"

سکندر رو رگذر کے انداز میں بولے۔

"ہم تو یہی سمجھے تھے صاحب کہ انارکلی اب نظر نہ آئے گی۔ وہ تو گئی کام سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر شاباش ہے مرغ اعظم کو دربار میں موت کا حکم دیا اور پھر جو ہم نے دیکھا تو کھڑے ہیں سرنگ میں ادھر انارکلی الگ کھڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم تو جانیں جان بخشی کر دی اس کی ۔ ۔ ۔ بس اتنا جرور اس سے مرغ اعظم نے کہا کہ "لڑکی جا ہم نے تیری جان بخشی کر دی۔ اب تو یہاں سے نکل جا اور پہنچ جا سیدھی کسی مغل سرائے (محل سرا) کو!"

انارکلی کے پورے قصّے میں سکندر کو یہی اعتراض تھا کہ اس بے وقوف چھوکری نے سخت حماقت یہی کی تھی کہ بادشاہ کے بیٹے سے عشق کر بیٹھی۔ سیدھے سیدھے اپنی جات برادری والے میں کسی آدمی کا ہات پکڑ لیتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس جات برادری کا تذکرہ کرتے ہوئے

سکندر کا لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ خود انارکلی کی جات برادری کے سب سے معزز فرد ہوں!!

دلیپ کمار کی اداکاری کے اب بہت قائل ہو گئے ہیں۔ پہلے نہیں تھے اور جب سے مغلِ اعظم میں اس نے انارکلی سے عشق کیا تھا خاصے اس سے ناراض رہنے لگے تھے لیکن ایک دن پکچر ہاؤس سے لوٹے تو بہت ہی خوش تھے اور دلیپ کمار کا تذکرہ اس طرح کر رہے تھے گویا اپنی جات برادری کی عورت سے عشق کرنے کا جرم انہوں نے معاف کر دیا ہو۔ بولے۔

"صاحب! کیا ایکٹنگ کی ہے دلیپ کمار نے اس فلم میں؟"

"کس فلم میں؟"

"ارے اسی کوہن صور (کوہِ نور) میں، کیا فلم بنا ہے کہ دس بار دیکھو اور جی نہ بھرے......" پھر گانے تو ایسے گستے ہیں کہ پیسے وصول ہو گئے۔ ایک مشہور شہیر (شعر) تو ایسا گایا ہے وِلس نے کہ جو سُنتا ہے' واہ واہ کرتا ہے۔ جنگل میں رات کے بخت (وقت) گاتا ہے کہ آج کی رات چاند اور ستاروں کا ملن ہوگا اور مسکراتا رہے گا جمین (زمین) پہ آسمان آج کی رات۔ دوسرے موکے (موقعے) پر گاتا ہے ؎

لوگ باگ پیار کی یہ دیکھیں جادوگری

سبز پری کو اٹھا لایا گلبھام......"

سکندر شاعری کے سلسلے میں کسی ردیف قافیے' وزن یا بحر کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے دل کو جو الفاظ شعر میں بھا جاتے ہیں۔ ان کو اُلٹ پلٹ کے کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت اور سوجھ بوجھ کے مطابق ترتیب دے لیتے ہیں اور اکثر اوقات اپنی کسی نہایت بے معنی اور احمقانہ بات کے ثبوت میں بطور مثال شعر پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک دن باورچی خانے میں بیٹھے دوسرے نوکروں سے کچھ امیری غریبی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بولے ـــ

"بھائی! بات کے (یہ) ہے کہ امیر امیر ہے' گریب گریب ہے' دونوں کو میں (قومیں) ایکدم الگ الگ ہیں۔ امیروں کا کیا ہے سیر تپریح (سیر تفریح) میں بخت (وقت) گزار دیتے ہیں۔ رہے گریب تو ان کی بھی گجر ہو ہی جاتی ہے۔ وہ جو کہا ہے کسی ساحر (شاعر) نے کہ ؎

'جب وقت تنہائی ہوتی ہے۔ ہم اس طرح گزارا کرتے ہیں'

جانے کس بھلے آدمی کے شعر کے گلے پر چھُری پھیر کے وہ اطمینان سے حُقّہ گڑگڑاتے ہوئے باورچی خانے سے نکل گئے۔

ایک دن گرمیوں کی رات میں گرمی اور مچھروں سے عاجز سکندر کو نیند نہیں آ رہی تھی صحن کے ایک گوشے میں اپنی کھاٹ پہ کبھی اٹھ بیٹھتے' کبھی بیٹھ رہے تھے۔ میرا ادھر سے گزر ہوا اور میں نے پوچھا ـــ

"کیا بات ہے سکندر۔ سوتے کیوں نہیں ہو؟"

بولے "کیا بتائیں بی بی...... گے مچھر سونے ہی نہیں دیتے ہیں۔ گرمی سے نیند الگ نہیں آ رہی ہے۔ وہی مجمون (مضمون) ہو گیا ہے جو کسی ساحر (شاعر) نے کہا ہے کہ ؎

کجا (قضا) کا تو دن ہم نے مکرر (مقرر) کر دیا ہے

پھر تجھے نیند کیوں نہیں آوے ہے؟

گزرا کے کی سردی کے دنوں میں کوئی فلم دیکھ کے آئے تو بہت ہی متاثر معلوم ہوتے تھے۔ بولے "صاحب! یہ فلم کے ایکٹرا ایکٹریاں

بھی جانے کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے .... دانت سے دانت بج رہا ہے اور اوپر سے فلم میں مینہ پہ مینہ پڑتا جاوے ہے اور دونوں گا رہے تھے مجے مجے (مزے مزے) سے کہ

جندگانی بھر نہ بھولے گی یہ برسات کی رات
کہ ہو گئی ایک حسینہ سے اچانک ملاقات

کاش خدانخواستہ وہ تو کہو خدا کو ان کی جندگانی بھر رہتی اور رجو ہو جاتا المونیا (نمونیہ) تو کیا ہوتا۔"

گیتا بالی کی کوئی فلم ایسی نہیں ہے جو سکندر نے نہ دیکھی ہو۔ پوری ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اگر کسی ایکٹرس کے قائل ہیں تو صرف گیتا بالی کے۔ سکندر نے گیتا بالی کو سب سے پہلے فلم 'سہاگ رات' میں دیکھا تھا اور اسی وقت سے اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"بھئی آخر ایسی کیا بات گیتا بالی میں ہے جو دوسری ایکٹرسوں میں نہیں ہے؟"

بولے "آپ سمجھتیں نہیں۔ اُن میں (گیتا بالی میں) کیا کیا کھوبیاں (خوبیاں) ہیں۔ ارے صاحب! ایسی اچھی عادت کی ہیں وہ کہ کیا کہیں ہم۔ بڑی سیدھی سادی طبیعت ہے ان کی شان اور غرور تو ان میں نام کو نہیں۔ ہم تو صاحب بس "سہاگ رات" دیکھتے رہے اور واہ واہ کرتے رہے۔ بھکارنی کی طرح رہتی ہیں۔ بچاری کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں، کھانے کو روٹی نہیں، رہنے کو گھر نہیں پر کیا مجال جو شکایت کا حرف منہ پہ لائیں۔ بڑی گریبی طبیعت کی ہیں۔ جیسا روکھا پھیکا کھانے کو دے دیا خوشی خوشی کھا لیا جیسا موٹا جھوٹا پہننے کو دے دیا پہن لیا۔ بس صاحب ہم تو اس بات کے قائل ہو گئے ہیں۔ دوسری ایکٹرسوں کی بات الگ ہے۔ بڑی دماگ دار (دماغ دار) ہوئی ہیں وہ ـــ کیا ہم نے دیکھی نہیں ہیں۔ ان کی فلمیں، ہر بات پہ جھگڑا، ہر چیز پہ نخرہ!"

غرضیکہ گیتا بالی کو ایک فلم میں سادہ مزاج بھکارن کے روپ میں دیکھ کے سکندر نے دل ہی دل میں بڑے بڑے ہوائی قلعے تعمیر کر لیے اور ہر دم اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اس غریب بھکارن کے کام آ سکیں۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ انھی دنوں سکندر کے دانت میں درد شروع ہو گیا اور ایک دن جب کہ وہ کسی ڈاکٹر کی تلاش میں تھے، کسی نے ان کو بتایا کہ گول مارکٹ میں ایک ڈنٹسٹ ہیں 'ڈاکٹر بالی'۔ ان سے ملیں اور علاج کرائیں۔ سکندر ڈاکٹر بالی کا نام سُن کر کھل اٹھے اور انھوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ ڈاکٹر صاحب گیتا بالی کے والد بزرگوار ہیں اور غربت سے تنگ آ کے ڈاکٹر بن بیٹھے ہیں اور ان کے ذریعہ سے دانت کے درد کا نہیں تو کم از کم دل کے درد کا تو علاج ہو ہی سکے گا چنانچہ سیدھے سیدھے وہ ڈاکٹر بالی کے مطب میں گھس گئے۔ ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟ دانت میں کیا تکلیف ہے آپ کے؟"

سکندر نے ان سے کہا "اطمینان رکھیے دانت کا علاج ہم آپ ہی سے کرائیں گے لیکن پہلے یہ بتائیے ... کہ وہ کہاں ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب بولے "وہ کون؟"

بولے "آپ کی صاحب جادی (صاحبزادی)؟"

ڈاکٹر صاحب نے غصیلی نگاہوں سے دیکھ کے گرج کے پوچھا "ہوش ٹھکانے ہیں مسٹر آپ کے۔ میری صاحبزادی کا نام لیا آپ نے تو گولی مار دوں گا آپ کو۔"

سکندر بولے "واہ صاحب واہ! ہم نے جرا پوچھ لیا ان کو تو آپ یوں چیخنے لگے اور سارے شہر میں لوگ باگ ان کے چرچے

کرتے ہیں تو آپ سب کو گولی ماردیں گے؟"

ڈاکٹر صاحب اس بات پہ چکرائے اور سمجھ گئے کہ خرابی سکندر کے دانت میں نہیں دماغ میں ہے۔ پھر بھی معقول کے آدمی تھے۔ بات کی تہ تک پہنچنے میں دیر لگی۔

آخر کار سکندر نے خود ہی بات صاف کی اور پوچھ ہی بیٹھے۔

"تو کیا گیتا بالی آپ کی صاحب جادی نہیں ہیں؟"

اب ڈاکٹر صاحب کی جان میں جان آئی۔ پھر بھی وہ سکندر کی جان بخشی پہ رضامند نہ ہوئے اور سکندر کے دانت پہ اپنی نظریں لگائے ہوئے تھے۔ آس پاس کے لوگوں نے سکندر اور ڈاکٹر صاحب کا جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا تو صلح صفائی کرانے لگے اور بڑی مشکلوں سے پانچ روپے اور ایک دانت کا نذرانہ لے کر ڈاکٹر صاحب نے سکندر کا پیچھا چھوڑا —— اس دن سے گیتا بالی کا نام سنتے ہی سکندر کو دانت کا درد لاحق ہو جاتا ہے اور اس طرح ہمیں بھی گیتا بالی کی گریب طبیعت اور خوبی کے قصے سننے سے نجات مل گئی ہے۔

سکندر کو ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ ان کی صحت خراب رہتی ہے اور اس لیے وہ عام طور سے ڈاکٹروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جان پہچان کے ڈاکٹروں کی وجہ سے انھیں میڈیکل ایڈ کی طرف سے بڑا اطمینان رہتا تھا۔ جب وہ دہلی آتے تو اپنے اُلٹے سیدھے بستر کے ساتھ ساتھ اپنے امراض کی پوٹلی بھی اٹھا لاتے۔ دہلی میں ان کو علاج کی وہ آسانیاں اور سہولتیں کہاں میسر آتیں جو علی گڑھ میں تھیں۔ اس بات سے سکندر بہت دکھی رہنے لگے اور ایک دن کہنے لگے۔

"ارے صاحب! علی گڑھ کی بھی کیا بات ہے۔ علاج اور ڈاکٹری کا تو وہاں بڑا آرام ہے . . . . . ایک یہ ہے آپ کا دہلی یہاں تو بیمار پڑنے سے بھی دل ڈرتا ہے۔ کل رات ہمیں بدہضمی ہو گئی تھی۔ ہم تو سمجھے کہ ہم کو ہو گئی 'کالکے' (کالرے) کی بیماری —— پر وہ تو خدا کو جندگانی منجور تھی ہماری کہ آپ ہی آپ ہم ٹھیک ہو گئے ورنہ یہاں تو مر جاتے ہم جب بھی کسی ڈاکٹر کو فکر نہ ہوتی۔" پھر بڑی حیرت سے بولے۔ "کاس کھدا نہ کھواستہ کوئی بیمار پڑے تو بس علی گڑھ میں۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ قسمت کے آگے کسی کی نہ چلے ہے تو یہ تو وہی مجمون (مضمون) ہو گیا ہے کہ "مجبوری کا نام شکریہ ہے۔"

بیماریوں میں وہ سب سے زیادہ زکام سے ڈرتے ہیں اور اسے بڑے خوف سے 'جوکھام' کہتے ہیں۔ ایک بار سردی کے دنوں میں انھیں کوئی ضروری خط لے کر علی گڑھ سے دہلی جانے کو کہا گیا۔ سکندر نے صاف انکار کر دیا کہ "صاحب ہم نہیں جائیں گے۔ یہ زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم دہلی گئے تو پانی بدلنے سے ہمیں جوکھام کا مرض پیدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔"

سردی سے بہت بچتے ہیں اور اکتوبر سے لے کر مارچ تک ایک مفلر اپنے سر اور کانوں کے گرد لپیٹے رہتے ہیں۔ کیسا ہی کوئی موقعہ آن پڑے سکندر پانچ ماہ تک اس مفلر کو کسی قیمت پہ اپنے سر اور کانوں سے الگ کرنے پہ تیار نہیں کیے جا سکتے۔ پانچ ماہ تک یہ مفلر باقاعدہ سکندر سے چپک کے رہ جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اکتوبر سے مارچ تک کی ہوائیں تو بس چلتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ہواؤں کی شان میں وہ ایسے ایسے الفاظ کہنے لگتے ہیں جو شاید وہ اپنے کسی بدترین مخالف سے کہتے۔ اس مفلر کا بھی عجیب حال ہے۔ یہ کبھی وقت سے پہلے اتارا نہیں جاتا اور وقت گزرنے کے بعد اس کی حالت ایسی نہیں رہ جاتی کہ اتار کے رکھا جا سکے۔ جب وہ سکندر پر سے اترتا ہے تو سیدھے کوڑے کرکٹ کی بالٹی میں جاتا ہے۔ سکندر سردی کی مدت ختم ہونے پہ اس مفلر کو اس طرح اپنے سے الگ کرتے ہیں جیسے ہم آپ کیلے کا چھلکا

اتارتے ہیں یا سانپ اپنی کینچلی اتار پھینکتا ہے۔ چنانچہ رُت بدلنے کا اندازہ محض کیلنڈر سے نہیں کبھی کبھی سکندر کے مفلر کے اُترنے چڑھنے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

کچھ تو سکندر سنتے بھی اونچا ہیں اور کچھ اس مفلر کی وجہ سے بھی سننے سے معذور رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آئے دن طرح طرح کے لطیفے ہوتے رہتے ہیں .... مثلاً ان سے کہا جاتا ہے۔

"بھئی سکندر! دھوبی کتنے دن سے نہیں آیا ہے؟"

جواب ملتا ہے "واہ صاحب واہ! اگر بھی تو ابھی پرسوں ہی پکی تھی۔"

کوئی کہتا ہے "ہمارا بستر چھت پہ لگانا۔"

سکندر جواب دیتے ہیں "خط تو ہم ڈال بھی آئے۔"

کسی نے کہا "بازار جاؤ تو گزک لیتے آنا۔"

سکندر نے لاپروائی سے حقہ پیتے ہوئے جواب دیا "گنے کا رس آج کل کہاں ملے گا۔"

ایک دن میں نے ان سے کہا "رات تم نے میری صراحی کیوں نہیں بھری؟"

بڑے فلسفیانہ انداز میں بولے "ہم نے تو آج تک آپ کی بُرائی نہیں کی۔"

عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پر سکندر ذرا کم ہی سنتے ہیں اور اگر بقول ان کے کوئی 'رگڑے' (جھگڑے) کا کام ان کے سپرد کر دیا جائے جب تو بالکل ہی بہرے پٹ بن جاتے ہیں لیکن جونہی بازار جانے کا نام کوئی لے وے سکندر رچا ہے زمین کی ساتویں تہ میں ہوں فوراً سُن لیں گے اور بازار جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ جانے کسی دیو کی جان کسی طوطے میں بستی تھی کہ نہیں لیکن سکندر کی جان تو بازار میں بستی ہے۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی بازار کا کام کسی نہ کسی طرح نکال لیں۔ ایک گلاس پانی کوئی گھر میں مانگ لے ان سے تو لگتا ہے ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھنے کی فرمائش کر دی گئی ہے لیکن اگر بازار کا کام ہو تو سکندر رچا ہے گھر کے کسی بھی حصے میں ہوں ایک جھپاکے میں الہ دین کے چراغ والے دیو کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ دراصل سکندر کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز بازار ہے۔ کام چاہے آدھے گھنٹے کا ہو وہ بازار میں تین گھنٹے سے کم صرف نہیں کریں گے۔ ساری خبریں، طرح طرح کی افواہیں، جھوٹی سچی وارداتیں سُن کے آتے ہیں اور پھر طرح طرح سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ سیاست سے بہت دلچسپی ہے اور لیڈروں کے نام خاص طور سے یاد ہیں انھیں۔ ذرا جغرافیائی معلومات میں کمزور پڑتے ہیں اس لیے کبھی کبھی ڈھاکے کو بہار میں، ناگپور کو بنگال میں، لاہور کو ہندوستان میں اور ملتان کو کانپور کے قرب و جوار میں شامل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بمبئی میں ہونے والے کسی حادثے کو مدراس سے منسوب کر دیتے ہیں اور دہلی میں ہونے والے واقعہ کو بلوچستان پہنچا دیتے ہیں۔ ایک دن ایک نہایت تاریخی اور دردناک واقعہ اپنے کسی دوست کو ان الفاظ میں سُنا رہے تھے کہ:

"جب تیمور لنگ حضرت ابراہیم کے پاس پہنچا اور روس نے کہا کہ "صاحب اطلو کے جلوسے پہ پہیں بھی ساتھ لے چلیے" تو حضرت ابراہیم بولے کہ پہلے ہیں وہ کشتی تو بنا لیتے دو بس میں بیٹھ کے ہم طور پہ پہنچیں گے ...."

قصہ تو اس کے آگے بھی بہت کچھ تھا لیکن اس کے آگے کا احوال سننے کی ہمت نہ پڑی ——!

بات چیت کے دوران میں سکندر کو محاورے بولنے کا بڑا شوق ہے مثلاً مجبوری کا نام شکریہ، کاش خدا نخواستہ، بیہ دنیا آنا کافی ہے،

(آتی جاتی ہے)" بڑا اچھا گمنام تھا ا ـــــ ان کا سب سے دلچسپ قول تو یہ ہے کہ "قبر کا حال یا تو گُرده جانے یا زنده، ہم کیا جانیں؟"

سکندر کو حادثوں سے بھی بڑی دلچسپی ہے لیکن چھوٹے موٹے حادثے جس میں کسی کو جان یا مال کا نقصان نہ پہنچے انھیں بالکل نہیں بھاتے۔ ہاں حادثے کو بڑے فخر سے ایسی ڈینٹ (ایکسی ڈینٹ) کہتے ہیں اور صرف اسی حادثہ میں جو "ایسی ڈینٹ" بن جاتا ہے سکندر کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ایک بار بازار سے لوٹے تو بڑے پریشان، مارے بدحواسی کے سانس نہیں سما رہا تھا۔ اپنی سائیکل کو بڑی بیزاری سے انھوں نے ایک طرف دیوار کے ساتھ جھٹکا دے کے کھڑا کر دیا اور ایک کیاری کی منڈیر پہ بیٹھ کے کراہنے لگے۔ دھیرے دھیرے گھر والے ان کے چاروں طرف اکٹھا ہونے لگے اور حال پوچھنے لگے۔ سکندر اس تمام عرصے میں اپنے سیدھے پاؤں کی دو انگلیوں کو بڑے پیار سے سہلا رہے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے بھی جا رہے تھے۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کے پوچھ ہی لیا۔

"آخر ہوا کیا، کچھ بتاؤ بھی تو؟"

سکندر نے غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولے "پرے ہٹ کے کھڑا ہو۔ منہ پہ کیوں چڑھا آوے ہے۔ تجھے کچھ نظر نہ آوے ہے جو ہم سے پوچھ رہا ہے کہ کیا ہوا .... دیکھتا نہیں ہے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔"

انگلیوں کے ٹیڑھی ہونے کی خبر پہ سب لوگ چونک گئے۔ آخر گھر کی مالکن نے آگے بڑھ کے اور زور سے ڈانٹ کے پوچھا "کیا انگلی انگلی کیے جا رہے ہو۔ اگر چوٹ زیادہ لگی ہے تو ہسپتال جاؤ، مرہم پٹی کرواؤ۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو .... سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں ہو کہ آخر ہوا کیا ...."

سکندر نے آنکھیں اوپر اٹھائیں، مجمع کو بھانپا، ہلکے سے کراہ کے بولے "ہوتا کیا بیگم صاحب ...... ہم تو سودا سلف خرید کے بازار سے لوٹ رہے تھے کہ پھل والے نے آواز دی کہ "میاں سکندر! کہاں بھاگے جا رہے ہو، دو گھڑی کو سستا لو۔" ہم صاحب ہم نے کہا، ایسا بھی کیا ہے، ذرا اس کی بھی دو باتیں سنتے چلیں .... ہم نے سائیکل کو دکان کے تختے سے لگا کے کھڑا کیا اور خود دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ابھی دو ہی ملٹ (منٹ) ہوئے تھے ہمیں کھڑے ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک گنوار ... زاہل (جاہل) رکشے والے نے اپنا رکشا ہماری طرف بڑھا دیا اور بس اس کم بخت رکشے کے اگلے پہیے نے آگے بڑھ کے ہمارے پاؤں پہ ایسی ڈینٹ (ایکسی ڈینٹ) کر دیا۔"

"ارے، ارے .... کسی نے کہا" اور سکندر تم نے رکشے والے کو یونہی چھوڑ دیا ......"

سکندر معاف کرنے کے انداز میں بولے۔

"ارے بھئی ہم نے تو آگے بڑھ کے اس کو گلے سے پکڑ لیا تھا اور اس کو سیدھے لے جا رہے تھے تھانے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ اپنے برنادلوی کے تھانے کے دیوان جی چلے آ رہے ہیں۔ ہیں جو دیکھا دیوان جی نے تو فوراً آگے بڑھے اور انھوں نے روداد (روداد) پوچھی۔ ہم نے رکشے والے کا ہاتھ دیوان جی کے ہات میں تھما دیا اور کہا "آپ خود انصاف کیجیے اس نے اتنے زور سے ہمارے پاؤں پہ ایسی ڈینٹ کیا ہے اس کو کیا سزا ملنی چاہیے؟" دیوان جی نے ہمارے پاؤں کو دیکھا، پھر رکشے والے کو دیکھا اور بولے "ارے بھئی جانے بھی دو، یہ بے وقوف آدمی ہے۔ آپ عقل مند آدمی ہیں منشی جی! .... بات بڑھانے سے کیا فائدہ، معاف کر دو۔" پھر مسکرا کے بولے دیوان جی کی بات کیسے ٹالتے صاحب؟ پھر انھوں نے تو خود ہی کہہ دیا کہ آپ ٹھہرے منشی جی .... رکشے والا ٹھہرا زاہل (جاہل) آدمی .... "بس

ہم سیدھے سیدھے سائیکل اٹھا کے چلے آئے......"

سکندر کی اس سائیکل کا بھی عجیب حال ہے۔ پچھلے پندرہ سولہ برس ہوئے سکندر کو یہ سائیکل دی گئی تھی...... اس وقت اس بچاری کے کل پرزے سب ٹھیک ٹھاک تھے۔ اب تو اس کی عجیب و غریب حالت ہوگئی ہے۔ سائیکل کے علاوہ ہر دوسری مشین کا اس پہ گمان ہوتا ہے اس کے سارے انجر پنجر گھس گھسا کے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی سائیکل کا موجد بھی چاہے تو اس کے الگ الگ پرزے نہیں پہچان سکتا ہے۔ ہر پرزے پہ کسی دوسرے پرزے کا گمان گزرتا ہے۔ سکندر کے اپنے ہاتھ پاؤں کا بھی یہی حال ہے۔ پاؤں کی وہ انگلیاں جن پہ اس بدنصیب رکشے نے ایکسی ڈنٹ کیا تھا سدا سے ایسی ہی ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ چلتے وقت ان کی دونوں ٹانگیں اس ترازو کی طرح اونچی نیچی ہوتی رہتی ہیں جس میں ڈانڈی یا بے ایمان دوکاندار کبھی توازن برقرار نہ رکھ سکتا ہو۔ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا جانے کس طرح پیچھے جاتے لگتا ہے۔ سکندر کو چلتے دیکھ کے بیک وقت دنیا کے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا، ترقی کرنے اور خوف کھانے کا خیال آتا ہے۔ سکندر کے پاؤں ایک پوری اس نسل کی نمائندگی کرتے ہیں جو آگے بڑھنا بھی چاہتی ہے اور پیچھے ہٹنا بھی نہیں چاہتی۔ سکندر کی چال میں ایک عجیب سا تذبذب پایا جاتا ہے جیسے وہ چلنے سے پہلے فیصلہ نہ کر سکے ہوں کہ کدھر جانا ہے۔ شاید یہی تذبذب سکندر کو پیدا کرنے والے کو بھی پیش آیا ہوگا کہ ان کو بھیجے کہ نہ بھیجے۔ سکندر نے اپنی سائیکل کو بھی اپنی عادتوں اور اپنے ہاتھ پاؤں کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس سائیکل کو سکندر کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں چلا سکتا ہے۔ سکندر اس سائیکل پہ اتنا حق جتاتے ہیں جتنا بعض والدین اپنی اولاد پر یا بعض شوہر اپنی بیویوں پہ جتاتے ہیں یعنی سکندر جو سلوک چاہیں سائیکل سے کریں۔ سائیکل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ان کے حکم کے خلاف عمل کرے۔ گھر کے وہ لوگ جو سکندر اور ان کی سائیکل سے واقف ہیں وہ تو اس سائیکل سے ایسا خوف کھاتے ہیں جیسے بھڑوں کے چھتے سے یا بجلی کے کھلے ہوئے تار سے لیکن ایک بار ایک نئے ملازم نے سکندر کو سوتا دیکھ کے ان کی سائیکل کو اغوا کرنا چاہا تھا نتیجے میں اس بچارے کو کئی دن مرہم پٹی کرانا پڑی تھی۔

ایک زمانے میں علی گڑھ میں سائیکلوں کی بڑی چوریاں سننے میں آرہی تھیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کی سائیکل کہیں نہ کہیں سے اور کسی نہ کسی طرح چوری ہو جاتی تھی۔ سکندر اس زمانے میں اپنی سائیکل کی طرف سے بہت فکرمند رہنے لگے تھے اور ان کی کچھ اس طرح کی حالت تھی جیسی اس غریب باپ کی ہوتی ہے جس کے گھر میں جوان کنواری بیٹی بیٹھی ہو اور پڑوس میں اچانک غنڈے آ بسیں۔ ہر روز سکندر سائیکلوں کی چوریوں کی خبریں لاتے تھے اور بدحواس سے رہتے تھے۔

ایک دن جو سکندر پوسٹ آفس گئے، خط ڈالنے تو ان کو وہاں دیوان جی (پولیس کانسٹیبل) مل گئے۔ پولیس والوں کو دیکھ کے تو سکندر کا چلو توں خون بڑھتا ہے۔ یہ دیوان جی بھی آخر سکندر کی کمزوری سے واقف تھے۔ انھوں نے محلہ اوپر کورٹ کے ایک ریٹائرڈ کانسٹیبل کا ذکر چھیڑ دیا جن کی دو بیٹیاں شادی کے قابل تھیں...... دیوان جی بھی جلدی میں تھے اور کسی طرح پوسٹ آفس میں سکندر کی بکواس میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتے تھے لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ ان دنوں دیوان جی کی اوپر کی آمدنی کچھ یوں ہی سی ہو رہی تھی...... اور تیوہار نزدیک تھا۔ اس لیے سکندر سے ان کی شادی کا تذکرہ ضروری تھا۔

سکندر حسبِ معمول کھل اٹھے اور بولے "اب کہئے دیوان جی! ہم آپ کو کیا پیش کریں (فرمائیں)؟"

دیوان جی بولے "بھیا! تم جانتے ہو ہم تو تمھارا گھر بسانا چاہتے ہیں۔ اسی نیت سے لڑکی والوں پہ نظر رکھتے ہیں...... کچھ روپیہ پیسہ بھی ان پہ خرچ کرتے ہیں کہ تمھارا کام نکل جائے...... اب یہی اوپر کورٹ والوں کو دیکھو، گھر والے سب ٹھیک ٹھاک کر لیے تھے لیکن لڑکی

کا بھائی اُڑ گیا ہے کہ ہم تو لڑکے کو دیکھیں گے، پھر کچھ کہیں گے۔"

لڑکے کے نام پر سکندر کچھ مسکرائے، کچھ شرمائے پھر بولے "آں ہاں ...... تو اس میں کیا جھگڑا ہے ...... لڑکے میں کیا کھرابی ہے ..... مریج ہے لڑکا کہ بیمار ہے لڑکا؟ تم نے کہا نہیں ان سے دیوان جی کہ لڑکا ہزاروں میں ایک ہے۔ کوئی عیب اس میں نہیں اور کسی عیب میں وہ نہیں ...... سارے کالج میں ہم سرنام (مشہور) ہیں ...... جس سے چاہیں پوچھ لیں ہماری بابت ...... !"

دیوان جی نے کہا "یہ باتیں تو میں نے سب ان کو بتا دیں مگر تم جانو لڑکی کا معاملہ ہے، چھان بین تو کرتے ہی ہیں گھر والے ......"

"ارے تو صاحب! جتنی چھان بین چاہیں کر لیں۔ ہمیں کیا ڈر ہے، ہر طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیں۔"

دیوان جی نے کہا "وہ جات برادری کا معاملہ ہے نا۔"

"جات برادری کا کیسا معاملہ؟"

"بھئی وہ لوگ پٹھان ہیں اور پٹھان ہی کو لڑکی دیں گے اور تم ٹھہرے شیخ!"

"آں ہاں! ہم تو ٹھہرے شیخ! پر اس سے کیا ہووے ہے۔ ہم ان کی کھاطر بن جائیں گے پٹھان ——— !" سکندر نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

"کیوں باؤلے ہوئے ہو۔ بھلا بننے سے کوئی بنتا ہے۔ ذات برادری آدمی بانٹ نہیں سکتا ہے، نہ خرید سکتا ہے۔ وہ تو پیدائش کے ساتھ ساتھ چلتی ہے ......"

سکندر نے منہ بنا کے کہا "ارے تو چلے ساتھ ساتھ جات برادری بھی ...... ہمیں کیا ڈر ہے۔ کیا شیخوں کو لڑکیاں نہ ملتی ہیں ......؟"

پھر ذرا نرم پڑے اور بولے "لیکن دیوان جی! ہم تو جانیں آپ چاہو گے تو جرور ہی ہمارا کام بن جائے گا۔ کسی کی جات برادری بدلنا تو تمہارے بائیں ہات کا کھیل ہے ...... یاد ہے وہ ستیتا کی شادی تم نے کرائی تھی سیدوں میں ...... اور ساری دنیا جانے ہے کہ ستیتا اصل نسل کھالص (خالص) جولاہے کی جات سے ہے۔"

دیوان جی مسکرائے۔ کچھ خوش بھی ہوئے پھر بولے "بھئی ہم کیا ہیں ...... سب اوپر والے کی قدرت ہے ...... اب تمہارا ہی معاملہ ہے۔ ہم تو اپنی سی سب کر رہے ہیں ...... پر تم جانو زمانہ ہی خراب آ لگا ہے۔ پھر اپنی حالت بھی آج کل ذرا یوں ہی سی ہے ...... ویسے ہم روپے پیسے کا کچھ خیال نہیں کر رہے ہیں اس سلسلے میں!" دیوان جی اب معاملے پہ آ پہنچے تھے۔

سکندر خوش ہو کے بولے "روپے پیسے کا آپ خیال نہ کریں دیوان جی! جب تلک سکندر کے دم میں دم ہے وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے۔ روپے پیسے کی آپ پھکر نہ کریں ...... جو آپ کہیں، ہم آپ کو پہنچائیں ......!"

دیوان جی نے کہا "آج رات کو لڑکی کے بھائی کو ذرا سنبھالے جاؤں گا۔ وہاں چائے پانی سے اس کی خاطر کروں گا۔ دیکھو شاید جم جائے تمہارا معاملہ ......"

سکندر نے بڑی شان سے جیب میں ہات ڈال کے دس روپے دیوان جی کی نذر کیے۔ دیوان جی بولے "ارے بھئی! اتنے میں تو آج کل سادا پانی بھی کوئی نہ پلا وے ہے کسی کو اور تم چلے ہو اپنے سالے کو اس رقم سے ٹالنے ......"

"سالے کو" یعنی بیوی کے بھائی کو۔" ہائے ہائے سکندر اس رشتے کا نام سن کر شرما شرما کے مسکرائے رہے اور بولے "ہاں صاحب!

سالے کی تو بات ہی اور ہوتی ہے ...... لوگ بانگ کہتے ہیں۔ ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف ......" اور پانچ روپے سکندر نے بیوی کے بھائی کی مزید خاطر کے لیے دیوان جی کو دیے۔ پھر احتیاطاً پوچھ بیٹھے "کوئی بہن بھی ہیں ان کی؟"

دیوان جی ذرا چکرائے۔ پھر سنبھل کے بولے "ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ بھرے گھر کی لڑکی ہے جی وہ۔ دو بہنیں اس کی اور ہیں۔"

"دو اور ہیں؟" سکندر خوشی اور اطمینان سے بولے۔

"ہاں ہاں بھئی! دو اور ہیں۔" دیوان جی نے جواب دیا۔

سکندر مسکراتے ہوئے بولے "بس دیوان جی! ہمارا دل کہے ہے کہ سکندر تیرا کام تو یہیں بنے گا ...... ارے صاحب! ایک سے نہ ہوگی شادی تو دوسری تو ہے اور وہ بھی کسی وجہ سے رہ گئی تو پھر تیسری کہاں جائے گی نکل کے ......؟"

دیوان جی اب جلد سے جلد بھاگنا چاہ رہے تھے بولے "ہاں جی! تیسری کہاں جائے گی۔ ہم نے تو سکندر اسی خیال سے اس بار ایسا گھر دیکھا ہے جہاں تین تین لونڈیاں موجود ہیں۔ اب بھی کوئی ایک تو تیرے مقدر ہی ہوگی ہی ......"

دیوان جی چلے گئے۔ سکندر تھوڑی دیر تک لوہے کا جنگلہ پکڑے کھڑے رہے۔ وہ تینوں لڑکیوں کے خیال میں گم تھے۔ جب وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے نکل کے اپنی اس پرانی باسی اور کنواری دنیا میں آئے تو انھیں گھر جانے کا خیال آیا اور پھر اپنی سائیکل کا خیال آیا ...... باہر نکلے تو سائیکل غائب! سکندر کے ہوش گم ہو گئے۔ چیخ پکار اور پوچھ تاچھ شروع کی۔ سائیکل کا ناک نقشہ حسب نسب سب کچھ بتاتے پھر رہے تھے لیکن سائیکل نہ ملنا تھی نہ ملی۔ لوگ باگ ادھر ادھر اکٹھے ہو گئے اور طرح طرح کی سائیکلوں کی طرح طرح کی چوریوں کا ذکر کرنے لگے۔ آخر کار تھک ہار کے اور سائیکل کو صبر کر کے سکندر پیدل گھر لوٹے اور اس طرح تھکے ہارے گھر میں داخل ہوتے جیسے کوسوں کا سفر کر کے آ رہے ہوں حالانکہ پوسٹ آفس دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا لیکن سکندر تو گھر کی چہار دیواری کے علاوہ کہیں بھی پیدل نہیں چلتے تھے۔ ہر دم اپنی سائیکل پر سوار رہتے تھے۔ سکندر ابھی چوری کی داستان ختم بھی نہ کر سکے تھے کہ دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دی۔ سکندر پریشان حال اور بڑی بیزاری سے دروازے کی طرف بڑھے ...... اور پلک جھپکتے جو لوٹے ہیں تو خوشی سے بے حال، اپنے سارے بڑے بڑے دانت نکالے، اپنی سائیکل کو جھاڑتے پونچھتے اندر داخل ہوئے۔ غصے میں جان آ گئی تھی۔ گھر والے سب سکندر کے آس پاس جمع ہو گئے تو سکندر بہت فخر سے بولے "دیکھیے ہم نہ کہتے تھے ہماری چیز کہاں جا سکتی ہے۔ اب پوچھیں گے ذرا سائیکل چور سے کہ بچہ! سکندر کی سائیکل چرانا مذاق نہیں ہے۔"

کسی نے پوچھا "چور پکڑا گیا؟"

"ہاں ہاں! پکڑا گیا۔" سکندر نے کہا۔

"تو کیا تھانے میں ہے چور؟" کسی نے پوچھا۔

سکندر مسکرا کے بولے "تھانے کیوں نہیں جائے گا۔ اگر زندہ رہا تو ضرور ہی تھانے جائے گا۔ ابھی تو ہسپتال میں پڑا ہے۔"

سکندر کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ دہلی میں انھوں نے ایک سردار سے دوستی کر لی تھی۔ اسی کے ساتھ باہر آتے جاتے تھے۔ ایک دن بہت شام گئے تک بھی نہ لوٹے تو مجھے فکر شروع ہوئی۔ آخر میں آٹھ بجے رات کو سکندر اکیلے گھر لوٹے۔ میں نے انھیں ڈانٹا کہ اتنی دیر تک کہاں غائب رہے سارے کام چھوڑ کے۔"

بولے "ارے صاحب! کیا بتائیں آج کیا قصہ ہوگیا۔"

میں نے پوچھا "کیا قصہ ہوگیا؟"

کہنے لگے "دیکھیے تو۔ ہوا یہ کہ ہم دونوں یعنی سردار اور میں چلے بازار کو، پہلے پہنچے فتحپوری، وہاں میں نے خریدا کوئلہ اور جو مڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ سردار نہیں! وہاں سے گھبرایا گھبرایا میں آیا چاندنی چوک۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا لیکن دیکھا کہ سردار نہیں...... وہاں سے بھاگا بھاگا آیا کشمیری گیٹ پھر دیکھا کہ سردار نہیں۔ اسی چکر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ سردار نہیں!!"

سکندر یہ کہتے جاتے تھے اور ہاتھوں کو نچاتے جاتے تھے۔ اب ان سے کوئی کیا پوچھتا کہ بھئی سردار تو نہیں تھا لیکن آخر یہ 'میں' کہاں چلا گیا تھا...... لیکن سکندر کی زبان پہ تو محاورہ چڑھا تھا کہ نہ آدم نہ آدم زاد...... انھیں کون کچھ سمجھا سکتا تھا......

فسادات کے زمانے میں سکندر دہلی ہی میں تھے لیکن تفصیل سے کچھ نہ جانتے تھے۔ انھیں تو بس یہ معلوم تھا کہ لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے کون کس سے جھگڑ رہا ہے اور کیوں جھگڑ رہا ہے اور جھگڑے میں کس کا پلّہ بھاری ہے، ان سب باتوں کا نہ تو سکندر کو دھیان آیا تھا نہ وہ ایسی باتوں پہ دھیان دینے کے قائل تھے۔ انھیں تو صرف یہ بات کھلتی تھی کہ وہ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے ہیں اور گھر پہ پڑا رہنا سکندر کے لیے تقریباً سولی پہ لٹکنے کے برابر ہے...... ایک دن اپنے دوست سردار سے بولے "بھئی گھر میں بیٹھے بیٹھے گھبرا گئے ہم تو.... کہیں باہر چلو گھوم پھر آئیں۔"

سردار نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا پھر کہا "آج نہیں۔ کل چلیں گے باہر گھومنے گھامنے......"

"کل ہی سہی" سکندر نے کہا اور بیٹھ رہے...... دوسرے دن پھر سکندر نے سردار کو یاد دلایا کہ "بھئی! کل تو تم ٹال گئے، آج تو ضرور ہی چلو باہر......"

سردار نے 'تفریح' کو مزید ٹالنا چاہا۔ بولا "بھئی سکندر میاں!...... بات یہ ہے کہ...... بھئی ایسی جلدی کیا ہے.... ذرا اطمینان ہونے دو پھر چلیں گے گھومنے پھرنے۔"

سکندر بولے "ایسی کیا بے اطمینانی ہے تجھ کو...... نہ بھائی..... ہم تو آج ضرور ہی باہر جائیں گے ـــــ"

سردار نے اس احمق کو سمجھانا چاہا۔ "ارے بھائی سکندر میاں! تم سمجھتے نہیں ہو...... ابھی شہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ گھر سے ابھی کچھ دن تک نہیں نکلنا چاہیے......"

"کیوں نہیں نکلنا چاہیے؟" سکندر نے جھنجھلا کے پوچھا۔

سردار نے سمجھاتے ہوئے جواب دیا "کہہ تو دیا تم سے کہ ابھی شہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑے دن صبر کر لو، پھر چلیں گے۔"

اب سکندر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جل کے سردار سے بولے "اچھا! اچھا!...... تو یوں کہہ کہ ڈرتا ہے تو ہم سے۔ ارے بھئی! ابے فضول میں ڈرتا ہے تو ہم سے۔ چل ہمارے ساتھ۔ ہم تجھے اکیلے ولاتے ہیں...... ہم سے مت ڈر...... ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے......"

اسی زمانے میں ایک دن خریداری کے لیے سکندر کہیں باہر گئے تو نو بجے رات تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم سب سخت پریشان

اور بدحواس تھے اور بے چینی سے سکندر کا انتظار کر رہے تھے۔ تقریباً نو بجے رات کو وہ ہانپتے کانپتے غصے سے "! پہلے، منہ ہی منہ میں کسی کو کچھ برا بھلا کہتے گھر میں داخل ہوئے۔ جب قریب آئے تو یہ کہتے سُنے گئے کہ "یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ نہتا دیکھ کے حملہ کر بیٹھے۔ ہوتا ہمارے پاس بھی کوئی ڈنڈا تو پوچھتے ...."

سکندر کو بار بار اپنے نہتے پن کا اور حملہ آور کی غیر شریفانہ حرکت کا تذکرہ کرتے سُنا تو سب لوگ گھبرا گئے۔ فسادات کا زمانہ تھا، طرح طرح کے خیالات لوگوں کے دماغ میں آ رہے تھے ...... آخر ایک آدمی نے آگے بڑھ کے پوچھا۔

"کس نے حملہ کیا؟ کون تھا وہ؟"

سکندر غصے سے بولے "ہوتا کون؟ وہ ڈیڑھ پسلی کے تھے۔"

ایک رات کو سب گھر والے سو رہے تھے کہ سکندر نے اچانک صاحب خانہ کی مسہری کے پاس آ کے آواز دی ——

"صاب! صاب!!"

صاحب خانہ گھبرا کے اٹھ بیٹھے، بولے "کیا ہے سکندر، خیریت تو ہے؟"

"خیریت کہاں صاب .... وہ سیاپ آئے ہیں!"

"کون صاحب آئے ہیں؟ کیا کوئی مہمان ہیں؟"

"مہمان نہیں صاب! سیاپ آئے ہیں۔"

"ارے بھئی کون صاحب؟ کیا خاں صاحب آئے ہیں؟"

"جی نہیں صاب۔ خاں صاب نہیں، صرف سیاپ آئے ہیں۔"

گھر کے مالک کو اب غصہ آ چکا تھا۔ بگڑتے ہوئے بولے "آخر صاف صاف کیوں نہیں بتاتا ہے کہ کون صاحب آئے ہیں؟"

سکندر نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"صاف صاف تو بتا رہا ہوں صاب کہ سیاپ آئے ہیں۔"

صاحب نے غصے سے پوچھا "کیا نام ہے ان صاحب کا؟"

"نام؟ نام کیسا؟" سکندر نے حیرت سے پوچھا۔

صاحب اب اٹھ کے بیٹھ گئے تھے اور سکندر کی باتوں پر سخت غصہ ان کو آ رہا تھا۔ آخر انھوں نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آخر وہ صاحب ہیں کہاں؟"

سکندر آگے بڑھ کے ہولے سے بولے۔

"آدھے بل میں ہیں آدھے باہر ہیں۔"

اچھا بھلا لفظ سکندر کی زبان پر چڑھتا ہے تو کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ان کو بازار جاتے ہوئے دیکھا تو فرمائش کی کہ کولی نوس ٹوتھ پیسٹ اور لیوڈی کلون خریدتے لائیں —— سکندر گھر لوٹے تو بہت خفا تھے، بولے۔

"جانے کہاں کے بے وقوف دکاندار آ گئے ہیں تمشو بلڈنگ (مارکیٹ) میں —— کوئی بات ہی نہیں سمجھتے ہیں ...."

میں نے پوچھا: "آخر کیا ہوا؟"

بولے: "ہم نے دکاندار سے کہا کہ ذرا کالی داس دے دو تو اس نے ہنسنا شروع کر دیا ...... ہمیں بڑا غصہ آیا ...... اور ہمارا اس سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ لوگ باگ جمع ہو گئے ...."

دوکاندار پوچھنے لگا: "کالی داس ہم کہاں سے لا دیں آپ کو؟"

ہم نے کہا: "کیوں بھئی! کیا گورنمنٹ نے منا ہی کر دی ہے کالی داس استعمال کرنے کی؟"

"استعمال؟ استعمال کیسے کریں گے کالی داس کو؟" دکاندار ہنستے ہنستے بولا: "سکندر میاں! اپنے یہاں تو تیل صابون کنگھا منجن ملتا ہے۔ کالی داس لینا ہے تو راستے میں کالج کی لائبریری پڑتی ہے وہاں جاؤ۔"

سکندر جھنجھلا کے بولے: "کالج کی راستے بریلی (لائبریری) میں تو کتابیں رکھی ہیں ...... وہاں کالی داس کہاں ملے گا؟"

پھر الماری کی طرف اشارہ کر کے بولے: "ارے کاہے کو وقت خراب کرتا ہے بھئی! وہ دیکھو تیرے پاس ہے تو کالی داس۔ بس یہی چاہیے ......"

اور سکندر اس طرح کولی نوس ٹوتھ پیسٹ خرید لائے ....

یوڈی کلون کے سلسلے میں انھوں نے ایک کیمسٹ کی دکان کا انتخاب کیا۔ وہاں جا کے بولے: "ایک شیشی گولی کونین دے دو ......"

کیمسٹ نے ایک شیشی انھیں تھما دی۔ سکندر بہت خفا ہو کے بولے۔

"یہ کیا ہے؟ یہ تو گولیاں ہیں؟"

دکاندار نے کہا: "یہی تو آپ نے مانگی ہیں کونین کی گولیاں!"

سکندر دکاندار کی حماقت پر ہنستے ہوئے بولے: "ارے صاحب! یہ تو وہ گولیاں ہیں ...... ملیریا میں کھانے کی —— اور ہمیں تو چاہیے گولی کونین کی شیشی جس میں چھڑکنے والا تیل ہوتا ہے!"

دکاندار نے گولیاں واپس لیں اور ایک بوتل سکندر کو تھما دی۔ بوتل دیکھ کر سکندر چراغ پا ہو گئے۔ جل کے بولے: "بالکل ہی اُلو سمجھ لیا ہے آپ نے ...... یہ کیا تھما رہے دے رہے ہیں آپ؟"

دکاندار نے کہا: "یہی چھڑکنے والا تیل ہے۔ فینائل ہے ڈی۔ ڈی۔ ٹی ملی ہوئی ہے اس میں ......!"

سکندر خفا ہو کے بولے: "یہ نہیں چاہیے ہم کو ...... فنائل اور ڈی۔ ڈی۔ ٹی تو ہم سب سمجھے ہیں ...... ہمیں تو گولی کونین چاہیے جو کپڑوں پر بھی چھڑکتے ہیں ...."

دکاندار نے عاجز آ کے انھیں فلٹ کا ڈبہ تھما دیا جسے سکندر نے کاؤنٹر پر پٹخ دیا اور بولے: "واہ صاحب واہ فلٹ کو ہم نہیں پہچانتے ہیں کیا؟ اس سے تو مکھیاں مرتی ہیں!"

آخر کار دکاندار نے ان سے کہا کہ تم خود اشارہ کر کے بتاؤ کہ کونسی شیشی تمھیں چاہیے —— سکندر نے یوڈی کلون کی شیشی دیکھی تو چیخ کے بولے: "بس یہی تو ہے گولی کونین کی شیشی ...... یہی تو ہمیں چاہیے!"

اور اس طرح بیچارے کیمسٹ کی جان بچی!

پولیس والوں سے سکندر کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ دنیا میں ان پر کسی شخص کا یا کسی عہدے کا وہ رعب نہیں پڑتا ہے جو پولیس کی وردی میں ملبوس کسی بھی اُلٹے سیدھے آدمی کو دیکھ کر ان پر پڑتا ہے۔ ان کے خیال میں پولیس کانسٹیبل ہونا دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ کانسٹیبل کو بڑی عزت اور احترام سے دیوان جی کہتے ہیں اور یہ لفظ ان کے منہ میں مصری کی طرح گھل جاتا ہے۔ ایک بار گھر میں ایک صوبے کے گورنر صاحب، جن سے گھر والوں کے پرانے مراسم تھے، تشریف لا رہے تھے۔ ان کی آمد کے سلسلے میں ایک دن پہلے گھر کے آس پاس پولیس پاسی۔ آئی ڈی کے آدمی ضابطے کی خانہ پری کے لیے آجا رہے تھے۔ سکندر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بار بار اس طرح بھاگ بھاگ کے باہر جا رہے تھے اور اس طرح پولیس والوں کی خاطر مدارات کر رہے تھے جیسے اپنی بارات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوں۔ گھر کا سارا کام کاج انھوں نے چھوڑ رکھا تھا اور تمام تر توجہ دیوان جی پہ صرف کر رہے تھے۔ دوسرے دن صبح نو بجے گورنر صاحب تشریف لائے تو سکندر بھی گھر والوں کے آس پاس منڈلانے دیکھے گئے ان کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس تھا اور وہ انتظار کر رہے تھے کہ جلد سے جلد بھیڑ چھٹے تو وہ باہر نکل سکیں۔ گورنر صاحب نے سکندر کو جو دیکھا تو بڑے تپاک سے آگے بڑھے اور بولے "ارے بھئی سکندر! اچھے تو ہو! آؤ ذرا ہاتھ تو ملاؤ!"

سکندر نے بڑی عجلت میں جواب دیا "جی ہاں! اچھے ہیں ہم!" اور ہاتھ ملانے کی پیش کش کو انھوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "صاحب..... ذرا راستہ دیجئے....... ہم باہر جائیں گے....... باہر دیوان جی کھڑے ہیں۔ ان کے لیے پانی لے جا رہے ہیں ہم!!"

ایک دفعہ پڑوس میں چوری ہو گئی۔ سکندر کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ لوگ باگ چور کی کھوج میں تھے اور چوری کے متعلق باتیں کر رہے تھے سکندر کو پولیس والوں کا انتظار تھا اور دیوان جی کے آتے ہی انھوں نے آگے بڑھ کے اور ہاتھ چلا چلا کے چوری کی تفصیل بیان کرنا شروع کی۔

تھانیدار نے مالک مکان سے پوچھا۔

"آپ نے کوئی نیا نوکر رکھا تھا؟"

سکندر آگے بڑھ کے بولے "ارے دیوان جی! ہر روز نئے نوکر آتے رہتے ہیں۔ یہاں کوئی دو دن سے زیادہ ٹکتا ہی نہیں۔"

صاحبِ خانہ نے کہا "ادھر ایک مہینے سے تو ایک ہی ملازم کام کر رہا ہے۔"

تھانیدار نے پوچھا "چوری کس کمرے میں ہوئی؟"

صاحبِ خانہ نے کہا "ہم لوگ برآمدے میں سو رہے تھے۔ سامان بیڈ روم میں تھا۔ اسی کمرے میں چوری ہوئی....."

سکندر نے کہا "اس کے مطلب یہ ہوئے کہ چور برآمدے سے نہیں بلکہ پیچھے کی کھڑکی سے کود کر کمرے میں داخل ہوا....."

تھانیدار نے پوچھا "آپ لوگوں کو کوئی کھٹکا وغیرہ تو نہیں سنائی دیا تھا؟"

سکندر بولے "کھٹکا تو ضرور ہی ہوا ہوگا۔ یوں کہیے کہ یہ لوگ بے خبر سو رہے تھے!"

تھانیدار نے کہا "آپ کا کتا گھر کے اندر تھا کہ باہر؟"

سکندر نے جواب دیا "کتوں کو تو ایسے موقعوں پہ چور نشہ کھلا دیتے ہیں۔"

تھانیدار نے پوچھا "گھر کے باہر کی بتی جل رہی تھی کہ نہیں؟"

سکندر نے کہا "دو ڈھائی بجے رات تک تو جل رہی تھی....... اس کے بعد ہم سو گئے تھے۔ پتہ نہیں کب تک جلی... ویسے چور ایسے موقع پہ پتھر مار کے بلب بھی توڑ دیا کرتے ہیں......."

سب نے ایک ساتھ باہر کی بتی پر نظر ڈالی تو اتفاق سے بلب ٹوٹا ہوا ملا! سکندر نے بڑے فخر سے سب کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی تفتیش پر بہت خوش نظر آ رہے تھے........ اسی طرح انھوں نے چوری کے سلسلے میں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف یہ کہ سکندر کو چوری کے بارے میں کچھ معلومات ہیں بلکہ شاید وہ خود اس چوری میں شامل بھی رہے ہیں۔ آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کی ان کو عادت ہے۔ پھر اس دن اتفاق سے دیوان جی بھی کوئی نئے تھے۔ انھوں نے سکندر کو اس طرح بڑھ بڑھ کے بولتے سُنا تو انھیں سکندر پر کچھ شبہ ہونے لگا اور انھوں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ تھانے چلو، وہاں تمھارا بیان قلمبند ہوگا!" سکندر نے اپنی اس اہمیت پر اور بھی فخر کا اظہار کیا۔ ادھر مجمع پر نظر ڈالی اور بڑے اطمینان سے بولے: "تھانے لے جا کے کیا کیجئے گا۔ قلم تو آپ کے پاس ہے ہی اس میں ہمارا بیان بند کر لیجئے!"

دیوان جی ذرا کڑوے مزاج کے تھے اور سکندر کے اس والہانہ عشق سے بھی قطعی ناواقف تھے جو ان کو محکمۂ پولیس کے افراد سے تھا، بگڑ کر بولے: "بک بک مت کرو، سیدھے چلو تھانے........ وہاں تیرا مزاج درست کر دیں گے۔"

اب سکندر معاملے کی سنگینی تک پہنچ گئے تھے۔ خود بھی بگڑ کے بولے: "معلوم ہوتا ہے نئے نئے آئے ہو دیوان جی —— اس علاقے میں........"

دیوان جی نے کہا: "ہم نئے نئے آئے ہیں کہ نہیں، اس سے تمھیں کیا مطلب........!"

سکندر جھنجلا کے بولے: "آخر آپ کو ہم پر کیا شبہ ہے؟ ہم چور لگتے ہیں آپ کو؟" پھر بہت اکڑ کر بولے: "اچھا صاحب —— ہم چور رہیں، ہم نے کی ہے چوری —— اگر اصل نسل دیوان جی ہیں آپ تو نکال لیجئے چوری کا مال ہمارے پاس سے!!"

جس گھر میں چوری ہوتی تھی اس گھر والے اس جھگڑے پر سخت کڑھ رہے تھے۔ ان کا معاملہ جہاں کا تہاں تھا اور ادھر سکندر میاں نے ایک دوسرا جھگڑا اٹھا دیا تھا۔ بات خاصی بڑھنے لگی تھی کہ اچانک پولیس کپتان صاحب کی گاڑی آتی نظر آئی۔ دیوان جی نے آگے بڑھ کے سلیوٹ کیا اور گاڑی کا پٹ کھولا........ کپتان صاحب سکندر کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سکندر ان کو دیکھتے ہی آگے بڑھے اور بولے "صاحب! یہ کہاں سے دیوان جی پکڑ لائے ہیں آپ نے، انھیں شریف آدمی بھی چور نظر آ رہے ہیں!"

دیوان جی نے جلدی جلدی مختصر فقروں میں سکندر کے بارے میں بتایا تو کپتان صاحب کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ سکندر کی پوری ہسٹری سے واقف تھے........ انھوں نے سکندر سے کہا: "میاں سکندر، تم گھر جاؤ۔ ہمارے لیے چائے بناؤ........ وہیں آکے بات کریں گے!" اور دیوان جی سے کہنے لگے: "دیوان جی! اس علاقے میں آئے ہوئے آپ کو چار، پانچ مہینے ہو گئے اور اب تک سکندر سے ناواقف ہیں آپ۔ اس طرح کیسے کام چلے گا!"

سکندر فاتحانہ انداز سے جھومتے جھامتے گھر آ گئے اور بات آئی گئی ہوگئی لیکن اس واقعے سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ آئندہ سے وہ اتنے محتاط رہنے لگے ہیں کہ دیوان جی کی وردی سے بات چیت شروع کرنے سے پہلے ان کا چہرہ مہرہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔

پچھلے سال علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فسادات کی واردات ہوئی تو ہر شریف اور بھلا مانس انسان ان ناخوشگوار واقعات سے اداس اور ہراساں تھا —— کرفیو لگا تو پریشانی اور بڑھی۔ سارے کام کاج بند ہو گئے۔ عجیب سی بددلی اور مایوسی فضا پر طاری تھی۔ سکندر نے اس طرح کی خبریں سنیں تو ذرا دیر کچھ سوچتے رہے لیکن جیسے ہی انھیں پتہ چلا کہ شہر اور یونیورسٹی پر پولیس کا پہرہ ہے........ تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ بے حد خوش ہو ہو کے ہر منٹ ایک نئی خبر اس فخر سے سنانے آتے جیسے کسی میلے کی چہل پہل کا ذکر کر رہے ہوں! یا بات بات

تا ہم بھی سائیکل اٹھاتے تھے اور پیچھے کے دروازے سے گھر والوں کی نظریں بچا کے نکل جاتے تھے۔

کرفیو کی وجہ سے دو دن ڈاک نہ آئی۔ گھر والوں کو ڈاک کا منتظر دیکھ کر سکندر گھر سے اچانک غائب ہو گئے اور سیدھے، سیدھے پوسٹ آفس کی طرف سائیکل دوڑانے لگے۔ راستے میں دو دفعہ کانسٹبل نے سیٹی دی جسے سکندر نے بہرے ہونے کے کارن سنا نہیں اور آگے بڑھتے گئے نکڑ والے کانسٹبل نے انھیں ہاتھ دکھا کے روکنا چاہا تو بولے "ہم جلدی میں ہیں ...... ڈاک پہنچانی ہے گھر ...... دیکھتے نہیں ہو دیوان جی "ہم" کون ہیں؟" پھر اپنی گاندھی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے بولے "یہ نہیں دیکھتے ہو کیا ہے؟"

دیوان جی نے حیرت اور بیزاری سے پوچھا "یہ کیا ہے؟ ٹوپی ہے!"

بولے "یہ تمھیں صرف ٹوپی لگے ہے! ارے بھیا ہم نے تو سنا ہے، جو یہ ٹوپی پہن لیتا ہے وہ حکومت کا آدمی ہو جاتا ہے ......"

دیوان جی کو سکندر کی سادہ لوحی پر ہنسی آگئی اور انھوں نے کہا "سیدھے سیدھے گھر چلے جاؤ" لیکن سکندر سیدھے پوسٹ آفس پہنچے اور اس بچارے ڈاکیے سے، جو ان دنوں ہمارے محلے کی ڈاک لاتا تھا، بولے "کیوں جی! ڈیوٹی بھی کوئی چیز ہے ...... تین دن سے ڈاک کا انتظار ہو رہا ہے اور تم یوں آرام کر رہے ہو ...... شرم نہ آوے ہے تمھیں؟"

ڈاکیے نے کہا "بھیا سکندر ہم تو بال بچے والے آدمی ہیں اپنی جان پیاری ہے ہمیں تو ...... مر گئے تو بیوی بچوں کو کون پوچھے گا؟"

سکندر کو بچوں سے قلبی نفرت ہے اس لیے بچوں کے مسئلے کو گول کر گئے لیکن جب گھر آ کے یہ واقعہ سنا رہے تھے تو ان کے تیور سے اندازہ ہوتا تھا کہ غالباً ڈاکیے کی بیوی کے مستقبل کی طرف سے کافی مطمئن ہیں!

ڈاکیے سے یہ باتیں کیں اور جتنی ڈاک ان کے ہاتھ لگی سب سمیٹ کے اپنے تھیلے میں رکھی، گھر آئے اور برآمدے کے فرش پر ساری ڈاک پھیلا دی۔ گھر والوں کو ڈاک دے کے پورے محلے کی ڈاک بانٹ آئے۔

یوں تو سکندر اپنی کڑوی زبان کی وجہ سے اکثر دکانداروں وغیرہ کو ناراض کرتے رہتے ہیں لیکن عبدالشکور نامی ایک پھل والے سے ان کی نوک جھونک آئے دن ہوتی رہتی ہے اور سکندر کا گزر جب بھی اس کی دکان کی طرف سے ہوتا ہے تو اس سے مخاطب ہو کے یہ ضرور کہہ آتے ہیں کہ "تو ٹھہرا ایک ملیچھ کا بے ایمان ...... ہم تجھ سے بے حد کرکے نفرت کرتے ہیں!"

کرفیو ختم ہوا اور حالات نارمل ہونے لگے تو سکندر معلومات کی خاطر بازار پہنچے۔ وہاں انھیں بہت سارے جان پہچان والوں کی شکل نظر آئی۔ آگے بڑھے تو دیکھا، عبدالشکور اپنا پھلوں والا ٹھیلہ لیے بیچ چوراہے میں کھڑا ہے۔ سکندر ہر چند کہ اس سے خفا رہتے تھے لیکن کچھ حالات کے تحت نرم لہجے میں انھوں نے آگے بڑھ کے پھلوں کی قیمت اس سے پوچھی، اس نے ہمیشہ کی طرح دام دُگنے بتائے ...... اسکندر کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے "ابے تیرا دماغ اب بھی ٹھیک نہیں ہوا ...... لوگ بات کہتے تھے کہ تیرے جیسے سب مر کھپ گئے ہو ......" "پر تُو تو کھڑا ہے ویسا ہی کا ویسا ...... تجھ میں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ویسا ہی بے ایمان اور جھوٹا ہے تُو، تو ......" پھر کچھ سوچ کے بولے "ٹھہر جا لگنے دے اب کے کرفیو پھر ...... اللہ چاہے گا تو ہم ضرور ہی تجھے اپنے "ناپاک ہاتھوں" سے ختم کریں گے"

مشکل یہ ہے کہ سکندر بات کی تہہ میں کبھی جاتے ہی نہیں ہیں، نہ ان کو جھگڑے کی نوعیت سے غرض تھی اور نہ محاورے کے غلط استعمال سے!

ایک دن بازار سے لوٹے تو بڑا خوش نظر آتے۔ کچھ مسکراتے جاتے تھے اور خلافِ عادت کام میں کچھ دل لگا کے کر رہے تھے۔ وہ زمانہ رمضان شریف کا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں روزہ کھولنے کے لیے شام کو سورج غروب ہونے پر سائرن بجایا جاتا ہے۔ گھر والے جب شام کو کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو سکندر بولے "آج نئی دکان بازار میں کھلی ہے۔ بڑی بڑھیا مٹھائیاں بنتی ہیں وہاں اور صاحب لوگ بات کہتے ہیں کہ دہی کی لسی تو مشہور ہے وہاں کی۔ ایسی لسی تو سارے شہر میں کوئی نہیں بنا سکتا جیسی یہ حلوائی بناتا ہے!" پوچھا گیا "تم نے بھی چکھی ہے وہ لسی یا محض سنائی تعریف کر رہے ہو؟" سکندر بولے "یہ صاحب! کل شام تو ہمارا ارادہ تھا لسی پینے کا لیکن پھر وہ بات کچھ ایسی ہو گئی کہ ارادہ بدلنا پڑا۔"

"کیوں بھئی ایسی کیا بات ہو گئی؟"

بولے "کل شام جب ہم بازار سے سودا خرید کے اس حلوائی کی دکان کے سامنے سے گزر رہے تو سائرن بجنے لگا........ حلوائی نے ہمیں آواز دے کے کہا کہ "بھائی سکندر میاں...... لسی تیار ہے۔ آئیے روزہ کھولتے جائیے" ہم نے حلوائی سے کہا "بھائی صاحب! آپ کی لسی کی تعریف تو ہم نے بھی سنی ہے اور آپ کہتے ہیں تو جرور ہی آپ کی لسی ایک نمبر کی ہو گی۔ ہمارا دل لسی پینے کو بھی چاہ رہا ہے لیکن کیا کریں، ہم بہت مجبور ہیں........ ہم لسی سے روزہ نہیں کھول سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارا تو روزہ ہی نہیں ہے!!"

سکندر کو قدرتی مناظر وغیرہ سے بالکل کوئی دلچسپی نہیں۔ کالی گھٹا، ٹھنڈی ہوا، رنگین شفق، قوس قزح کی دھنک، بہتا ہوا جھرنا، ابھرتا ہوا چاند، چڑیوں کا چہکنا...... یہ سب کچھ انھیں بالکل نہیں بھاتا۔ ایک بار برسات کے موسم میں ان سے کسی نے کہا "سکندر! دیکھو کیا گھٹا چھائی ہے؟" برا سا منہ بنا کر بولے "ہاں ہاں! گھٹا چھائی ہے دیکھ رہے ہیں ہم۔ اب برسے گی تو آ کے مصیبت کھڑی کر دیوے گی۔ ہر طرف کیچڑ ہو جاوے گی پھسل پھسل کے لوگ ہائے اللہ گر پڑ گئے!"

کسی نے کہا "آج چودھویں کا چاند ہے...... کتنا خوبصورت لگ رہا ہے" سکندر نے بیزاری سے کہا "سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کم بخت چاند میں کیا اس بات کیا ہے جو سب اس کو دیکھیں ہیں...... چالیس سال سے ہم اس کو دیکھتے آ رہے ہیں...... نکلتا ہے...... ڈوبتا ہے...... اس میں آخر کیا خاص بات کیا ہے!"

ایک بار گرمیوں کی چھٹی میں جبکہ ہم لوگ نینی تال میں تھے۔ بیٹھے بٹھائے پکنک کا پروگرام بن گیا اور کھرپا تال (نینی تال سے چند میل نشیب میں واقع ایک خوبصورت سی وادی) جانا طے ہوا ——— سکندر کو معلوم ہوا تو بہت بددلی سے انھوں نے پکنک کا سامان تیار کرنا شروع کیا...... بہت خفگی سے بولے "سمجھ میں نہیں آتا یہ بیگم صاحب کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے؟...... اچھا بھلا گھر چھوڑ کر جنگل میں جانے کا پروگرام بنا لیتی ہیں۔ بھلا پوچھو...... اچھی خاصی میز کرسی چھوڑ کے وہاں کوڑے کرکٹ پر بیٹھ کے کھانا کھائیں گی۔ تال کے گندے پانی سے ہاتھ دھوئیں گی گھاس پہ ٹانگیں بچھائیں گی...... پھر آنے جانے میں جو تکلیف ہو گی سو الگ......!!" آخر کار اسی طرح بڑبڑاتے اور بڑبڑاتے ہوئے سکندر ہم لوگوں کے ساتھ کھرپا تال روانہ ہوئے...... جب کافی دیر ہو گئی اور سکندر کا مزاج بدستور بگڑا رہا، تو ہم میں سے کسی نے ان کو خوش کرنے کی خاطر ان سے کہا۔

"ارے سکندر! دیکھو تو کیسا خوبصورت منظر ہے!"

سکندر نے تیوری پر بل ڈال کے کہا "کدھر...... کدھر ہے منظر؟"

کہا گیا "دیکھو وہ سامنے کتنی خوبصورت پہاڑی ہے......... مویشی کس قدر خوش خوش ادھر ادھر گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ دیکھو چرواہا اپنی

بانسری بیٹے درخت کی شاخ پر بیٹھا ہے ......۔ سامنے جھرنا بہہ رہا ہے۔ ......!"

سکندر نے بہت ہی بُرا منہ بنا کے کہا "لو صاحب! یہ منظر ہو گیا۔ اس میں کیا خاص بات ہے ...... سامنے ایک اینٹ پتھر کا ٹیلہ ہے اس پہ اُگے ہوئے بیل گھاس چر رہے ہیں ...... ایک گندہ غلیظ کالا سا چھوکرا پیڑ پر اچھل کود رہا ہے اور جو شاخ ٹوٹی او ر آپ پڑے بچہ منہ کے بل جمیں پر تو پتہ چلے گا کہ چرواہا کیسے کہتے ہیں اور جھرنے کا کیا ہے ...... پانی اوپر سے گر رہا ہے تو نیچے کو تو آوے ہی ہے۔ سدا سے یہی کاندہ (قاعدہ) ہے دنیا کا۔ آپ اسے جھرنا بنائے دیں ہیں۔ اب ہم آپ کو کیا بھر مائیں۔"

سکندر کو قدرتی مناظر کے بعد اگر کسی چیز سے بے حد کر کے "نفرت" ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کہتے ہیں "صاحب! سمجھ میں نہیں آتا آخر بچوں سے فائدہ کیا ہے؟ ہر وقت دنگا فساد مچائے رہتے ہیں۔ رونے جھگڑتے ہیں اور ہر وقت ان کی دیکھ بھال الگ کرنا پڑتی ہے۔"

جس گھر میں بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہاں جانے سے سکندر ہمیشہ بچتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ بچے بھی سکندر کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کرتے ہیں جیسے کسی جیتے جاگتے انسان سے کیا جاتا ہے۔ گھر اور محلے بھر کے بچے سکندر کو ایک انوکھی مخلوق سمجھتے ہیں اور آئے دن سکندر کو اپنی شرارتوں کا مرکز بناتے رہتے ہیں۔ کبھی موقع پا کر سکندر کی سائیکل گھسیٹتے ہیں، کبھی سکندر کی نظر بچا کے ان کا حقہ چھپا دیتے ہیں، کبھی سکندر کی بے خبری پا کر ان کی ٹوپی جھپٹ لیتے ہیں۔ اس وقت سکندر کا غصہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور وہ معصوم بچوں کی شان میں ایسے ایسے الفاظ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ اگر بچوں کی مائیں سن لیں تو سکندر کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں لیکن بچے ان کی گالیوں سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں اور سکندر کا بھلا بُرا کہنا تو انہیں کسی دلچسپ کھیل کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔

میرے بچے سے سکندر عام طور سے نفار رہتے ہیں۔ یہ بچہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہے لیکن سکندر کو دیکھتے ہی اس کی خاموشی اور سنجیدگی یکدم غائب ہو جاتی ہے اور سکندر کو ستانے میں وہ سب سے آگے رہتا ہے ...... چنانچہ آئے دن سکندر اور اس بچے کے جھگڑے کا فیصلہ مجھے کرانا پڑتا ہے ...... دراصل سکندر اس بچے سے اس کی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی سے نفار رہتے ہیں۔ اس خفگی کے پیچھے ایک قصہ یہ ہے کہ جب بچہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کا تھا تو ایک دن اس کی آیا ایک دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلی گئی۔ مجھے کسی ضروری کام سے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے گھر سے باہر جانا تھا ناچار میں نے سکندر سے کہا کہ وہ میری غیر حاضری میں بچے کے پالنے کے پاس بیٹھے رہیں اور اس کی نگرانی کریں خلاف عادت سکندر نے حامی بھر لی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد میں لوٹی تو بچے کے کمرے سے سکندر کی باتیں کرنے کی آوازیں سن کے میں کمرے کے باہر ٹھٹک گئی۔ سکندر بچے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھے کہ

"ہم آپ سے اتنی دیر سے بات کر رہے ہیں اور آپ چپ ہیں ...... آخر ماجرا کیا ہے؟ آپ اگر کوشش کریں تو ضرور ہی بول سکتے ہیں۔"

یونہی پڑے پڑے بچہ ہنس دیا تو سکندر کا حوصلہ اور بڑھا اور وہ کہنے لگے:

"جب آپ ہنس سکتے ہیں تو بولتے ہیں ایسا کون سا زور پڑے گا آپ پہ! ہم اتنی دیر سے یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے قید بھگت رہے ہیں اور آپ ہیں کہ چپ چاپ پڑے ہوئے ہیں۔ بس انہی باتوں کی وجہ سے تو ہمیں بچے کو بے حد کر کے ناپسند ہیں۔"

میں اندر داخل ہوئی تو سکندر اسٹول سے اس طرح تھکے ہارے اٹھے جیسے کوسوں کا سفر کر کے آئے ہیں۔ جماہی لے کے بولے۔

"ارے بی بی! بڑی کڑی ڈیوٹی آج آپ نے ہماری لگا دی ...... ہم تو اکیلے بیٹھے بیٹھے عاجز آ گئے۔ عجیب بچہ ہیں یہ بھی ...... نہ اپنی

کہیں نہ ہماری منیں !!" بچہ دو تین سال کا تھا کہ ایک دن میری ایک بزرگ ملنے والی آگئیں .... انھوں نے جیسا کہ بڑوں کا قاعدہ ہے بچے کو گلے سے لگایا اور اس کو دعائیں دیتی ہوئی بولیں "ارے بس ایک ہی بچہ ہے؟" میں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا تو وہ اور بھی ہمدردی کرنے لگیں "ارے۔ ایک بچہ بھی کوئی بچے میں بچہ ہوتا ہے۔ چار پانچ بچے تو کم از کم گھر میں ہونے ہی چاہئیں۔ بچوں ہی سے تو گھر کی رونق ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ !"

جب وہ اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں تو سکندر بھی چائے پانی وغیرہ پلانے کے سلسلے میں کہیں آس پاس بھٹک رہے تھے اور ہماری بات چیت سنتے جاتے تھے۔ ان بیوی کے جانے کے بعد سکندر میرے سامنے آ کے کھڑے ہوئے اور بولے "بیگم صاحبہ .... وہ کہے جا رہی تھیں کہ بس ایک ہی بچہ ہے .... ارے صاحب ایک بچے نے تو آفت مچا رکھی ہے اور جو" کاس خدانخواستہ " وہ ایک اور ہوتے تو مجھے تو قیامت آ جاتی' اس گھر میں تو .... یہ تو ایک بھی بھاری ہیں سو بچوں پہ !" میں تو خیر سکندر کے اندازِ گفتگو سے واقف تھی اس لیے مجھے تو بڑا لطف آیا' ان کی اس بات سے' لیکن بچے کی دادی اور نانی نے اس دن سکندر کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔

سکندر کو اپنی زندگی میں صرف ایک چھوٹی سی بچی سے قدرے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی بھی ایک داستان ہے۔ ہمارے گھر میں تین پشتوں سے ملازموں کا ایک خاندان رہتا ہے۔ ایک ملازمہ ہے جس کی نانی کو میری نانی نے قحط کے زمانے میں خرید کے پالا تھا۔ اس کی بیٹی کو میری والدہ نے پالا پوسا اور اس کی شادی کر دی۔ یہ شادی ایسی مبارک ثابت ہوئی اور اولاد کا ایسا سلسلہ بندھا کہ ہمارے گھر میں گھر والے کم اور اس ملازمہ کا خاندان زیادہ نظر آنے لگا۔ اس کا شوہر بڑا نکما اور کام چور تھا۔

سکندر جس دن ہمارے وہاں نوکری کرنے کی نیت سے آئے تھے تو بس ایک ماہ پہلے ہی اس ملازمہ کی شادی ہوئی تھی۔ سکندر کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ وہ ایک ماہ لیٹ ہو گئے ورنہ سغری (ملازمہ کا نام) کا بیاہ انہی سے ہوتا۔

اتفاق کی بات ہے جب ۱۹۴۲-۴۳ء میں لڑائی کا عروج تھا' ایک دن سغری کا کوئی طعنہ سن کر اس کا شوہر "مبارک" فوج میں بھرتی ہو گیا اور اچانک لام پر چلا گیا .... کچھ عرصے تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر دو تین مہینے تک جب اس نے سغری کو کچھ رقم بھی خرچے کی .... تو سغری بہت فخر محسوس کرنے لگیں اور سکندر کو اور بھی زیادہ حقیر سمجھنے لگیں کہ سکندر تو ایک معمولی گھریلو ملازم ہی تھے اور اس کا شوہر ایک مانا ہوا فوجی تھا۔ آئے دن سکندر اور سغری کی جھڑپ ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن دوپہر کو جب گھر والے کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک ایک پولیس کانسٹیبل ایک سرکاری نوٹس لے کے آیا جس پر درج تھا کہ۔
"مبارک خاں مرحوم کے بال بچوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ لام پر کام آ گئے" وغیرہ وغیرہ !

اتفاق سے وہ نوٹس سکندر کے ہاتھ میں پڑا۔ بجائے افسوس کرنے کے وہ بڑے فخر اور خوشی سے گھر میں داخل ہوئے اور سغری سے مخاطب ہو کے بولے "لو بڑا ہر وقت فوج' فوج کرتی رہتی تھیں .... اب دیکھ لو ہو گئے نا مبارک خاں بھی "مروم" (مرحوم) !!"

سغری بیچاری پچھاڑیں کھانے لگی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سے بچے سہم کے رہ گئے۔ سارے گھر والے سغری کو دلاسہ دینے لگے .... کئی دن تک گھر پر بڑا سوگ طاری رہا۔ دھیرے دھیرے لوگ باگ اس واقعے کو بھولنے لگے۔ سغری غریب ہر وقت روتی رہتی تھی۔ اس نے چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ سفید کپڑے پہننے لگی تھی اور خود کو بیوہ کے روپ میں اس نے ڈھال لیا تھا۔

سغری کی سب سے چھوٹی بیٹی اختری اس وقت ڈھائی تین سال کی تھی۔ بڑی تندرست اور سرخ' نانی کی منہ چڑھی تھی۔ توتلا توتلا کے بولتی تھی اور بڑی بھولی بھالی نظر آتی تھی۔ سکندر بھی سغری کو دم دلاسہ دیتے رہتے تھے لیکن سغری ان کا نوٹس ہی نہ لیتی تھی۔ آخر سوچ بچار کے بعد سکندر نے ایک ترکیب

نکالی کہ افسری پر وہ بہت توجہ صرف کرنے لگے۔ اس کو بڑے چاؤ سے "بیٹی" کہتے تھے اور اس کے لیے پھل مٹھائی وغیرہ بھی روزانہ لے کے آتے تھے۔ دھیرے دھیرے افسری بھی ان سے مانوس ہو چلی.......

ہم لوگوں کو بڑی حیرت تھی کہ آخر سکندر نے کسی بچے سے کیونکر سمجھوتہ کر لیا ہے۔ ایک دن میرا گزر باورچی خانے کی طرف ہوا تو سکندر کی آواز سن کے میں ذرا کی ذرا باہر ہی رک گئی........ سکندر کے ہاتھ میں ایک کاغذ کی پڑیا تھی۔ اس میں دو لڈو تھے۔ سامنے لڈو پہ نظریں جمائے افسری بیٹھی تھی اور بار بار اس طرح زبان ہونٹوں پہ پھیر رہی تھی جیسے بھوکی بلی طشتری کے دودھ کی طرف دیکھتی ہے .....

سکندر بولے: "بیٹیا! لڈو کھاتے گی؟"

افسری نے آگے بڑھ کے زور سے گردن ہلائی اور ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

سکندر بولے: "ہم یہ لڈو تیرے ہی لیے لاتے ہیں!...... لیکن..... ایسے نہیں دیں گے....... بس ایک بار تو ہم کو ابا کہہ دے۔ یہ لڈو تیرے ہیں!"

صرف اتنی سی بات کہنے میں بچی کا کیا نقصان تھا اگر مٹھائی پانے کی یہی شرط تھی تو وہ سکندر تو کیا لڈو تک کو ابا کہنے پہ تیار تھی...... اس نے آگے بڑھ کے پڑیا سکندر سے چھینتے ہوئے کہا: "ابا لڈو دے دے!" سکندر خوشی سے کھل اٹھے۔ اپنے ٹیڑھے میڑھے سارے دانت باہر نکال دیے انھوں نے اور لڈو بچی کے حوالے کر دیے۔ بچی پڑیا لیتے ہی اچک کے سکندر کی پہنچ سے دور ہو گئی اور ایک کونے میں کھڑی ہو کے زور سے کہنے لگی: "تو ابا نہیں ہے۔ تو تو چھیکندر ہے چھیکندر...... چھیکندر چھیکندر......."

سکندر غصے سے بے حال ہو کے آگے بڑھے کہ میں اندر داخل ہو گئی۔ سکندر مجھے دیکھ کر پانی کے بلبلے کی مانند ایکدم بیٹھ گئے ..... اور حقہ گڑگڑانے لگے!!

اسی زمانے میں عید کا تہوار آ گیا۔ افسری کے اس واقعہ کے بعد بھی سکندر مایوس نہیں ہوتے تھے اور اپنی سی کوشش میں لگے رہتے تھے اور سفری کے جھڑکنے پھٹکارنے کے باوجود وہ سفری کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔

عید کے دن صبح ہی سے سفری نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ بالوں میں دھول ڈال لی اور اپنے شوہر کی ہر اس خوبی کو یاد کر کر کے رونے لگی جو اس بچارے مرے ہوئے آدمی پر سراسر بہتان تھا۔ سکندر صبح صبح چھڑی لے کر عید کی نماز پڑھنے گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو مردانے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے کورے کورے کھڑکھڑاتے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نیا جوتا چوں چوں کرتا ہوا ان کے پاؤں کاٹ رہا تھا۔ سر پہ کڑھی ہوئی ٹوپی تھی۔ ہاتھ میں ایک دونا تھا اس میں افسری کے لیے گرما گرم مٹھائی تھی.......

سکندر بلا وجہ ہنستے ہوئے ایک دروازے سے گھر میں داخل ہوئے اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ان کے بالکل سامنے والے زنانے دروازے سے سفری کا شوہر مبارک اپنی خاکی وردی پہنے داخل ہوا۔

سفری تو خوشی سے چیخ مار کے اس کی طرف دوڑی....... لیکن سکندر کے ہاتھوں سے مٹھائی کا دونا چھوٹ پڑا۔ ان کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہاتھ جھاڑ کے اس طرح ہکا بکا کھڑے ہو گئے جیسے انھوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد جب سکندر کے ہوش و حواس بجا ہونے لگے تو وہ بھی مبارک کی طرف بڑھے وہاں افسری کھڑی تھی۔ سکندر نے بچی پہ کڑی نظریں ڈالتے ہوئے کہا: "اری چڑیل! کیوں راستہ گھیرے کھڑی ہے..... چل دور ہٹ..... ادھر سے کاٹے کر رہنک رہی ہے!"

اور مبارک سے بڑے اُداس لہجے میں انھوں نے صرف اتنا کہا کہ "یہاں تو گھبرا گئی تھی کہ کاش کہ خدانخواستہ آپ ہو گئے "مرحوم"..... لیکن... اب ہم آپ کو کیا پہنائیں!"

مبارک کو ایک مہینے کی چھٹی ملی تھی۔ وہ کسی فوجی کنٹین میں بیرا ہو گیا تھا لیکن لڑائی اور فوج کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرتا تھا کہ سکندر دنگ رہ جاتے تھے اور ایک دن جب مبارک نے سکندر کو یہ واقعہ سنایا کہ' فوج کا بھی عجیب حال ہے سکندر بھائی .... وہاں تو ہر بات ہی کا ڈھنگ الگ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ایک چیز کہلاتی ہے پیراشوٹ!"

سکندر ڈرتے ہوئے بولے "آں ہاں! ہم جانتے ہیں اسے وہ ہوائی جہاز سے اُترنے کی چھتری ہوتی ہے!"

مبارک نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا "ایک دفعہ کیا ہوا سکندر بھائی...... کہ ہمارا جہاز سنگاپور کے اوپر اڑ رہا تھا ..... کچھ خطرہ دیکھ کے ہمارے افسر نے حکم دیا کہ فوراً اپنی اپنی چھتریاں کھولو اور نیچے اُتر پڑو۔ ہم لوگ جلدی جلدی چھتری کھول کے نیچے اتر پڑے.....سنگاپور میں بڑا خوبصورت شہر نظر آیا۔ بڑی رونق تھی وہاں، ہم نے سوچا ذرا دو ایک دن گھوم پھر لیں یہاں، کہ بس اچانک افسر نے ہمیں حکم دیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے اور واپس اڑ جاؤ اپنی ڈیوٹی پر"

سکندر نے مبارک کی زبانی فوج کا اتنا حال سُنا کہ وہ خود بھی فوج میں بھرتی ہونے کی سوچنے لگے۔ پہلے تو انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا..... پھر دوسرے نوکروں سے ذکر کیا ہوتے ہوتے گھر والوں تک سکندر کے فوج میں بھرتی ہونے کے فیصلے کی خبر پہنچی! شروع شروع میں تو سب لوگ سکندر کا اس سلسلے میں مذاق اُڑاتے رہے لیکن چند دن بعد جب معلوم ہوا کہ سکندر واقعی بہت سنجیدہ ہیں اور اکثر صبح شام وہ گھر سے غائب رہنے لگے اور ہر روز علی گڑھ کے اس پُرانے قلعے میں جانے لگے جہاں اُس زمانے میں اِدھر اُدھر سے بٹور کے فوجی بھرتی کیے جاتے تھے اور وہاں ان کو فوجی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ فوجیوں کی وردی سے وہ بہت مرعوب تھے اور صبح کے وقت جب سڑک پر سے فوجیوں کے ٹرک گزرتے تھے تو سکندر بڑی حسرت سے ان کو دیکھتے تھے۔

ہم لوگ ہر وقت ان کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ فوج کی زندگی اور اس کی پابندی سکندر کے بس کی چیز نہیں لیکن ایک دن سکندر کہیں سے ایک فارم بھروا لائے اور انھوں نے گھر آکے اطلاع دی کہ اب تو ان کو خوشی خوشی فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت دے دی جائے ورنہ وہ خود ہی غائب ہو جائیں گے۔ نوبت یہاں تک پہنچی تو مجبوراً انھیں اجازت دے دی گئی بلکہ ایک ملاقاتی کپتان پولیس نے سکندر کی بہادری، ہمت اور دلیری کی بھی بڑی تعریف کر دی گئی اور سکندر کو بڑی عزت سے رخصت کیا گیا۔

آٹھ دس دن تک سکندر کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایک دن کسی بچے نے بتایا کہ وہ فوجیوں کے ساتھ پریڈ کرتے ہوئے شمشاد بلڈنگ (یونیورسٹی کی مارکیٹ) میں دیکھے گئے ہیں۔ اسی شام کو سکندر جب ہم لوگوں سے ملنے گھر آئے تو فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ کسی بڑے جسیم فوجی کی وردی انھیں دے دی گئی تھی لہٰذا سکندر تو برائے نام نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف وردی ہی وردی نظر آتی تھی۔ سکندر نے آتے ہی ہم لوگوں کو فوجی سلام کیا اور بڑے فخر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ باورچی نظر آیا تو اس سے بولے "جا بھئی جا تو چولہا جھونک، یہاں کیا کر رہا ہے کھڑا کھڑا!"

کسی نے ان سے پوچھا "کیوں بھئی سکندر! فوج میں بھرتی ہو گئے تم، اب تو خوش ہو؟"

سکندر ہنس کے بولے "جی ہاں! بہت خوش ہیں اب تو ہم!"

"کیسی لگ رہی ہے فوج کی زندگی تمھیں؟" میں نے پوچھا۔

بولے: "اور تو سب ٹھیک ہے بی بی...... بس ذرا جوتے کی مشکل ہے!"

"جوتے کی مشکل! کیا مطلب ہے بھئی؟"

"وہ صاحب بات یہ ہے کہ فوج میں ہمارے سائز کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وردی ہے تو ۔۔۔ جوتا ہے تو ۔۔۔ سب یا تو ہمارے ناپ سے بڑے ہیں یا چھوٹے......... اب یہی دیکھئے نا......" یہ کہتے ہوئے سکندر نے اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنے ایک پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے آگے کھسکا دیا اور بولے "یہ جوتا ہے؟ اس کو جوتا کہیں ہیں؟ ارے صاحب! خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈھائی ڈھائی سیر اس ایک کا وزن ہے...... نیچے یہ بڑی بڑی کیلیں الگ جڑی ہیں۔ پھر بڑے سائز کا ہے تو بار بار ہمارا پاؤں اس میں سے نکلنے لگے ہے!! اور صاحب! حکم یہ ہے کہ دن بھر یہی وردی پہنے رہو اور ساتھ میں ہر دم یہی جوتا چڑھائے...... کسی وقت دل چاہے ہے کہ اپنا کرتا پاجامہ پہن کے چپل پاؤں میں ڈال کے گھومیں تو صاحب اجازت نہیں ہے! جمعدار جی بڑے کڑوے مزاج کے ہیں۔ ہر بات پہ کاٹے دوڑے بیٹھے ہیں۔ کل ہم جرا دیر کو دوپہر میں کمر سیدھی کرنے کو لیٹے رہے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھے آ کے ایک ہنٹر جڑ دیا انھوں نے! پھر بولے "کل سیدھے سیدھے پریڈ ہو رہی ہے۔"

"ابھی سو کے اٹھے تھے ہم، نہ تو ہمیں وقت دیتے منہ ہات دھونے کا...... چار بجے تھے چار ہی تک۔ تو چینے کو ملی نہیں تھی، فوراً کھڑا کر دیا سے جا کر ہمیں لین ڈوری میں! اور ڈانٹ ڈانٹ کے کہنے لگے کہ "دایاں ۔۔۔ بایاں ۔۔۔ دایاں ۔۔۔ بایاں ۔۔۔ اب صاحب یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ فوج میں ٹانگوں کو دایاں اور بایاں کہتے ہیں لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ دایاں کون سا پاؤں ہے اور بایاں کون سا ہے۔ اب جانے کیا پھیر پڑ جاتا تھا کہ جب جمعدار جی کہیں بایاں تو ہمارا شاید "دایاں" پاؤں اٹھ جاتا تھا اور جب وہ پکاریں "دایاں" تو ہمارا "بایاں" پاؤں بڑھ جاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پیچھے جو "رنگروٹ" تھا وہ ہمیں دیکھ دیکھ کر پاؤں بڑھاتا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی اس کے پیچھے والا بھی ایسا کرتا تھا۔ بس صاحب! قواعد میں جھگڑا پڑ گیا اور جمعدار جی ہماری جان کو آ گئے اور آگے بڑھ کے انھوں نے ہمیں اپنے بوٹ سے ٹھوکر ماری...... اور صاحب! بوٹ بھی کیسا بوٹ...... کہ پانچ سیر وزن اس کا...... ہم نے اس مصیبت سے جان بچانے کے لیے جمعدار جی سے کہا کہ ہمیں بیچ میں کھڑا کرنے کی بجائے سب سے آگے کھڑا کریں۔ جب ہی معاملہ ٹھیک ہوگا۔ وہ مان گئے اور ہمیں اس سے آگے کھڑا کر دیا اور لگے ڈانٹنے پھٹکارنے کہ "دایاں...... بایاں ۔۔۔ دایاں...... بایاں......" پھر صاحب! ہم جلدی جلدی پاؤں آگے پیچھے کرنے لگے کہ انھوں نے چیخ کے پریڈ ہی رکوا دی اور ہمیں گالیاں دینے لگے کہ پوری لائن ہی بگڑ گئی ہے اب کے تو لاؤ تو کیا کہیں صاحب...... اس دائیں بائیں نے بڑی مصیبت کر دی ہے ہماری!"

اس دن تو سکندر چلے گئے۔ تیسرے دن آئے تو بہت بجھے ہوئے تھے۔ وردی بھی میلی ہو چکی تھی اور سکندر کے چہرے پہ ایسی کمزوری تھی جیسے کسی بیمار کے چہرے پہ ہوتی ہے۔ کمرہ کے نیچے بیٹھ گئے اور بولے "ارے صاحب! ہم باز آ گئے اس فوج سے...... کسی طرح ہماری جان بچ جائے اس سے...... ہم تو بڑی مصیبت میں پھنس گئے!"

"کیوں بھئی کیا ہوا آخر؟"

سکندر اداسی سے بولے "ایک بات ہو تو کہیں صاحب! وہاں تو ہر بات ہی اوندھی ہے۔ ابھی دایاں بایاں ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کل ناشتے پہ جھگڑا ہو گیا۔ صبح صبح جو ہمیں کھانے کو ملا وہ ایسا تھا جیسا یہاں بھاری بھینس کو دیا جاتا ہے! جب ہم نے کہا کہ "یہ خدا آدمیوں کے

کھانے کی ہے؛ تو جمعدار جی ہم پر برس پڑے کہ فوج میں بھرتی ہوا ہے کہ بادشاہی تخت پر بیٹھا ہے۔ کل جمعہ کا دن تھا۔ ہم نے جمعدار جی سے کہا: "آج تو ہم نہائیں گے، مسجد جائیں گے نماز پڑھنے اور شام کو بچھی بہادر صاحب کے مزار پر قوالی سننے جائیں گے تو جمعدار جی نے ایک موٹی سی گالی ہمیں دی اور کہا کہ کیا پاگل خانے سے نکل کے آیا ہے؟ یہ فوج ہے کہ راج محل۔۔۔۔۔۔! ہم پرسوں شام کو یونہی ذرا بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھیوں کو مدار گیٹ والی لیلا بائی کا قصہ سنانے لگے کہ کیسی آن بان والی عورت ہیں وہ اور کیسے کوکین پھروشی کرنے ہوئے پکڑی گئیں اور کیسے چھ مہینے کی جیل کاٹ کے آئیں اور کیا گلا پایا انھوں نے! صاحب بس اتنی جراسی بات پر جمعدار جی نے آکے شور مچا دیا۔ گالیاں دیں، ایک بید بھی مارا اور بولے، "اسی لیے تو یہاں ہمارے فوجیوں کو بگاڑ رہا ہے۔ تجھے کس نے یہاں بھرتی ہونے کو بھیج دیا۔ تو تو جا کے سیدھے سیدھے کسی کوٹھے پہ طبلہ تھاپ!!"

آج صبح کہنے لگے کہ حکم آگیا ہے تیار رہو بس چار پانچ ہی دن میں کوچ کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔"

ہم نے جمعدار جی سے پوچھا۔ "جمعدار جی! کہاں جانا ہوگا؟"

بس صاحب اتنی سی بات پر بگڑ گئے۔ بولے "تجھے کیا ــــ کہاں جانا ہے۔۔۔۔۔۔ ارے جہاں بھیجنا ہوگا وہاں بھیج دیے جاؤ گے!!"

ہم نے کہا۔ "ہم یہ کیسے مان لیں جمعدار جی۔۔۔۔۔۔ ہم بھی بھلا کوئی مرغی ہیں کہ انڈے ہیں کہ جہاں چاہا بھیج دیا۔ جب تک بتاؤ گے نہیں ہم تو کھسکنے کے نہیں یہاں سے۔۔۔۔۔۔"

لوگ باگ ہنسنے لگے تو جمعدار جی نے ہمیں پھر گالی دی اور بولے "بکواس مت کرو۔۔۔۔۔۔ سیدھے سیدھے جانے کی تیاری کرلو۔۔۔۔۔۔"

ہم بھی اٹھ گئے صاحب کہ ایسا قاعدہ نہ سنا نہ دیکھا۔ آدمی جہاں جاتا ہے وہاں کا کچھ نام پتہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ٹکٹ ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کہ بس حکم دے دیا کہ چلنا ہے۔۔۔۔۔۔ ارے بھئی کہاں چلنا ہے؟ یہ تو بتا دو۔۔۔۔۔۔ لیکن صاحب فوج کی تو کوئی بات ہی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جمعدار جی کو نہ بتانا تھا نہ بتایا انھوں نے کہ کہاں جانا ہے؟ جب ہم نے ان سے کہا کہ ہم اپنے رشتے داروں کو کہاں کا پتہ دیں تو انھوں نے کہا کہ تمھارا نمبر لکھ کے دے دیا جائے گا ان کو ــــ اسی سے خط کتابت ہو سکتی ہے۔

اب صاحب ہم کوئی چور ہیں، اچکے ہیں، جو نمبر ہمارا بھی نمبر ہوگا۔۔۔۔۔۔ پر صاحب وہ تو اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔" اسی طرح سکندر میاں دس پندرہ دن تک ہر دوسرے تیسرے دن آ کے اپنا دکھڑا سناتے رہتے تھے۔ پہلے تو ہم لوگ ان کی درگت سے خوش ہوتے رہتے لیکن آخر میں جب ان کی حالت واقعی بہت تباہ ہوگئی تو بڑی کوششوں، طرح طرح کی سفارشوں اور میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کروا کے ان کو فوج سے چھٹکارا دلوایا گیا ــــ

سکندر فوج کے ذکر سے اب بہت بیزار ہو چکے ہیں ــــ اور اس طرح ہندوستان کی فوج، وطن کے اس سپاہی یعنی سکندر جیسے سورما کی خدمات سے محروم ہوگئی ــــ

سکندر فوج سے لوٹے تو کچھ دنوں بہت دل لگا کے کام کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے کام کاج میں پھر ڈھیل دینے لگے اور ایک دن کسی کام سے بازار گئے تو ایک گھنٹے کے بجائے چار گھنٹے میں گھر لوٹے۔ گھر میں اس دن کوئی دعوت وغیرہ تھی۔ مہمان آ چکے تھے مگر سکندر کا کوئی پتہ نہ تھا اور کھانے پینے کی وہ چیزیں بھی غائب تھیں جنھیں لینے سکندر بازار گئے تھے۔ گھر کی مالکن دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں اور مہمانوں کو طرح طرح کی باتوں میں مشغول رکھ رہی تھیں کہ خدا خدا کر کے میاں سکندر بلند سے بلند سے اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہوئے۔ موقع ایسا تھا کہ ان سے

کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا — جب مہمان وغیرہ چلے گئے تو مالکن نے سکندر پر غصہ اتارتے ہوئے کہا — "میں نے طے کر لیا ہے کہ آج کے بعد سے تم سے بازار کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔ تم نہایت کام چور آدمی ہو اور کسی ڈھنگ کے کام کی تم سے توقع رکھنا انتہائی حماقت ہے۔ تم تو بس باربرداری (بوجھ ڈھونا) کے قابل ہو!"

باربرداری کا لفظ سن کے سکندر کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور وہ بہت جھنجھلا کے بولے "لو صاحب اور سنو! چوبیس سال سے ہم رات دن سب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہر دم ہر گھڑی اس گھر کی "چلاق" میں لگے رہتے ہیں اور آپ کہتی ہیں کہ ہم بربادی کر رہے ہیں اس گھر کی! ایسی بات ہے تو لیجیے اپنا گھر سنبھالیے ہم تو جاتے ہیں......"

مالکن بھی اس دن غصے میں تھیں اس لیے فوراً ہی کہہ بیٹھیں "تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا ہمارے گھر کا کام تمھارے بغیر چل نہیں سکتا۔ تم ایک منٹ میں یہاں سے جا سکتے ہو اور آئندہ اس گھر میں کبھی قدم نہ رکھنا.........!"

سکندر بھی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ سیدھے اپنی کوٹھڑی میں پہنچے اور اپنا سامان وغیرہ باندھنے لگے اور رمالی سے انھوں نے ایک رکشا لانے کے لیے کہا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا —!! علی گڑھ میں اس زمانے میں نمائش ہو رہی تھی۔ سکندر کو ڈانٹ پھٹکار کر سب گھر والے نمائش دیکھنے چلے گئے — اتفاق سے اس دن وہاں بہت رات ہو گئی جب ہم لوگ گھر لوٹے تو دیکھا کہ سکندر صحن کے بیچوں بیچ پتھر کی چبوتری پر بیٹھے ہیں اور اپنا مفلر سر سے لپیٹے ہوئے سردی سے کانپ رہے ہیں اور ان کا سامان ان کے پاس رکھا ہوا ہے..... ہم لوگوں کو دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن تیور بتا رہے تھے کہ اب تک گھر والوں کی طرف سے دل صاف نہیں ہوا ہے ...... مالکن نے ان کو دیکھا تو بولیں۔

"کیوں؟ گئے نہیں تم اب تک؟"

سکندر غصے میں کانپتے ہوئے بولے۔

"جانے کو کیا ہوا؟ کیا ہم جا نہیں سکتے؟ کیا ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؟ کیا ریل گاڑیاں بند ہو گئیں ہیں جو ہم جا نہیں سکتے!"

کسی نے پھر سکندر کو چھیڑا! "پھر گئے کیوں نہیں آخر؟"

اب سکندر آپے سے باہر ہو چکے تھے۔ گرج کے بولے۔

"آپ لوگوں کا کیا ہے....... وقت دیکھتے ہیں نہ موسم ..... بس سب کو تفریح کی پڑی رہتی ہے۔ سب کے سب چل دیے نمائش دیکھنے...... اور جو کاس کھدا نہ کھاستہ ہم بھی چلے جاتے اور ہمارا گھر کوئی لوٹ لے جاتا..... تو...... آپ لوگوں کا کیا جاتا۔ .....!!"

یہ فقرے سن کے ہم سب کے سر شرمندگی سے جھک گئے اور خاموشی سے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مالکن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے سکندر کو ڈانٹ کے کہا۔

"کیوں سردی میں کھڑا کھڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ باورچی خانے میں جا کے کچھ کھا پی اور اپنی کوٹھڑی میں جا کے مر۔ یہاں کیوں جاڑے میں صورت بنا رہا ہے۔ بیمار ہو جائے گا تو گھر کا کام کون کرے گا؟ کام چور کہیں کا!!"

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے سکندر کے وطن سے ان کے نام ایک خط آیا — سکندر کو اپنی ڈاک کا بہت انتظار رہتا ہے اور ہفتے دس دن میں ان کے نام ضرور ایک نہ ایک خط ان کے گھر سے آ جاتا ہے..... عجیب بات یہ ہے کہ چوبیس سال کی مدت میں ان کے

نام جتنے خط آتے ہیں ان سب کا مضمون تقریباً یکساں ہوتا ہے، صرف بھیجنے والے کے نام میں کبھی کبھی فرق ہو جاتا ہے...... ہر خط میں سکندر سے کوئی نہ کوئی فرمائش یا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کسی نہ کسی کا قرضہ چکانا لکھا ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاج کے لیے رقم درکار ہوتی ہے۔ گھر کی مرمت کے لیے پچاس ساٹھ روپیوں کا سوال ہوتا ہے۔ آج تک ان میں سے کوئی سکندر کے کام نہیں آیا ہے، کسی نے سکندر کی کبھی کوئی مدد نہیں کی۔ سکندر کو وطن جانے پر کسی نے مہمان نہیں رکھا بلکہ الٹا سکندر سے پیسے لے لے کے گھر کا خرچ چلایا ہے......
لیکن سکندر ہیں کہ سب پر جان چھڑکتے رہتے ہیں۔ ہر سال محرم کے زمانے میں دس دن کی چھٹی لے کے اپنے وطن بدایوں جاتے ہیں اور جو کچھ بھی جمع پونجی، قرض لی گئی رقم یا پیشگی تنخواہ ہوتی ہے سب اپنے ان خود ساختہ رشتے داروں پر خرچ کر آتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو بہت برا مانتے ہیں اور کہتے ہیں: "صاحب! ہم تو اپنے 'ماں باپوں' کو چھوڑیں گے نہیں!"

یہ ماں اور باپوں کا لطیفہ بھی کم دلچسپ اور عبرتناک نہیں۔ سنا ہے جب سکندر پیدا ہوئے تو ان کے ماں باپ دونوں زندہ تھے۔ کچھ عرصے کے بعد سکندر کی ماں کا انتقال ہو گیا اور ان کے باپ نے کسی عورت سے شادی کر لی جسے سکندر ماں کہنے لگے...... عجب اتفاق کہ آٹھ دس سال کے بعد سکندر کے والد بھی چل بسے اور اس عورت نے کسی اور آدمی سے شادی کر لی..... اور سکندر اس آدمی کو باپ کہنے لگے! لاکھ لاکھ سمجھاؤ کہ بھئی تمھارے لیے یہ عورت اور مرد دونوں قطعاً اجنبی ہیں لیکن سکندر کسی طرح یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتے ہیں کہ ان کے "ماں باپوں" میں کوئی گڑبڑ ہے...... ان دونوں ماں باپوں نے بھی سکندر کو لوٹنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ سکندر کی پوری کمائی انہی کے حصے میں آتی ہے... ایک دفعہ میں نے سکندر کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور ان سے کہا کہ تمھارے یہ سارے رشتے دار بڑے خود غرض اور لٹیرے قسم کے ہیں۔ اپنی تمام ضرورتیں تم سے پوری کرا لیتے ہیں اور تمھاری شادی تک کہیں نہیں کرا سکے ہیں..... چونکہ شادی کا ذکر آ پڑا تھا لہٰذا سکندر کے دل کو یہ بات لگ گئی اور انھوں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے کے اپنے گھر جانے کی ٹھانی اور ہم لوگوں سے کہہ گئے کہ اب کی بار تو ضرور ہی وہ شادی کر کے اور "ان کو" ساتھ لے کے لوٹیں گے!! جب ایک ہفتہ گزر گیا اور سکندر نہیں لوٹے تو سب کو بڑی فکر ہوئی کہ آخر ہوا کیا۔ سکندر تو اس معاملے میں بڑی پابندی کے قائل تھے۔ چھٹی ختم ہونے پر ایک دن بھی زیادہ وہ کہیں نہیں رکتے تھے۔ —— آٹھویں دن سکندر کا ایک ہم وطن چپراسی آیا اور اس نے ایک لفافہ دیا جو سکندر نے اس کو دیا تھا کہ گھر جا کے مالکن کو دے آئے۔

خط کھولا گیا تو اس میں درج تھا:

"بیگم صاحب —— ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہم وقت پر گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ یوں کہ آپ کی دعا سے ہمارے 'ماں باپوں' نے یہاں ایک جگہ ہمارے 'رشتے' کی بات چیت چلا رکھی ہے —— آج لڑکی والوں نے ہم کو اپنے گھر بلایا ہے، دیکھنے کو —— ہم خود بھی چاہتے ہیں کہ اس دفعہ یہ ہماری شادی کا رگڑا (جھگڑا) جو ہے ختم ہو جائے۔ ہم اپنے دوست کے ہاتوں یہ گستی (دستی) خط بھجوا رہے ہیں!"

اس خط کے پہنچنے کے دس دن بعد سکندر بے حد خوش و خرم گھر میں داخل ہوئے...... سب گھر والوں نے ان کو گھیر لیا، یہ سوچ کر کہ سکندر [illegible] ہیں........

کسی نے پوچھا: "کیوں سکندر آ گئے؟"

بولے: "آں ہاں! ہم آ گئے۔"

ایک بچے نے آگے بڑھ کے پوچھا" تمھاری شادی ہوگئی سکندر ؟"

سکندر نے جذبات سے خالی لہجے میں جواب دیا " نہیں ...... شادی تو نہیں ہوئی ہماری !"

"ارے ...... رے ...... رے اس بار بھی تم کنوارے کے کنوارے لوٹ آئے ...... ابھی تم نے تو اپنے گستی خط میں لکھا تھا کہ تم بر دکھوا کو جا رہے ہو !"

سکندر نے اطمینان سے پتھر پہ بیٹھتے ہوئے کہا "بات ذرا لمبی ہے ... بیگم صاحب ... فرصت سے سنائیں گے ہم اس قصے کو ۔"

لیکن ایسا دلچسپ قصہ سننے کے لیے فرصت کا انتظار کسے تھا سب لوگ سکندر سے اصرار کرنے لگے کہ پورا حال ابھی سنا دیں ۔

سکندر بھی اب قصہ سنانے کے موڈ میں آ چکے تھے ۔ کہنے لگے " صاحب ! ہمارے پڑوس میں ایک منشی جی رہتے ہیں ' ان کی دو بیٹیاں ہیں ایک بیٹی اپنے گھر میں خوش ہے اور اپنے آدمی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے ۔ دوسری بیٹی یہیں اندر میں بیاہی تھی ۔ اس کا گھر والا ٹھیک آدمی نہیں تھا اور سسرال والے بھی اچھے نہیں تھے ...... اس لیے وہ لڑکی اپنے میکے آ کے رہنے لگی تھی اور اس نے صاف صاف اپنے ماں باپوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کو دوبارہ اس کی سسرال بھیجا گیا تو اپنی جان کی گھوس کھسی (خودکشی) کر لے گی ۔ اب پانچ سال سے وہ اپنے میکے میں بیٹھی تھیں ۔ اس کا آدمی بار بار اس کو لینے آتا تھا لیکن اس نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا ۔ اس کے میکے والوں نے سوچا کہ کہیں دوسرا گھر اس کے لیے دیکھا جائے ۔ انھیں اچھے داماد کی تلاش تھی کہ ہمارا تذکرہ چھڑ گیا ۔ ہمارے ذکر پر سننے میں وہ کچھ کچھ راضی ہونے لگی تھیں ۔ انھوں نے " یہ شرط رکھ دی تھی کہ اب کی دفعہ وہ اندھے کنویں میں نہیں گریں گی بلکہ دروازے کی آڑ سے خود بھی " لڑکے " کو دیکھیں گی ۔ ہمیں یہ روداد (روداد) معلوم ہوئی تو ہم نے کہا کہ ہمیں ان کی یہ شرط بھی منظور ہے اور اسی دن شام کو ہم ان کے گھر پہنچے وہاں ہماری بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ شربت پلایا گیا ' پان کھلایا گیا اور " ان " کے چچا نے ہم سے کہا کہ آپ خاطر جمع رکھیں شاید آپ کی قسمت کھلنے والی ہے اور شاید ہم آپ کو اپنی " گلامی " (غلامی) میں لینے والے ہیں ۔ ہم یہ سن کے اپنے گھر چلے آئے ۔ دوسرے دن جب سارا دن گزر گیا اور شام بھی ڈھلنے لگی تو ہم " ان " کے گھر پہنچے ...... وہاں جا کے پتہ چلا کہ ہمارے آنے کے بعد سے جو " انھوں نے رونا شروع کیا تو رات بھر روتی رہیں اور صبح سویرے اٹھ کے رکشا منگوا کے اپنے شوہر کے گھر چلی گئیں ۔

ہم سب کا مارے ہنسی کے برا حال تھا ۔ میں نے کہا " واہ سکندر واہ ...... یہ بھی خوب ہوا ... تمھیں تو اس قصے سے بڑا دکھ ہوا ہوگا !"

سکندر نے ذرا سا پہلو بدلا ۔ کچھ مایوسی سی ان کی آنکھوں میں جھلکی لیکن وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولے " دکھ کی کیا بات ہے بی بی ! ہم تو بہت خوش ہیں کہ ہماری وجہ سے کسی کا گھر تو بس گیا !!"

پھر وہ آہستہ آہستہ چل کے پانی کے نل کی طرف گئے اور جوتے اتار کے اکڑوں بیٹھ کے سر جھکا کے اپنے پاؤں دھونے لگے ' جیسے اب ان کی زندگی میں یہی ایک اہم کام باقی رہ گیا ہو !

میری شادی کی پچیسویں سالگرہ

(ایک تقریر)

فکر تونسوی

(پچیس سال پہلے والدین نے سازش کرکے میری شادی کردی تھی۔ اور پچیس سال بعد احباب نے سازش کرکے میری شادی کی پچیسویں سالگرہ منا ڈالی۔ اس "تقریب سعید" پر مجھے بھی تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ تحریری تقریر سوائے میری اہلیہ محترمہ کے سبھوں نے پسند کی)

محترم خاوندو! بیویو! — اور ناکتخداؤ!

آپ حضرات نے میری شادی کی پچیسویں سالگرہ منا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک انتہائی بھونڈی بات بھی بڑے خوبصورت شائل سے کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ ایک شاعرانہ خصوصیت ہے۔ لہٰذا مجھے شبہ ہے آپ سب حضرات شاعر ہیں۔

مگر جناب! ہر شاعری میں ایک نقص بھی ہوتا ہے۔ اور وہ نقص ہے مبالغہ آرائی کا۔ چنانچہ آپ سب نے اتفاق رائے سے مبالغہ کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ ہم ایک "آئیڈیل جوڑا" ہیں تو گویا آپ نے ہم میاں بیوی کے گذشتہ پچیس سال کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ ہماری شادی کو پچیس برس گزر چکے ہیں تو مجھے فطرتِ انسانی پر بے حد ترس آیا۔ جو بیچاری اپنی قوتِ برداشت کی بُری طرح شکار ہے — صاحبان! پچیس برس تک شادی شدہ رہنا بے حِسی کی بدترین مثال ہے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ پچیس برس تک دُودھ کی نہر میں بیٹھے نہاتے رہیئے تو میرا خیال ہے، پچیس گھنٹوں ہی میں دودھ کی بُو سے آپ کی ناک سڑ جائے گی اور آپ نہر میں شگاف کرکے اُسے توڑ ڈالیں گے — لیکن پورے پچیس سال تک ہم دونوں میاں بیوی نے ایک دُوسرے کی نہر کو نہیں توڑا۔ تو اُس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دودھ کی نہر اور انسانی فطرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر میری بیوی دُودھ کی نہر ہوتی تو آج مجھ سے کٹ کر کسی مندر کی ہیڈ پجارن یا کسی ماننے سری سکول کی انچارج بن چکی ہوتی۔ اور آج کی محفل میں گلابی غرارا پہن کر یوں مرغی کی طرح اٹھلاتی نہ پھرتی۔

دوستو! اِس مرحلہ پر میری بیوی طفلانہ حد تک بھڑک سکتی ہے اور کہہ سکتی ہے کہ اگر وہ ہیڈ پجارن ہوتی تو آپ کیا ہوتے؟ [illegible] ہے کہ میرے لیے بہترین راستہ تو یہ تھا کہ میں دنیا تیاگ دیتا۔ (کیونکہ اگر دنیا نہ تیاگی جائے تو لوگ کہتے ہیں دوسری شادی [illegible] کے لیے ضروری ہے کہ انسان کم سے کم گوتم بُدھ ہو۔ میں نے گذشتہ پچیس برس میں پچیس مرتبہ گوتم بدھ بننے کی [illegible] پر ہارپتی کی مباؤں نے مجھے ڈرا دیا۔ اور جس رات بھی کسی بتے کے ساتھ رومانس کرنے گئی ہوئی ہوتی، اُس رات

کوئی بچہ رونے لگتا یا گشت کا سپاہی ہانک لگانے لگتا اور میں گوتم بدھ بنتے بنتے رُک جاتا۔ اس سے اگرچہ دنیا میرے عظیم پیغام سے محروم رہ گئی لیکن انشورنس کمپنی کو بڑا فائدہ پہنچا کہ اُسے میرے بیمہ کی قسط برابر پہنچتی رہی۔ شادی کے فوراً بعد مجھے کسی نے ڈانٹ پلائی تھی کہ اب تم گرہستی ہو گئے ہو اس لیے اب اگر تم مر گئے تو تمہارے ساتھ تمہارے بیوی بچے مرنا پسند نہیں کریں گے اس لیے پسماندگان کو زندہ رکھنے کی خاطر تم بیمہ ضرور کروا لو۔

برادران! بات یہ ہے کہ دراصل گوتم بدھ کو وہ دقتیں درپیش نہیں تھیں جو مجھے ہیں کیونکہ اس نے بیمہ نہیں کروایا تھا۔ میرے ایسے اَن گنت خاوند بلّی کی میاؤں کا شکار ہیں۔ اور شاید یہ بات صحیح ہو کہ جو خاوند بلّی کی میاؤں سے ڈرتا ہے وہی معزز اور آئیڈیل گرہستی کہلاتا ہے۔ بلّی کی میاؤں ہی گرہست کے ناموس کو بچاتی ہے —— حضرات! آپ میں سے کونسا خاوند ہے جو گوتم بدھ نہیں بننا چاہتا۔ اور کونسی بیوی ہے جو "میراں" بننے کے لیے مارکیٹ میں تنبورے کا ریٹ نہیں پوچھتی پھرتی۔

جب لمبے قد اور چھوٹی مونچھوں والے برہمن نے معطّر اگنی کے سامنے مقدّس منتر پڑھتے ہوئے حکم دیا تھا "دولہا اور دلہن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں" تو بیوی کے ہاتھ کے لمس سے میرے بدن میں ایک تیز سی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ حضرات! بعد میں مجھے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ سنسنی دراصل ہمارے جوان اور راحتی خون کی تھی —— یاد رکھئے، یہ ڈاکٹر لوگ صرف علم الاعضا میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ محبت، رومانس، حُسن، ہجر، جذبہ، دھڑکن وغیرہ اشیا کو صرف خون ٹیسٹ کرنے والے آلہ سے ناپتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے جناب! اگر برہمن کا رول ڈاکٹر لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو بیاہ کی مہندی اور ہسپتال کی اپریشن ٹیبل میں کوئی فرق باقی نہ رہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ سرجری کی بنیاد پہ کوئی شادی ہو بھی سکتی یا نہیں؟

میں سرجری کے خلاف نہیں ہوں لیکن میں شاعری کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ جو دل کی دھڑکن اور جسم کی سُستی کو مبالغہ کا شکار بنا کر محبت کہہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُس لمحہ کے بعد ویسی سنسنی مجھے پھر کبھی نہیں ہوئی۔ پچیس برس سے میں اُس سنسنی کی دوبارہ آمد کا انتظار کر رہا ہوں۔ لیکن وہ نہیں آئی بلکہ اُس کی بجائے بچے آئے، رشتہ دار آئے، بِل آئے، راشن آیا۔ حتیٰ کہ ایک بار پولیس کا سپاہی بھی آگیا۔ جو میرے قرضہ کے وارنٹ گرفتاری لے کر آیا تھا۔ میں نے ہزار بار بیوی کا ہاتھ پکڑا، لیکن ہمیشہ یوں لگا، جیسے میرا ہاتھ کسی کرسی پر جا پڑا ہے، کسی ایش ٹرے کو چھُو رہا ہے، کسی تولئے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

لیکن جناب عالی! میرا اور میری بیوی کا (مشترکہ) کمال یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو تولیہ یا ایش ٹرے نہیں کہا۔ آئیڈیل گرہستی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کے زوال کا ذکر نہ کیا جائے بلکہ گندم کی مہنگائی اور پڑوسن کی خود غرضی کا ذکر کیا جائے اور جتنی شد و مد سے ذکر کیا جائے گا، اُتنا جذبات کا زوال کم محسوس ہوگا۔ دوستو! وہ لمحہ گرہستی زندگی میں بڑا نازک ترین لمحہ ہوتا ہے، جب گندم سستی ہو جائے اور پڑوسن سے تعلقات خوشگوار ہو جائیں۔ اُس لمحے میاں بیوی خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ اور ویرانی بہت ستاتی ہے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے سے ہی لڑ پڑتے ہیں، ایک دوسرے کو ایش [illegible] کہہ دیتے ہیں اور یہی وہ نادر موقع ہوتا ہے، جب وہ ایک دوسرے کو طلاق بھی دے ڈالتے ہیں —— لہٰذا [illegible] ازدواجی زندگی کا راز اسی میں ہے کہ گندم مہنگی رہے، پڑوسن سے تنازعہ جاری رہے اور بچے متواتر پیدا ہوتے رہیں [illegible] خالی نہ رہے۔ کیونکہ بھرے پڑے میدان میں ہی محبت زندہ رہتی ہے۔ بیوی کے ہونٹ گلابی محسوس ہوتے ہیں۔ اور سنسنی کی آمد کا انتظار بڑا لذید ہوتا ہے۔

ابھی ابھی ایک دوست آپ کو بتا گئے ہیں کہ میرے ازدواجی تجربات بڑے قیمتی ہیں اور آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اٹھائیں گی چنانچہ جناب! میں آئندہ نسلوں کو باآواز بلند ایک قیمتی بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ شادی نیچرل چیز نہیں ہے۔ آپ غصہ میں مت آئیے میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے پاؤں سے چلنا نیچرل چیز ہے، پانی پینا نیچرل چیز ہے' گھاس کا اُگنا نیچرل چیز ہے۔ اس حساب سے شادی نیچرل چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کی ذاتی اختراع ہے۔ اصل میں انسان کو اختراعات کا بڑا شوق ہے۔ مثلاً وہ چابی بھر کر چلنے والی پُتلی ایجاد کرتا ہے، پانی کو برف کی طرح جمانے کا طریقہ ایجاد کرتا ہے' پینٹر ایجاد کرتا ہے جو رنگ اور بُرش سے گھاس کی ہوبہو ہری پتیاں بنا دیتے ہیں ـــ بالکل اسی طرح انسان نے شادی بھی ایجاد کر ڈالی۔ اس ایجاد کے ذریعے وہ ایک مرد اور عورت کو اکٹھا کر دیتا ہے اور اُسی طرح کر دیتا ہے جیسے وہ میز کے ساتھ کُرسی بنا دیتا ہے۔ بارش کے لیے چھتری بنا دیتا ہے اور اُسے وہ اپنا آرٹ کہتا ہے۔ برادران! انسان نے آج تک نیچر کے خلاف جتنے کام کئے ہیں وہ اُس کا آرٹ کہلائے ہیں۔ ذرا غور کیجئے۔ اگر سماج میری اہلیہ کو چھتری قرار نہ دیتا تو نیچر کے اولوں سے میرے گنجے سر کا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔

چونکہ شادی نیچرل چیز نہیں ہے بلکہ انسان کی ایجاد ہے۔ اس لیے نیچر کی طرح پرفیکٹ نہیں ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت کا زندگی اکٹھے رہنا ایک ٹیکنیکل کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی خاوند کو اچھی بیوی نہیں ملی اور کسی بیوی کو اچھا خاوند نہیں ملا۔ صاحبان! اچھے خاوندوں کے لیے بُری بیویوں کی اور بُرے خاوندوں کے لیے اچھی بیویوں کی بہتات پائی جاتی ہے۔ مگر میری اہلیہ محترمہ غور سے سُن لیں کہ وہ ایک اچھی بیوی ہیں۔ اور اگر میرے متعلق بھی اُن کا یہی خیال ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ بے ہوش ہو جائیں تو میں ان کے چہرے پر گلاب کا پانی ضرور چھڑکوں گا اور جواباً وہ بھی اپنی گھنی لمبی پلکیں اُٹھا کر یہ ضرور کہیں گی "پیارے! تم کتنے اچھے ہو"

حضرات! میں مانتا ہوں کہ گلاب کا پانی ایک ڈاکٹر بھی چھڑک سکتا ہے لیکن ڈاکٹر کی پرابلم یہ ہے کہ وہ سال میں ایک آدھ مرتبہ ہمارے گھر آتا ہے اور میں ہر روز گھر آ جاتا ہوں اور انسان صرف اُسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے' اُسی چیز کو پیارا کہہ سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ اُس کے نزدیک رہے۔ مثلاً "میری جرابیں" بیوی کی چوڑیاں "بچے کی گُڑیا۔ جناب! میں تو اس چڑیا کو بھی "پیاری" سمجھتا ہوں جو صرف میرے ہی گھر میں گھونسلہ بنا کر رہتی ہے اور کہیں نہیں جاتی۔ حتیٰ کہ وہ کئی بار ہمارے گھر میں بچے بھی دے چکی ہے۔

میری بیوی اور چڑیا میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ چڑیا کے بچوں کی تعداد ہمارے بچوں سے زیادہ ہے اور بس!

اور میرا تیسرا تجربہ یہ ہے کہ بچے پیدا کرنا ایک نہایت ہی معمولی فعل ہے۔ جو لوگ بچے پیدا نہیں کرتے وہ صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو غیر معمولی فعل میں یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً پیغمبری کرنا، خدا کی تلاش کرنا، شہید ہونا۔ حتیٰ کہ ایک صاحب تو کبوتروں کی مختلف اقسام کی چھان بین کے غیر معمولی فعل میں اتنے مگن ہو گئے کہ لاولد مر گئے ـــ لیکن مجھے اور میری بیوی کو نہ پیغمبری کا شوق ہے نہ کبوتروں کا۔ کیونکہ ہم دونوں معمولی انسان ہیں بلکہ جب ہماری شادی کے پانچ سال بعد تک ہمارے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا تو پڑوسی [illegible] نگاہ سے دیکھتے تھے جیسے ہم سمگلر ہوں۔ بچوں کے جھولے بنانے اور بڑھئی ہماری طرف دیکھتا تو ناک سکوڑ لیتا۔ ایک [illegible] قرض دینے سے انکار کر دیا تھا کہ بانجھ لوگوں کا کیا اعتبار ہے، کب خودکشی کر جائیں یا پیغمبر بن جائیں اور قرضہ ڈوب جائے۔ اور جب پہلا بچہ تولد ہوا تو اُس نے آتے ہی حالات نارمل کر دیئے۔ جھولے والے بڑھئی سے لے کر زائچہ بنانے والے جیوتشی تک سب نے یہی کہا کہ بچہ بڑا بھاگوان ہے اور بڑا ہو کر بادشاہ بنے گا اور خاندان کا نام روشن کرے گا ـــ چنانچہ ہمارا

وہ پہلا فرزند ارجمند گذشتہ دنوں نوکری نہ ملنے کی وجہ سے گھر سے نکل کر نجانے کہاں بھاگ گیا ہے اور دکاندار سے لے کر شری کیدارناتھ ریٹائرڈ ایڈووکیٹ تک سبھی یہ کہہ رہے ہیں کہ بھگوان نالائق اولاد کسی کو نہ دے۔

مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ بھگوان نالائق اولاد بھی دے اور لائق بھی۔ لیکن سب سے زیادہ اولاد وہ دے جو درمیانہ قسم کی ہو۔ آئیڈیل گرہستی زندگی صرف درمیانہ اولاد کے سہارے ہی چلتی رہی ہے۔ نہ صرف گرہستی زندگی بلکہ خدا کی ساری خدائی بھی۔ میں، میری بیوی اور آپ سب درمیانہ قسم کی اولاد ہیں، خدا کی خدائی ہم سے قائم ہے۔ ہم تمنائے خداوندی ہیں۔ ہم مقصدِ تخلیق ہیں۔ میری بیوی نے جب جب بھی مندر میں جا کر پرارتھنا کی، جب جب خدا نے ہمیں ایک درمیانہ بچہ عطا کر دیا۔ اور جب جب بھی پرارتھنا کے بغیر بچہ پیدا ہوا وہ لائق نکل آیا یا نالائق۔ اور میری بیوی گواہ ہے کہ نہ نالائق بچے ہمارے کام آئے نہ لائق۔ ایک لائق بچہ فلاسفر بن گیا اور ایک نالائق بچہ نوکری حاصل نہ کر سکا اور بھاگ گیا۔

بھائیو اور بہنو! بچوں کی پرورش اور تربیت کے مسئلہ پر میں اپنا کوئی تجربہ بیان نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس مسئلہ پر ہزاروں کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں آپ انھیں پڑھ سکتے ہیں۔ ہمارا جو لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے اُس کی پرورش کے لیے میں نے ڈیڑھ سو کتابیں پڑھی تھیں ——— اور اُس کے بھاگ جانے کے بعد وہ تمام کتابیں ایک لائبریری کو دان میں دے دی ہیں۔

میرا خیال ہے جناب! کہ معمولی رکھ رکھاؤ کے علاوہ بچوں کی تربیت پر زیادہ مغز پچی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بچے خود بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ کئی نالائق والدین کے بچوں کو جب میں وزیر اور ادیب بنتے دیکھتا ہوں تو والدین پر سے میرا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ میری اہلیہ محترمہ نے لاکھ کوشش کی کہ ہمارا منجھلا لڑکا بازاری گالیاں سیکھ جائے جو اُسے اپنی ماں کے زیرِ سایہ مل رہی ہیں۔ مگر لڑکا بالکل بُدھو نکلا یعنی ہمیشہ سر نیہوڑا کر چلتا ہے۔ میرے ایک اور بچے کا خیال ہے کہ ڈیڈی مجھے تو مضمون پولیٹیکل سائنس پڑھا رہے ہیں حالانکہ میں ٹیکسی ڈرائیور بنوں گا۔ اسی طرح میری ایک چھوٹی بچی ہمیشہ اپنی سہیلیوں کی پٹائی کر کے گھر آتی ہے۔ حالانکہ اُس کے لہو میں ہماری گذشتہ آٹھ نسلوں کا شریفانہ کلچر گھلا ہوا ہے۔ اگر وہ بڑی ہو کر کسی ملک کی ڈکٹیٹر نہ بنی تو یہ ایک انتہائی غلط بات ہوگی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بچوں سے پیار نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بچوں سے اتنا گہرا پیار ہے کہ یہ پیار میری بیوی کی آنکھوں میں کئی بار کھٹکا ہے۔ لیکن پیار میرا ذاتی پرابلم ہے، بچوں کا نہیں۔ ورنہ بچے اپنی تربیت خود کر لیتے ہیں۔ اپنی ترقی، اپنا مستقبل، اپنی نفرت، اپنا حسد، اپنے رجحان کا تصفیہ وہ خود کرتے ہیں۔ اور یہ تصفیہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! شاستر انوسار آج ہمارا گرہست آشرم کا پیریڈ ختم ہو چکا۔ اور بان پرستھ آشرم شروع ہو گیا۔ لہٰذا کل میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اب ہمیں بن کی طرف نکل جانا چاہیئے لیکن وہ ٹال مٹول کرنے لگی۔ مشکل یہ ہے کہ اُس کی کوئی پڑوسن، کوئی سہیلی آج تک بن میں نہیں گئی۔ میں نہیں جانتا یہ شاستروں کی توہین ہے یا شاستروں کے احکام میں کوئی خامی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ شاستروں کی فروخت ممنوع قرار دے دی جائے۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اُن کے احکام پر عمل کروانے کے لیے کوئی قانون ضرور بنائے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاستروں کے احکام صحیح ہیں۔ غلطی صرف میری بیوی میں ہے۔

ایک مرحلہ پر میری بیوی اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ وہ بن میں چلنے کے لیے تیار ہے۔ مگر اس شرط پر کہ ہم دونوں ایک ہی کٹیا میں رہیں۔ لیکن یہ تجویز مجھے "سوٹ" نہیں کرتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ تم ڈنڈک بن میں جاؤ اور میں ... بن کی طرف نکل جاتا

ہوں۔ جناب! جب ہندوستان میں بہت سے بن موجود ہیں تو کیوں نہ اُن سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ لیکن افسوس! میری بیوی کا ٹمپریمنٹ اتنا ڈیولپ نہیں ہے۔ کاش! شاستروں میں ٹمپریمنٹ ڈیولپ کرنے کے طریقے بھی درج کئے جاتے تو اُن کے احکام پر زیادہ بہتر طریقہ پر عمل کیا جا سکتا تھا۔

حضرات! اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ مگر خاتمہ پر ایک راز کا انکشاف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں کئی بار دوسری شادی کا خیال آ رہا ہے۔ ہر خاوند کے دل میں ایک آدھ بار یہ خیال ضرور آتا ہے۔ مگر میری بیوی کو خوش ہونا چاہیئے کہ میں نے اس خیال کو ہمیشہ زبردستی دبا دیا ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ہر بیوی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر خاوند بھی پہلے خاوند جیسا ہوتا ہے۔ ہر دوسری شادی صرف ایک تجربہ کا اعادہ ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بلی جب بھی کرتی ہے، میاؤں کرتی ہے۔ جب بھی پیدا کرتی ہے، بلونگڑے ہی پیدا کرتی ہے۔ یقین نہ آئے تو میرے دوست مسٹر برش بھان سے پوچھ لیجئے، جن کی تیسری بیوی کے ہاں آٹھواں بچہ پیدا ہوا ہے —— آٹھواں بلونگڑا نہیں۔

رنگوں کا بھرم

جوگندر پال

جُدائی وطن کی جغرافیائی حدود سے نہیں ہوتی، جدائی اپنے گھر کی اینٹوں سے بھی نہیں ہوتی، جدائی تو اقارب سے ہوتی ہے، اس ماحول سے ہوتی ہے جو اقارب کی سانسوں سے مہکا ہوتا ہے۔

جب میں اپنوں کو ہزاروں میل پیچھے چھوڑ کر افریقہ پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا پُر رونق وجود ——— میری خواہشوں سے لدا پھندا یہ گھر یکلخت سُونا ہو گیا ہے، اس گھر کے افراد ——— میرے سبھی اعزا پھانسی لے کر مر گئے ہیں اور اس خالی خالی مکان میں میں اکیلا باسی ہی رہ گیا ہوں، جیسے کسی غیر آباد گھر میں گھر کی اپنی ہی المناک روح کے سوا کوئی اور مکین نہ ہو۔

مجھے اپنا جسم اپنے آبائی قصبے کی لال سرائے کی طرح معلوم ہونے لگا جس کی دیواریں اجڑ اجڑ کر پیلی پڑ چکی تھیں اور جہاں میں سب کی نظروں سے چھپ چھپ کر ویرو سے ملا کرتا تھا۔

ہماری سگائی کے بعد ویرو مجھ سے پرے پرے رہنے لگی لیکن کوئی اپنے آپ سے کیسے پرے پرے رہ سکتا ہے، کبھی کبھی وہ لال سرائے کے پیلے سایوں میں ملاقات کے لیے آ جاتی تو اُجڑی دیواروں پر شرائی ہوئی دلہن کے رنگدار دوپٹے کے بیل بُوٹے نکھر آتے۔

ناطے جوڑتے ہوئے جی کو یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کچے دھاگے کہیں جھٹکا نہ کھا جائیں۔ رشتہ جتنا پیارا ہو، دھاگا اتنا ہی کچا ہوتا ہے۔ میرے افریقہ آنے سے پیشتر ہماری شادی میں چند ہی روز رہ گئے تھے کہ دفعتاً ہماری سگائی ٹوٹ گئی۔

”گیان شاہ!“ ویرو کا باپو آ کر میرے بھائیا جی سے کہنے لگا ”میں بڑا شرمندہ ہوں۔ نہ لڑکی کی ماں مانتی ہے، نہ بھائی، نہ ماما ——— !“

”پر لعل شاہ! اب تو ———“

”نہیں میرے بھائی! وہ سب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جان بوجھ کر تو مکھی نہیں نگلی جا سکتی۔ جہاں تہاں پردیسوں کو مر کر [illegible] وہ مرنا پسند نہیں کرتے۔ میں اپنی لڑکی کو اتنی دور کیسے بھیج دوں۔ ا پھریکا بڑا مزے دار شہر ہوگا۔ مجھے معلوم ہے [illegible] پر کھلنے اچھا سوچ ہم سب کے لیے تو مر ہی جائے گی، اتنی دور ———“

”لعل شاہ! یہ باتاں تم نے پہلے کیوں نہ سوچیں؟ اب تو ——— اب تو میں ایسٹ افریقن ریلویز کے کانٹریکٹ پر دستخط

کر کے بھی بھیج چکا تھا، اپنی پہلی نوکری سے استعفا بھی دے چکا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟

"بتی گیا نے" ویرو کے باپو نے اپنی پگڑی اتار کر میرے بھائیا جی کے قدموں پر ڈال دی۔ "تو میرا بھائی ہے۔ پنچایت میں بیٹھ کر میں اپنا تھوک چاٹ لوں گا میرے بھائی، پر ویرو کو سمندر میں دھکا نہیں دوں گا۔ تیرے بیٹے کی نوکری چنگی بھلی شہر کے ریلوائی سٹیشن پر لگی ہوئی تھی۔ ہمیں تو وہ بھی دور لگتا تھا، پر یہ دوری تو ہماری سوچ سے بھی باہر ہے ــــ"

اور بھائیا جی بڑے اداس نظر آنے لگے، شاید یہ سوچ کر کہ وہ کیوں اپنے بیٹے کو سمندر میں دھکا دے رہے ہیں لیکن وہ بیچارے لاچار تھے۔ ہماری زمین اور مکان ٹھاکر جی کے پاس رہن تھے اور جب سے میری نوکری کی خبر اڑی تھی، ٹھاکر جی نے ہمیں بڑی ڈھیل دے رکھی تھی ــــ!

آج کل کی بات کچھ اور ہے۔ آج کل تو چاند کی کرنیں دیکھ کر بھی انسان کو یہی گمان ہوتا ہے کہ پڑوس کے گھر سے روشنی آ رہی ہے لیکن جس زمانے کا قصہ میں سنا رہا ہوں، ان دنوں لوگوں کے اپنے اپنے قصبے ہی علیحدہ علیحدہ چاند تھے۔ کبھی کوئی بدقسمت قصبے سے باہر جا بسنے کی تیاری کرتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ بے چارہ دوسرے جہان میں اینٹیں ڈھو رہا ہے۔

بھائیا جی بظاہر خوش خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتے لیکن اچانک کبھی ہماری نظریں مل جاتیں تو مجھے ان کی آنکھوں میں وہی گیلی گیلی ہائے نظر آتی جو کئی برس پہلے اپنا پلا ہوا بھولو بیل بیچتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بہہ نکلی تھی۔

اور میری ماں ــــ ۱۶

پہلی بار جب میرے افریقہ جانے کی بات چلی تو وہ میری طرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہی، پھر میں نے کانٹریکٹ پر دستخط کر کے اسے بھیجا تو اسے عمر بھر میں پہلی مُورچھا ہوئی اور پھر تو یہ حالت رہی کہ وہ تصویر سی بن گئی، چلتی پھرتی بھی ایسی ہی نظر آتی گویا بیہوشی میں ہو۔ اپنی ماں کی اس بیہوشی کا تصور کر کے مجھے اٹل وشواش ہو جاتا ہے کہ دکھیا آدمی بیہوش ہو یا مردہ، اس کا باطن اپنے دکھ سے غافل نہیں ہوتا۔

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں افریقہ نہیں جاؤں گا۔

میرا چھوٹا بھائی سرنا ابھی پرائمری اسکول میں ہی پڑھتا تھا۔ ایک بار میں ایسٹ افریقن ریلویز کے باتصویر پمفلٹ میں کالے کالے حبشیوں کے چہرے دیکھ رہا تھا کہ مجھے باہر سے سرنے کی آواز سنائی دی۔

"میرا بھیا افریقہ جا کر ہمیں ڈھیر روپے بھیجے گا۔" وہ اپنے معصوم دوست کو بتا رہا تھا۔ "اور ان روپوں سے میں پڑھوں گا اور ولایت جا کر بڑا ڈاکٹر بنوں گا۔"

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں افریقہ ضرور جاؤں گا۔

میری روانگی میں ایک ہفتہ رہ گیا تو میری بہن بسنتی بھی سسرال سے چلی آئی۔

کسی کے دن تو تم ابھی سمندر دیوتا کی ہتھیلی پر ہی ہو گے؟" آنسو کی ایک ننھی منی بوند سمندر کی طرح بے کراں اور گہری ہو گئی۔

ا ساکھی بندھن یہیں بندھوا لو۔"

سب بندھن کچے دھاگوں کے کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے ایک زردسی مسکراہٹ سے اپنی کلائی اس کی طرف بڑھا دی۔

"بھیا! آج میں ویرو کے گھر گئی تھی۔"

میری بہن شاید سوچ رہی تھی کہ ویرو کے بندھن مجھے سچ مچ باندھ لیں گے۔ پگلی!

"بھیا! وہ تو رو رو کر جھاڑو کا تنکا نکل آئی ہے۔"

اور میری آنکھ میں بھی جھاڑو کا تنکا چبھ گیا اور میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"بھیا! افریقہ کوئی آسمان سے دور تو نہیں۔ پھر بھی ہم آسمان کے سب تارے دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ افریقہ پہنچ کر میں اپنی روح کو کسی تارے میں بند کر دوں گا اور وہ تارا یہاں میرے اپنوں کے سروں پر جھلملایا کرے گا۔

"بھیا! میں ہر روز تمھیں آسمان پہ ڈھونڈا کروں گی۔"

اور آسمان سے رم جھم ہونے لگی، پتہ نہیں کب تک ہوتی رہی۔

روانگی سے پہلے میری ملاقات ویرو سے بھی ہوئی، وہیں لال سرائے کی پیلی دیوار تلے ـــ اور رونے کے سوا ویرو کے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا۔ محسوسات میں سیلاب آیا ہو تو انسان شاید باتیں کر ہی نہیں سکتا، بے زبانوں کی طرح صرف ہنستا یا رونا ہی چلا جاتا ہے۔

پیلی پیلی دیوار پر ویرو کے بیلدار دوپٹے کا لرزاں سایہ دیکھ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ کسی کنواری کی لاش پر رنگدار کفن لہرا رہا ہے!

"ویرو! میں نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا ـــ!"

لیکن اس کا یقین نہ ویرو کو تھا نہ مجھے۔

ٹھاکر جی کے الفاظ پتھر بن کر میرے دل کی تہوں پر اُتر آئے تھے۔

"بیٹا کشمن! ہر مہینے ڈیڑھ سو کا منی آرڈر سیدھا میرے نام ہی بھیج دیا کرو۔ سیدھا میرے نام ہی، بیٹا! تمھارے باپ کو خواہ مخواہ میرے گھر آنے کی تکلیف ہوگی ـــ سیدھا میرے نام ہی ـــ!"

میں نے ویرو سے ایک بار پھر کہنا چاہا کہ میں نہیں جاؤں گا، لیکن انجن کے پیچھے بندھے ہوئے ریل کے ڈبے اپنی مرضی سے تھوڑا ہی رُکتے یا چلتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بھگوان کی ساری رچنا ہی اسی اصول پر ہے کہ شش اپنے آنے جانے کا فیصلہ خود آپ نہیں کر سکتا۔

اور آخر میں اپنے باپ کا قرض اتارنے کے لیے سفر پر چڑھ گیا، سولی پر چڑھ گیا اور یہاں آ پہنچا، افریقہ میں!

جب میں گھر سے چلا تھا تو افریقہ بہت دور لگتا تھا اور یہاں پہنچ کر اب گھر بہت دور لگنے لگا، اتنا دُور کہ واپس پہنچ سکنے کا تصور بھی ذہن میں نہ آسکا ـــ!

(۲)

یہ افریقہ کا پیٹ ہے بالبرا! ایلبورو ریلوے اسٹیشن پر افریقی کانٹے والے نے دنیا کی عظیم ترین رفت...

اور مجھے معلوم ہوا کہ افریقہ کا کالا دیو مجھے ہڑپ کر گیا ہے اور میری نظریں سراسیمہ ہو ہو کر اس کے ...

سرپٹ دوڑ رہی ہیں۔

بچپن میں میں ایسی کہانیاں پڑھا کرتا تھا۔

پھر راجکمار راجکماری کی تلاش میں گھنے جنگل کی سیاہیوں میں کھو گیا اور اس کا گھوڑا ایک دیو کے غار کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا....

لیکن میں اپنی راجکماری کو روتا چھوڑ کر یہاں کالے پیٹ میں کیوں آگھسا؟

کمٹی کے لہلہاتے پودوں کے سائے میں شاید میرا خاکی رنگ بھی افریقی کانٹے والے کے رنگ کی طرح سیاہ نظر آنے لگا۔

"آؤ بابو! تمھیں تمھارا کوارٹر دکھا آؤں۔"

اسٹیشن کے عقب میں وادی میں اترتے ہوئے مجھے یوں معلوم ہوا جیسے ویرو میرے ساتھ ساتھ ہے۔

"ایک کمرے میں ہم سوئیں گے (ہم!) ایک میں میں رامائن پڑھوں گی اور تم سنو گے۔ (ریلوے اسٹیشن پر انجن کے وسل نے چیخ ماری!) اور ایک کمرہ ملنے والوں کے لیے ہو گا——"

ملنے والے! میں نے نگاہ اٹھا کر خالی خالی دھرتی کی طرف دیکھا۔ کون ملنے والے؟ یہاں تو دور دور تک کسی اپنے آدمی کی دھول بھی اڑتی دکھائی نہیں دیتی—— وہ خمیدہ درخت اپنا پوپلا منہ جھکا کر بیرے بوڑھے باپ کی طرح اپنے بیٹے کو پردیس بھیج کر پچھتا رہا ہے——!

میں ٹھوکر کھا کر اپنے کوارٹر کے دروازے پر آکھڑا ہوا اور اندر جھانکنے لگا، گویا اپنے ہی سنسان وجود کے خالی خالی نہاں خانوں پر نظریں کھڑی کر لی ہوں۔

اچانک کوارٹر کے ایک کمرے سے ایک کالی لڑکی برآمد ہوئی، ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے، نہایت کالے چہرے پر بلا جھجک مسکرا مسکرا کے کھلتے ہوئے نہایت سفید دانتوں کی قطاریں——اور انھیں دیکھ کر مجھے اسٹیشن کے پاس کالی مٹی پر اُگے ہوئے چنبیلی کے دودھیا پھولوں کا خیال آگیا اور وہ بھی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔

"یہ میری لڑکی ہے بابو! تمھارا کوارٹر صاف کر رہی ہے۔"

وہ بدستور مسکراتی رہی۔

"اس کا نام تیشرو ہے۔"

"تیشرو؟"

"ہاں! ہماری ککیو بولی میں تیشرو کا مطلب ہوتا ہے گوری۔"

اچانک تیشرو نے خوشی سے تالی بجا کر اپنے باپ سے تیز تیز افریقی زبان میں کچھ کہا۔

"تیشرو کیا کہہ رہی ہے؟" اگرچہ یہاں پوسٹ ہونے سے پیشتر میں نیروبی ہیڈ کوارٹرز میں افریقی زبان کا کورس پاس کر چکا تھا تاہم ابھی میرا اس زبان کا علم خام تھا۔

کمٹی بوڑھے کانٹے والے نے زمین کی طرف اشارہ کیا جہاں تیشرو کا سایہ میرے کندھے پر سر ٹیکے بڑی شوخی سے ہل رہا تھا۔ ... کا لہجہ بڑا واضح تھا۔

... کہتا ہے اس کا سایہ اور تمھارا سایہ دونوں ایک جیسے کالے ہیں۔"

... سے پیچھے ہٹ گیا۔

کانٹے والا جانے کے لیے مڑ گیا لیکن ہیٹرو وہیں کھڑی میری جانب تکتی رہی کچھ دور جا کر کانٹے والے نے ہیٹرو کو پکارا "آؤ بیٹا ہم دونوں بابو کا سامان شیشو سے لے آئیں۔" پھر اس نے میری طرف منہ اٹھا کر کہا: "تمھارے کواٹر کے ذرا نیچے میرا گھر ہے ——— کسی شے کی ضرورت پڑ جائے تو آ جایا کرو ——— یا بلا لیا کرو!"

(۳)

مٹیمو رو میں ان دنوں دن رات بارش ہوتی رہتی ہے جیسے ہمارے دماغ پر دیر و ہر دم روتی ہی روتی تھی۔

میرا سارا دن اسٹیشن پر دودھ اور آلوچوں کی بلٹیاں بناتے، کانٹے بدلواتے اور نیروبی ہیڈ کوارٹرز سے متفرق ہدایات موصول کرتے ہوئے بیت جاتا۔

ایک ادھیڑ عمر انگریز کسان ہر روز بارہ بجے دوپہر کی گڈز ٹرین پر دودھ کے کین اور آلوچوں کی بوریاں بک کروانے آتا اور اگر کبھی اتفاق سے خود نہ آتا تو عین وقت پر اس کا کالا نوکر اور سفید کتا میرے آفس میں آ کھڑے ہوتے۔

"مسٹر ہربرٹ!" چند روز میں یہ انگریز کسان میرا دوست بن گیا۔ "کیا تم یہاں تنہائی محسوس نہیں کرتے؟"

"تنہائی؟" وہ اپنے منہ سے پائپ ہٹا کر تعجب سے مسکرانے لگا۔ "وہ کیوں؟"

"تم بھی یہاں میری طرح اجنبی ہو۔"

"او ——— تو! میں اجنبی نہیں ہوں۔ یہ میرا گھر ہے! ———"

"گھر؟"

"ہاں! میں یہیں پیدا ہوا تھا اور میری خواہش ہے کہ مرنے پر میری قبر بھی یہیں کہیں وادی میں پھیلتے ہوئے پہاڑوں پر بنے۔" اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے تمباکو کا دھواں ہاتھ سے پرے جھٹک دیا اور شفقت اس کی نگاہ سے اڑ اڑ کر پہاڑوں کی خواب آگیں دھند کو چھونے لگی۔ "اگر اتفاق سے میری پیدائش کہیں اور ہوتی تو بھی میرا گھر یہیں ہوتا۔" ہربرٹ نے اپنی کرسی میرے نزدیک سرکا لی۔ "میرے بھائی! پیدائش تو محض ایک اتفاق ہے۔ آدمی یہاں پیدا ہو جائے یا وہاں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پیدا ہونے کے بعد ہمیں بھی چرند پرند کی طرح گھر کے لیے چاروں کھونٹ گھومنا پڑتا ہے اور پھر جہاں متعلق ہو گئے وہیں گھر ——— سوال تو تعلق کا ہے۔" ہربرٹ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چار پانچ بڑے پکے ہوئے موٹے موٹے آلوچے نکالے۔

"لو کھاؤ، مجھے اچھے لگے تھے اس لیے میں نے بوری سے نکال کر اپنے بیٹے کے لیے رکھ لیے تھے۔"

آلوچے کا میٹھا میٹھا رس چوستے ہوئے مجھے اپنے عزیز و اقارب کا خیال آیا تو میرے حلق میں زہر کی بوندیں ٹپکنے لگیں اور میں نے جلدی جلدی ہربرٹ کی بلٹی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "وزن، پلیز؟"

"میرے مشورے پر عمل کرو گے تو بہت خوش رہو گے۔" اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ "ایکسپٹ [illegible] بھی مرضی ہے کہ انسان اور حیوان اپنی اپنی مادہ کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کریں اور اپنی اپنی نسل بڑھائیں۔ ینگ مین! جو انسان [illegible] فطری اصولوں کے مطابق ہمیشہ غمگین رہے گا ———"

"بڑا اچھا آدمی ہے۔" جب ہربرٹ چلا گیا تو کانٹے والا اس کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ "اس علاقے میں تنہا وہی ایک [illegible]

ہے اور اس نے —— ہمارے قبیلے کی ایک عورت سے شادی کر رکھی ہے اور اس کے بچے ——" گویا کانٹے والا اپنے ہی پوتوں کی بات کر رہا ہو۔ "بڑا پیارا رنگ ہے ان کا، جیسے گہرے نیلے آسمان میں سفید بادل گھلے ملے ہوں۔"

اسی اثنا میں دفتر میں کہیں سے بندر کا ایک بچہ گھس آیا۔ میں نے پیپر ویٹ اٹھا کر اسے دوڑانا چاہا لیکن کانٹے والے نے لپک کر بندر کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور اس کی جلد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسی کی مانند منہ بنا بنا کر ہنسنے لگا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں اس بندر کے بچے سے، بابا؟"

"اس بندر کی تین نسلوں سے میرا ملنا جلنا رہا ہے، بابو!" کانٹے والے نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر بندر کو زمین پر چھوڑ کر اس سے مخاطب ہوا "جاؤ بیٹا! تمہاری ماں پیچھے ہی ہو گی۔ جاؤ کھیلو۔"

بندر کا بچہ دوڑ کر کانٹے والے کے گھر کی طرف ہو لیا۔

"بابو! یہ ان پہاڑوں کے عقب میں رہتا ہے —— وہاں!" اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے بتایا۔ "یہاں سے کم از کم دس میل کا فاصلہ ہے، پر یہ ٹوٹو (بچہ) بڑا ہوشیار ہے، اچھل اچھل کر پلوں میں یہاں آ پہنچتا ہے۔"

میں نے سمجھا کہ بڈھا شاید اپنی بات بھول کر کسی انسان کے بچے کا ذکر لے بیٹھا ہے۔

"بابو! یہاں ہمارے قبیلے کے صرف گنتی کے ہی چند لوگ ہیں اس لیے ہماری اور ان پشوؤں کی یہاں ساجھی برادری ہے۔ اپنے آس پاس جانداروں کی گنتی زیادہ معلوم ہو، بابو! تو جیون سکھی رہتا ہے۔" مجھے اپنی باتوں میں اتنی دلچسپی لیتے پاکر کانٹے والا میرے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ "اس ٹوٹو کا دادا بڑا سیدھا بھولا بھالا تھا۔ اپنی بڑھیا سے لڑ جھگڑ کر اکثر میرے پاس چلا آتا —— پچھلے سال میرے ففی (یار) کو انگائی (گکویو قبیلے کا خدا) کا بلاوا آ گیا —— " کانٹے والا ہتھیلی سے آنسو پونچھ کر چاٹنے لگا۔ "مُردوں پر بہائے ہوئے آنسو ہم لوگ ضائع نہیں کرتے بابو! ہمیں انگائی کا حکم ہے کہ انھیں پی جاؤ۔"

میں حیرت سے کانٹے والے کی طرف تکتا رہا۔

"لیکن بابا! پشو تو بے زبان ہوتے ہیں، پھر تم ایک دوسرے سے بات کیسے کرتے ہو؟"

"بات؟" بڈھے کو شاید میری جہالت پر ترس آنے لگا۔ "بات صرف زبان سے ہی نہیں کی جاتی، بابو! تمہاری طرح ایک جانور بیچارہ بڑا حیران ہو کر ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا۔ بابا! تمہاری صرف دو ٹانگیں ہیں، پھر تم چلتے کس طرح ہو؟ —— اب کوئی اس مورکھ سے پوچھے کہ سانپ کی ایک ٹانگ بھی نہیں ہوتی، پھر وہ کیسے چلتا ہے؟"

میں لاجواب ہو گیا۔

"بابو! یہ پہاڑ، یہ درخت، یہ نالے سب باتیں کرتے ہیں ——"

"اچھا بابا! بتاؤ وہ درخت کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔

بابا نے درخت کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کی طرف اپنا سر اٹھا لیا۔

"پہلے تو یہ درخت چپ چپ رہا، بابو!" کانٹے والا مجھ سے گویا ہوا۔ "اور پھر تمہارے متعلق شکایت کرنے لگا کہ یہ اجنبی اب تک ہم سے گھل مل کیوں نہیں جاتا ——"

میں ڈھیلا پڑ گیا۔

تمہیں اجنبیوں سے بڑا پیار ہے بابو! ان کے گورے رنگ سے! ان کی گوری بدھی سے! اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی اپنی طرح بنالیں۔ ادھر آؤ بابو——" وہ بکنگ آفس کے پچھلے دروازے سے مجھے باہر ایک جوہڑ کے پاس لے آیا۔ "پانی کے بیچے وہ مجانی (پودے) دیکھ رہے ہو؟ عام طور پر پودوں کی جڑیں زمین کے نیچے ہوتی ہیں مگر جوہڑ کے یہ پودے زمین کے اوپر اوپر ہی رہتے ہیں۔ ان کی جڑیں بھی زمین کے اوپر ہی ہوتی ہیں۔ ہم لوگ انھیں پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ ہمارا ہی پانی پی پی کر پلتے ہیں لیکن اپنی جڑوں کو ہماری دھرتی میں نہیں اترنے دیتے ——لیکن ہمیں ایسے اجنبیوں سے بڑا پیار ہے بابو، جو یہاں رچ بس جاتے ہیں جو ہمیں اپنے جیسا بنا لیتے ہیں۔ جب تم یہاں آئے تھے تو میری بیٹر مو نے تمہارے کوارٹر کے سامنے آم کے پیڑ کا بیج گاڑا گیا تھا——"

"میں تو ایک ٹوٹی ہوئی ٹہنی ہوں بابا!" میں نے کانٹے والے سے کہنا چاہا۔ "جو اپنے گھر کے سایہ دار پیڑ کے ساتھ جڑ جانے کے انتظار میں سوکھ رہی ہے!"

"ہمارا ہربرٹ صاحب کہا کرتا ہے بابو۔" کانٹے والا بول رہا تھا "بیج کی ٹہنی کہیں کی بھی ہو پر پیڑ تو اسی دھرتی کا ہو جاتا ہے جہاں اس کی شاخیں پھیلتی ہیں——"

اس کی باتیں سنتے ہوئے میں نے اطمینان سے اپنا جائزہ لیا اور جوہڑ کے مجانی کی طرح اپنی جڑوں سمیت افریقی دھرتی کے اوپر اوپر ہی رینگ کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

رات کو اپنے کوارٹر کے کمرے میں بھاٹیا جی کی دی ہوئی رامائن پڑھتے پڑھتے مجھے اونگھ آگئی اور یوں لگا جیسے باہر آنگن میں میری ماں بے ہوشی میں چل رہی ہے۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

وہاں بیٹر مو کھڑی تھی اور اس کے سیاہ ہاتھ پر رکھے ہوئے گلاس سے بکری کا گرم گرم سفید دودھ چھلک رہا تھا۔

"لو دودھ پی کے سوؤ۔"

(۴)

ہوتے ہوتے بیٹر مو نے میرے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا تھا۔

شام کے ساڑھے پانچ بجے کی گڈز ٹرین سے فارغ ہو کر میں گھر لوٹتا تو وہ ہمیشہ میری منتظر ہوتی اور مسکرا مسکرا کر دروازہ کھولتی۔ میں صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیتا اور وہ رسوئی میں جا کر فوراً میرے لیے چائے لے آتی۔

"اچھی بنی ہے؟" میں ابھی پہلی چسکی ہی بھر رہا ہوتا کہ وہ پوچھ لیتی۔

"ہاں! بہت اچھی!"

"میں نے پہلے ہی چکھ کر دیکھ لی ہے۔" وہ نہایت خوش ہو کر جواب دیتی۔ "اگر اچھی نہ ہوتی تو میں جھٹ پٹ دوسری اور تیار کر لاتی" اگر میرے بھاٹیا جی بھی ہمیں اس حالت میں دیکھ لیتے تو یہی سوچتے کہ میں نے اسے جورو بنا لیا ہے۔

"یہ میری جورو ہے!" اس کی طرف دیکھ دیکھ کر میری ہنسی پھوٹ پڑتی۔ جورو——وہ کالی کلوٹی سر پر الجھے الجھے بالوں کے چھتے

اَن گنت سیاہ چھلے، اور یہ موٹے موٹے ہونٹ، مانو زبان کی بجائے اس کے ہونٹ ہی بولتے ہوں —— ہم ہم ہا ہم —— ہم —— یہ میری جورو! ——"

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

میری اداسی کبھی اس کی موجودگی میں کھلکھلا پڑتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ ساکت کھڑی خوشی سے گوما (افریقی ناچ) کر رہی ہے۔

"بس یونہی مجھے خیال آیا ہے کہ ہمارے ریل کے کالے بھوت انجن میں کیا کشش ہوتی ہے جو گورے گورے ڈبے اس کے پیچھے پیچھے مارے پھرتے ہیں؟"

"میں بتاؤں؟"

"ہاں!"

"ڈبے اپنا راستہ بھول گئے ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ کالی بلبو کارٹ ان کے ٹھکانے ڈھونڈ نکالے گی؟"

ایک دن بیٹھے بیٹھے چائے پر مجھے دیر ہو گئی۔ سامنے پہاڑ کی پشت پر رات شاید بیچ سنور کر آ پہنچی تھی اور اپنی اس افریقی محبوبہ کو سجدہ کرنے کے لیے پہاڑ کا سر پستیوں میں ڈوب رہا تھا۔

چائے کی آخری چسکیاں بھرتے ہوئے میں نہ جانے کس سوچ میں مستغرق تھا کہ میرا دھیان اپنے سامنے کوارٹر کی دیوار کی طرف چلا گیا جہاں ایک بھولا بھٹکا کوا لگاتار کائیں کائیں کر رہا تھا۔

ٹیٹرو نے بڑی معصوم شادمانی سے اپنی نظریں کوے پر جمالیں اور بڑے عقیدت مند کانوں سے کائیں کائیں سننے لگی۔

میری بھرائی ہوئی فکر کی لہریں بیتاب ہو ہو کر نئے کنارے بنانے لگی۔

"تم اتنے دلگیر کیوں دکھائی دے رہے ہو بابو؟"

"میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا ٹیٹرو۔" کوا بدستور کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"ہمارے دیش میں روایت ہے کہ جب کوا کسی گھر کی منڈیر پہ اسی طرح کائیں کائیں کرتا ہے تو گھر والے اسے اپنے بچھڑے ہوؤں کا سندیس سمجھتے ہیں۔"

ٹیٹرو کو شاید مجھ پر ترس آنے لگا تھا، اس لیے میں نے اپنے لہجے کو قابو میں کرنا چاہا۔

"ٹیٹرو! یہ کوا سات سمندر پار کر کے یہاں آیا ہے اور میری دیوار پر آ گرا ہے۔ ضرور یہ ہندوستان سے میرے گھر والوں کی خبر لایا ہے ——"

"نہیں بابو! یہ کوا ہندوستان کا نہیں، ہمارے دیش کا ہے۔" ٹیٹرو نے مجھے ٹوک کر کہا۔ "اور ہم لوگوں میں کوے کے بارے میں روایت مشہور ہے۔ ہمارے کوے صرف اجنبیوں کی دیواروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتے ہیں، ان سے یہ کہنے کے لیے اب یہیں ڈھونڈھ لو ——"

سر اپنی افریقی محبوبہ کو سجدہ کرتے کرتے اب یکسر معدوم ہوتا جا رہا تھا ——!

(۵)

مجھے بسنتی کی چٹھی ملی گویا کوّے کی کائیں کائیں کو انسانی زبان میں سمجھانے کے لیے!

میں نے خوشی سے دیوانہ ہو ہو کر تیزی سے لفافہ کھولا۔

منگل کے دن ویرو کی شادی ہو رہی تھی! جیسے مرتے مرتے مریض کے چہرے پر رونق آ گئی ہو اور پھر جاں بلب ہونے کا عالم! میرے سر پر ایک ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا اور میں اس ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ ہوائی جہاز ہندوستان جا رہا تھا اور سارا آسمان میرے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا —

ویرو! — ویران! — ویرو!!

لیکن آج تو بدھ وار ہے! ویرو کی شادی ہو چکی ہے! ویرو اپنے گھر جا چکی ہے!

اپنا گھر! میں سوچا کرتا تھا کہ ویرو میرے گھر کی مالکن بنے گی۔ میرا یہ کوارٹر — یہ گھر ویرو کا بھی ہو سکتا تھا!

"میں تو ڈرتی تھی جی! آپ کے افریقہ میں کسی طرح ہمیں مرضی کی خوراک مل جاتی، پر یہاں تو دودھ کی ندیاں بہہ رہی ہیں — اور یہ آلوچوں کے ڈھیر! موئے اپنے وطن میں تو انہیں آگ لگی رہتی ہے — میں کہتی ہوں جی! اگر ہم گھر کے سبھی آدمی ساتھ لے آتے تو کتنی خوشی ہوتی! سبھی جی بھر بھر کے کھاتے پیتے — اے جی! اٹھیے اب آپ کی آٹھ بجے کی گاڑی کا ٹائم ہو رہا ہے! —"

ہاں! ویرو میری بھی ہو سکتی تھی! لیکن اب کیا فائدہ؟ اب تو — اب تو وہ مر چکی ہے!

جدائی میں ہمارے سینے اعزا کے سینوں سے ملنے کے لیے پھٹتے رہتے ہیں لیکن اسی دوران میں ہمیں خبر مل جائے کہ ہمارے اعزا ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن گئے ہیں تو یہ سن کر پہلے تو کلیجہ منہ کو اچھل آتا ہے لیکن پھر ہماری بے قراریوں کے منہ پر گہری نیند کے آثار ہویدا ہونے لگتے ہیں، شاید اس لیے کہ دوسری جانب ہمارے لیے رو رو کر ہلکان ہونے والے بھی اب اٹوٹ نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں!

رات کو سونے سے پیشتر میں نے کھڑکی سے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی، مانو یونہی دوریوں کے تصور سے مغلوب ہو کر۔ وہاں ایک تنہا کونے میں ایک بھیگا بھیگا تارا ٹمٹما رہا تھا، گویا بسنتی کی آبدیدہ نظر میری ڈھارس بندھا رہی ہو۔ تھوڑی دیر میں یہ پرنم آنکھ سیاہ بادل کی ایک لمبی چادر میں چھپ گئی۔

میں بھی کمرے کی تاریکی میں سر تک رضائی اوڑھ کر سو گیا!

(۶)

ٹیبرمو بہت خوش تھی کہ اب میں پہلے کی طرح اداس نہیں رہتا۔

"دبا — بُو — و!"

بہروں کی سماعت کا علاج درکار ہو تو ان کے لیے ایسی ہی مسرور آوازوں کا ریکارڈ بھر لینا چاہیے۔

میں نے اپنے کوارٹر کے دروازے کی طرف نظر اٹھائی تو ٹیبرمو کا مسکراتا ہوا تابندہ، سیاہ چہرہ وہاں آ رُکا۔

"ہم نیچے وادی میں جا رہے ہیں۔ آؤ، تم بھی چلو۔"

"یہ اتنی خوش کیوں ہے؟"

لیکن میں اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ خوشی کا کوئی خاص سبب نہیں ہوتا کیونکہ انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ خوش رہے سبب تو ہمیشہ انسان کی اداسی کا ہوتا ہے۔

"چلو گے؟ بابا بھی جا رہا ہے۔"

اور مند مند تھکن کے احساس کے باوجود میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر میں ہم تینوں نیچے وادی میں اتر رہے تھے۔

"ارے آہستہ چلو نا" کانٹے والے نے اپنی بیٹی کو پکار کر کہا جو ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھر رہی تھی، پھر وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔ "آج یہ بہت خوش ہے۔"

"کیوں؟" بات چیت ہی سے "کیوں" اڑا دی جائے تو شاید انسانی گفتگو بھی جانوروں کی طرح زبان کی محتاج نہ رہے۔

"نیچے وادی میں میرے بھائی کا بیٹا آج اس کی ایک سہیلی کو بیوی بنا کر گھر لایا ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

"با ـــ بو ـــ وا"

کسی پتھر کی طرح تیز تیز لڑھک کر ٹیبرو ہم سے بہت آگے پہنچ چکی تھی اور اب ذرا رک کر ہماری طرف ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھی۔

"با ـــ بو ـــ!"

"نہیں" میں نے اپنے آپ سے کہا "آدمی صرف خوش رہنے کی خواہش سے ہی خوش نہیں رہ سکتا بلکہ خوشی کا بھی کوئی نہ کوئی حیلہ ہوتا ہے، کوئی بھولا بھالا، ننھا منا بے ضرر سا حیلہ، جیسے یہ معصوم لڑکی اپنی ایک سہیلی کے دلہن بننے کی خبر پا کر من ہی من میں اپنے سارے چاؤ بھی پورے کر رہی ہے ـــ"

"مجھے یوں لگتا ہے بابو، اب میری لڑکی کو بھی مرد کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔" گویا کانٹے والے نے گاڑی کی آمد کی اطلاع پا کر بڑی آسانی سے کانٹا بدلا ہو۔

"با ـــ بو ـــ وا!" اور گویا ٹیبرو کی آواز لائن پر تیز تیز دوڑنے لگی ہو۔

ہم دونوں جلدی جلدی اس کے پاس پہنچے تو وہ ایک سفید بکری کے گلے میں باہیں ڈالے اس کے گال سے گال جوڑے ہوئے تھی۔

"میں اچھی لگ رہی ہوں یا یہ بکری؟"

اور بکری کی سفیدی مجھے اس کے کالے رنگ سے سنوری سنوری سی نظر آنے لگی۔

"تم سفید بکری ہو اور بکری ـــ"

"کالی ٹیبرو" ٹیبرو کے بابا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

ٹیبرو نے شرما کر سر جھکا لیا، بالکل ہمارے دیش کی کنواریوں کی طرح، اور میں دیکھتا رہ گیا کہ جنگلی بکریاں بھی اس طرح شرما سکتی ہیں۔

جب ہم کافی نیچے اتر آئے تو شام ذرا گہری ہو چکی تھی۔

یکایک میرے نتھنے آگ میں بھنتے ہوئے جنگلی شکار کا گوشت سونگھ سونگھ کر پھڑکنے لگے۔

"وہ دیکھو!" تیتیرو کے بابا نے وادی میں ایک طرف آگ کے ایک ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ بلندی اس پہاڑی پگڈنڈی پر بے صبری سے پیچھے دوڑ دوڑ کر میری نگاہ سے بھی پہلے بستیوں کی روشنی سے جا ملی ہے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے گویا ہمارے استقبال میں اپنا گانا تیز کر دیا۔

دائرے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں تمبو (افریقی شراب) کا ایک ایک پیالہ پیش کیا گیا۔

ایک گبرو سر دھن دھن کر ڈھول کی تھاپ پہ گا رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ناچتے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

"اس گیت کا یہ مطلب ہے" تیتیرو کا بابا ہمارے لیے گکیو بولی کے اس گیت کا ترجمہ سلیس افریقی زبان میں کرنے لگا "کہ اے اجنبی! اب تو اپنے آپ کو اجنبی مت سمجھ، اب تو ہم میں سے ہی ایک ہے —— گھر والے یہ گیت دلہن کی آمد پہ گاتے ہیں۔"

"مزوری سانا!" (بہت خوب) مٹی کے پیالے سے باقی ماندہ تمبو میں غٹ غٹ چڑھا گیا "میں بھی تم ہی میں سے ہی ایک ہوں۔"

"اگر یہ بات ہے" لڑکے کے باپ نے جو پاس ہی کھڑا تھا اپنے کندھے سے لنگور کی کھال کا پہناوا اتار کر میرے کندھے پر لٹکا دیا "تو یہ لو!"

"اس کا مطلب ہے" تیتیرو کے بابا نے مجھے سمجھایا "کہ اب تم ہمارے قبیلے کے ہو گئے ہو!"

"ہاں!" کسی نے میرے پیالے میں مزید تمبو انڈیل دی "اب میں تم لوگوں کا ہو گیا ہوں۔"

اور پھر وہ لڑکیوں کی ٹولی سے نکل کر میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنی نشیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں پیالے بن گئیں۔ مجھے معلوم ہونے لگا کہ میری اس سے پرانی جان پہچان ہے۔ انڈیا میں ہمارے گھر ایک تصویر تھی کرشن کی، گھن روپ ترسوں میں ایک گوپی ہرن کی طرح کی تھی، بڑی خوبصورت، اور اس کی آنکھیں ہو بہو ایسی ہی تھیں!

(۷)

دوسرے دن جب میں کوارٹر پہ لوٹا تو ان لوگوں سے اتنا میل ملاپ بڑھانے پر بہت پچھتا رہا تھا۔

دروازہ کھول کر پاؤں اندر دھرنے لگا تو سامنے ایک ناگ اپنی طرف گھورتا ہوا نظر آیا۔ ابھی میں واضح طور پہ یہ بھی نہ سوچ پایا تھا کہ یہ ناگ میرے من کے پچھتاوے اور نفرت کے روپ سے ملتا جلتا ہے کہ ناگ نے اچھل کر میرا ٹخنہ ڈس لیا۔

مجھے صرف یہی یاد ہے کہ میرے نیچے سے تیتیرو بے دم ہو کر دوڑی دوڑی آئی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

شام کو جب مجھے ہوش آیا تو تیتیرو کا بابا میرے سرہانے مسکرا رہا تھا اور تیتیرو میرے پاؤں کی طرف زمین پر بیٹھی [illegible] جڑی بوٹی پیس رہی تھی۔

"موذی بڑا ظالم تھا بابو! پر اب فکر کی کوئی بات نہیں۔" تیتیرو نے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے تمہارا سا [illegible]
تیتیرو کے موٹے موٹے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیلنے لگی تو میرا جی چاہا کہ ذرا ہمت سے لڑکھڑاتا ہوا انھیں چوم لوں۔

جینیرو اٹھ کر ذرا رسوئی میں گئی تو بڈھے نے خوش ہو ہو کر کہا "تم ہماری عورتوں کے بھرے بھرے، جھٹ چپک جانے والے ہونٹوں کا چسکا کیا سمجھو گے بابو؟ جب میری لگائی زندہ تھی اور مجھے چوما کرتی تھی تو لگتا تھا گویا ۔۔۔ مجھے یہی لگتا تھا کہ سانپ کے کاٹے کا منتر پھونک رہی ہے!"

جینیرو نے کمرے میں لوٹ کر اپنے بابا کو ٹوکا "بابو کو آرام کرنے دو بابا!"

"ہاں بیٹی میں چلتا ہوں" بابا نے اٹھ کر کہا "اسٹیشن کا چکر کاٹ آؤں۔ تم فکر نہ کرو بابو! ایک دو دن اسٹیشن کا کام میں خود ہی سنبھال لوں گا۔"

جب بابا چلا گیا تو میں نے جینیرو کو اپنے پاس بلا لیا اور جب وہ سمٹ کر میرے سرہانے جھکی جھکی آ کھڑی ہوئی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ پہلی بار اس کے بدن کو چھوا۔ یہ لمس! ملائمت کا صرف تخیل ہی! مجھے قطعاً علم نہ تھا کہ کالی کھال اس قدر کومل اور صحت مند ہوتی ہے، اس کے نغموں میں رس بھرا جادو ہوتا ہے، میں افریقی جلد کے سیاہ طلسم سے بالکل واقف نہ تھا ۔۔۔

میری نظریں اس کی دریا سے نیل کی سی آنکھوں میں جھانک کر اس کی روح کو چھونے لگیں، جو اس کی جلد سے بھی زیادہ ملائم تھی۔

"جینیرو! تو نے میرا سارا زہر چوس لیا ہے، سب بھرم مٹا دیے ہیں ۔۔۔"

وہ مسکرانے لگی اور میں نے کوشش کر کے اپنا منہ آگے بڑھایا اور جنگلی کے شگفتہ پھولوں کے موٹے موٹے کناروں کی زرخیز، کالی مٹی کو چوم لیا۔

(۸)

"بابا!" دوسرے دن جب بابا میری عیادت کے لیے آیا تو میں نے اس سے پوچھا "اگر میں تمھاری بیٹی سے شادی کرنا چاہوں تو کتنی بکریاں لو گے؟"

بابا اپنی خوشی میں میری کمزوری بھی بھول گیا اور میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے مسرت سے دھڑکتی آواز میں کہنے لگا۔

"اوروں سے پوری ایک درجن، مگر تم میرے سفید فام نواسوں کے باپ بنو گے، اس لیے تم سے صرف دو بکریاں ۔۔۔" اس نے ایک اور ہاتھ میری پیٹھ پر دے مارا "یا اگر تم چاہو تو بے شک ایک بھی نہ دو! ۔۔۔"

دھرتی

رام لعل

رمیش! جان دے دینے کی دھمکی دے کر نیچے اترا تو دیا رانی نے اسے روکنا چاہا لیکن اس کی دیورانی سروج نے غصے سے چلا کر کہا — "اسے جانے دو دیدی! مرتا ہے تو مرے۔ روز روز کا ٹنٹا آج ختم ہو جائے۔"

وہ اپنے کمرے کے دروازے میں بھیگے ہوئے بالوں کو سکھانے کے لیے تولیے سے زور زور سے جھٹک رہی تھی۔ بڑی جیٹھانی نے آنگن میں واپس آکر کہا — "آخر بچہ ہے سروج!"

یہ سن کر سروج نے اپنے بھیگے ہوئے بال سر کو زور سے گھما کر پیٹھ پر پھینک دیے۔ قدرے بپھر کر بولی: "ابھی یہ بچہ ہے! اگر ایسا ہی ہے تو پھر پڑھتا لکھتا کیوں نہیں؟ اس کی عمر کے لڑکے تو دن رات ایک کر کے وظیفے اور انعام پر انعام پا رہے ہیں۔ اسے تو یونیورسٹی کے نام سے ہی بیر ہے جیسے۔ سب کتابیں بیچ باچ کر کھا گیا۔ یہاں سے فیسیں لے جا جا کر سنیما اور جوئے پہ لگا دیں۔ کیوں؟ کوئی حرام کی کمائی ہے کیا؟ آئندہ سے ایک پیسہ نہیں دوں گی۔ میں نے خیرات خانہ نہیں کھول رکھا ہے!"

دیا رانی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ کسی سوچ میں ڈوب کر سر جھکا لیا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: "سروج! میں یہ تو کبھی نہیں بھول سکتی کہ تم نے میری بڑی مدد کی۔ ڈوبتے کو سہارا دیا۔ میرا سارا سنکٹ ہر لیا۔ میرے بچوں کو پڑھایا، لکھایا، ان کی شادیاں بھی کر دیں۔ ان کے سورگیہ پتا کی آتما کو شانتی بخشی۔ میں جب تک تمھارے قدموں پہ پڑی ہوں تمھیں ہمیشہ دعائیں دیتی رہوں گی۔ پھر بھی اگر تمھیں میری وجہ سے کوئی کشٹ ہوتا ہو تو میں کہیں اور چلی جانے کے لیے تیار ہوں لیکن بھگوان کے لیے تم یہ نہ سمجھ لینا میں تمھارا احسان بھلا کر ایسا کہہ رہی ہوں۔"

سروج ہکا بکا رہ گئی۔ "دیدی!" اس نے آگے بڑھ کر اپنی جیٹھانی کو گلے سے لگا لیا: "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میرے منہ سے ایسی غلط بات بھی نکل سکتی ہے لیکن میرا یہ مطلب کبھی نہیں تھا، نہیں دیدی نہیں۔ یہ تو میں اس نالائق رمیش کے لیے کہہ رہی تھی، اپنے چھوٹے بھائی کے لیے لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم مجھ پر بوجھ ہو؟ تم تو میری ساس کی طرح میرے لیے قابل عزت ہو۔ پھر تم نے بھی تو [illegible] میں محنت مزدوری کرتی ہو۔ بتاؤ بھلا تم مجھ پہ بوجھ کس طرح ہو گئیں؟"

اچانک نیچے سے گھنٹی بجی۔ نیچے کوئی آیا ہوا تھا۔ سروج نے بڑی ملتجیانہ نظروں سے اپنی جیٹھانی کی طرف [illegible] وشواس کر سکتی ہوں کہ اب تم مجھے کبھی غلط نہیں سمجھو گی؟ نہیں نا؟"

دونوں کی آنکھیں چھلچھلا اٹھیں۔ دیا رانی آنکھیں پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سروج نے بھی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بکھرے ہوئے

گیلے بالوں کو جلدی جلدی ایک ڈھیلی کھلی کھلی چوٹی میں سمیٹ رہا تھا۔ اس کے کالے بالوں میں چاندی کی طرح سفید بالوں کی بھی بڑی کثرت تھی۔ وہ پینتیس برس کی تھی۔ صحت مند گورے چکنے چہرے اور سڈول جسم کی۔ بڑی جذباتی اور سنجیدہ۔ بڑی ہمت والی بھی۔ اس کے باحوصلہ ہونے کا احساس اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک اور اونچی گھٹے ہوئے نتھنوں والی ناک، بھینچے رہنے والے پتلے پتلے ہونٹوں اور نوکیلی ٹھوڑی کی سختی سے بھی ہوتا تھا۔ ریڑ سول کی سُرخ چپل، سفید وائل کی دھوتی اور پیلے رنگ کا بنا آستینوں کا بلاؤز پہنے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ نیچے اُتر گئی۔

اس کے مکان کے نچلے حصے میں ناری شلپ نکیتن کا دفتر اور سلائی گھر تھا۔ دو بڑے بڑے کمروں میں بجلی اور ہاتھ سے چلنے والی مشینوں کے سامنے عورتیں اور مرد الگ الگ بیٹھے کپڑے سی رہے تھے۔ مشینوں کی مسلسل اور ایک ساتھ گونجنے والی گھر گھر سے ایک عجیب سی نغمگی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ سنگیت روز ہی گونجتا تھا۔ صبح نو بجے سے لے کر رات کے آٹھ بجے تک۔ پچھلے پندرہ برسوں میں سروج شاہ نے کپڑا سینے والی مشینوں کے مدھر سنگیت میں اپنی کتنی مایوسیوں، محرومیوں اور کتنی دوسری مشکلات کو بھلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کسی حد تک بھول بھی چکی تھی۔ اپنی نئی زندگی بنانے میں وہ خاصی کامیاب نظر آتی تھی لیکن آج اس کے دل پر اپنے بن ماں باپ کے چھوٹے بھائی کے تعلیم سے جی چرانے اور بُری عادتوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے بہت بڑا بوجھ تھا۔

وہ کاریگروں کے کمروں میں سے ہوتی ہوئی اپنے دفتر میں آپہنچی جہاں دیوار سے لگے ہوئے ایک لمبے اور چوڑے صوفے پر ایک عورت اپنے ننھے منے بچے کے ساتھ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ یہ بات حیرت ناک تھی کہ سروج جو چند لمحے پہلے تک بہت ہی افسردہ نظر آرہی تھی اپنے سامنے ایک دوسری عورت کو دیکھ کر ایسی آسانی سے مسکرا دی تھی جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو۔ اس کا دل بہت ہی اور اطمینان سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بچے کو پیار کیا اور پھر اپنی بڑی میز کی طرف جاتی ہوئی بولی۔ "کہیے بہن جی! کیا حکم ہے؟"

اس عورت نے کپڑوں کا ایک بنڈل اس کی میز پر رکھ دیا اور بولی — "یہ لیجیے نئی شلوار قمیص بھی ہیں۔ اب تو ان کا بہت فیشن چل پڑا ہے۔ دو شلواریں اور دو قمیصیں بنا دیجیے۔ چار فراک اور چار نیکریں اس راجیو کے لیے ہوں گی۔"

سروج جلدی جلدی کپڑوں کا بنڈل کھولنے لگی۔ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں شیشوں کی بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ ان میں عورتوں اور بچوں کے بڑے خوبصورت اور دلکش کٹنگ کے نئے نئے فراک بلاوز، قمیصیں اور شلواریں سجی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے پھولوں، بوٹیوں اور بارڈروں سے کاڑھے ہوئے رنگ برنگے ریشمیں دوپٹے اور ساڑھیاں بھی تھیں۔ عورتوں کے ہاف اور پورے کوٹ بھی تھے جہاں وہ کھڑی تھی اس سے بہت پیچھے تک سلائی کے فیشن کی کتابوں، بٹنوں، تاگوں اور دوسری ضروری چیزوں سے بھرے ہوئے ڈبے پڑے تھے اور ان کے اوپر دیوار پر ایک وجیہہ اور صحت مند نوجوان کا فوٹو ٹنگا ہوا تھا۔ کالے چمکیلے بال، آنکھوں پر جھکی ہوئی محراب دار گھنی بھویں، مونچھوں تلے ایک شرارت بھری مسکراہٹ، دھاریوں والے گہرے رنگ کے کوٹ کے ساتھ قمیص اور نکٹائی۔ یہ تھے سروج شاہ کے پتی

[illegible]

[illegible] سب کپڑوں کو ایک نظر دیکھ کر پلاسٹک کے ایک فیتے سے عورت اور اس کے بچے کا ناپ لیا اور ان سے ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کر کے انھیں رخصت کر دیا۔

کاریگروں کو کام دینے کے لیے اس کے پاس بہت سے کپڑے رکھے تھے۔ دوسرے کمروں میں سے کاریگر کام لینے کے لیے

اس کے پاس آنے لگے، عورتیں بھی اور مرد بھی۔ اس نے سب کو کام بانٹ دیا۔ جن کے پاس کام تیار تھا اس کی سلائی کی کمیشن دے کر ان سے کام واپس لے لیا۔ گاہک بھی بیچ بیچ میں آتے رہے۔ شلپ نکیتن میں بہت دور دور سے گاہک آتے تھے۔ اچھی سلائی اور نئے نئے ڈیزائن پیش کرنے کی وجہ سے سروج شاہ نے بڑی شہرت پائی تھی۔ یہ دو منزلہ مکان سروج نے اپنی ہی محنت سے بنایا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر اس کی کڑی محنت اور حوصلے کی گہری چھاپ تھی۔ پندرہ سال پہلے جب اس نے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مشین چلانی شروع کی تھی اس وقت اس کے پاس اس مشین کے علاوہ اپنے پتی کی رُلانے والی صرف ایک یاد ہی تھی۔ پاکستان سے آنے کے بعد ہی مہینے بعد اس کا پتی اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس کئی ہزار روپے تھے۔ وہ کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ بہت انتظار اور تلاش کے بعد بھی اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ یہی سمجھ لیا گیا تھا آزادی کے بعد کی افراتفری میں کسی نے اس کی جان لے لی تھی یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا

اس وقت سروج کی عمر بیس سال تھی۔ بیس سال اور کچھ مہینے۔ اس کی شادی ہوئے بھی آٹھ مہینے ہوئے تھے۔ ان دنوں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ خود غرضی اور چشم پوشی ایک مجبوری بن گئی تھی۔ کوئی کسی کا شکوہ کرنے کے لیے بھی حق بجانب نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے سورگ باسی ماں باپ کا ہی ذمہ بھی تھا۔ اس کے سسرال میں ایک جیٹھ زندہ تھے جو فوج میں تھے۔ وہ اپنے بیوی بچے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ پارٹیشن کے ریلے میں دیارانی بھی دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کے ساتھ سروج کے پاس آگئی تھی۔ یہ پہنچ کر اس سے اس کا خاوند ایک ہی بار ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس کے بعد اچانک ایک مہلک عارضے سے اس کا انتقال ہو گیا تھا لیکن وقت تو گزر جاتا ہے اچھا بھی اور بُرا بھی۔ انسانی زندگی میں جب بھی طوفان آتے ہیں، جب بھی آندھیاں چلتی ہیں اور حادثات گزرتے ہیں۔ وہ سب کہیں نہ کہیں گہرے، ہلکے نقوش یقیناً چھوڑ جاتے ہیں۔ دھرتی پر بھی اور چہروں پر بھی۔ انسان دھرتی کا ایک روپ ہی تو ہوتا ہے دھرتی کی طرح اجڑتا ہے۔ دُکھ سہتا ہے اور پھر پھلنے لگتا ہے۔ اتنے دل شکن حالات کے باوجود سروج بوڑھی نہیں ہوتی تھی۔ مُسکراتی نہیں تھی۔ کچھ تنک مزاج ضرور ہو گئی تھی لیکن غصہ اسے کبھی کبھی ہی آتا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کے اندر کی خلا اور ویرانی کا شدید احساس ہوتا تھا۔

اچانک شلپ نکیتن کے گیٹ پر ایک نئی اور قیمتی کار آکر رُک گئی۔ اس میں سے شہر کا میئر، اس کی بیوی اور رمیش نکلے۔ رمیش کو ان کے ساتھ دیکھ کر وہ چونک گئی۔ میئر ہنستا ہوا اندر آیا۔ بولا۔ "مسز شاہ! اس جانور کو کیوں گھر سے باہر ہانک دیا ہے؟ کانجی ہاؤس والے پکڑ کر لے جائیں، کیا یہی چاہتی ہو؟ یہ میری کار کے آگے آگے بڑی مستی سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے بہت ہارن دیا۔ اسے پکارا بھی لیکن اسے تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ اس وقت میں تھانے میں ہونے کی بجائے تمہارے پاس آکر اس کی شکایت کر رہا ہوں۔"

سروج کا دل غصے، تعجب اور ہمدردی سے بیک وقت بھر گیا۔ اس نے رمیش کو ہلکی سی چپت لگا کر ایک طرف بٹھا دیا اور پھر حافظ صاحب کا اس کی جان بچانے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے حافظ صاحب سے رمیش کے [illegible] کی کہانی بھی کہہ سنائی جسے سن کر میئر نے کچھ سوچا اور پھر کہا ــــ "تم فکر نہ کرو مسز شاہ! کل اسے میرے پاس بھیج [illegible] میرے [illegible] کاغذ کے کارخانے میں ایک ایسی جگہ خالی ہے جہاں اچھی تنخواہ بھی ملتی ہے اور دن بھر کی مصروفیت بھی رہتی ہے۔ خدا نے چاہا تو

وہاں سے یہ آدمی بن کر نکلے گا۔"

سروج نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا۔ اس کی مشکلیں اسی طرح کسی نہ کسی کی بروقت مدد سے آسان ہوتی رہی تھیں۔ اسی لیے تو اس نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ سیٹھ بیگم جواب تک خاموش بیٹھی تھی موقع پا کر بولی ——— "ہم تو تمھارے ہی پاس کپڑے سلوانے آ رہے تھے؟" یہ کہہ کر اس نے کار میں رکھے ہوئے کپڑوں کے دو بنڈل منگوائے۔ وہ لوگ پچھلے کئی سالوں سے یہاں سے کپڑے سلوا رہے تھے وہ ابھی نسلپ نکیتن ہی میں تھے کہ کسی پاٹھ شالا کی ہائی سکول کی لڑکیوں کی فوج کی فوج اندر گھس آئی۔ انھیں اپنی یونیفارمیں سلوانی تھیں۔

سروج اپنے معزز گاہکوں سے معذرت خواہ ہو کر اور انھیں وداع کر کے لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک ہی رنگ کے کپڑے کی کئی یونیفارمیں بنانا تھیں۔ چونکہ لڑکیاں بہت کافی تعداد میں تھیں اس لیے ان سب کا ماپ لیتے لیتے وہ دوپہر ہو گئی۔ اس درمیان میں اس کی جیٹھانی اپنا شلپ کا کام ختم کر کے دو ایک بار جھانک گئی۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ سروج تو کھانا ہمیشہ دیر سے کھاتی تھی۔ کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا تھا۔

جب لڑکیاں ایک دوسرے کو دھکا دیتی "ہنستی" چلاتی ہوئیں باہر چلی گئیں تو دیورانی اسے بلانے کے لیے ایک بار پھر اندر آئی۔ لیکن اسی وقت ایک تانگہ پانچ لڑکیوں اور ایک تیس برس کی عورت اور تھوڑے سے سامان کے ساتھ لدا پھندا سانکیتن کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس عورت کے ہاتھ میں نسلپ نکیتن والی سروج کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

وہ سب اندر آ گئیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے اوپر آتی ہوئی لگتی تھیں۔ بارہ، آٹھ، چھ، چار اور ایک سال کی۔ سب سے چھوٹی کو بڑی لڑکی نے بغل میں لے رکھا تھا۔ سب کی سب میلے اور معمولی فراکوں میں بکھرے بکھرے بے ترتیب بالوں میں۔ اس عورت نے بھی بہت اچھے کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ اس کے بھورے کالے بالوں پر سفر کی گرد جمی ہوئی تھی جیسے کہیں بہت دور سے لڑکیوں کو لیے آ رہی ہو۔ دبلے پتلے شریر کی بڑے دلکش ناک نقشے والی عورت تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ تھکی ہوئی بھی لگتی تھی۔

سروج ان سب کو اپنی چوڑی میز کے پار سے بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ انھیں نہیں جانتی تھی لیکن وہ اسی کے پاس آئی تھیں۔

باہر سے آنے والی عورت کچھ دیر تک صوفے پر لڑکیوں کے درمیان اس طرح خاموش بیٹھی رہی جیسے چاہتی ہو سروج اسے پہچان لے تو پھر وہ کچھ کہے۔ جب سروج خاموش رہی تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور بولی ——— "میرا نام کنتی ہے۔ میرا باپ انجینئر تھا۔ ہم دونوں نے کئی دن تک ایک ہی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ خانیوال سے جالندھر تک۔ پھر کچھ دن ہم ایک ہی کیمپ میں بھی رہی تھیں۔ یاد ہے؟"

سروج کو جیسے ایک لمحے میں سب کچھ یاد ہو آیا۔ اس نے کنتی کو کپڑوں کا اپنا ایک فالتو جوڑا بھی دیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی توے پر روٹی پکاتی رہی تھیں۔ ایک ہی برتن میں کھانا تیار کر لیتی تھیں۔

"ارے تو کنتی! میری اچھی کنتی!" وہ خوشی سے باؤلی ہو کر اس سے لپٹ جانے کے لیے دوڑ پڑی لیکن کنتی نے اسے روک دیا۔ میز پر پڑی ہوئی وزنی قینچی اٹھا کر دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کو دیکھ کر بولی "رک جاؤ۔ اس طرح مت بھاگو۔ پہلے میری بات سُن لو۔ تم جس پتی کی پتنی تھیں اگر میں یہ کہوں کہ میں بھی پچھلے پندرہ سال اسی کی پتنی رہی ہوں تو تم یہ قینچی لے کر میرے منہ پر تو نہیں دے مارو گی؟ لیکن مار و میں تمھارے ہاتھ سے یہ چوٹ [illegible] ہی آئی ہوں۔"

سروج جہاں تھی وہیں کی رہ گئی۔ بالکل سکتے کے عالم میں۔ جیسے اس نے کچھ سنا بھی نہ ہو۔ اگر سنا بھی ہو تو کہیں بہت دور سے۔ اتنی دور سے کہ وہ آواز ابھی تک صاف صاف شبدوں کی شکل بھی اختیار نہ کر سکی ہو لیکن کنتی نے اس کے پتی کا نام کیوں لیا تھا۔ وہ دراصل کہنا

کیا چاہتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے پتی کی تصویر کو دیکھا۔ پھر اپنے اندر کے سارے طوفان کو جو نہ جانے کیسے اس قدر اچانک اٹھ کھڑا ہوا تھا روک کر بڑے ضبط سے پوچھا ـــ "کنتی! تم یہاں کیوں آئی ہو؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

لیکن کنتی کوئی جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ سروج کی جیٹھانی حیرت کا بت بنی ایک طرف کھڑی رہ گئی تھی۔ کنتی کے رونے کی آواز سن کر سارا اسٹاف جمع ہو گیا تھا۔ سروج نے ان سب کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس کی جیٹھانی نے سارے دروازے بند کر دیے اور اس عورت کو خاموش کرانے کے لیے اس کے پاس گئی۔

"تم کون ہو بہن! یہاں کیوں آئی ہو، تمھیں کیا دکھ ہے؟"

سروج کا دل ایک عجیب سی چبھن سے چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا ایک دن اس عورت نے ان سب کے کپڑے دھوئے تھے۔ وہ بہت بیمار تھی۔ اس کا پتی اسے پانی بھر بھر کر لا کر دیتا رہا تھا۔ دونوں نے مل کر کپڑے سکھائے تھے۔ پھر مل کر ہی کھانا پکایا تھا۔ بس اتنی سی ہی بات اسے یاد تھی جو اب پھوڑے کی طرح اس کے ذہن میں ابھر آئی اور پھر اس نے اچانک میز پر رکھی ہوئی قینچی اٹھا لی۔ اس نے کنتی کے چہرے کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ اس تصویر کو بنایا جو دیوار پر ٹنگی تھی۔ تصویر کا شیشہ چھن سے ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گیا اور تصویر الٹی ہو کر کیل کے ساتھ لٹکی کانپنے لگی۔

"کہاں ہیں وہ جنھوں نے مجھے پندرہ سال سے بیوہ بنا رکھا ہے؟ میں انھیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

کنتی نے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور روتے روتے بولی "اب وہ زندہ نہیں ہیں۔ پانچ مہینے ہوئے ٹی بی سے چل بسے۔ دو سال پہلے ایک بار یہاں تم سے ملنے کے لیے آئے تھے لیکن شرم کے مارے ملے بغیر ہی لوٹ گئے۔ مرنے سے پہلے مجھے ہدایت کر گئے تھے۔ میں لڑکیوں کو لے کر تمھارے ہی قدموں میں جا ڈالوں کیونکہ انھیں یقین تھا تم انھیں اور مجھے ضرور معاف کر دو گی۔"

شام کے ساتھی

رتن سنگھ

بابے کھیمے کو سردیوں میں [illegible] دھوپ سینکنے میں کچھ لطف آتا تھا، تو صرف مائی ویراں والی کے آنگن میں۔ اور مائی ویراں والی کو گرمیوں میں [illegible] بابے کھیمے کے پیپل کی چھاؤں ہی زیادہ ٹھنڈی لگتی تھی۔ اس طرح کئی سال گزر گئے تھے اُن کو اکٹھے بیٹھتے۔

بابے کھیمے [illegible] اُن کی شادی نہیں ہو پائی تھی۔ بیاہ کی عمر میں تو وہ کالے پانی میں عمر قید کاٹ رہا تھا، ایک قتل کے مقدمے میں پھنس کر۔ اور جب وہ قید کاٹ کر لوٹا تو پینتالیس سال کا ادھیڑ تھا جس کا جسم طویل قید کی مار نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے، اور چہرے سے جیتی جاگتی زندگی کے آثار مٹ سے رہے تھے۔ بہت ہی بے رونق سا ہو گیا تھا اُس کا چہرہ۔ ویسے تو کچھ دن آزاد فضا میں سانس لینے کے بعد اُس کے چہرے پر رونق پھر لوٹ آئی تھی اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش اُس کے دل میں ترنگ بن کر اُٹھی تھی لیکن اُس کی شادی نہ ہو سکی۔ کئی تو کہتے ہیں کہ بڑے بھائی نے ہی کھیمے کی شادی نہ ہونے دی کہ کہیں وہ بیاہ کے بعد اُس سے جائداد کا حصہ نہ مانگ لے۔ اور کئی کہتے ہیں کہ عمر قید کاٹ کر آئے مجرم کو کون اپنی بیٹی دیتا۔ بات کچھ بھی ہو کھیمے کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔

شادی نہ ہونے کے دُکھ کو کھیمے نے اِسی طرح برداشت کر لیا جیسے قید کی جسمانی و ذہنی تکلیفوں کو برداشت کیا تھا۔ لیکن لوگوں کی تیکھی زہریلی نظروں کو وہ برداشت نہ کر سکا۔ لوگ اُس کی طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی کوڑھی ہو۔ گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اُسے جلدی جلدی دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آتیں۔ کبھی کبھی دروازوں کے پیچھے ہو رہی کھسر پھسر بھی اُسے سُنائی دیتی۔ چھوٹے چھوٹے بچے اُس سے ڈرتے تھے۔ اُس کے پاس آکر سہم جاتے تھے، جیسے وہ انھیں کچا ہی کھا جائے گا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لوگ اُس کی طرف انگلیوں سے اِشارے کرتے ہوں کہ وہ جا رہا ہے کھیما جو عمر قید کاٹ کر آیا ہے۔ کبھی کبھی تو اُسے اِتنا غصہ آتا کہ اُس کا دل چاہتا کہ ان انگلیوں کو کاٹ کر رکھ دے یا کسی کا قتل کر کے پھر جیل چلا جائے۔

لیکن کھیمے نے کچھ بھی نہ کیا۔ دراصل اُس کا خون ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اُس کا غصہ اب پانی کے اُبال کی طرح تھا۔ منٹ دو منٹ کیلئے رہتا اور بس۔ ویسے بھی وہ جیل سے اچھی زندگی جینے کی تعلیم لے کر نکلا تھا۔ اور وہ سچ مچ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ جیل میں اُسے کئی قسم کے کام سکھائے گئے تھے۔ چارپائیاں بُننا۔ طرح طرح کے رسے بنانا۔ کھادی کا کپڑا بُننا۔ وہ ان ہنروں کو استعمال میں لانا چاہتا تھا

بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ لڑتا، اُس نے اُن سے اچھا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ کسی کا کوئی کام ہو، کسی قسم کا، کھیما ہنس کر کر دیتا۔ لوگ اس کے متعلق طنزیہ باتیں کرتے رہتے۔ لیکن وہ اپنے کام میں مست رہتا۔

اس طرح زندگی بسر ہوتی رہی اور اب وہ اسّی سال کا ہو گیا تھا۔ اب گاؤں کے لوگ تقریب قریب بھول چکے تھے کہ کھیما عمر قیدی ہے۔ اُس کے بہت سے ساتھی مر کھپ چکے تھے یا وہ اُس کی طرف زہریلی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ نئی پود میں بہتوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا اور جن کو معلوم بھی تھا وہ کھیمے کے بزرگ ہونے کی وجہ سے اُس کی عزت کرتے تھے۔ اس لیے اُن کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اُسے عمر قیدی کہہ کر اُس کی توہین کریں۔

اسی لیے کھیما خوش تھا۔ اور اب تو اُسے مائی ویراں والی ایسی ساتھن مل گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ مائی ویراں والی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بڑھاپے کا سُونا پن ختم کرنے کے لیے اُسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور یہ ساتھی اُسے ملا تھا بابا کھیما۔ کھیمے کے گھر آتے جاتے رہنے سے مائی ویراں والی کو گھر میں مرد کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کھیمے کو دمے کی بیماری تھی۔ ضرورت پڑنے پر مائی ویراں والی اُسے جوشاندہ یا چائے وغیرہ بھی بنا دیتی تھی۔ تھکا ہوا ہو تو اُس کی ٹانگیں اور کمر بھی دبا دیتی تھی۔

جب شروع شروع میں بابے کھیمے اور ویراں والی نے ایک ساتھ بیٹھنا شروع کیا تو کچھ لوگوں نے ہنسی ہنسی میں کہا: "بابا۔ ویراں والی پر چادر ڈال لو۔" رام سنگھ کے لڑکے اور دینا ناتھ نے ایک دن سب کے سامنے اُن دونوں کے اوپر ایک چادر تان دی۔ نمبردار نے ہنستے ہنستے چادر ڈلوا لی اور اس بھی پڑھ دی۔ سنت رام کا گھر نزدیک ہی تھا وہ جھولی بھر کر شکر بھی لے آیا اور وہاں بیٹھے لوگوں میں بانٹ دی۔ کنوارے لڑکوں نے وہ شکر چھین چھین کر کھائی تاکہ اُن کے بیاہ جلدی ہوں۔ اس مذاق کا نہ تو بابے کھیمے نے بُرا منایا نہ مائی ویراں والی نے۔ بلکہ دونوں ہنستے رہے۔ مائی ویراں والی بھی ہنستی رہی اور چادر ڈالنے والوں کو گالیاں دیتی رہی: "وے ٹٹ پینیو نہاڈا کجھ نہ رہوے۔" لیکن وہ چادر کے نیچے بیٹھی رہی۔ کھیما تو اُس دن بہت خوش تھا۔ جیسے سچ مچ اُس کی شادی ہو گئی ہو۔ اس واقعے کے تین چار دن بعد اماوس تھی۔ بابا کھیما اور مائی ویراں والی کھڑک سنگھ کی بیل گاڑی پر بیٹھ کر اماوس کا اشنان کرنے کے لیے امرتسر کو چلے تو نمبردار نے کہا: "بابا کھیما ہنی مون منانے کے لیے پہاڑ پر جا رہا ہے۔"

سارے گاؤں والے اس بات کو دہرا کر کئی دنوں تک ہنستے رہے۔

ویراں والی کا ساتھ مل جانے سے بابا کھیما یوں محسوس کرتا تھا جیسے ساری عمر کانٹوں پر گھسیٹنے کے بعد کوئی اُس کے لہو لہان جسم کو پھولوں کی سیج پر پھینک گیا ہو۔ سچ مچ بابے کھیمے کو سُکھ کا سانس ابھی لینے کو ملا تھا۔ ایک عمر تو جیل میں بیت گئی تھی اور دوسری لوگوں کی زہریلی نظروں کو برداشت کرتے۔

لوگ کہتے تھے جب سے بابے کھیمے اور مائی ویراں والی کا ساتھ ہوا ہے، بابے کھیمے کی عمر بڑھ گئی ہے۔ جب تک مائی ویراں والی جیتی ہے تب تک تو موت بھی بابے کھیمے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک دن بابا کھیما ویراں والی کے آنگن میں بیٹھا اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ کچھ دیر تک دونوں بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ کھیما اُٹھ کر اپنے گھر کو چلا تو مائی ویراں والی

نے روک لیا۔ کہیں راستے میں بارش نہ آ لے۔

وہ دونو اندر چلے گئے۔ باہر کی کوٹھڑی میں ہوا زیادہ زور سے آ رہی تھی۔ اِس لیے وہ اندر کے کمرے میں بیٹھے۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بابے کھیمے نے تھوڑی دیر بعد کہا "ویراں والی! دیا جلا لو۔ تمہاری کوٹھڑی میں تو بہت اندھیرا ہے۔"

ویراں والی کو ڈھونڈنے پر ماچس نہ ملی۔ اِس لیے اُنھیں اندھیرے میں ہی بیٹھنا پڑا۔ وہ کافی دیر بیٹھے رہے۔ بات کرنے کو کوئی تھی نہیں۔ دوپہر کو اُنھوں نے بہت باتیں کی ہوئی تھیں۔ ایسے ہی کوئی بات چلانے کے لیے مائی ویراں والی نے بابے کھیمے سے پوچھ لیا "بھلا جیل کی کوٹھڑی میں اس سے زیادہ اندھیرا ہوتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔"

مائی ویراں والی کے دل میں کچھ نہیں تھا۔ وہ جیل کا نام لے کر بابے کھیمے کا دِل دُکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ بات اُس نے بالکل غیر شعوری طور پر کی تھی۔

لیکن یہی بات بابے کھیمے کے دل کو چیرتی چلی گئی۔ تیکھے کانٹوں کی طرح "اچھا! تو یہ بھی مجھے عمر قیدی ہی سمجھتی ہے" اُس نے سوچا۔ منٹ دو منٹ تک وہ مائی ویراں کی طرف اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر وہ چُپ چاپ اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

ویراں والی اُسے روکتی ہی رہ گئی۔ منتیں کرتی رہی۔ باہر بارش ہے۔ ابھی نہ جاؤ۔ لیکن بابا کھیما کسی کام کا بہانہ کر کے گھر آ گیا۔

جب بابا کھیما اگلے دن سویرے مائی ویراں والی کے گھر دھوپ سینکنے کے لیے نہ آیا تو مائی ویراں والی کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ کھیما اُس سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ اور وہ اُسے منانے کے لیے اُس کے گھر کی طرف چل دی۔

بابا کھیما اپنے پیپل کے نیچے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ لیکن اندرونی درد سے اُس کا دل رو رہا تھا۔ مائی ویراں والی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس کا تمام غصہ جاتا رہا اور اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

(۲)

جو افسانے بروقت مل گئے تھے۔
وہ سب پہلے حصہ میں آگئے ہیں۔
جو بعد میں ملے۔ انھیں یہاں پیش کیا
جا رہا ہے۔ (ادارہ)

روشن

عصمت چغتائی

اصغری خانم دو باتوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ایک تو دین و دھرم کے معاملے میں اور دوسرے شادیاں کروانے میں۔ اُن کی بزرگی اور پارسائی میں تو کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سب کو یقین تھا کہ انھوں نے اتنی عبادت کی ہے کہ جنت میں ان کے لیے ایک شاندار زمرد کا محل ریزرو ہو چکا ہے۔ حوریں اور فرشتے وہاں ان کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ وضو کا بدھنا، جائے نماز اور تسبیح جھلاتی ہوئی پھڑپھڑاتے جنت کی دہلیز پہ ڈولی سے اُتریں اور دودھ اور شہد کی نہروں میں تیر کر پستے اور بادام کے لدے درختوں کی چھاؤں میں سہانے ہیرے زمرد کے محل میں بٹھا دیں اور اُن کی سیوا پر جٹ جائیں۔

اصغری خانم کا غصہ ہمیشہ ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ اگر ذرا بھی کسی جنتی بیوی نے انھیں چھیڑا تو وہ اس کی سات پشت کے مردے اکھاڑنے لگیں گی اور وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے گی اور دوزخ کی آگ کی پناہ لے گی۔

دُور دُور خانم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انھیں ساری دنیا کا کچا چٹھا معلوم تھا۔ مجال تھی جو کوئی اُن کے سامنے بڑھ چڑھ کر بولے۔ غازی پور سے لے کر لندن تک کی ہر بدکار عورت کا بھید جانتی تھیں۔

"اے ہے مرئی بیاہی تیاہی ڈبڈشنے نگوڑے بادشاہ کو پھانس لیا" وہ مسز سمپسن اور ایڈورڈ ہشتم کے عشق پر تبصرہ کرتیں۔ "معمنہ جلی کو لاج بھی نہ آئی۔ میرا بس چلتا تو تخصمی (جس نے تین خصم کیے ہوں) کا چونڈا جھلس دیتی۔"

مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ لندن سات سمندر پار تھا۔ اور اُن کو گھٹنوں میں آئے دن ٹیسیں اٹھتی رہتی تھیں۔ چونڈا جھلسنے کیسے جاتیں۔ اتنا دم ہوتا تو حج نہ کر آتیں۔

مگر شادیاں کرانے میں تو وہ ایسے ایسے معرکے مار چکی تھیں کہ دنیا میں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قریب قریب نا... قسم کی شادیاں کرانے کا انھوں نے ریکارڈ قائم کر دیا تھا جسے وہ خود ہی آئے دن توڑا کرتی تھیں۔ بس اسی وجہ سے لوگ ان کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ کنواریاں کس گھر کا بوجھ نہیں ہوتیں۔ جس گھر میں چلی جاتیں لوگ سر آنکھوں پہ بٹھاتے۔ سر جھکا کر ان کی گالیاں، کوسنے، طعنے مہنے سنتے۔ انھوں نے ایسی ایسی ڈراؤنی شکل کی لڑکیوں کے نصیب کھولے تھے کہ لوگوں پہ اُن کی ہیبت بیٹھ گئی تھی۔ خاص طور پہ یہ کنوارے لڑکے تو اُن سے ایسے کانپتے تھے جیسے وہ موت کا فرشتہ ہوں۔ نہ جانے کس پہ مہربان ہو جائیں اور اپنے بٹوے میں سے کوئی کچھل پائی نکال کر سر پہ منڈھ دیں۔ جہاں کوئی شادی کے لائق نظر پڑ جاتی وہ سنبھے جھاڑ کر

ماں باپ اور سارے محلے ٹولے والوں کے پیچھے لگ جاتیں اور شادی کے قابل ہونے نہ پاتے کہ اُٹھتے مگر وہ شادی کرا کے ہی دم لیتیں۔ کچھ ایسا پینترا چلتیں کہ اللہ لڑکا دہیز پر ناک رگڑنے لگتا۔ نوبوں کا ایسا تھا ان کے فیصلے جب سناتے ہیں جو ان کا ہر حکم بجا لاتے ہیں۔

مگر ایک جگہ اُن کے سارے ہتھیار کُند ثابت ہوئے۔ تمام تعویذ گنڈے چوپٹ ہو گئے۔ ان کی اپنی ممیری بہن توفیق جہاں کی بیٹی صبیحہ کو چوبیسواں سال لگ چکا تھا اور ابھی تک کوار کوٹلہ چُنا ہوا تھا۔ اس سے چھوٹی عقیلہ منگی ہوئی تھی۔ عقیلہ کی پیٹھ کی ممتونہ کالج میں پڑھتی تھی۔ سب سے چھوٹی منّو تھی۔

قبر کے بھی چار کونے ہوتے ہیں۔ توفیق جہاں کی قبر چُنی کھڑی تھی۔ آج تک خاندان میں نہ کوئی باہر کی لڑکی آئی تھی نہ گئی تھی۔ کھرے سیدوں کے گھرانے کو داغ لگانے کی کسے ہمت تھی۔ لڑکوں کا تو دن بدن کال پڑتا جا رہا ہے۔ کسی کی تنخواہ ٹھیک ہے تو ڈیڑھ میں کھوٹ، کوئی کمبوہ ہے تو کوئی پٹھان۔ ایک بیچارے انجینئر کی شامت آئی پیغام بھیج دیا بعد میں پتہ چلا کہ ہے ہے موئے انصاری ہیں۔ اصغری خانم نے ستیہ گرہ شروع کر دی، طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کے جیتے جی بیٹی انصاریوں میں جائے ایسی بھاری چھاتی کا بوجھ ہے تو کنواں میں ڈال دو۔

یہ جب کی بات ہے جب صبیحہ کو میٹھا برس لگا تھا۔ اس کے بعد جب چھ برس چھ صدیوں کی طرح چھاتی پر سے دندناتے گئے تو اصغری خانم کو اپنی پالیسی نرم کرنی پڑی اور یہ طے پایا کہ اچھے خاندان کا لڑکا ہو تو کوئی زیادہ بڑا اندھیر نہیں۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ صبیحہ کوئی بدصورت ہو کہ کانی کھتری اور ... مرار میاں کا لٹھ ہو۔ سانولی سلونی بوٹا سا قد، نازک نازک ہاتھ پیر، کمر سے نیچے جھولتی ہوئی چوٹی، سونی سونی آنکھیں جن میں قدرتی کاجل بھرا ہوا تھا، جی بھر کے دیکھو تو نشہ آ جائے۔ ہنس دیتی تو موتی سے رل جاتے۔ آواز ایسی میٹھی کہ نوحے پڑھتی تو سننے والوں کی ہچکی بندھ جاتی۔ اس برس ... نے برس ... علیگڑھ سے پرائیویٹ میٹرک پاس کر چکی تھی۔

مگر نصیب کی بات تھی، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ورنہ کہاں صبیحہ اور کہاں روشن۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں عورت مرد کا جوڑ آسمانوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اگر صبیحہ اور روشن کا جوڑ بھی آسمان پر طے ہوا تھا تو ضرور کچھ گھپلا ہو گیا۔ فرشتوں سے کچھ بھول چوک ہوئی۔ یہ دھاندلی آسمانی طاقت نے جان بوجھ کر اصغری خانم کو ستانے کے لیے تو ہرگز نہ کی ہو گی۔

مگر الزام سارا اصغری خانم کے ماتھے تھوپ دیا گیا۔ لڑکا لڑکی صفا چھوٹ گئے اور روند دھر لی گئیں۔ صمد میاں کو کبھی نے جو نہ تھا کہ وہ بہن کی بانہہ پکڑ کے اُسے عذاب دوزخ جیسے کو جھونک آتے۔ سارا گھر منہ پیٹ کے رہ گیا ... کی ایک نہ چلی۔

ہائے اصغری خانم کہیں منہ دکھانے کی نہ رہیں۔ کیا آن بان شان تھی بیچاریوں کی۔ مجال تھی جو محلہ میں اُن کے بغیر کوئی کاج ہو جائے۔ کسی کی بٹیا کا کن چھید ن ہوتا تو انھیں کو دلوچ کر بیٹھنے کے لیے بلایا جاتا۔ کسی کے بال بچہ ہونا ہو تو پہلا پیٹ خانم پر بہایا دیتیں۔ پھر توفیق جہاں تو ان کی سگی ممیری تھیں اور روشن کو شیشے میں اتارنا کوئی کھیل نہ تھا۔ اس لیے معاملہ انھی کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا۔

صمد میاں چھ سال انگلستان رہ کر لوٹے تو بیٹے کی سلامتی کی خوشی میں توفیق جہاں نے میلاد شریف کروایا تھا۔ بریلی والے مولانا خاص طور پر میلاد پڑھنے تشریف لائے تھے۔ سب عورتیں اندر والے گول کمرے میں بیٹھی ثواب لوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں بیسے لگی کھس پھس کر رہی تھیں کہ اتنے میں صمد میاں روشن کے ساتھ داخل ہوئے وہ شاید میلاد شریف کے بارے میں بھول ہی

چلے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید لوٹ جاتے مگر میاں صاحب نے گھور کر دیکھا تو پکڑے گئے۔ مجبوراً دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔

"ہائے یہ کون ہے؟" لڑکیوں نے روشن کو دیکھ کر کلیجے تھام لیے۔ صمد میاں کے سارے دوستوں کو دیکھا تھا کمبخت سب ہی تو چمرخ مرگھلے اور گھونچو تھے۔ مگر روشن اپنے نام کی طرح روشن تھے کہ آنکھیں چکاچوند ہو گئیں کلیجے منہ کو آ گئے۔ جیسے دیوار پھاڑ کر آفتاب سوا نیزے پر آ گیا۔ کیا تیز تیز جگمگاتی آنکھیں جو ہنستے میں یوں کھو جاتیں کہ جی گم ہو جاتا۔ دانت گویا موتی چن دیے ہوں۔ چوڑے چکلے شانے لمبی لمبی بت تراشوں جیسی سڈول انگلیاں اور رنگت ——— جیسے مکھن میں زعفران کے ساتھ چٹکی بھر شہابی رنگ ملا دیا ہو۔ بچوں نے دیکھا کہ صبیحہ کے سلونے چہرے پر یکایک ہلدی بکھر گئی۔ گھنی گھنی پلکیں لرزیں اور جھپک گئیں۔ ہونٹ میٹھے میٹھے ہو گئے۔ لڑکیوں کو مکاری سے مسکراتا دیکھ کر بگڑ بیٹھی۔

صمد میاں اور روشن ننگے سر بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایک ڈاڑھی والے بزرگ غرائے:

"اے صاحبزادے اتنے بھی جنٹلمین نہ بنئے۔ میلاد شریف کے موقع پر ننگے سر بیٹھنے والوں کے سر پر شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

روشن نے سہم کر صمد کی طرف دیکھا انھوں نے جھٹ جیب سے رومال نکال کر چپاتی کی طرح سر پر منڈھ لیا۔ روشن نے بھی اُن کی نقل کی۔ ہوا سے رومال اُڑا تو بندر کی طرح سر پر ہتھیلی جما کر بیٹھ گئے۔ ایسی بھولی بھولی شکل لگی کہ لڑکیوں کی پارٹی کی گرگری رینگ گئی۔ صبیحہ کے مکھڑے کی ہلدی میں ایکدم گلال گھل گیا اور نارنجی رنگ پھوٹ نکلا۔

ڈاڑھی والے حضرت جو موچھ ڈاڑھی صفاچٹ ولایت پلٹ لڑکوں کی گھات میں بیٹھے تھے اور اپنی قہر آلود نگاہیں دونوں پر گاڑ رکھی تھیں۔ مگر یہ دونوں بھی چوکنے بیٹھے تھے۔ اور بالکل بندروں کی طرح اُن کی نقل میں آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر سن رہے تھے اور سر دُھن رہے تھے۔ بڑے میاں نے درود پڑھ کر انگلیوں کے پوروں کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ جھٹ صمد میاں نے اُن کی نقل کی اور روشن کو کہنی ماری۔ انھوں نے بھی بوکھلا کر جلدی سے انگلیاں چوم لیں ایسے بھونڈے پن سے کہ لڑکیوں کے دل اُچھلنے لگے۔ بڑے میاں کا جی خوش ہو گیا۔ وہ انھیں بڑے فخر سے بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ سید کا بیٹا انگلستان گیا امریکہ بھی چلا جائے گا پھر بھی سید۔ مگر لڑکیوں کو خوب معلوم تھا کہ ان لوگوں کو خاک کچھ یاد نہیں یونہی ملاؤں کی طرح بڑبڑ ہونٹ ہلا رہے ہیں۔ انکی اس شرارت پر اتنی بُری طرح ہنسی کا حملہ ہوا کہ صغرا خانم نے دُور سے پنکھے کی ڈنڈی دکھا کر دھمکایا تب کہیں جا کر ہنسی نے دم توڑا۔

میلاد شریف ختم ہوتے پر جب سلام پڑھا گیا تو سب کھڑے ہو گئے شیخ میاں نے محبت سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر سلام پڑھنے میں شریک ہونے کا اشارہ کیا۔

"پڑھو میاں، خاموش کیوں ہو ——"

"جی —— ا —— جی!!"

خدا کے حضور میں جو دل سے نکلے، وہی اسے منظور ہوتا ہے۔" انھوں نے روشن کو ایسے گھورا کہ وہ سہم کر ساتھ دینے لگے

صمد میاں نے بھی ایک تان کھینچ "اولڈ مین ریور" سے سروں میں لگائی۔ مگر روشن نے سنبھال لیا۔ کیا بھاری بھرکم پرسوز آواز تھی کہ بچے پر نور رقت طاری ہو گئی۔ ولایت پلٹ لڑکوں سے بدظن تمام بزرگ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر رہ گئے۔

"ارے صاحب سچا مسلمان چاہے کافروں میں رہے چاہے مسجد میں اس کے ایمان پر داغ نہیں پڑتا۔ ماشاء اللہ دیکھو کے گلے میں عقیدے کا سوز بھرا ہوا ہے۔" بڑے میاں نے آستین کے کونے سے آنکھیں صاف کر کے فرمایا اور روشن کے چہرے کی چمک دمک دیکھ کر کھل اٹھے۔

صبیحہ کی کٹورہ جیسی آنکھیں چھل چھل برس اٹھیں۔ ٹکٹکی باندھے وہ انھیں تکتی رہ گئی۔ جب لڑکیوں نے قاعدے کے مطابق اسے چھیڑا تو وہ جھوٹوں کو بھی نہ بگڑی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پرانا جان پہچان کا مل گیا ہو۔

صمد میاں جب گھر میں آتے تو ہر ایک کا چہرہ روشن کے پرتو سے جگمگا رہا تھا۔ سوائے صبیحہ کے جس نے چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بھرمار کر دی۔ کون ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔

"اے کس کا لڑکا ہے؟" صغرا خانم نے لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

"اپنے باپ کا۔" صمد نے لاپرواہی سے ٹال دیا اور چائے باہر بھجوانے کے لیے کہا۔

"اے ہے لڑکے ہر وقت کا مذاق نہیں بھاتا۔ یہ بتا اس کے باپ کون ہیں؟"

"ہیں نہیں — تھے — فورسٹ افیسر تھے۔ تین سال ہوئے ڈیتھ ہو گئی ان کی۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون! کیا کرتا ہے لڑکا؟" نانی بی نے پوچھا۔

"کون سا لڑکا؟" صمد نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

"اے یہی تیرا دوست۔"

"روشن؟ ڈاکٹر ہے ایم۔ ڈی کی ڈگری لینے میرے ساتھ ہی گیا تھا پھر وہیں انگلینڈ میں نوکری کر لی۔ کچھ کھانے کو بھجوا دیجیے کر میرے کمرے میں بھجوا دیجئے گا باہر درجن بھر بڈھے بیٹھے ہیں سب ہڑپ کر جائیں گے۔ یہ بڑھاپے میں لوگ اتنے ندیدے کیوں ہو جاتے ہیں؟"

صغرا خانم فوراً خم ٹھوک کر میدان میں پھاند پڑیں۔ تیر تلوار سنبھالے اور ہلہ بول دیا۔

"اے صمد میاں جیسے تم ویسے تمہارا دوست۔ اس سے کیا پردہ؟ ادھر ہی گول کمرے میں بلا لو۔" وہ آنکھوں میں رس گھول کر بولیں۔ ان دنوں سیدوں میں بھی کا ناپردہ شروع ہو گیا ہے۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر لڑکیاں کھلے منہ نمائش میں جائیں مشاعروں میں شریک ہوں۔ سہیلیوں کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں سے بڑی بوڑھیوں کی رضامندی سے کر ملیں مگر سڑک پر چلتے وقت تانگہ میں پردہ باندھا جاتا ہے۔ بزرگوں کو دکھانے کے لیے۔ صمد روشن کو گول کمرے میں لے آئے۔ صبیحہ کے سوا سب وہیں چائے پینے لگے۔

صبیحہ کو صغرا خانم کمرے میں گھیرے چونکتے جملے کر رہی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو جہیز کا کوئی بھاری زرتار جوڑا پہنا دیتیں۔ مگر صبیحہ حسب عادت بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے سو رہی تھیں۔ گھر میں جب کوئی موٹا مرغا آتا اسے یونہی سجایا جاتا۔ بیچاری کے

ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے، منہ لٹک جاتا اور ناک پر پسینہ پھوٹ نکلتا اور شکل چچوندی بلی کی سی ہو جاتی۔ جب سے کئی پیغام آ کر پھر گئے تب سے اُسے اور بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ روشن جیسا ہلیشٹ ہم اور ماؤ بڑھلا کیسے چلنے گا۔ ذرا کوئی لڑکا کسی قابل ہوا تو خاندان والے ہی رشتہ کا حق وصول کرنے دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر ملنے ملانے والوں کی باری آتی ہے — ہو سکتا ہے اُس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ دو بچے ہوں!

مگر اصغری خانم بھی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ نہ انھوں نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا تھا۔

"لونڈا جیبرے سے کنوارا ہے، بیاہے مرد کا ڈھنگ ہی اور ہوتا ہے۔" دوسرے انھوں نے پہلے ہی صمد سے پوچھ لیا تھا۔

"بیوی بچے سنگ ہی ہیں؟"

"کس کے؟ روشن کے — ارے اُس گدھے کے بیوی بچے کہاں۔ ابھی تو خود ہی بچہ ہے۔ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔"

بس اصغری خانم نے جھٹ حساب لگا لیا کہ صبیحہ سے چار سال بڑا ہوا۔ خوب جوڑی رہے گی۔ اس سے کم فرق ہو تو چار بچوں بعد بیوی میاں کی اماں لگنے لگتی ہے۔ ویسے مرنے والے تو اصغری خانم سے بیس برس بڑے تھے۔ ہائے کیا عشق تھا اپنی دلہن جان سے!

مگر جب اصغری خانم سجا بنا کر صبیحہ کو گول کمرے میں لائیں تو روشن جا چکے تھے! اصغری خانم کا بس چلتا تو چیختی چلاتی ان کے پیچھے لپکتیں مگر صمد میاں کی انھوں نے خوب ٹانگ لی۔

"صبو ان جنیا کی پال کب تک ڈالو گے۔ کیا سفید چونڈے ہیں افشاں چنی جانے کی رقم ہی کچھ نہ کرو گے تو کون کرے گا۔"

"کون میں؟" صمد خواہ مخواہ چڑ گئے۔ "مجھ سے خود تو اپنی شادی ہو نہیں رہی ہے دوسروں کی کیا کروں گا؟"

"مذاق میں ہر بات کو ٹال دیتے ہو۔ آج اُس کا باپ زندہ ہوتا تو —" اصغری خانم شسر شسر رونے لگیں۔ "آخر اپنا ہو گا ان چار چٹانوں کا۔ توفیق کموری کو ہول دل کے دورے نہ پڑیں تو اور کیا ہو —"

"کونسی چٹانیں؟" صمد میاں انجینیر تھے انھیں چٹانوں، پہاڑیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔

"اے میاں اب بزمت اللہ رکھے اب تم اس قابل ہو اپنے دوستوں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کوئی۔"

"بھئی میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ ٹال کر چل دیے۔

مگر آندھی سے طوفان سے اصغری خانم کو کون ٹالے؟ آتے جاتے ٹانگ لیتیں۔ پھر انھیں ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ وہ فوراً کسی جان لیوا اور انجانے مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ اور عین اس وقت جب روشن صمد میاں سے ملنے آئے، ان پر سخت بھیانک قسم کا دورہ پڑ گیا۔ اتنی زور زور سے آہیں بھریں کہ بیچارے بدحواس ہو گئے۔ جھٹ سے نوکر کو بھیج کر اپنی ڈسپنسری سے بیگ اور انجکشن منگوائے۔ بڑی دیر تک دیکھتے بھالتے رہے۔ اصغری خانم آخری وقت میں بھلا صبیحہ کا ہاتھ کیونکر چھوڑ دیتیں۔ وہ اُن کے سرہانے بھی ہرنی بیٹھی رہی کہ کہیں چور پکڑ نہ لیا جائے۔ انھیں خاموش دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اصغری بوا کی چال پکڑی گئی۔

"کیا بیماری ہے؟" اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ پوچھئے کونسی بیماری نہیں ہے۔ گردوں کی حالت خراب ہے، معدہ قطعی کام نہیں کرتا۔ دل بس ذرا سا دھڑک رہا ہے۔ آنتوں میں زخم ہیں، پھیپھڑوں کے نیچے پانی اُتر آیا ہے۔" انھوں نے صمد کو ایک طرف لیجا کر کہا۔ صبیحہ نے سُنا تو ہنسی نہ روک سکی۔ اصل مریض کی طرف تو انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"اماں ہٹاؤ بھی اتنی بیماریاں ہوتیں تو زندہ کیسے رہ سکتی تھیں۔ اور زندہ بھی کیسی کہ سارے خاندان پر چابک پھٹکارتی ہیں ـــــ" صمد بولے۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں یہ زندہ کیسے ہیں۔ کچھ ایسی لیپا پوتی ہوتی رہتی ہے کہ کھنڈر کھڑا ہے۔ ڈاکٹری سے بڑھ کر کوئی طاقت کام کر رہی ہے۔" اصغری بوا ٹھنکیں اور بدک اٹھیں۔

"اوئی نوج ـــ دور پار ـــ اے لو میرے دشمن کا ہے کو لب گور ہوتے ـــ اے میاں تم ڈاکٹر ہو کہ نرے سلوتری۔ اے چولہے میں جائیں تمہاری دوائیں۔ موئی فرنگیوں کی دواؤں میں دنیا بھر کی غلاظتیں ہوتی ہیں ـــ تھو ـــ" وہ بڑبڑائیں۔

"بس اللہ پاک عزت آبرو سے اٹھالے ـــ اے لڑکے ٹھیک سے بیٹھ۔ نگوڑ ریو کچھ شربت پانی لاؤ کہ گدھیوں کی طرح کھڑی منہ دیکھ رہی ہو ـــ اے بچے کے بہنیں ہیں تیری۔" اچانک صغرا خانم نے پینترا بدلا

"ایں ـــ! جی دو ـــ دو (۲) بڑی بہنیں ـــ ایک بیوہ ہے۔" روشن نے سنبھل کر وار روکا۔

"اچھا ہے ہے ـــ اور دوسری کہاں بیاہی ہے۔"

"کانپور میں سول انجینئر ہیں اُن کے ـــ"

"اے کانپور ہی میں تو اپنے تقی میاں کی خلیا ساس رہتی ہیں۔ کیا نام ہے اللہ رکھے بہنوئی کا ـــ"

"ایس ایں کچلو۔" صمد میاں بولے۔ "کیوں کیا کچھ بنوانے کا ارادہ ہے۔"

"ہاں اپنی قبر بنواؤں گی ـــ اچھا تو تم لوگ کشمیری ہو۔" بیچاری کچھ بجھ گئیں۔ "یہ سیف الدین کچلو کے خاندان سے کچھ ہے میل ـــ"

"جی وہ میرے چاچا کے دوست تھے۔"

روشن کے جانے کے بعد تڑپ کر مریضہ اٹھ بیٹھیں۔

"بھئی سوچو تو کشمیری ہیں۔"

"ہاں اور اس سے پہلے جو پیغام آیا تھا وہ لوگ کمبوہ تھے۔ بس یہی دیکھتی رہو اسے سب انسان برابر ہیں۔ پاک پروردگار نے سب کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات چھوت چھات نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں بگڑنے لگیں۔

"بھئی مجھے یہ صبیحہ کے نخرے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔ ادھر وہ آیا ادھر بنو منہ تھوتھا کر بھاگیں۔ جی چاہا لگاؤں چڑیل کے دو چانٹے۔"

مگر صبیحہ کیا کرتی۔ روشن کے آتے ہی وہ کمرے میں بھاگ جاتی۔ یوں سب کے سامنے گھور کر دیکھتی تو نہ جانے وہ کیا سوچتے دروازے کی آڑ سے مزے سے جی بھر کے دیکھ سکتی تھی۔ اب تو علاج کے لیے وہ بلا ناغہ آنے لگے۔ اصغری خانم کچھ ایسی ترکیب چلتیں کہ صبیحہ کو پاس روک لیتیں۔ اور بے چارے روشن تو ایسے جھینپو تھے کہ صبیحہ بھی شیر ہو گئی۔ انھیں ایک نظر بھر کے اپنی کالی بھونرا آنکھوں سے دیکھتی تو اُن کے ہاتھ میں انجکشن کی سوئی کانپنے لگتی۔ وہ ہنس پڑتی تو گھبرا کر بچوں کی طرح ناخن کترنے لگتے۔ تب وہ اور بھی دیدہ دلیر ہو جاتی۔

"ڈاکٹر صاحب ہماری بی کا جی اچھا نہیں۔"

"کیا ہو گیا؟"

"پتہ نہیں۔ بیچاری کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔"

"اوہو۔ معلوم ہوتا ہے بیچاری کا دل ٹوٹ گیا ہے۔"

"ارے واہ۔ کیوں؟"

"آپ روٹھ گئی ہوں گی۔" وہ دبی زبان سے کہتے۔

"اجی ہاں، میں کیوں روٹھتی۔" صبیحہ کالی کالی پلکیں جھپکاتی۔

"تو پھر ڈر گئی ہو گی آپ سے۔"

"واہ کیا میں اتنی ڈراؤنی ہوں۔"

"ڈراؤنی چیزوں سے تو ڈرپوک ڈرتے ہیں!"

"اور بہادر؟"

"کالی کالی آنکھوں سے۔"

دونوں انگریزی میں نوک جھونک کیئے جاتے تو اصغری خانم کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ بھلا گٹ پٹ کر کے بھی کہیں پیار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ موئی کافروں کی زبان میں "لفٹ رائٹ کوئک مارچ" کے سوا اور کیا ہوتا ہے؛ وہ ایکدم بیچ میں کود پڑتیں۔

"اے روشن میرے چاند ذرا میری بالوشاہیوں پر نیاز تو دے دے۔ تیرے خالو میاں کی برسی ہے۔" وہ فوراً ہوشیاری سے رشتہ لگاتیں۔

"کون میں؟" روشن بوکھلا گئے۔

"آپ بھی حد کرتی ہیں اصغری خالہ۔ ان سے فاتحہ پڑھوا کر اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ ہے۔ بھلا انہیں کیا خبر کہ فاتحہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ایک آئت بھی نہ یاد ہو گی۔" صبیحہ اُڑانے لگی۔

"اچھا مُلّانی جی آپ بیچ میں نہ بولیں۔" روشن چڑ گئے۔

"ارے صاحب چھوڑیے۔ ہمیں معلوم ہے آپ اور صمد بھیا میں کیا کچھ فرق ہے۔ وہ بھی تو صاحب بہادر بن گئے ہیں۔"

"خالہ جی آپ روشن سے فاتحہ پڑھوا رہی ہیں؟" صمد نے قہقہہ لگایا۔

"اے غارت ہو کل مونہو۔ لعنت ہو، موئے آج کل کے لونڈے ہیں کہ نگوڑے سب کے سب بے دین۔" صغرا خانم بالوشاہیوں کا تھال اٹھا کر دالان میں لے گئیں۔ مگر بیچاری کی فکر دُور نہ ہوئی۔

"اے توفیق جہاں۔"

"ہاں کیا ہے؟" توفیق جہاں نے پنکھے سے مکھی کو دھمکا کر جواب دیا۔

"اے میں کہوں یہ آج کل کے لڑکوں کے نکاح کیسے پڑھے جاویں گے۔"

"کیوں؟"

"اسے انھیں — آمنتو بھی تو نہیں آتی۔" "آمنتُ باللہ — ایک آیت ہوتی ہے جو نکاح کے وقت دولہا کو پڑھنی پڑتی ہے جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ میں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس آیت کو پڑھے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔"

"قاضی جی بولتے جاتے ہیں اور دولہا دہراتا جاتا ہے۔ بس بس اب تو ایسے ہی نکاح ہو رہے ہیں۔" توفیق جہاں بولیں۔

"مگر اب اس نیاز کا کیا ہو؟" وہ فکرمند ہو گئی۔

"کیسی نیاز — ؟"

"ارے بھئی میں نے تو جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ اُن کی برسی ہے۔ یہ منّت کی نیاز ہے۔ لڑکا خود نیاز دے جب ہی پوری ہو گی۔"

"اے چلو اُدھر۔ ایسی کوئی منت نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں نے ٹالنا چاہا۔ "نہیں جی تم تو کسی بات کو مانتی ہی نہیں ہو۔ خیر پھر سہی۔" اور وہ خود دوپٹہ سر پہ منڈھ کر بڑبڑ نیاز دینے لگی۔

دوسرے دن روشن آئے تو جھٹ پوچھا "کیوں رے تو نے قرآن ختم کیا تھا؟"

"جی؟ — نہیں تو ایکبار انگریزی میں پڑھا تھا تھوڑا سا — تو —" روشن ہکلائے۔

"تف ہے یہ موئی ملکڑ توڑ زبان میں کیسا قرآن؟ لڑکے دیوانہ تو نہیں ہوا۔"

"تو صمد بھیا نے کونسا پڑھ لیا ہے۔ ساری عمر انگریزی اسکولوں میں رہے۔ کالج میں فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔" مگر صبیحہ خود ہر رمضان کے مہینے میں پانچ قرآن ختم کرتی تھی۔ روزے نماز کی پابند تھی۔ حالانکہ صمد کہتے تھے۔ وہ نازک بدن پھٹنے کے لیے فاقے کرتی تھی — توبہ توبہ!

سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا! روشن کی آنکھوں سے دل کے راز کا بچہ بچہ کو مل چکا تھا مگر زبان نہ جانے کیوں گنگ تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ایکدم آنکھوں میں غم کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا اور سر جھکا کر اُٹھ کر چلے جاتے۔ صبیحہ کی طرف ایسی ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں کھڑی ہو درمیان میں فولادی سلاخیں ہوں اور کالے دیو کا پہرا۔ صبیحہ کے مکھڑے پر غرور اور اطمینان کا نور پھوٹنے لگا تھا جیسے منزل پہ پہنچ کر آرام سے چھاؤں میں بیٹھ گئی ہو۔ ساری انجانی کسک اور تنہائی مٹ کر گھروندا جگر مگر کرنے لگا ہو۔

مگر دقت یہ تھی کہ لڑکے کا یہاں کوئی ہے نہیں پھر پیغام کیسے منگوایا جائے۔ آج تو شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں کہ دو جوڑوں کا ایک دوسرے پر جی آ گیا دوستوں نے پیغام دیا۔ یاروں نے شادی کر دی۔ اصغری خانم کو ایسی ٹلکڑ توڑ شادیوں سے نفرت تھی مگر زمانے کے نئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر نئی وضع کی شادیوں سے بھی انھوں نے رو پیٹ کر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل جب نصرت اور خلیقہ نے ایسی جھٹ پٹ شادی کی تھی تو انھوں نے بڑا شور مچایا تھا۔ مگر پھر انھیں اپنی پالیسی نرم کرنا پڑی۔

ادھر روشن بھوندو سے تھے ادھر صبیحہ بھی ذرا جنٹ ہوتیں تو کبھی کا انھیں ڈکار چکی ہوتیں۔ کاش اُسے کوئی چھوٹی موٹی بیماری کی بیماری لگ جاتی تو روشن اس کا علاج کرتے کرتے خود مرض مول لے بیٹھتے۔ اصغری خانم گھیر گھیر کے مُرغی کو ڈربے میں پھانسنے

کوشش کرتیں مگر اپنے منہ کی کھا کر رہ جاتیں۔

"اے لڑکی تیرے سر میں آدھے سر کا درد ہو وے ہے۔ علاج کیوں نہیں کرا لیتی ڈاکٹر سے؟" وہ صبیحہ کو رائے دیتیں۔

"اے واہ خالہ جی میرے سر میں کاہے کو ہوتا درد" وہ بگڑنے لگتی گڑھی۔

"پہلے تو ہو وے تھا اب بھلی چنگی ہو گئی ہو تو ہمیں نہیں خبر" وہ صبیحہ کی صحت سے جل کر کہتی "دیکھ تو بیٹا روشن کیسی جھلس کر رہ گئی ہے بچی"

"ارے خالہ جی ان کی تو رنگت ہی سیاہ بھٹ ہے۔ کہئے تو کھال کھینچ کر دوسری چڑھا دوں پلاسٹک سرجری سے۔"

"جی ہاں بڑے آئے کھال کھینچنے والے۔ ہم کالے ہی بھلے۔"

"اوئی کالی کدھر ہے لونڈیا، ہاں گیہواں رنگت ہے" اصغری بوا پریشان ہو کر کہتیں۔

"جی ہاں ادھر کچھ دنوں سے امریکہ سے گیہوں بھی کالا ہی آ رہا ہے" روشن چھیڑتے۔

"ہاں بس ایک آپ ہی زمانے بھر میں گورے ہیں، ہو نہ پھیکے شلجم!" صبیحہ چڑ جاتی۔

"آپ تو نمک کی کان ہیں۔ چکھئے کچھ تو مزہ آ جائے گا" وہ چپکے سے کہتے۔

صغرا خانم بدمزگی مٹانے کو جلدی سے بات بدلتیں۔ "اے کالی گوری رنگتیں سب اللہ کی دین ہیں۔ پرسوں کہہ رہی تھی سر بھاری ہے ویسے تیرے بال بھی تو جھڑ رہے ہیں۔ بیٹا کوئی بال بڑھانے کی دوا بتاؤ۔"

"ارے خالہ جی بہت بال ہیں۔ ہاں کہئے تو دماغ کو بڑھانے کے دو چار انجکشن لگا دوں۔"

"آہا! بڑے آئے سلوتری جی۔" اور روشن کا چہرہ ہنستے ہنستے صبیحہ کے گلابی آنچل کو مات کرنے لگتا۔

صغرا خانم اس کچر کچر سے اداس ہو کر بڑی زور زور سے کراہنے لگتیں۔ ایک دن انھوں نے صمد کو گھیر کر بات کر ہی ڈالی۔

"اے بھیا کو پیغام نہ انعام۔"

"کیسا پیغام؟"

"اے روشن کا۔ اس سے کہو اپنی بہن بہنوئی سے پیغام بھجوائے۔"

"مگر خالہ جی روشن۔"

"ہاں ہاں بیٹے مجھے سب معلوم ہے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے ہزاروں شادیاں ہو رہی ہیں۔ کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے۔ توفیق جہاں کا دل کوئی دن اور کام دے گا۔ پھر دونوں میں اللہ رکھے چاؤ بھی ہے۔"

"مگر۔ خالہ جی۔"

"بیٹے تم اللہ رکھے سات سمندر پار رہے تمھیں کیا معلوم دنیا کتنی بدل گئی۔ سیدوں کی بیٹیاں کن کن کو گئیں۔ سرفراز میاں کی لڑکی نے تو زہر کھا لیا۔ اب اللہ کی مرضی یہی ہے تو جہالت کی باتوں میں پڑنے سے کیا حاصل۔"

"مگر۔ میں سوچوں گا۔" صمد میاں چکرائے سے جا کر باہر پڑ گئے۔ اس انقلاب کی انھیں امید نہ تھی۔ دُنیا سے دور وہ کتنے جاہل رہ گئے جبکہ ان کے بزرگ تک اتنے روشن خیال ہو چکے تھے۔ ان کا دل غرور سے بھر گیا۔ شام کی گاڑی سے انھیں سائنس کانفر

میں شرکت کے لیے جاتا تھا۔ اب وہاں سے لوٹ کر ہی سب کچھ ہوگا۔

ادھر اصغری خانم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ یہاں بیٹی بیاہنی تھی اس لیے توفیق جہاں کو کہہ سن کر پٹا لیا کہ صبیحہ بیکار وقت برباد کرنے کے اگر کچھ کام سیکھنے لگے تو کیسا رہے۔ طے ہوا کہ روشن میاں کی ڈسپنسری میں نرسنگ سیکھنے چلی جایا کریں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور صبیحہ نرسنگ سیکھنے جانے لگی جس کا سبق صبح سے لے کر رات کے سینما کے آخری شو تک چلتا رہتا۔ اور صبیحہ چست چالاک نرس کے بجائے دن بدن اس جانے پہچانے مرض میں کھوتی گئیں جو جنم جنم سے مرد عورت کو سونپتا آیا۔ روشن کے سوئٹر بنے جانے لگے اور کمرے میں اُن کی قمیص، اُن کے موزے بکھرے گئے —— بس چودہ طبق روشن ہو گئے!

جیسے ہی شکار گرتا ہے شکاری جو مکر گانٹھے جھاڑیوں میں دبکا ہوتا ہے۔ ایک ہی جست لگا کر آدبوچتا ہے اور گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔ اصغری خانم نے بھی ساری بیماری دور پھینکی اور دھم سے اکھاڑے میں آن جمیں۔ جھپا جھپ جہیز سلنے لگا بڑی دیگوں پر سے لحاف توشک کے انبار اتار کر قلعی ہونے لگی۔ ڈیوڑھی پر سنار بیٹھ گیا کہ سامنے نہ بنواؤ تو موا اُپلے تھوپ دے گا۔ بی سیدانی محلے کی پوٹ سنبھال کر ڈھولی جمیا اور گوکھرو توڑنے لگیں۔ گوکھرو کے ہر کنگورے پر لب بھر کے دعائیں دیتی جاتیں۔ گوئیاں سہاگ اور بنرے یاد کر کر کے کاپیوں میں اتارنے لگیں۔ گورے دولہا اور سانولی دلہن پر گیت جوڑے جانے لگے۔

"اے بھی باپ کا نام روشن تو بیٹے کا؟" صغرا خانم فکر مند ہو کر پوچھتیں۔

"جوشن" کوئی شوخ سہیلی چھیڑتی اور صبیحہ جل کر اس کی بوٹیاں نوچنے لگتی۔

"اے بھی انھیں اپنی کلورانی ہی پسند ہے تم لوگ کاہے کو جلی مرتی ہو؟" صغرا خانم ڈانٹتیں اور صبیحہ آنکھوں میں خوابوں کے جگمگٹے لیے نرسنگ سیکھنے بھاگ جاتیں۔

مگر کسے خبر تھی قسمت یہ گل کھلائے گی۔ پل بھر میں چمکتا سورج اُلٹا توا بن جائے گا۔ وہی روشن جو کل تک چودھویں کے چاند کو شرما رہے تھے لوٹ پوٹ کھڑے ہوئے توکالا دیو! اور اس کالے دیو نے پلک جھپکاتے میں اونچے اونچے محلوں کو چکنا چور کر دیا۔ صغرا خانم کے سارے نئے پرانے مرض ایک دم اُن پہ ٹوٹ پڑے۔ جب صمد میاں کانفرنس سے جھم جھم لوٹے تو گھر میں جیسے کوئی میت ہو گئی ہو۔ سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صغرا خانم کا ایک کوسنا زمین تو ایک آسمان —— زمرد کا محل ساتویں آسمان پر لرزا اور ایک دم بھس سے بیٹھ گیا۔ قلعی کی دیگوں پہ پھر لحاف توشک لد گئے۔ دھنک کی پنڈیاں اُلجھ کر جھونج بن گئیں۔ سنار ڈیوڑھی سے دھتکار دیا گیا اور جس نے سنا منہ پیٹ لیا۔

"آخر ہوا کیا —— کچھ معلوم تو ہو؟" صمد میاں نے پوچھا۔

"ارے اس چھنیسی سے پوچھو —— جو چڑھ چڑھ کے دیدے لڑانے جاتی تھی؟"

توفیق جہاں نے زانو پیٹ لیا۔ "حرافہ ——؟"

فیشن

احمد ندیم قاسمی

اِدھر فیشن بدلتا، اُدھر حلیمہ کے وارے نیارے ہو جاتے۔ نجمہ پرانے فیشن کے سب کپڑے حلیمہ کو تھما دیتی اور کہتی "لے بھئی حلیمہ۔ تیری قسمت سے فیشن بدل گیا ہے۔" یہی وجہ تھی کہ حلیمہ کے پاس بند گلے والے، کھلے گلے والے، پوری آستینوں والے، آدھی آستینوں والے، بہت نیچے اور بہت اونچے جمپروں کے علاوہ کھلے اور تنگ پائنچوں والی گھیرے دار اور بے گھیر شلواروں کا ڈھیر سا لگ جاتا تھا۔ حلیمہ ہر مہینے کی چار تاریخ کو نجمہ کی امی سے تنخواہ لیتی تھی اور جب حلیمہ کی ماں ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو حلیمہ سے تنخواہ لینے آتی تھی تو شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جب وہ اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک گٹھڑ اٹھا نہ لے گئی ہو۔ پھر وہ خوش ہو کر حلیمہ سے کہتی تھی "ہائے ری چھوکری۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ جب دیکھو نئے کپڑے۔ جب دیکھو نئے کپڑے۔ یہ نجمہ بی بی نے تجھے نوکرانی رکھا ہے کہ سہیلی بنایا ہے؟"

پھر جب وہ دیکھتی کہ نجمہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے تو وہ دانت بھینچ کر اور حلیمہ کے سینے میں اپنے دو ہتڑ چبھو چبھو کر کہتی "اری حرام کی اولاد۔ نجمہ بی بی جو تجھ پر اتنی صدقے قربان ہوتی ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھا۔ تجھے جو ڈھیر سے کپڑے ملتے ہیں، ان میں اچھے والے خود کیوں پہن لیتی ہے؟ تُو نوکرانی ہے۔ اپنے آپ میں رہا کر۔ اپنا جہیز جمع کر۔ ریشمی کپڑے ملیں تو خود نہ پہن لیا کر۔ ان پر لوہا کر لیا کر اور میں آؤں تو مجھے دے دیا کر۔ اس صدی کا ایمان خراب ہو گیا ہے۔ اب عورت کو کوئی نہیں دیکھتا۔ سب جوڑے گنتے ہیں اور زیور تولتے ہیں۔"

اور اگر اوپر سے نجمہ کی امی آ گئیں تو وہ ہنس ہنس کر کہتی "یہ میری بیٹی سدا کی انوکھی ہے بی بی جی۔ تیرہ سال تک بالشت بھر کی رہی۔ اس کا باپ اسے پِدی کہتا تھا۔ پھر جو ایکا ایکی بڑھنے لگی ہے، تو بی بی جی، قسم لے لیجئے کہ سردیوں میں اس کے لیے جو شلوار سلائی وہ گرمیوں میں اس کے گھٹنوں سے نیچے اُترتی ہی نہیں تھی۔ یوں کدوی بیل کی طرح بڑھی ہے کہ الٰہی توبہ۔ اس کا باپ ہنس ہنس کر کہتا تھا۔ اسے روکو، روکو، یہ کہاں جا رہی ہے۔ پہلے مجھ سے سر نکالا۔ پھر اپنے باپ کے بھی آس پاس پہنچنے لگی تھی کہ اسے اللہ نے بلا لیا اور یہ وہیں رُک گئی۔ شکر ہے رُک گئی ورنہ پرنالوں سے ٹکراتی پھرتی۔"

بی بی جی کی ہنسی ختم ہونے کا انتظار کرنے کے بعد وہ کہتی "اب بھی دیکھ لیجئے۔ ویسی ہی انوکھی ہے۔ نوکری کرنے کو اللہ نے ایسا گھر دیا ہے کہ ——— یہی جوڑا دیکھ لیجئے۔ ایسا ریشم پہننے کا خواب تو میری دادی پردادی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں تو ایک دن اسے بجمہ بی بی سمجھ کر سلام بھی کر بیٹھی تھی' اور اس حرام کی اولاد کو دیکھئے کہ بولی: "وعلیکم سلام۔"

دونوں مائیں ہنسنے لگتیں اور حلیمہ' جو ماں کی باتوں کے دوران میں مسلسل مسکرائے جاتی، بھاگ کر بجمہ کو ماں کی ساری باتوں کی رپورٹ کرنے پہنچ جاتی۔

بجمہ کے لیے حلیمہ محلے کا اخبار تھی۔ وہ دس منٹ کے لیے بھی کہیں پڑوس میں رقعہ دینے جاتی تو واپس آ کر ایک گھنٹے تک گلی کے ہر گھر کے تازہ حالات بیان کرتی رہتی اور بجمہ کے جسم میں سنسنی پر سنسنی دوڑتی رہتی۔ "اب آگے بھی بکو نا۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا بجمہ بی بی۔ طلاق ہو گئی۔"

"کس کی؟"

"جس کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہائے بے چاری۔"

"بے چاری نا بے چاری! قسم سے بجمہ بی بی۔ بیویوں نے بھی کبھی عشق کیا ہے؟"

"پر کسی نے دیکھا تھوڑی ہو گا۔"

"کسی نے دیکھا ہو، نہ دیکھا ہو، اس کے گھر والے نے تو دیکھا۔ لوگ تو کہتے ہیں بجمہ بی بی، کہ اس نے چاقو بھی نکال لیا۔"

"ہائے — پھر؟"

"پھر کیا۔ بس سوچا ہو گا کہ چاقو نہ مارو، طلاق دے دو۔"

"ہاں — بات تو ایک ہی ہے۔"

یا پھر بجمہ بے قرار ہو کر پوچھتی۔ "اب کہہ بھی چکو نا۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا بجمہ بی بی۔ بس پولس آ گئی۔"

"پھر —؟"

"پھر کیا بجمہ بی بی! بس بچے کو نالی میں سے اٹھوایا۔"

"ہائے — نالی میں سے؟"

"تو کیا گود میں سے؟ قسم سے بجمہ بی بی، آپ بھی بڑی بھولی ہیں۔ کہہ تو چکی ہوں کہ حرام کا تھا۔"

"اونچا مت بکو۔"

"لیجئے۔ باہر گھر گھر ڈھنڈورا پٹ گیا ہے اور بجمہ بی بی کہتی ہیں اونچا مت بکو۔"

"پر تھا کس کا؟"

"یہ تو بجمہ بی بی، خدا ہی جانے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ سنا ہے سارے محلے کی عورتوں کی ڈاکٹری ہو گی تو پتہ چل جائے گا۔"

"ہائے۔ خدا سب کے پردے رکھے۔"

ایک بار حلیمہ کی ماں کو نمونیہ ہو گیا اور حلیمہ اس کے پاس چلی گئی تو نجمہ سارے گھر میں اجنبیوں کی طرح ٹامک ٹوئیے مارتی پھری۔ ایک دن "چنا جور گرم" والے نے اپنی کراری آواز میں مسالوں کی تعریف گائی تو نجمہ رونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ چنوں والا سیڑھیوں کے سامنے کھڑا حلیمہ کے اُترنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اسی لیے تو وہ "چنا جور گرم بابو" کی جگہ "چنا جور گرم بی بی" گا رہا تھا، اور اس کے گیت میں یہ اصلاح حلیمہ ہی نے کی تھی۔ اس نے کہا تھا "کیوں وے۔ تو مینوں بابو کیوں کہتا ہے۔ کیا بابو ایسے ہوتے ہیں؟" اور وہ یوں اکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی جیسے تصویر اتروا رہی ہے۔ نجمہ اوپر کھڑکی کی چق میں سے دیکھ رہی تھی۔ اس زور سے ہنسی اور اتنی دیر تک کمرے کمرے میں ہنستی پھری کہ اس کے ابا جی کو بھی آخر کار ذرا سا مسکرا دینا پڑا۔

نجمہ کے ابا صرف اس وقت مسکراتے تھے، جب انھیں یقین ہو جاتا تھا کہ اب فرار کی کوئی راہ نہیں اور مسکرائے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لیے نجمہ اپنی امی سے کہا کرتی تھی کہ اگر ابا کھالوں کے سوداگر نہ ہوتے تو بڑے قنوطی قسم کے فلسفی ہوتے۔ وہ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ایسے لگتے جیسے انھوں نے اپنی گردن پر چیتے کی کھال لپیٹ رکھی ہے۔ ہزاروں کماتے مگر کبھی کبھار ایک آدھ سینکڑے کا بھی نقصان ہو جاتا تو کم سے کم ایک وقت کا کھانا نہ کھاتے اور رات بھر جاگتے اور تسبیح کے منکے چلاتے رہتے۔ کھالیں بیچ بیچ کر انھوں نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ بیٹھے ہوئے بھی ہانپتے رہتے۔ محلے والے ان کی دولت کا اندازہ یہ کہہ کر لگاتے کہ جب وہ مر گئے اور ان کی دولت کو ان کے ساتھ قبر میں دفن کرنا پڑا، تو خود ان کی میت کے لیے دوسری قبر کھودنی پڑے گی۔ اور اگر ان کی گنجائش نکالنے کے لیے قبر کو کچھ اور کھودا گیا تو نیچے سے پانی نکل آئے گا۔

مگر ادھر نجمہ اسکول سے نکل کر کالج پہنچی، ادھر ان کی دولت کو سیندھ لگ گئی۔ ادھر فیشن بدلتا، اُدھر وہ نئے فیشن کے اکٹھے دس پندرہ جمپر سلوا لیتی۔ جار تو اس کے صرف برقعے تھے۔ کالا، نیلا، گہرا چاکلیٹ اور ہلکا بادامی۔ جوتے اتنے تھے کہ دو شیلفوں میں سے کتابیں نکال کر ان میں جوتے بھر دیے گئے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بھی فیشن کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ لپ اسٹک کے سب شیڈ اس کے پاس تھے۔ نیل پالش کی ہر ملک کی شیشیاں اس کی سنگار میز پر سجی رہتی تھیں۔ "آئی برو" پنسلیں تک درجنوں کی تعداد میں موجود تھیں۔

شروع شروع میں جب نجمہ نے ہاتھ دکھانے شروع کیے تو اس کی امی بہت گھبرائیں۔ نجمہ کو ابا کے پاس جانے سے روکتی رہیں مگر نجمہ بولی "میں ان کا بیٹا ہوتی تو اب تک دو تین موٹریں خرید چکی ہوتی۔ پھر پتہ چلتا ابا جی کو۔ میرا خرچہ تو ایک سائیکل تک کا خرچہ بھی نہیں ہے۔" پھر وہ ابا کے کمرے میں دراز چلی گئی اور ہکا بکا ماں دیوار سے چمٹ کر اندر جھانکنے لگی۔

وہ بیٹھے شاید کھالیں گن رہے تھے۔ نجمہ نے "ابا جی" کہا تو اسے چھوٹے چھوٹے شیشوں والی سنہری عینک کے اوپر سے یوں دیکھا جیسے مارے پیار کے، ڈکرانے لگیں گے۔ پھر جب اس نے کہا کہ "ابا جی۔ مجھے پانچ سو روپے چاہئیں۔ کپڑے خریدنے ہیں اور چند جوڑی جوتے اور لڑکیوں کی ضرورت کی کچھ اور الابلا۔" تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مہینوں کے بعد مسکرا دیے۔ پھر گلے کا ایک کونہ اٹھایا۔ انگشتِ شہادت کو زبان سے چھو کر گیلا کیا اور سو سو کے پانچ نوٹ گن کر نجمہ کی طرف بڑھا دیے۔

چکرائی ہوئی امی کو اتنا ہوش تھا کہ بیٹی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیے جب نجمہ نوٹ لے کر اور سر پر ہاتھ پھروا کر پلٹی تو وہ کھسک کر ایک طرف ہو گئیں۔ اور جب وہ چلی گئی تو آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے پاس پہنچیں۔ انھوں نے بیوی کی طرف

یوں دیکھا جیسے وہ کچھ اور قریب آئیں تو انھیں سینگ ماردیں گے۔ بولے " روپیہ چاہیے؟" نجمہ کی امّی بولیں " جی ہاں " اور انھوں نے سنہری عینک کی کمانی کو ذرا سا ہلا کر کہا " تو پھر اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ میرے مرنے کا تو ذرا سا انتظار کر لو۔" پھر سر جھکا کر ہندسے گننے لگے۔

بیٹی کے سلسلے میں باپ کی اسی فیاضی کا نتیجہ تھا کہ نجمہ نے اپنی الگ نوکرانی رکھ لی۔ پچاس روپے ماہانہ بھی، اور روٹی بھی، اور کپڑا الگ۔ اور کپڑے بھی موسم کے ساتھ نہیں فیشن کے ساتھ۔ امی نے صرف اتنا کہا کہ " بیٹی۔ جب تمہارے ابّا کلرک بھرتی ہوئے تھے تو اتنی تنخواہ تو انھیں بھی نہیں ملتی تھی۔" مگر بیٹی پر اس بات کا صرف اتنا سا اثر ہوا کہ ہنسنے لگی اور بولی " ہائے امّی۔ یہ سوچ کر کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہمارے ابا جی بے چارے کبھی کلرک بھی تھے۔"

آہستہ آہستہ نجمہ کی امّی بھی عادی ہو گئیں، بلکہ اب تو جب بھی نجمہ، ہاتھ میں سو سو کے چند نوٹ لے کر ابا کے کمرے میں سے نکلتی تو وہ یوں اطمینان کی سانس لیتیں جیسے انھوں نے اپنے شوہر سے انتقام لیا ہے۔ ان کے اطمینان کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان کی بھی بعض ضرورتیں نجمہ کے روپے سے پوری ہونے لگی تھیں۔ اب روپے کی خاطر وہ شوہر کی بجائے بیٹی کو خوش کرنے میں لگی رہتیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ایک دن حلیمہ کی تنخواہ میں اکٹھے دس روپے بڑھا دیے، اور جب حلیمہ نے جا کر نجمہ کو بتایا تو وہ اتنی خوش ہوئی کہ بھاگتی آئی اور امی سے لپٹ کر انھیں چومنے لگی۔ پھر امی کو ابا جی کی طرف سے ملے ہوئے ماہانہ حساب کے روپے میں اس نے حلیمہ کی تنخواہ کے علاوہ دس دس کے دو نوٹوں کا بھی اضافہ کر دیا اور بولی " آپ نے میری نوکرانی کے دس روپے بڑھائے ہیں تو میں آپ کی مائی کے دس روپے بڑھاتی ہوں۔"

ویسے تو مائی اور شرفو، نجمہ کے دست بستہ غلام تھے مگر نجمہ کی مشکل یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے کمرے میں اگر دو منٹ سے زیادہ رُکتا تو نجمہ کو ایسا لگتا جیسے وہ پلٹ کر آئینہ دیکھے گی تو اس کے بال سفید ہو چکے ہوں گے۔ شرفو کے سر اور داڑھی کے بال اتنے سفید تھے کہ وہ سارے کا سارا برف کا بنا ہوا لگتا تھا۔ اور پھر وہ مرد تھا اور نجمہ کو بیٹی جی اور بٹو جی کہہ کر پکارتا تھا۔ اب نجمہ اسے یہ کیسے سمجھاتی کہ لتا نے " برکھا بہار آئی " گا کر اپنے آپ پر دوزخ کی آگ حرام کر لی ہے۔

ادھر مائی تھی کہ اس عمر میں اس کے صرف دو کام رہ گئے تھے۔ کھانا پکانا اور وضو کرنا۔ کھانا یوں فٹافٹ پکاتی تھی۔ جیسے چولہے میں لکڑیوں کے ساتھ خود بھی جل رہی ہے۔ مگر نماز یوں آسودگی سے پڑھتی تھی جیسے اب مر کر ہی سلام پھیرے گی۔ پھر ایک بار جب نجمہ ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سن رہی تھی اور مائی اس کے پاس کانی لائی تھی، تو گانے میں " جوبن " کا لفظ سن کر مائی کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی تھی۔ جیسے گانے والے نے اس کے سینے میں مکا کھینچ مارا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا تھا " یہ تو بٹو جی، بڑی شرم کی بات ہے۔" اور نجمہ نے کہا تھا " ہاں مائی۔ تمہاری عمر میں سچ مچ بڑی شرم کی بات ہے۔" اس کے بعد وہ خوب ہنسی تھی مگر یہ اکتاہٹ کی ہنسی تھی، جیسے وہ ہنس نہیں رہی ہے، چہرے کو مکھیوں سے بچا رہی ہے۔

حلیمہ کو اس نے صرف اس لیے ملازم رکھا تھا کہ جوان لڑکی ہے۔ اس سے دل کی بات کہی جائے گی تو پلکیں نہیں جھپکنے لگے گی۔ وہ غسل خانے میں ہوگی اور ادھر ریڈیو پر فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا تو وہ بے کہے ریڈیو آن کر دے گی اور یوں ایک بھی ریکارڈ کو ضائع نہیں جانے دے گی۔ وہ گھر میں چلے پھرے گی تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نہیں کھچ جائے گا بلکہ زندہ رہنے کو جی چاہے گا۔

مگر جس روز حلیمہ آئی تو دن بھر نجمہ سے دُور رہنے کے بہانے ڈھونڈھتی رہی۔ نجمہ نے اسے بار بار پکارا اور وہ بار بار آئی مگر یوں جھجکی اور سمٹی ہوئی جیسے جوانی کا محض سوانگ بھرے پھرتی ہے۔

رات نجمہ کو کھانا کھلانے کے بعد جب حلیمہ جانے کی سوچ رہی تھی تو نجمہ اُٹھی اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ پھر حیران حلیمہ کو بازو سے پکڑا اور جھٹکے سے کھینچ کر اپنے بستر پر گرا لیا۔ حلیمہ پلش کے لحاف پر یوں گیند کی طرح اچھلی جیسے آگ میں گر پڑی تھی۔ مگر بے تحاشہ ہنستی ہوئی نجمہ نے اسے پھر سے دھکا دیا اور وہ پلش کے لحاف کو اپنے جسم کے مس سے بچانے کی کوشش میں نجمہ کی مسہری کو دُور تک دھکیلتی چلی گئی اور پھر فرش پر گر پڑی۔ مسہری کے پائے ٹائیلوں والے صاف فرش پر پہنچے تو دور سے نجمہ کی امی کی آواز آئی: "کیا ہوا بیٹی؟"

نجمہ پکاری: "کچھ نہیں امی جی۔ حلیمہ سے پلنگ کی پوزیشن بدلوا رہی ہوں۔" پھر وہ حلیمہ کی طرف ہنستی ہوئی بڑھی۔ حلیمہ ڈر کر اٹھی اور کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو دیوانی؟" نجمہ نے حلیمہ کے پاس آ کر پوچھا۔ "مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نہ دیکھو۔"

حلیمہ نے ایک دم اپنا کھلا منہ اور پھٹی آنکھیں سمیٹ لیں۔

"تم میری نوکرانی نہیں ہو۔" نجمہ نے اسے سمجھایا۔ "تم میری سہیلی ہو۔ تم میری باتنخواہ سہیلی ہو۔ میں بڈھوں میں گھر گئی تھی۔ گھر میں رہ کر بھی ایسا لگتا تھا۔ جیسے موہنجوداڑو کے کھنڈروں میں گھوم رہی ہوں۔ اسی لیے میرا دل بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ اب میں زہرِ عشق کی بجائے مناجاتِ بیوہ پڑھنے کی سوچ رہی تھی۔ سمجھ رہی ہو میری بات؟"

حلیمہ کا منہ پھر کھلنے لگا تھا مگر نجمہ کے اس سوال پر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی۔ "جی کچھ سمجھی ہوں، کچھ نہیں بھی سمجھی ہوں۔"

نجمہ مسکرائی: "جو کچھ سمجھی ہو وہ مجھے بتاؤ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتاؤ۔"

خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے میں حلیمہ نے ہمت باندھی۔ پھر کچھ نگل کر بولی: "جی بس اِتنا سمجھی ہوں کہ آپ بھرے گھر میں اکیلی ہیں اور ——، اور اکیلی ہیں اور ——"

"اور؟" نجمہ نے پوچھا۔

"اور آپ بہت اچھی بی بی ہیں۔" حلیمہ سے صرف یہی الفاظ بن پڑے۔

نجمہ نے ہنس کر حلیمہ کا ہاتھ پکڑا۔ پھر اسے اپنی مسہری کے پاس لے آئی اور بولی: "اچھی بیبیاں محبت تو نہیں کرتی نا؟"

"جی نہیں۔" حلیمہ فوراً بولی۔

اور نجمہ نے پوچھا: "پھر میں اچھی کیسے ہو گئی؟ میں تو محبت کرتی ہوں۔"

نجمہ یہ کہہ کر مسہری پر بیٹھ گئی اور حلیمہ یوں کھڑی رہ گئی جیسے گاڑی یکایک چھوٹ گئی ہے۔

نجمہ نے مسہری پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا اور بولی: "آؤ، ادھر میرے پاس لحاف میں گھس آؤ۔"

"میں؟" حلیمہ نے پوچھا جیسے کمرے میں نجمہ اور اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو۔

"تم نہیں تو کیا تمہارے فرشتے؟" نجمہ ہنسی۔ "کہہ جو چکی ہوں کہ تم میری نوکرانی نہیں ہو سہیلی ہو۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ لوگ

سہیلیاں بناتے ہیں۔ میں نے سہیلی رکھی ہے۔ اور اگر تم اپنے آپ کو نوکرانی ہی سمجھتی ہو تو میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ ادھر میرے پاس گھس آؤ۔"

حلیمہ ہکا بکا کھڑی رہی۔

"تو سُنتی نہیں ہو؟" نجمہ نے ذرا رُعب سے کہا۔ "چلو، ادھر آؤ!"

حلیمہ اس کی طرف یوں چلی جیسے ملزم حوالات کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پھر وہ اس کے پاس جا کر رُک گئی۔ نجمہ نے پل بھر انتظار کیا۔ پھر اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا، اور جب وہ بستر پر گر پڑی تو اسے لحاف اُڑھا دیا۔ حلیمہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی — پھر بولی "قسم سے نجمہ بی بی، کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

نجمہ نے سیل کے تکیوں پر سے سر اٹھایا اور حلیمہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "تم کتنی خوبصورت ہو حلیمہ۔ تمھاری آنکھیں کسی شاعر فرشتے نے بنائی ہیں اور تمھارے ہونٹ کسی مصوّر فرشتے نے تراشے ہیں۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے حلیمہ؟ مگر تم نے کیا کی ہوگی۔ تم سے تو محبت کی جانی چاہیئے۔ کسی نے کی؟"

حلیمہ جو نجمہ کی باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھی، آنکھیں جھکا کر مسکرانے لگی۔

"اچھا تو پہلے میں بتاتی ہوں۔" نجمہ بولی "میں نے صرف ایک محبت کی ہے۔ اور میں نے جو تمھیں پچاس روپے مہینے پر بلایا ہے نا، تو اسی لیے بلایا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

"پر کس سے نجمہ بی بی؟" حلیمہ نے پہلی بار کارروائی میں براہ راست حصّہ لیا، مگر یہ پوچھتے ہی وہ ڈر گئی جیسے اس کا مخاطب کوئی مرد ہے اور اس کے سوال کے جواب میں وہ اسی کا نام لے دے گا۔

نجمہ نے لحاف کے اندر حلیمہ پر اپنا بازو پھیلا دیا اور بولی "آج تم چنا جور گرم والے سے چنے خریدنے گلی میں گئی تھیں نا۔ تو سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے جس مکان کے سامنے تم نے چنے خریدے، اس کا مالک شیخ منصور احمد ہے اور وہ اتنا خوبصورت ہے کہ اگر وہ عورت ہوتا اور میں مرد ہوتی تو اسے بھگا لے جاتی۔"

حلیمہ پہلی بار کھل کر ہنسی۔

نجمہ کہتی رہی۔ "اس کے گھر میں صرف وہی رہتا ہے یا نوکر چاکر ہیں جو اس کے حکم کے بغیر اُوپر کی منزل میں نہیں آسکتے۔ اگر کوئی چاہے تو بڑی آسانی سے اس کے پاس جا سکتا ہے اور گھنٹوں بیٹھ سکتا ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں اور میرا کسی ایسے گھر میں قدم رکھنا جس میں میری عمر کی کوئی لڑکی نہیں رہتی، ایسا ہی ہے جیسے میں نیکر بنیان پہن کر سڑک پر نکل جاؤں۔"

حلیمہ ایک بار پھر ہنسی۔

نجمہ بولتی رہی۔ "میرے ہاں سے اگر کوئی وہاں جا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔"

"میں؟" حلیمہ بستر میں اُٹھ بیٹھی۔

نجمہ نے تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے ایک بند لفافہ نکال کر بولی۔ "میں نے باتوں باتوں میں حلیمہ

سے اس کے گھر کا سارا نقشہ پوچھ لیا ہے۔ اندر جاتے ہی دائیں ہاتھ کو سیڑھیاں ہیں جو سیدھی اوپر جاتی ہیں۔ تم اوپر چلی جانا۔ منصور کو سلام کرنا اور کہنا کہ اس خط کی صورت میں بے حد شریف خاندان کی ایک لڑکی کی آبرو آپ کے پاس امانت رکھنے آئی ہوں۔"

"آپ نے اسے خط لکھا ہے؟" حلیمہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" نجمہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔ "میں نے اسے لکھا ہے کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے، مجھے ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے پوری دنیا میں صرف ایک مرد رہتا ہے اور وہ آپ ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ کوئی سبیل نکالیے ورنہ میں کسی روز آپ کے کمرے میں چھُرا لے کر داخل ہوں گی اور اسے آپ کے سامنے اپنے سینے میں اُتار لوں گی۔"

"ہائے نجمہ بی بی، قسم سے، یہ لکھا ہے آپ نے؟" حلیمہ نے پہلی بار نجمہ کے کندھے پکڑ لیے۔

"ہاں" اب نجمہ کی آنکھوں پہ آنسوؤں کی ایک مہین سی تہہ پھیل رہی تھی۔ "میں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر صورت دیکھے بغیر محبت نہیں ہو سکتی تو بھی آپ کو مطمئن رہنا چاہیئے کیونکہ مجھے میرا آئینہ روزانہ بتاتا ہے کہ میں بھی کچھ ایسی بُری نہیں ہوں۔"

"بُری نہیں ہوں!" حلیمہ بولی۔ "ارے نجمہ بی بی۔ قسم سے، آپ تو چھپی ہوئی مُورت ہیں۔ آپ تو اتنی خوبصورت ہیں کہ آپ کو میں نے پہلی بار دیکھا تو سوچا کہ یہ بی بی بے شک مجھے تنخواہ نہ دیں، بس مجھے دیکھتا رہنے دیں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔"

نجمہ چونکی۔ پھر ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور بولی۔ "ہائے، تم نے کیسی پڑھے لکھوں کی سی بات کی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بس یونہی ہو۔ تمہارے سینے کے اندر تو دل ہے۔"

حلیمہ شرما کر مسکرائی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "لائیے۔"

"اس وقت؟" نجمہ نے خط کتاب میں رکھ دیا۔ "اری نہیں دیوانی۔ اس وقت نہیں۔ رات بھی کوئی وقت ہے؟ صبح صبح سودا لینے کے بہانے نکلنا تو چلی جانا۔ اوپر کوئی نوکر ہو تو کہنا، شیخ جی سے ایک دکان کا پوچھنے آئی ہوں۔ بازار میں منصور کی اپنی بھی ایک بڑی دکان ہے اور بہت سی دکانیں کرائے پر بھی دے رکھی ہیں۔ لوگ دکانوں کے لیے اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور دیکھو۔ میں نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا۔ تم بھی نہ بتانا۔ پوچھے تو کہنا، بس کوئی ہے۔ اس کے جواب ہی سے پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اگر وہ ایسا ویسا نکلا تو یوں کریں گے کہ تم ابا جی کے لیے کُشتے کے بہانے ذرا سی سنکھیا لے آنا۔ وہ میں چپکے سے کھا لوں گی اور میرے ساتھ میری محبت بھی ختم ہو جائے گی۔ محبت یونہی ختم ہوتی ہے۔ یوں ختم نہ ہو تو محبت نہیں ہوتی، بدچلنی ہوتی ہے۔ سمجھ گئیں نا؟"

مگر حلیمہ تو یہ بات سُن کر رونے لگی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ حلیمہ بس اسی دن روئی اور اس کے بعد تو وہ جیسے رونا بھول ہی گئی۔ چند ہی دنوں میں اس کے اندر سے چلبلا پن یوں امڈ گھمڈ کر نکلی کہ سارے گھر کو ہنسانے اور سارے محلے کو چونکانے لگی۔ ایک لڑکا تو اس پر فدا بھی ہو گیا۔ جس گلی میں سے گزرتی، وہ نکڑ پہ کھڑا آہیں بھرتا ملتا۔ ایک دن اس نے حوصلہ کر کے کہہ بھی دیا کہ "حلیمہ، میں تم پہ مرتا ہوں۔" اور حلیمہ پٹ سے بولی۔ "مرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیتے۔ کہ تمہاری ناک کو سامنے سے دیکھیں تو پورب سے پچھم تک پھیل رہی ہے۔"

اور ایک طرف سے دیکھیں تو جیسے تم گھر سے نکلتے ہوئے ناک کہیں الماری میں بند کر آئے ہو۔" اس لڑکے کی محبت شکیب کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

حلیمہ، شیخ منصور احمد کے گھر یوں جانے لگی تھی جیسے اپنے گھر میں جا رہی ہو۔ رقعہ دیتی۔ رقعہ لیتی۔ پھر نجمہ کے پاس آ کر دروازہ اندر سے بند کر دیتی اور کہتی: "پڑھئے نجمہ بی بی۔ اونچا اونچا پڑھیئے۔"

نجمہ پڑھتی: "تم نے یہ کیا ستم توڑا ہے کہ اپنے کاروبار میں میرا جی ہی نہیں لگتا۔ دکان پر بھی جاتا ہوں تو تمہارے خط ساتھ لے جاتا ہوں اور انھیں بار بار پڑھتا ہوں۔ اب، کہ تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم کون ہو۔ یہ دُوری مجھے اور بھی مارے ڈال رہی ہے۔ کل ایک شخص نے سات روپے کے رومال خریدے اور مجھے دس روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے تین کی جگہ اسے ترانوے روپے تھما دیے اور اس اللہ کے بندے نے بھی انھیں اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میرا ایک آدمی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ٹوکا تو گاہک بولا۔ کہ میں سمجھا شیخ صاحب زکوٰۃ نکال رہے ہیں۔ میرا آدمی نہ دیکھتا تو نوے کی ڈز پڑ گئی تھی — تو میرے ذہن کا یہ عالم ہے۔ اور تم ایسی ظالم ہو کہ آج تک ذرا سی جھلک بھی نہ دکھائی۔ تم کہتی ہو تم ہر روز مجھے چق میں سے دیکھتی ہو، تو کیا یہ چق اتنی بھاری ہے کہ تم سے ذرا سی اٹھ نہیں سکتی؟ کیا یہ بھینسے کی کھال سے بنی ہوئی چق ہے!—"

نجمہ اور حلیمہ ایک دم کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔ پھر حلیمہ نجمہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کی مسہری پر گراتی اور اسے پیار کرنے لگتی اور کہتی: "قسم سے نجمہ بی بی۔ آپ کے رقعے کے انتظار میں وہ ایسا تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ جیسے بلی چوہے کی تاک میں ہو۔ مجھے دیکھتا ہے تو یوں فرلانگ سے آ کر رقعہ چھینتا ہے کہ میرے تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ آج تو اس نے شاید سیڑھیوں پر میرے قدموں کی چاپ سُن لی۔ ابھی میں آخری سیڑھی پر تھی کہ میرے ہاتھ سے رقعہ جھپٹ کر وہ گیا۔ اور میں گرتی گرتی بچی۔ سیدھی سیڑھیاں ہیں۔ گرتی تو کھوپڑی ہنڈیا کی طرح پھیتے پھینے ہو جاتی۔"

"اور جب تک وہ میرا رقعہ پڑھتا اور اپنا رقعہ لکھتا ہے، تم کیا کرتی ہو؟" نجمہ پوچھتی۔

حلیمہ کہتی: "میں بس اس کی کتابوں میں مورتیں دیکھتی رہتی ہوں۔"

ایک دن حلیمہ نے اسی سلسلے میں بتایا کہ "نجمہ بی بی۔ ہائے کیسے بتاؤں۔ اس کے پاس ایک کتاب ہے۔ اس میں ننگی تصویریں ہیں قسم سے۔ بالکل الف ننگی۔ یہاں وہاں دو تاگے دھجی بھی نہیں۔ سہاگ رات کو پوچھ بیٹھے گا اس سے۔ کوئی کھڑی ہے کوئی بیٹھی ہے کوئی لیٹی ہے۔ کوئی دوہری ہو گئی ہے۔ کوئی تہری ہو گئی ہے۔ قسم سے!"

"ہائے، ایسی ہے وہ کتاب!" نجمہ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"جی" حلیمہ نے جی کی 'ی' کو لٹکایا۔ "پرسوں وہ رقعہ لکھ رہا تھا۔ میں نے کیا کیا کہ یہی کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دی مگر وہ اللہ کا بندہ اِتنا سا بھی نہ گھبرایا۔ بولا "ارے یہ کہاں سے اٹھا لائی ہو میری ڈاکٹری کی کتاب ہے"۔ سو نجمہ بی بی۔ آپ کا شیخ منصور صرف کاروباری ہی نہیں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی بننے والا ہے۔"

اسی دوران میں حلیمہ پر کپڑوں کے نت نئے بدلتے فیشنوں کے دم سے جمپروں اور شلواروں کے ڈھیر لگتے رہے اور اس کی تنخواہ میں اضافے پر اضافہ ہوتا رہا۔ پھر حلیمہ کے دم سے نجمہ کو محلے کے سو سوا سو بالغ افراد میں سے ہر ایک کے

معاشقے بھی معلوم تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کس کی کس کے ساتھ دوستی لگی ہے۔ کون کس کو دھوکا دے کر کدھر کھسک گیا ہے اور کس نے کس کے ہاتھ کیوں رقعہ بھیجا ہے۔ حد یہ تھی کہ جب نجمہ اور حلیمہ چھت کی اوٹ میں بیٹھی ہوتیں اور سڑک پر سے کوئی برقعہ پوش لڑکی گزرتی تو حلیمہ برقعے ہی سے پہچان لیتی کہ یہ اس محلے کی نہیں ہے اور ——— "اگرچہ میں اسے نہیں جانتی مگر یہ کہیں خراب نیت سے نہیں جا رہی ہے۔ نیت خراب ہو تو چال بولتی ہے۔ یہ ضرور کسی خالہ ممانی سے ملنے جا رہی ہے۔"

محبت کے بعد نجمہ کے صرف دو محبوب مشغلے تھے۔ نئے فیشن کے کپڑے اور محلے کے اسکینڈل۔ یہ شوق اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ اگر کالج میں اس نے کسی لڑکی کے دوپٹے کا ایک سر محض اتفاقاً بال پن سے اٹکا پایا تو اسی فیشن بنا لیا، اور محلے میں کوئی زور سے چھینکا بھی تو حلیمہ کو دوڑایا کہ کن سن لے آئے۔

ایک روز نجمہ نے شام کے بعد حلیمہ کو بلایا اور اس سے کہا: "وہ ادھر منصور کے گھر کی پرلی طرف سے عورتوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ذرا جا کر معلوم تو کرو کہ کیا ہوا ہے۔"

حلیمہ تیر کی سی تیزی سے گئی مگر خاصی دیر تک نہ آئی۔ نجمہ چھت کی اوٹ سے گلی میں جھانکتی رہی مگر حلیمہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی بھی نہ کی۔ وہ بار بار چھت کے پاس کیسے جا سکے گی۔ اس کی امّی نے آ کر اسے پکارا تو وہ بولی: "کیا ہے امّی؟"

امّی نے روشنی کر دی اور پوچھا: "اندھیرے میں کیا کر رہی ہو بیٹی؟"

نجمہ بولی: "سر میں درد ہے۔"

"تو پھر کھڑی کیوں ہو؟" امّی نے پوچھا

"بس ٹہل رہی تھی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"حلیمہ سے سر دبواؤ۔ وہ کہاں ہے؟" امّی نے پھر پوچھا۔

"اسپرو لینے بھیجا ہے۔" نجمہ نے فوراً جواب گھڑا۔

"اسپرو؟" امی بولیں: "تمہارے ابّا کے لیے میں درجنوں منگوا کے رکھتی ہوں۔ تم لیٹ جاؤ۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

امی پلٹیں تو حلیمہ آ گئی۔ وہ اتنی سنجیدہ ہو رہی تھی جیسے ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اس کی عمر دس سال بڑھ گئی ہے: "اسپرو لائیں؟" امّی نے پوچھا۔

حلیمہ بس ایک پل کو جھجکی۔ پھر بولی: "جی نہیں ملی"

"اسپرو نہیں ملی؟" امی حیران رہ گئیں: "یہ بھی کوئی نہ ملنے والی چیز ہے؟"

حلیمہ نے بڑے بھولپن سے کہا: "جی میں نے تو یہاں سے وہاں تک سارے سبزی والوں سے پوچھا ہے۔ کسی کے پاس نہیں۔"

"سبزی والوں کے پاس؟" امّی نے قہقہہ مارا اور نجمہ بھی ہنسنے لگی: "رہیں نا وہی گنوار کی گنوار۔" پھر وہ چلی گئیں۔

نجمہ سنجیدہ ہو کر حلیمہ کی طرف بڑھی مگر اب حلیمہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی: "کیوں نجمہ بی بی۔ قسم سے، کیسا بہانہ گھڑا؟"

"مگر تمھیں ہوا کیا تھا؟" نجمہ نے پوچھا۔

حلیمہ کچھ کہنے لگی تو امی اسپر دے آئیں۔ پھر جب وہ نجمہ کو چند ہدایات دے کر چلی گئیں۔ تو حلیمہ بولی "ایک لڑکی بھاگ گئی۔ وہ جس کا دوپٹہ برقعے میں سے ہمیشہ نکلا رہتا تھا۔ اری نجمہ بی بی، وہی جو اس روز کپڑے والے سے قیمت چکا رہی تھی کہ برقعے کی نقاب اٹھا دی اور کپڑے والا مفت کپڑا دے گیا۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔"

"مجھے تو یاد نہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"تو پھر میں بتانا بھول گئی ہوں گی۔" حلیمہ بولی "بس وہ لڑکی بھاگ گئی۔ ایک سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے گئی اور اسی سہیلی کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ اس کا کوئی دوست تھا جو برقعہ پہن کر آیا تھا۔"

"پر یہ سب پتہ کیسے چلا؟" نجمہ نے پوچھا۔

"یوں، کہ سینما کا وقت ختم ہو گیا اور وہ نہ آئی۔ پھر اس کی ڈھنڈیا پڑی۔ پھر اس کی ماں وہیں اس کے بستر پر بے ہوش ہو گئی۔ کسی نے تکیہ ٹھیک کیا تو نیچے سے لڑکی کا رقعہ نکلا۔ اس میں وہ لکھ گئی ہے کہ ہم چلے۔"

"بے حیا!" نجمہ نے گالی دی۔

"اس کے باپ نے تو کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا ہے اور اس کا بھائی گلیوں میں چاقو لیے پھرتا ہے۔"

"ہائے"، نجمہ ڈر گئی۔ "پر تم نے کیوں اتنی دیر لگا دی؟"

"میں اس کی ماں بے چاری کے تلوے ملتی رہی۔ اب ہوش میں آئی ہے تو میں اٹھ آئی۔"

"اب کیا ہو گا؟" نجمہ نے پوچھا۔

اور حلیمہ بولی "ہونا کیا ہے بی بی۔ ہوتا آیا ہے۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔"

پھر حلیمہ جانے لگی تو نجمہ نے کہا "اپنا کھانا یہیں اٹھا لاؤ۔ اکٹھے کھائیں گے۔"

حلیمہ بولی "آج تو نجمہ بی بی، قسم سے میری طبیعت اتنی الجھ رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بس بستر پر لیٹوں گی۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔ آج رات کی چھٹی دے دیجئے۔" پھر وہ ایک دم ہنسنے لگی اور بولی "ہائے۔ بڑی بی بی جی کے سامنے مجھے کیسا مزے کا بہانہ سوجھا۔ کیوں نجمہ بی بی؟" اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اب حلیمہ کا معمول سا ہو گیا کہ نجمہ کے کسی حکم کی تعمیل میں جاتی تو دیر دیر سے واپس آتی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی کہ درد ہو رہا ہے۔ انہی دنوں مہینے کی پانچویں کو اس کی ماں تنخواہ لینے آئی۔ پہلے اس نے بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کو سلام کیا۔ پھر حلیمہ سے رقم لینے کے لیے اسے الگ لے گئی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے حلیمہ کو دو ہتڑوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ نجمہ اور اس کی امی آواز سن کر پیچھے بھاگیں مگر جب تک وہ حلیمہ کو ہاتھ سے گھسیٹ کر باہر گلی میں لے جا چکی تھی۔ نجمہ اور اس کی امی نے فوراً اوپر آ کر چھت میں سے نیچے گلی میں جھانکا تو حلیمہ کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی اور اس کی ماں نے اس کا بازو اسی طرح جکڑ رکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نجمہ کی آواز چق کی جھلملی میں سے نکلی اور وہ پکاری "حلیمہ۔ اے حلیمہ۔"

مگر نہ حلیمہ نے اوپر دیکھا نہ اس کی ماں نے اور دونوں گلی کے موڑ پر غائب ہو گئیں۔

بخمہ کی امی نے اسے فوراً پیچھے کھینچ لینا چاہا "محلے میں اتنا اونچا نہیں بولتے بیٹی۔ کوئی تمہاری آواز سن لیتا تو کیا کہتا؟"

بخمہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور بولی "مگر امی ـــ یہ آخر ہوا کیا؟"

امی نے اسے سمجھایا کہ "اُجڈ لوگ ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پہ گلے کاٹ دیتے ہیں۔ حلیمہ نے پیسے کہیں خرچ کر ڈالے ہوں گے۔ بڑھیا کو ہر مہینے بندھی ہوئی آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتی۔ مار پیٹ کرنے لگی۔ کل کلاں لے آئے گی۔"

مگر کل کلاں گیا، حلیمہ مہینوں تک واپس نہ آئی۔

اور جس روز آئی، اس روز بخمہ کا گھر رنگ رنگ کی جھنڈیوں سے دلہن بن رہا تھا اور سڑک تک کی لمبی گلی نے شامیانے اور قناتیں اور قالین اوڑھ بچھا رکھے تھے۔ حلیمہ نے فوراً پلٹ کر سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے مکان کی طرف دیکھا مگر وہاں تو محلے کے چند کتے ایک ہڈی کے مسئلے پر لڑ رہے تھے۔

حلیمہ کے پاؤں میں پھٹا پرانا جوتا تھا۔ اس کے کپڑے ڈھیلے اور میلے تھے اور اس کی لٹوں کو دھول نے رتیاں بنا ڈالا تھا۔ وہ آئی اور سیدھی اوپر جانے لگی۔ عورتوں کا اتنا ہجوم ہو رہا تھا کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جھٹکے کے ساتھ اس کی کمر چھل چھل گئی۔ مگر اسے کسی نے نہ پہچانا۔ پھر اوپر سے ہانپتا ہوا اشرفو آیا، اسے گھور کر دیکھا اور بولا "اے۔ اوپر منہ اٹھائے کہاں جا رہی ہے؟ جا۔ باہر سے مانگ۔" پھر وہ تیزی سے نیچے اُتر گیا اور حلیمہ اوپر بخمہ کے کمرے میں آ گئی۔

رنگ رنگ کے ریشم میں لپٹی ہوئی ساٹھ ستر لڑکیوں نے اس مخلوق کو ایک ساتھ دیکھا۔ پھر کوئی ہنسا تو سب ہنسنے لگیں۔ حلیمہ ان میں سے کئی کو پہچانتی تھی اور وہ ان کا سارا کچا چٹھا بیان کر سکتی تھی مگر پھر وہ سب ایکدم خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ دلہن اُٹھی۔ روتی بلکتی ہوئی جھپٹی اور حلیمہ سے لپٹ گئی "اری حلیمہ۔ اری میری سہیلی۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم حلیمہ ہی ہو نا؟"

"جی ہاں بخمہ بی بی" وہ بولی "ہوں تو حلیمہ ہی۔"

"اور یہ کون ہے؟" بخمہ نے مہینے دو مہینے کے بچے کی طرف اشارہ کیا جسے حلیمہ نے اٹھا رکھا تھا۔

"جی یہ میرا بیٹا ہے۔" حلیمہ بولی۔

"اری کم بخت" بخمہ مسکرائی اور اس کے کندھے پر چپت ماری "تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں اور چپکے سے شادی کر لی؟"

حلیمہ بولی "شادی تو کر لی بخمہ بی بی۔ چپکے سے ہی کر لی۔ کرنی پڑ گئی۔ کرنی پڑتی ہے۔"

لڑکیاں ہنسنے لگیں تو حلیمہ نے بخمہ کو بازو سے پکڑا اور ملحقہ غسلخانے میں لے گئی۔

ذرا سی دیر کے بعد ایک چیخ نکلی اور کسی کے دھب سے گرنے کی آواز آئی۔ لڑکیاں گھبرا کر اٹھیں اور غسلخانے کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔ پھر بخمہ کی امی کو راستہ دیا گیا۔ انھوں نے اندر جا کر دیکھا کہ بخمہ فرش پر بے ہوش پڑی ہے، حلیمہ زور زور سے اس کی ہتھیلیاں مل رہی ہے اور بچہ فرش میں گڑے ہوئے فلش کے بیسن میں لڑھک گیا ہے اور رو رہا ہے۔

بخمہ کی امی نے وہیں فرش پر بیٹھ کر بیٹی کا سر گود میں رکھ لیا۔ لڑکیاں اس کی ہتھیلیوں اور تلووں سے چمٹ گئیں اور حلیمہ بچے کو فلش میں سے اٹھا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

پھر دروازے میں کھڑی ہوئی لڑکیاں دوپٹے سروں پر پھیلاتی اِدھر اُدھر ہٹ گئیں اور نجمہ کے ابا گھبرائے اور ہانپتے اندر آ گئے۔ نجمہ کے ہاتھ پیروں میں حرکت آچلی تھی اس لیے اُدھر سے مطمئن ہو کر وہ حلیمہ کے سامنے آئے اور گرج کر پوچھا "سچ سچ بتا کیا ہوا؟"

حلیمہ دُور سے آتی ہوئی آواز میں بولی "میں نے تو میاں جی، قسم سے، بس اتنا کیا کہ نجمہ بی بی کو شادی کی مبارکباد دی۔ اور کہا کہ نجمہ بی بی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی شادی شیخ منصور احمد جیسے کمینے سے نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟" نجمہ کے ابا کڑکے "اسی سے تو ہو رہی ہے۔"

حلیمہ کی آنکھیں جیسے پتھرا گئیں "اسی سے ہو رہی ہے؟ مگر میاں جی۔ وہاں اس کے گھر کے سامنے تو ——"

"وہ گلبرگ چلا گیا ہے" نجمہ کے ابا دہاڑے "پر کتیا۔ تُو نے اسے کمینہ کیوں کہا؟"

حلیمہ خاصے وقفے تک ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ پھر نظریں جھکا لیں اور بچے کو ایک پہلو سے دوسرے پہلو پہ لاتی ہوئی بولی "غلطی ہو گئی میاں جی!"

خرمن

خدیجہ مستور

کنیز کوٹھری کے ایک کونے میں سر نہوڑائے بیٹھی تھی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے جا رہی تھی۔ اس کے پاس اماں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اسے گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔ کنیز نے ایک بار سر اٹھا کر بے بسی سے ماں کو دیکھا اور پھر گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔

"سوچ لے ری، ہاں کہنا بڑا آسان ہے۔ چھ مہینے بعد جب واپس آئے گی تو دنیا یہی کہے گی کہ تیری ماں نے کھصم کیا، بہت برا کیا، کر کے چھوڑ دیا اس سے بھی برا کیا، مجھ بڑھیا کی "جندگی" کیوں کھراب کرنے کی سوچ رہی ہے۔"

"اتنے دن تو گھر بیٹھوں گی اماں ری ـــ" کنیز منمنائی۔ "دنیا تو اب بھی جانے کیا کیا کہتی ہے، کوئی پتہ ہے ایں مڑ کر نہ آؤں۔"

"مڑ کر نہیں آنے کی تو پھر کہاں جائے گی ری؟" اماں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"جواب دے اماں، دیری ہو رہی ہے۔" دین محمد نے صحن میں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ ستمبر کی دھوپ کھوپڑی چٹکائے دیتی تھی۔

"بن باپ کی لڑکی ہے چھ مہینے تو مجھ سے کھانے پڑے گی۔" دین محمد کی آواز بہت اونچی تھی۔

"کہیں چلی جاؤں گی اماں، تو اسے جواب تو دے دے، کب کا کھڑا ہے۔" کنیز نے بے چینی سے کہا۔

"تو میری ناک کاٹنے پھر ادھر ہی آئے گی، پھر جائے گی کہاں او باؤلی، ایسی جگہ بیٹھ جہاں سے مڑ کر نہ آئے، اتنوں کو کھصم بنایا پر کسی کے گھر نہ ٹک گئی۔"

"تجھ سے جو کہا ہے، کہہ دے جا کر کہ منجور ہے۔ اپنے سنگ کل آ کر ساوی کر لے۔" کنیز جیسے بلبلا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر دھم سے بیٹھ کر ٹانگ میں پھنسے ہوئے چوڑی دار پاجامے کو کھسکا کر پنڈلی کھجانے لگی۔

"حرامجادی کس کی سنتی ہے۔" اماں بڑبڑاتی اور گالیاں بکتی کوٹھری سے نکل گئی ــــــ "مجھے منجور ہے رے دین محمد!" اس نے چیخ کر اعلان کیا۔

کنیز دوڑ کر کوٹھری کے دروازے سے جا لگی اور باہر صحن میں جھانکنے لگی جہاں کھڑا ہوا دین محمد اپنا صافہ ٹھیک سے باندھ رہا تھا۔

"اچھا اماں میں چلا، کل کو آؤں گا، تیار رکھیو۔" وہ پگڑی سر پر جماتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

کنیز کوٹھری سے نکل آئی۔ سامنے صحن کا دروازہ اب تک کھلا تھا۔ وہ گم سم سی ادھر دیکھنے لگی۔ "کل سچ مچ تیری ساوی ہو جائے گی ری کنیج۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

مت تل کوٹ کر تھوڑے سے لڈو بنا لے۔ کل جو تیرا کھصم آئے گا تو اسے کیا دوں گی؟" ماں نے کڑوی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو کس کارن کھار کھا رہی ہے اماں" کنیز نے چمک کر جواب دیا اور پھر کوٹھری میں جا کر ٹھکلی سے تل نکالنے لگی۔

ماں کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی اور کنیز تل کوٹنے بیٹھ گئی۔ "اگر ابا جندہ ہوتا تو ایک دن تیری سادی بھی محبت کے ساتھ ہو جاتی دی، جب محبت نہیں رہی تو تجھ سے سادی کون کرتا" ــــ کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کھیر کوئی بات نہیں، تھوڑے دن تو محبت کے ساتھ گھر بیٹھ کر گجر جائیں گے" یہ کنیز نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔ آج اسے بڑی مدت بعد جانے کیوں ابا بار بار یاد آ رہا تھا اور اس کی موت کی ذرا ذرا سی تفصیل اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔

اس دن جب ابا مزدوری کر کے واپس آیا تو بکری کے لیے ہریالی لانا بھول گیا تھا۔ ایک گلاس پانی پی کر فوراً ہی چلا گیا۔ ماں روکتی بھی رہی کہ "مت جا رے، بادل گھرے کھڑے ہیں۔ کپڑے بھیگ جائیں گے، رات ویسے بھی گجر جائے گی۔" پر ابا نے اس کی بات نہ سنی اور چلا گیا۔ پھر کنیز روٹیاں پکا کر انتظار کرتے کرتے تھک گئی مگر ابا نہ آیا۔ رات آ گئی، بڑے زور سے بارش ہونے لگی تھی۔ باہر گھور اندھیرا تھا اور بڑے زور سے بجلی چمک رہی تھی۔ ماں بے چین ہو ہو کر بار بار بارش میں بھیگتی ہوئی باہر کے دروازے تک جاتی اور پھر لوٹ آتی۔ کنیز بار بار ماں کو تسلی دیتی کہ "بارش میں بھیگنے کے ڈر سے کہیں درخت تلے بیٹھا ہوگا۔" اس طرح اور بھی وقت گزر گیا۔ بارش رک گئی مگر ابا درخت تلے سے نہ اٹھا تب وہ اماں کے ساتھ ابا کو دیکھنے نکل کھڑی ہوئی۔ دیا جلا کر اس نے پلو کی آڑ میں چھپایا تھا اور کیچڑ میں سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی قریب کے جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ ہوا دیے کی روشنی کے ساتھ دشمنی پر اتری ہوئی تھی مگر کنیز نے اسے بجھنے نہ دیا اور ایک ایک درخت تلے گھور گھور کر دیکھتی چلی گئی۔ پھر ایک درخت تلے اس نے دیکھا کہ ابا بڑے آرام سے لیٹا ہے۔ اس نے ابا کو آوازیں دیں مگر وہ نہ اٹھا۔ ہریالی کا گٹھا اس کے قریب پڑا تھا اور درخت کے پتوں سے بوندیں ٹپ ٹپ اس کے کپڑوں پر گر رہی تھیں۔ ماں نے دیے کی روشنی میں غور سے دیکھا تو ابا کے منہ سے ہرا ہرا جھاگ بہہ رہا تھا اور ٹانگ پر خون کی دو بوندیں بڑی تازہ لگ رہی تھیں۔ "اری اسے تو سانپ ڈس گیا ہے۔" ماں کلیجہ پھاڑ کر رونے لگی۔

کنیز نے موسل زور سے پٹک دیا اور اوکھلی سے تل نکالنے لگی۔ "جانے کتنا جہر بھرا ہوگا۔ انہی تلوں کی طرح کالا ہوگا ری۔" کنیز کو وہ تل لہراتے ہوئے سانپ معلوم ہو رہے تھے۔ "اری تجھے نہ ڈس گیا۔ تیرا کیا کام تھا اس دنیا میں، ابا جندہ ہوتا تو کچھ کما کر لاتا، ماں کو محبت سے رکھتا۔ تو نے کیا کمایا ری، سب کچھ لٹا دیا۔ بھوک جالم نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔"

اور پھر کنیز کو یاد آیا کہ بھوک نے اسے کتنی جلدی بے ایمان بنا دیا تھا۔ ابا کے مرنے کے دوسرے دن شام کو جب بکری سینگ ہلاتے گھر میں داخل ہوئی تو وہ لٹیا لے کر دوڑ پڑی تھی اور دودھ دوہ کر آدھے سے زیادہ خود پی گئی تھی اور آدھے سے کم اماں کو دیا تھا پھر بھی رات تڑپ کر گزری تھی۔ مارے بھوک کے ایک منٹ کو بھی نیند نہ آئی تھی اور وہ منہ اندھیرے چپکے چپکے اٹھ کر بکری کا دودھ دوہ کر پی گئی تھی۔ ساری رات کی روتی ہوئی اماں صبح بے خبر سو رہی تھی۔ دن چڑھے جب وہ اپنی کھاٹ پر سے اٹھی تو بکری کے تھن خالی تھیلیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ کنیز نے گھنٹوں تھنوں کو سہلایا تھا تو کہیں جا کر آدھا پاؤ دودھ اترا تھا۔ اماں اتنا سا دودھ دیکھ کر بلبلا اٹھی تھی۔ "اس ناس ماری کو کسی کصائی کے ہاتھ بیچ دے ری، یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔" اور کنیز نے بڑی مکاری سے کہا تھا

کہ "اماں ساید یہ گیابھن ہوگئی ہے، اللہ کرے گا دوسری بکری آجائے گی، اسے بیچ کر کتنے دن روٹی چلے گی۔"

شام کو جب بکری چراگاہ سے واپس آئی تو تھن اتنے بھرے ہوئے تھے کہ بھوری بھوری کھال کھنچی کھنچی معلوم ہو رہی تھی۔ دو تین دن میں اماں پر راز کھل گیا تھا کہ بکری گیابھن نہیں اور وہ خوب چیخی تھی کہ "حرام جادی، گیابھن تو تو ہوگئی ہے۔ اری چار دن پیٹ کا بوجھ نہ رکھا، اتنے میں کرا سنے تیرے ابا نے اور اب چاہتی ہے کہ تیرا پیٹ بھرنے کے لیے ابھی سے مجوری سروع کر دوں، مرنے والے کی عجت کھاک میں ملا دوں۔ برادری بھی کہے گی کہ کچھ نہ چھوڑ مرا۔"

"بڑے عیس کیے تھے" کنیز بڑبڑا اٹھی تھی۔ "روج روج باجرے کی روٹی اور دھنیے کی چٹنی، بہت ہوا تو گڑ کی بھیلی مل گئی، اب عجت لے کر بیٹھی رہ، مجوری کیے بگیر پیٹ بھرنے سے رہا۔" کنیز نے ماں کو سمجھایا تھا۔

ماں سر جھکا کر کچھ سوچنے بیٹھ گئی تھی کہ "پر میں تو گٹھیا کی ماری ہوں مجھ سے مجوری کیسے ہوگی ری، اور تو کرے گی تو تیرے ابا کی روح کیا کہے گی؟"

"لے بھلا روحیں بھی کبھی کچھ کہنے آتی ہیں اماں، تو پھکر نہ کر، میں تیری کھدمت کروں گی۔" اور پھر دوسرے دن سے کنیز محنت مزدوری کرنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

"توبہ توبہ اللہ ماپھی دے" کنیز او کھلی سے تل نکالتے ہوئے بڑبڑائی اور پھر سوچتی چلی گئی — "بن باپ کا جان کر جگ نے کتنا ستایا، سارے ملنے نے اپنی عورت سمجھ لیا پر ایک نے بھی گھر نہ بٹھایا۔ جالم مار کر پانی بھی نہ دیتے اور توبے سرم پھر بھی تلیا میں نہ ڈوب مری۔ یہ جندگی بھی کیسی بیچ ہوتی ہے، اپنے ہاتھوں نہیں لی جاتی ری۔" کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری اور دو آنسو ٹپ سے تلوں پر گر کر جذب ہو گئے۔ "رے دین محمد تو یہ لڈو کھائے گا، اس میں کنیز کے آنسو ملے ہیں، چھوڑیو نہ رے، تجھے ان آنسوؤں کی کسم!"

کنیز نے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی مگر جب اماں جلانے کی لکڑیاں چن کر اندر آئی تو وہ آنسو پونچھ کر اس طرح جلانے بیٹھ گئی جیسے ذرا دیر پہلے روئی ہی نہ تھی۔

اب شام ہونے لگی تھی۔ وہ چولھے پر چھوٹی سی کڑھائی چڑھا کر لڈو بنانے لگی۔ اس کی اماں نیم تلے کھاٹ ڈال کر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکنیں بڑی گہری ہو رہی تھیں۔

"اماں اداس نہ ہو۔ میں تیرا کھیال رکھوں گی، سال سے جیادہ کا اناج کوٹھری میں بھرا ہے، تیری اکیلی جان ہے۔" کنیز نے کڑھائی اتارتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی پھکر کر ری، میرا کیا ہے" ماں نے دھیرے سے کہا اور پھر المونیم کی لٹیا اٹھا کر باہر چلی گئی۔

لڈو بنا کر کنیز مسافروں کی طرح صحن میں ٹہلنے لگی۔ برسات میں جمی ہوئی کائی کے اب سوکھ سوکھ اکھڑ چلے تھے، کچی دیواروں پر شورا پھول رہا تھا اور نیم کا درخت خوب ہرا بھرا ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ برسات میں ابا اس درخت میں جھولا ڈال دیتا تھا اور وہ لڑکیوں کو جمع کر کے گھنٹوں جھولا جھولا کرتی تھی۔ شادیوں کی باتیں ہوتی تھیں اور رساس سے جلنے کا اظہار کرتے ہوئے سب کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے تھے۔

کنیز ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی کھاٹ پر لیٹ گئی۔ "اری کنیز! تیری ہی کسمت کھراب تھی، ساری لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ ان کی سادیوں میں کھوب ڈھول بجی، تاسے ہوئے، دولھے سہرے باندھ باندھ کر آئے تھے۔ ایک تیری سادی ہو گئی اپنے ہاتھوں

لٹھ بنا کر بیٹھی ہے۔ تو کیا ہے ری اور تیری ساوی کیا ری، ڈھول بجانے کون آئے گا۔ اماں تو سب سے چھپاتی پھرتی ہے کسی کو پتہ نہ چلے کہ چھ مہینے کے لیے ساوی ہو رہی ہے۔" وہ نیم سے گری ہوئی پتیاں دوپٹے پر لے اٹھا کر مسلنے لگی۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا نہ اماں باہر سے لوٹی اور نہ کنیز کھاٹ سے اٹھی۔ اس وقت اسے اپنی بدنصیبی کے احساس کو جگانے اور رو لینے میں بڑا سکون مل رہا تھا۔ بکری جب سے آئی تھی صحن میں کھلی پھر رہی تھی اور ہر جگہ مینگنیاں بکھیر رہی تھی مگر کنیز کا جی نہ چاہا کہ اٹھ کر اسے باندھ دے۔

اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ منظر دیکھا تو منہ ہی منہ میں جانے کیا کچھ کہنے لگی پھر بکری کو باندھ کر دودھ دوہا اور آنگن سے مینگنیاں بٹورنے بیٹھ گئی۔

رات کچی پکی نیند میں کٹ گئی۔ آج صبح مزدوری کے لیے جانے کے بجائے وہ ماں کے ساتھ جنگل جا کر واپس آگئی۔ جھاڑو اٹھا کر اس نے کوٹھری اور آنگن جھاڑا پھر دو کھاٹیں نیم تلے بچھا دیں۔ اپنے حساب وہ براتیوں کے بیٹھنے کا انتظام کر رہی تھی مگر نظریں باہر کے ادھ کھلے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ "بس اب آتا ہی ہو گا وہ، کہیں نہ آیا تو؟" مارے شبہے کے کنیز کا دل بیٹھنے لگا۔ "اری اس گاؤں میں تو کوئی تجھ سے چھ مہینے کے لیے بھی ساوی نہ کرے گا۔"

ماں کوٹھری کی دہلیز پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کنیز ہاتھ دھو کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ "میں تیرا کھیال رکھوں گی اماں ری!"

"چپ رہ حرام جادی" ماں نے جھنجلا کر کہا اور پھر گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے لگی ـــ "جو تو ایسی نہ ہوتی تو آج اپنی برادری میں عجت کے ساتھ بیاہ جاتی۔ اپنا گھر، اپنا گاؤں ہوتا۔ چھ مہینے بعد پھر بے عجت ہو کر آجائے گی۔" اماں آنسو پونچھ کر اٹھ گئی اور کوٹھری میں جا کر سرخ پھولوں والے پرانے بکس میں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

کنیز جیسے کلیجہ تھامے وہیں کھڑی رہی۔ اس نے پہلے بھی اپنے لیے دوسروں سے اور خود اپنی ماں سے جانے کیا کچھ نہ سنا مگر اسے اتنا برا نہ لگا تھا۔ پر آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر کہے کہ وہ ایسی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے گھر اور عزت کے لیے ترستی رہی تھی۔

"لے یہ تیرے باپ نے تیرا جوڑا بنایا تھا، نہا کر پہن لے۔ وہ کہہ گیا تھا کہ نہ کچھ لانا ہے نہ لینا ہے، پھر کن جوڑوں کے انتجار میں بیٹھی ہے۔" اماں نے جاپانی کھیلے کا سرخ پھولدار جوڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور پھر مٹکی سے چاول اور گڑ کی بھیلی نکال کر سوپ میں رکھنے لگی۔

"اماں کھا مکھا جان نہ جلا۔ تو نہ ڈر ری، میں واپس نہیں آنے کی۔" کنیز نے کپڑے بغل میں دبا لیے۔ "آ لینے دے، پھر پہن لوں گی، تو پھکر نہ کر۔" جوڑا کھاٹ پر رکھ کر وہ صحن میں چلی گئی۔ پانی کا گھڑا اٹھا کر نیم کے پاس رکھا اور پھر کھاٹ کھڑی کر کے اس کی آڑ میں نہانے بیٹھ گئی۔

نہانے کے بعد اس نے کھاٹ بچھا دی اور کوٹھری میں جا کر میلے دوپٹے سے بال پونچھنے لگی۔ اماں اب تک دہلیز پر بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھی۔ جانے اس وقت وہ کیا کیا سوچ رہی تھی۔ شاید یہی کہ سردیاں آنے والی ہیں۔ اس کے جوڑوں کا درد جاگ اٹھے گا۔ وہ اس گھر میں اکیلی کھاٹ پر پڑی کراہا کرے گی، کوئی اس کے جوڑوں پر سرسوں کا تیل ملنے والا نہ ہوگا۔ کوئی ایک گلاس پانی دینے والا نہ ہوگا۔ آج اگر اس کی کنیز اپنی برادری میں، اپنے گاؤں میں بیاہی جاتی تو وہ اسے سردیوں کے سردیوں سسرال سے بلا لیا کرتی اور جانے کیا کیا ـــــ

"اماں یوں چپ چاپ نہ بیٹھ۔" کنیز نے بال پیچھے جھٹک کر دھیرے سے کہا۔ اس کی نظریں آنگن کے ادھ کھلے دروازے کے پار دین محمد کی راہ تک رہی تھیں۔

ابھی اچھی طرح دھوپ نہ چڑھی تھی کہ دین محمد چار آدمیوں کے ساتھ آگیا۔ اماں نے آگے بڑھ کر ان کو کھاٹوں پر بٹھایا اور خود ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "بہت صبح چلے ہو گے، پھر دھوپ کڑی ہو جاتی ہے، راستے میں تکلیف تو نہیں ہوئی تھی۔"

"کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اب تم جلدی کرو اماں، دھوپ چڑھنے سے پہلے نکل کھڑے ہوں، تین کوس کا راستہ ہے۔" دین محمد نے آہستہ سے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنے لگا۔

لے اتنی صبح صبح آ گیا، چین نہیں پڑا تجھے رات کو۔" کنیز نے دل میں کہا۔ وہ خوشی سے جیسے باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ "گاؤں والوں کو جب مالوم پڑے گا کہ کنیج بیاہ کر چلی گئی تو کیسا پانی پڑ جائے گا سب پر۔" اس نے جلدی سے پھولدار کپڑے بدل لیے، تین موتیوں والی ہیکل کی تھنک میں ٹھونس لی اور پڑیا سے لال رنگ ہونٹوں پر ملتے ہوئے جب اس نے شیشہ دیکھا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ "ہے ری کنیج، اس وکھت ڈھول بجانے والیاں پاس ہوتیں تو پھر کیسا مجا آتا۔" وہ بڑبڑائی۔

گواہ کوٹھری کے دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے اور کنیز نے اتنے زور سے "ہوں" کی کہ سب نے سن لی۔ اماں ایک بار کھڑے سے بیٹھ گئی اور پھر لڈوؤں کی تھالی اٹھا کر کوٹھری سے نکل گئی۔

لڈو کھلانے کے بعد جب اماں اندر آئی تو اس نے سوپ میں رکھے ہوئے چاول اور گڑ کی بھیلی کنیز کے پلو میں باندھ دیے۔ "لے اب اٹھ، جانے کا وکھت ہو گیا ہے۔"

کنیز ذرا دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس وقت اس کا جی دکھ رہا تھا ——— یہ کیسی شادی ہے کہ کوئی رخصت کرنے والا بھی نہیں اور پھر چھ مہینے کا کھٹکا جی کو ڈسے جاتا ہے ——— وہ پلو میں بندھے ہوئے چاول سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔ "اماں کسی کو پتہ نہ چلے کہ میری ساری چھ مہینے کے لیے ہوئی ہے۔"

"ایسا ہی ڈر پڑا تھا تو پہلے سوچتی ری، جب آئے گی تو سب کو نہ مالوم ہو گا؟" اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔ "لے اب چل۔"

اماں کنیز کا بازو تھام کر اسے باہر آنگن میں لے آئی تو دین محمد اور اس کے ساتھی کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اماں کو سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گئے۔ کنیز اماں سے گلے مل کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

کچھ لمبے راستے پر جب وہ تھوڑی دور چل لی تو اس نے مڑ کر دیکھا کہ اماں کھلے دروازے کے بیچ میں بیٹھی آنسو پونچھ رہی ہے۔ اماں سے رخصت ہوتے وقت اسے رونا نہ آیا تھا مگر اب اس کا جی بھر آیا۔ وہ رک کر اماں کو دیکھنے اور آنسو پونچھنے لگی ——— "اماں! میں تیرا بڑا کھیال رکھوں گی تو بیکل نہ کرنا۔" کنیز کا جی چاہا کر چلا کر کہہ دے۔ جانے کیوں اب اس کے قدم نہ اٹھ رہے تھے۔

دین محمد چلتے چلتے رک گیا۔ "کیوں روتی ہے ری، جلدی جلدی چل نہیں تو دھوپ تیج ہو جائے گی۔"

"اپنا آدمی اپنا ہوتا ہے ری، ابھی سے کھیال کر رہا ہے۔" کنیز کے پاؤں جلدی جلدی اٹھنے لگے۔ اگلی پگڈنڈی پر جب وہ مڑی تو اس کا گھر اور گاؤں نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔

چلتے چلتے وہ پسینے میں نہا گئی۔ ہونٹوں پر لگا ہوا لال رنگ پسینے میں بہہ گیا اور مارے گرمی کے اس کا سانولا رنگ تپ کر سیاہ لگنے لگا۔ راستے کی دھول نے اس کے پھولدار پاجامے کو گھٹنوں تک ڈھانپ دیا تھا، پھر بھی اسے تھکن کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آدمی کے ساتھ اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس کے خوابوں میں بسنے والا چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا جوان مردانگی سی لاٹھی زمین پر مارتا اس کے آگے آگے

چل رہا تھا اور کنیز کی آنکھیں اس کی پیٹھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے سوا وہ کچھ نہ دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ بکریوں کے ریوڑ اِدھر سے اُدھر چرتے پھر رہے تھے اور چرواہے لڑکے لاٹھی کے سہارے ٹک کر اسے بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"بس وہ اپنا گاؤں دکھتا ہے ری۔" چلتے چلتے دین محمد نے رُک کر کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ کنیز بھی تیزی سے چلنے لگی ۔۔۔ "پہلے دھیرج بندھاتا ہے، جانتا ہو گا کہ میں تھک گئی' ارے میں تیرے ساتھ چل کر نہیں تھکتی رے۔" کنیز نے بڑے جوش سے سوچا۔

اگلی پگڈنڈی کے موڑ پر وہ چاروں آدمی ہاتھ ملا کر دین محمد سے رخصت ہو گئے۔ "وہ اپنا گھر دِکھتا ہے ری ۔۔۔" دین محمد نے سب کو رخصت کر کے کنیز کی طرف دیکھا اور پھر اس کے برابر چلنے لگا ۔۔۔ "تو گھر سنبھال لے گی؟ میرے دو بچے بھی ہیں، سکینہ بہت بیمار رہتی ہے۔"

"تو فکر نہ کر مجھے سب معلوم ہے۔" کنیز نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لڑائی جھگڑا تو نہ کرے گی؟"

"میں تجھے شرمندہ نہ کروں گی، فکر نہ کر۔" کنیز نے کہا۔ اس کا جی بیٹھا جا رہا تھا۔ گھر قریب تھا اور وہ تھک گئی تھی۔ اس سے اب ایک قدم بھی نہ اُٹھ رہا تھا۔ "ارے دین محمد اس وکھت تو کوئی اچھی سی بات کر لیتا، اپنا ماتھا پکا کرتا ہے۔ لڑنا ہوتا تو تیرے ساتھ آنے کو راضی کیوں ہوتی ۔۔۔ تو کنیز کو نہیں جانتا۔" ۔۔۔ کنیز نے آنسو پونچھ کر دین محمد کی طرف دیکھا جو اب اس سے بہت آگے چل رہا تھا۔ وہ سوچتی چلی گئی ۔۔۔ "اپنی تو کسمت ہی کھراب تھی ری، لڑ کر کسے کھوسی ملے ہے۔"

دوپہر پلٹ چکی تھی۔ اب دونوں گاؤں کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ عورتیں کنویں پر پانی بھر رہی تھیں اور گاؤں کی پنچکی بڑے زور سے پک پک کر رہی تھی۔ دین محمد ایک گھر کے سامنے رُک گیا اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کنیز بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلی گئی۔ دین محمد جھپٹ کر آگے بڑھا اور برآمدے میں لیٹی ہوئی سکینہ پر جھک گیا۔ "کیسی طبیعت ہے ری؟"

کنیز اجنبیوں کی طرح آنگن میں کھڑی رہ گئی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے گوندھی ہوئی مٹی سے کھیلتے کھیلتے اٹھ کر اسے اشتیاق اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"لے آیا رے؟" سکینہ بستر سے اٹھنے کی کوشش میں جیسے گر سی پڑی۔

"لے آیا، پر تو نہ اٹھ طبیعت کھراب ہو جائے گی۔"

سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے تکیے کے نیچے رکھا ہوا دوپٹہ نکال کر اپنے منہ پر ڈال لیا جیسے وہ کچھ بھی نہ دیکھنا چاہتی ہو۔

"اری تو ہی نے تو کہا تھا کہ گھر اور بچے تباہ ہو رہے ہیں۔" دین محمد بڑا بیتاب ہو رہا تھا اور بار بار اس کے چہرے سے دوپٹہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو ہاتھ منہ دھو لے رے، میری طبیعت بگڑ رہی ہے، ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔" سکینہ نے منہ پر سے پلو ہٹا دیا اور دین محمد کا ہاتھ پکڑ کر بڑے انداز سے دیکھنے لگی۔

کنیز آنگن میں کھڑی جیسے نہ کچھ دیکھ رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے شور مچا رہے تھے اور آنگن کے ایک کونے میں بندھی ہوئی بھینس جانے کیوں ڈکرا رہی تھی۔

"اندر آجا ری کنیز، وہاں کیوں کھڑی ہے۔" سکینہ نے نقاہت سے کہا اور کنیز دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سکینہ کے پائنتی جا بیٹھی۔ چاول اور گڑ کی پوٹلی اس کی گود میں آ پڑی۔

"گھونگھٹ الٹ دے ری" سکینہ نے اشتیاق سے کہا ۔۔۔ "میں بھی تو منہ دیکھوں تیرا۔"

کنیز نے گھونگھٹ سرکا دیا تو سکینہ نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے بڑے سکون سے لمبی سی سانس لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

کنیز نے بھی نیچی نیچی نظروں سے سکینہ کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی "ہائے ری کیسی خوبصورت بلا ہے پر جان میں تو کچھ سا نہیں ہڈیاں ہی ہڈیاں، جا تو کبر کے کنارے لگ گئی ہے اور کتنے دن جئے گی غریب۔" کنیز نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

سکینہ کی بری حالت نے اسے جانے کتنا مطمئن کر دیا تھا پھر بھی سکینہ کا حسن آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

دین محمد ہاتھ منہ دھو کر لال انگوچھے سے منہ پونچھتا ہوا باہر چلا گیا تو سکینہ پٹی کی ٹیک لے کر اٹھ گئی۔ "بڑے دنوں سے بیمار ہوں، کوئی نہ گھر دیکھنے والا ہے نہ بچے۔"

"تو فکر نہ کر ری، میں جو آ گئی ہوں تیری کھدمت کرنے۔" کنیز نے دھیرے سے کہا ۔۔۔ اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔ "مجھے سب کام بتا دے۔" وہ دوپٹے کے پلو میں بندھے ہوئے چاول کھولنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سکینہ کی آنکھوں میں اس کے لیے کتنی نفرت تھی۔

چاول اور گڑ کی بھیلی تھالی میں رکھ کر کنیز نے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر گھڑے کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ منہ دھلانے لگی "راجہ بابو منہ دھلائے گا، گڑ کا ملیدہ کھائے گا۔" وہ لڑکوں کو ضد کرنے پر بہلا بھی رہی تھی۔

دوپٹے کے پلو سے منہ ہاتھ پونچھنے کے بعد وہ بچوں کو کوٹھری میں لے گئی اور پھر چھوٹے سے ہرے پھولدار بکس سے کپڑے نکال کر بچوں کو پہنا دیے۔ ہاتھ منہ صاف کرا کے دونوں کیسے پیارے لگ رہے تھے۔ بڑے لڑکے کی رنگت تو بالکل سکینہ جیسی تھی چھوٹا باپ پر پڑا تھا۔ کنیز کو چھوٹے پر بڑی ممتا پھوٹ رہی تھی۔ اس نے چھوٹے کو لپٹا کر چومنا شروع کر دیا۔ "ہائے ری کچھ دن بعد بیچارے بن ماں کے رہ جائیں گے، پر میں انھیں تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ یہ تو میرے دین محمد کے بچے ہیں۔"

بچے خوشی خوشی باہر نکل گئے تو کنیز اپنے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ تین بڑے بڑے بکس جن میں تالے پڑے ہوئے تھے پیتل کے بھاری بھاری، سرخ پایوں والا نواڑی پلنگ اور اس کے پائنتی رکھا ہوا نیا لحاف اور گدا، ایک طاق میں رحل پر قرآن شریف رکھا تھا دوسرے طاق میں گیس کی لالٹین اور تیسرے طاق میں آئینہ اور سرمے دانی۔

کنیز کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ان تینوں بکسوں کو بھی کھول کر دیکھ لے۔ جانے کیا کچھ بھرا ہوگا۔ آخر تو اب یہ سب چیزیں اس کی ہیں۔ سکینہ کی بری حالت دیکھ کر کنیز کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس گھر سے مر کر ہی نکلے گی۔

ہر چیز پر دھول جمی تھی، بچوں نے ہر طرف کوڑا پھیلا رکھا تھا۔ جانے کب سے کوٹھری میں جھاڑو نہ دی تھی۔ کنیز کو افسوس ہونے لگا ۔۔۔ "عورت روج روج کی بیمار ہو تو پھر یہی ہوتا ہے ری۔ اسی کارن تو بیچارے کو دوسری سادی کرنی پڑی۔ ایسی عورت سے بھلا کیا سواد ملے۔" کنیز نے شرما کر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ لیا ۔۔۔ "ہائے ری کیسا محلوں جیسا گھر ملا ہے۔ کیسی کیسی چیزیں کہ آدمی کی نجر نہ ہٹے۔"

دالان میں آ کر اس نے سکینہ کی طرف دیکھا جو نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ سکینہ نے چونک کر کنیز کی طرف دیکھا۔ "باہر چھپر تلے جو بیل بندھے ہیں وہ اپنے ہیں ری؟" کنیز نے پوچھا۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول کر گھر کی مالکن بنی ہوئی تھی۔

"کیوں ری اکس لیے پوچھ رہی ہے؟" سکینہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پھر تجھے کیا، "بیل میرے ہیں تیرے باپ کے نہیں۔ اب جا کر ہانڈی چڑھا دے، سام ہو رہی ہے، دینو جلدی روٹی کھاتا ہے۔ بھینس بھی دوہ لے۔" سکینہ نے منہ پھیر لیا۔

"ہے ری کیسا گھمنڈ ہے، کل کی آس نہیں، جندگی نام کو باکی نہیں"۔ کنیز صحن میں جا کر بالٹی دھونے لگی۔ "اری اب تو یہ گھر میرا ہے، تیری بھی کھدمت کر دوں گی۔"

بھینس دوہتے ہوئے کنیز کو عجیب سا فخر محسوس ہو رہا تھا۔ "ہے اتنا بڑا جانور، جانو ہاتھی لگتا ہے۔ بھلا بکری بھی کوئی چیز ہوئی ایک لٹیا دودھ دے اور سینگ مارے الگ۔" بکری کے ساتھ اسے اپنی بکری بھی یاد آ گئی اور اماں کی تنہائی کا خیال بھی ستانے لگا۔ "جانے بیچاری اماں کیا کرتی ہوگی، پر بیٹیاں ہمیسہ تو نہیں بیٹھی رہتیں۔"

شام ہو گئی تھی، آنگن کی کچی دیوار پہ بیٹھے ہوئے کوے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے۔ باہر سڑک سے بھینسوں اور بکریوں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے دال صاف کر کے چڑھا دی اور پھر دو گھڑے اٹھا کر کنوئیں پہ پانی بھرنے چلی گئی، بچوں کا ہاتھ منہ دھلانے کے بعد ذرا سا پانی رہ گیا تھا۔

گھڑے منڈیر پہ رکھ کر وہ اپنی باری کا انتظار کرنے لگی، دوسری عورتیں بڑی تیزی میں تھیں۔ "اری تو دوسرے گاؤں سے آئی ہے، دین محمد کی عورت ہے نا؟" ایک عورت نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ری!" کنیز نے غرور سے گردن اونچی کر کے ذرا سی گھونگھٹ نکال لی۔

"آج ہی تو لایا ہے کر کے، اس دنیا کا کیا اتبار، سکینہ کو تو مر لینے دیتا۔" دوسری عورت نے کہا اور گھڑا کمر پہ جما کر چل دی۔

"چڑیل کو جانے کا ہے کا دکھ ہے۔" کنیز نے ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے جاتی ہوئی عورت کو دیکھا اور گراری میں رسی ڈال دی۔

پانی بھر کر جب گھر لوٹی تو دین محمد چھوٹے کو گود میں لیے سکینہ کے پاس بیٹھا تھا اور سکینہ منہ موڑے لیٹی تھی۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بار بار شانے پہ ہاتھ رکھ رہا تھا اور آنچل کھینچ رہا تھا۔ کنیز کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل کے بالکل نزدیک کسی نے آگ جلا دی ہے۔ وہ جلدی جلدی روٹیاں پکانے لگی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتی بھی جا رہی تھی۔ "اری تجھے تو پہلے ہی مالوم تھا، پھر کیا فائدہ اس کڑھنے کا، تجھے تو چھ مہینے کو لے کر آئے ہیں۔ تو تو مسافر ہے ری۔ رات کے رات ٹھہرے منہ اندھیرے چل دیے۔" کنیز نے ٹھنڈی آہ بھری اور دونوں لڑکوں کو پیار کر کے روٹی کھلانے لگی۔

بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد اس نے ڈلیا میں روٹی اور دال کا پیالہ رکھ کر سکینہ کی طرف بڑھا دیا جو اب تک منہ پھیرے لیٹی تھی پھر چپ چاپ کھڑے ہو کر نیچی نیچی نظروں سے دین محمد کو دیکھنے لگی۔

"اٹھ کر تھوڑا سا کھا لے۔" دین محمد نے سکینہ کو سہارا دیا تو وہ بڑے تکلف سے اٹھ گئی اور دین محمد اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلانے لگا۔ سکینہ ہر نوالے پر بس بس کر رہی تھی اور کنیز بڑی بے بسی سے کھڑی دیکھ رہی تھی کہ اس جھاڑ جیسی عورت میں اب کیا رہ گیا ہے جو دین محمد اس

کے نیچے پاگل ہو رہا ہے۔

"بس کر دینو میرے پیٹ میں چھریاں چلتی ہیں رے۔" دو چار نوالوں کے بعد سکینہ نے تڑپ کر پیٹ پکڑ لیا۔ دین محمد نے گھبرا کر اسے لٹا دیا اور طاق سے چورن کی شیشی اٹھا کر پھنکا رنے لگا۔

کنیز روٹی کی ٹوکریا اٹھا کر چولہے کے پاس چلی گئی۔ کیسا جی دکھ رہا تھا۔ دینو نے کچھ بھی تو نہ کھایا ری، اسی لیے تو مجبور ہو رہا ہے نا کھانے نہ کھانے دے، میں ہوتی تو اس کے لیے جبر دستی کھاتی، چاہے میرا پیٹ پھٹ جاتا، کیسی جھوٹی محبت کرتی ہے تو بھی جانے کس سے جادو کرا دیا ہے، ویسے کون پھرتا ہے بیمار عورت کے پیچھے۔"

کنیز کو کئی نام یاد آ گئے جن کی عورتیں ہمیشہ بیمار رہتیں اور وہ انھیں پلٹ کر پوچھتے تک نہ تھے۔ ان میں سے دو ایک تو کنیز کے پیچھے پھرتے تھے۔

سامان بٹورتے اور بھینس کو سانی لگاتے لگاتے خاصی رات ہو گئی۔ دور سے سیاروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور جانے کہاں، کتنی دور بہت سی مردانی آوازیں مجیرے پر گا رہی تھیں۔ پیا سون گھر جائے بسے ہو ہو ————

کنیز کان لگا کر سننے لگی ——" لے تیری سادی کی کیسی ہیں گانے ہو رہے ہیں، تیری تو ایسی سادی ہوئی کہ نہ ڈھول بجی، نہ ڈولی میں بیٹھی کسی سے بیل گاڑی بھی نہ کی، بس تیری سادی ہو گئی۔" پھر ایک دم کنیز کو یاد آیا کہ آج تو اس کی شادی کی پہلی رات ہے۔ ابھی تو اسے اپنا بستر لگانا ہے "بھلا تو کہاں سوئے گی ری ——— تو اس سے کون کون سی باتیں کرے گی؟ ہائے کیسا میٹھا میٹھا لگتا ہے۔"

"تو چھوٹے کو اپنے پاس سلا لیجیو ری۔ آنگن میں بستر لگا لے۔ اچھی طرح اڑھا لیجیو، رات اوس پڑتی ہے، چھوٹے کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔" سکینہ نے درد سے تڑپتے ہوئے اور دین محمد کی آغوش میں سر ٹکتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔

کنیز کو ایسا لگا کہ سکینہ کے پیٹ سے ایک چھری نکل کر اس کے کلیجے کو چیر گئی ہے۔ وہ ذرا دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ رات کے سناٹے میں کنویں کی گراری گھومنے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی ——— اماں نہ کہتی تھی کہ سوچ لے۔" اب کاہے کا گم کرتی ہے؟" کنیز نے اپنے آپ سے پوچھا۔

آنگن کے ایک کونے میں بستر لگا کر اس نے باہر کے دروازے بند کر لیے اور پھر چھوٹے کو اپنے سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔

"بھول تو نہ جائے گا رے؟" سکینہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ دینو نے کیا کہا، کنیز سن نہ سکی۔ اس نے گردن اچکا کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں منہ سے منہ جوڑے لیٹے تھے۔

کنیز نے ٹھنڈی آہ بھری ——" جانے چاند کی کون سی تاریخ ہو گی۔ شاید رات گئے چاند نکلے گا، ابھی تو اندھیارا پھیلا ہے۔" کنیز جیسے اپنے جی کو بہلا رہی تھی۔" جانے گاؤں والوں نے اپنے جی میں کیا سوچا ہو گا، کہتے ہوں گے کہ تو کنیز کی بھی سادی ہو گئی، اب جرور پچھتاتے ہوں گے کہ ہم نے کیوں نہ سادی کر لی۔ سب جرور یاد کرتے ہوں گے، پر اب یاد کرنے سے کیا بننا ہے ری۔ اس وکھت تو سب کو کہہ تھکی کہ گھر میں بٹھا لو، تب کسی نے نہ مانا۔"

ایک بار اس نے پھر گردن اچکائی۔ وہ دونوں اسی طرح لیٹے تھے ——" شاید سو گئے۔ گریب سوئے نہ تو کیا کرے، مر جائے گی تو کچھ اور ہی یاد آتا ہے۔ اس نے جادو کرا کے کابو میں کر لیا ہے۔ کب تک جئے گی۔"

تین کوس پیدل چلنے کی تھکن نے اسے جلدی سلا دیا مگر وہ صبح منہ اندھیرے اٹھ گئی۔ بھینس دوہنے کے بعد اس نے آگ جلا کر دودھ پکنے کے لیے رکھ دیا اور پھر جلدی سے رات کے بچے ہوئے دہی کو متھنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں دین محمد جنگل سے فارغ ہو کر آ گیا۔ اس نے رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کیا اور چھاچھ کا گلاس پی کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا ——— "سکینہ کا خیال رکھیو ری۔" باہر نکل کر چھپر تلے سے بیل کھول کر وہ جلدی سے انھیں ہانکنے لگا۔

کنیز اسے ناشتہ کرتے اور جاتے ہوئے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تھی۔ اسے کتنا انتظار تھا کہ شاید وہ کچھ کہے گا۔ سکینہ سو رہی تھی اب تو وہ کچھ کہہ سکتا تھا۔

دین محمد کے جانے کے بعد کنیز نے بھینس کے نیچے سے گوبر سمیٹ کر اس میں پیلی مٹی ملائی اور سکینہ اور بچوں کے سو کر اٹھنے سے پہلے پہلے کوٹھڑی اور برآمدہ لیپ ڈالا۔ جس وقت سے وہ یہاں آئی تھی جگہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین کھل رہی تھی۔

کوٹھڑی کو لیپتے ہوئے اس نے بڑا سکون محسوس کیا تھا ——— اسے بڑے سہانے سہانے خواب نظر آ رہے تھے اور وہ اپنے کو سمجھا رہی تھی ——— "اری کچھ دن کی دیر ہے، ماہ پوہ کی سردی میں تو یہیں اس نواڑی پلنگ پر دینو کی چھاتی سے لگ کر سویا کرے گی ——— سکینہ نہیں جینے کی۔"

ہاتھ دھو کر جب وہ بچوں کو لپٹا کے پیار کر رہی تھی تو سکینہ اٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ذرا دیر کے لیے التفات کی جھلک آ کر غائب ہو گئی۔ اس نے کراہتے ہوئے کنیز کو آواز دی تو وہ اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر بھاگی ——— "ہائے ری سکینہ، رات کی تکلیف میں کیسا پیلا منہ ہو رہا ہے، ذرا سا دودھ پی لے تو کچھوری جائے۔"

سکینہ نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ لیے اور پیٹ سہلانے لگی ——— "نصیبوں سے کھانا پانی اٹھ گیا ہے ری، تو جلدی جلدی روٹی پکا لے، کھیت پر لے جانی ہو گی، چھوٹے کو ساتھ لے جائیو، رستہ بتا دے گا۔" سکینہ نے کراہتے ہوئے کہا اور پھر لیٹ گئی ——— کتنے خطرات، کتنی نفرت اس کی آنکھوں میں امنڈ رہی تھی۔ کتنی ناکامیاں زہر گھول رہی تھیں۔

موٹی موٹی گھی چپڑی دو روٹیاں اور چھاچھ سے بھری ہوئی لٹیا لے کر جب کنیز نے کھیت پر جانے کے لیے چھوٹے کی انگلی پکڑی تو سکینہ جیسے ناگن کی طرح لوٹنے لگی ——— "روٹی دے کر پھوراً مڑ آئیو، دھوپ اس دیوار تک نہ چڑھنے پائے ری۔" سکینہ نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ کنیز نے مڑ کر دیکھا، دھوپ دیوار کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

کنیز جب کھیت پر پہنچی تو دین محمد تھک کر ایک پیڑ تلے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر دھول کا غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کنیز اس کے قریب بیٹھ گئی اور رانگوچھا کھول کر روٹی سامنے رکھ دی۔ دین محمد نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر کھانے لگا۔ "سکینہ کیسی ہے ری؟" اس نے پوچھا۔

"اچھی ہے رے" کنیز نے آہستہ سے جواب دیا ——— "اتنی دور سے آئی ہوں، مجھے بھی پوچھ لے رے!" کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دین محمد نے کوئی جواب نہ دیا اور روٹی کھا کر برتن انگوچھے میں باندھ دیے۔ "تجھے میرا گھر اچھا لگا ری؟" دین محمد نے دھیرے سے پوچھا جیسے کسی کے سننے کا خوف طاری ہو۔

"تیرا گھر نہیں، میرا گھر ہے دین محمد" کنیز نے کچھ اس طرح سر اٹھا کر کہا کہ دین محمد ایک لمحے کو جیسے ان آنکھوں میں کھو کر رہ گیا۔ "اچھا رے میں چلی۔ سکینہ نے کہا تھا کہ دھوپ دیوار پہ نہ چڑھے تو لوٹ آئیو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو اس کی کھوب کھدمت کرے گی نا؟" سکینہ کا نام سنتے ہی دین محمد کا چہرہ اتر گیا۔

"میرے اوپر بھروسہ کر رے۔" وہ چھوٹے کی انگلی پکڑ کر چل دی۔

گھر پہنچی تو سکینہ کی نظریں دروازے پہ لگی ہوئی تھیں ——— "تو نے اتنی دیر کیوں لگائی ری؟" سکینہ جیسے چیخ پڑی۔

"لمبا رستہ ہے سکینہ! اس نے روٹی کھائی تو میں اٹھ پڑی۔"

"تو نے اس سے کون سی باتیں کی تھیں؟" سکینہ نے اسے گھورا۔

"اری! مجھے کیا کہنا ہے، میں تو تیری کھدمت کو آئی ہوں۔" کنیز کمر پہ گھڑا جما کر پانی بھرنے چلی گئی۔

شام جب دین محمد کھیت پر سے واپس آیا تو سکینہ بیتابی سے اٹھ پڑی اور اس کی آنکھوں میں اس طرح جھانکنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ دین محمد نے اس کا سر سینے سے لگا لیا تو سکینہ سرگوشیوں میں اس سے جانے کیا کہتی رہی۔ یہاں تک کہ ذرا ہی دیر میں دینو صافے سے آنسو پونچھنے لگا۔

"ارے تو کیوں روئے، تیرے دشمن روئیں" ——— کنیز نے پھڑک کر ادھر دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ توے پہ پڑی ہوئی روٹی جلتی رہی۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ دین محمد کے آنسو پونچھ ڈالے اور سکینہ کا گلا گھونٹ کر یہ چار دن کی زندگی بھی چھین لے۔

رات مارے درد کے سکینہ نے کچھ نہ کھایا۔ دین محمد نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کنیز بچوں کو کھلا کر خود بھی بھوکی پڑ رہی، پھر اس سے کون کہتا کہ تو بھوکی نہ رہ۔ ہاں سکینہ ساری رات ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی اور دین محمد اس کی ہر آہ پر سوتے میں بھی چونکتا رہا۔

دوسرے دن جب کنیز کھانا لے کر اس کے پاس کھیت پر گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، بیلوں کی طرح سر جھکا کر کھانا شروع کر دیا۔

"بہت تھک گیا ہے رے، تو کھانا کھا لے تو میں تیرے پاؤں داب دوں۔" کنیز نے اس کے قریب سرک کر کہا۔ "چھوٹا ادھر کھیت میں ادھر سے ادھر بھاگا پھر رہا تھا ——— "تجھ سے سکینہ نے کہا ہے کہ بات نہ کیجیو۔ نہ بول، پر میں تو بولوں گی، اس نے مجھے کون سی کسم دی ہے، تجھ سے نہ بولوں گی تو پھر کس کے سنگ بات کروں گی رے، کیوں میں جھوٹ کہتی ہوں؟"

دین محمد پھر بھی کچھ نہ بولا۔ بس ایک بار نظر اٹھا کر کنیز کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے کو آواز دینے لگا۔

کنیز ذرا اور قریب سرک گئی۔ دین محمد چھوٹے کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔

"یہ کس کے نام کی چمیاں لے رہا ہے رے؟" کنیز نے اسے چھیڑا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ دین محمد نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا ——— "گھر جا ری۔" اس نے چھوٹے کو گود سے اتار دیا اور بیلوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ہائے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ مجھ سے کیوں بھاگتا ہے؟ کیا میری تیری ساری نہیں ہوئی؟ تین کوس دور تیرے پیچھے آئی ہوں رے ———" کنیز اکیلی بیٹھی سوچتی رہ گئی اور پھر برتن اٹھا کر چھوٹے کی انگلی پکڑ لی۔ دینو کی شرافت پر تو وہ اس وقت قربان ہو کر رہ گئی تھی۔ "اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو جانے کیا کرتا ری پر وہ آدمی تھوڑے ہوتے ہیں، ڈنگر ہوتے ہیں۔"

گاؤں والے حیران تھے کہ کنیز نے گھر اور بچوں کو سنبھال لیا۔ سکینہ کی خوب خدمت کی۔ کبھی کسی نے لڑنے بھڑنے کی آواز

نہ تھی۔ جب کنوئیں پر جاتی تو عورتیں سکینہ کا حال پوچھتیں اور وہ ایسی رقت سے اس کی خراب حالت کا ذکر کرتی کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ جوں جوں سردی بڑھتی جا رہی تھی سکینہ کی حالت بھی گرتی جا رہی تھی۔ کنیز اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیتی مگر اس کی کیفیت کون جانتا تھا۔ دین محمد خوش نظر آتا تھا کہ اس کی سکینہ کی خوب خدمت ہو رہی ہے مگر جب کنیز کھیت پر روٹی لے کر جاتی اور لبھانے کے لیے باتیں کرتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔

جب سے سردیاں پڑی تھیں سب لوگ ایک ہی کوٹھری میں سوتے، ایک سرے پر سکینہ اور دین محمد کا پلنگ ہوتا، دوسرے سرے پر کنیز چھوٹے کو لے کر لیٹتی۔ سرِ شام پکا کھا کر وہ کوٹھری کو اُپلے جلا جلا کر گرم کر دیتی اور پھر دور پڑے پڑے دیکھتی رہتی کہ کراہتی ہوئی سکینہ پر دین محمد جھکا ہوا ہے، اسے سہلا رہا ہے، دبا رہا ہے، چوم رہا ہے، اس کی تکلیف پر آنسو بہا رہا ہے۔ کنیز تڑپتی رہتی، جلتی رہتی، اس کے شوہر کو ایک بیمار عورت چھینے ہوئے تھی مگر کنیز منہ سے اُف بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ سکینہ کی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو بہت سے لوگوں نے بتایا تھا کہ بعض جادو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اسی وقت ختم ہوتا ہے جبکہ جادو کرانے والا مر جائے۔

شام پڑتے ہی کنیز جلدی جلدی سارا کام ختم کر لیتی تو بھینس کو دالان میں باندھ کر اپنے بستر میں آ جاتی۔ دین محمد جیسے ہی گھر میں آتا اور سکینہ کے پاس بیٹھتا تو کنیز کے ہاتھوں میں جیسے بجلی کی تڑپ آ جاتی ——— "ہائے ری جانے وہ دونوں کیا کر رہے ہوں گے، کون سی باتیں کرتی ہو گی سکینہ؟" گھنٹوں کے کام منٹوں میں کر کے وہ اپنی کھاٹ پر آ جاتی اور سکینہ کو بار بار کام یاد آنے لگتے مگر آج جب وہ اپنی کھاٹ پر لیٹی تو سکینہ کو کوئی کام نہ یاد آیا۔ دین محمد کے کندھے پر سر رکھے جانے کیوں وہ چپ چاپ بیٹھی دیے کو تکے جا رہی تھی۔ دین محمد بار بار اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے۔ کنیز کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ کر کہہ دے "مرنے والے اسی طرح روشنی کو تکتے ہیں رے، تو کیوں فکر کرتا ہے۔"

"تیل ختم ہو جائے تو بتی آپی آپ بجھ جاتی ہے رے، میری جندگی کا تیل بھی ختم ہو رہا ہے۔" دین محمد کے اصرار پر آخر سکینہ بول ہی پڑی۔

"اس طرح کہے گی تو میں کنوئیں میں کود پڑوں گا، تو نے تو ساری باتیں بھلا دیں سکینہ۔" دین محمد بیتاب ہو رہا تھا۔

کنیز تن من سے سن رہی تھی ——— "کون سی باتیں رے دین محمد، تجھ سے کیا کہا تھا سکینہ نے، ہائے رے مجھے نہ بتائے گا؟ کیا تو میرا آدمی نہیں؟ مجھے بتا، میں جو تیری عورت ہوں۔ ارے دین محمد میں نے تیرے ہی تو کھواب دیکھے تھے۔" کنیز بار بار کروٹیں بدل رہی تھی اور سکینہ دیے کی لو تکے جا رہی تھی۔

"بول ری؟" دین محمد اس سے جواب مانگ رہا تھا۔

"پھر وعدہ کر کہ اگلے مہینے پھصل کاٹ کر مجھے سہر آگرہ علاج کے لیے لے جائے گا، وہاں بڑے اسپتال میں رکھے گا، رچاہے گا تو تیل کبھی نہ کھتم ہو گا۔"

"سہر میں علاج کے لیے تو بہت سے رپیوں کی جرورت ہو گی، پر تو نے پہلے کیوں نہ کہا۔ میں تیری کھاطر ہل، بیل، بھینس سب بیچ دوں گا۔ پھصل کا دانہ دانہ اٹھا دوں گا، میں بھوکا رہ لوں گا پر تجھے جرور لے جاؤں گا۔"

"بھوکے مریں تیرے دشمن۔" کنیز تڑپ کر بیٹھ گئی۔ "کون بیچے گا میرے بیل، میری بھینس، پھر یہ سب کہاں سے ملے گا رے ——؟

گاؤں والے بے جت بھیں کے شہر میں تو بابو لوگ جاتے ہیں علاج کرنے تے۔ جانے کیسے کنیز نے یہ سب کچھ کہہ دیا۔ اس کا تن لٹ رہا تھا اب گھر گھٹنے کیسے دیکھتی۔

"اری تو کون بولنے والی۔ کہاں سے آگیا تیرا گھر حرام جادی! تجھے تو پہ بیٹے کے لیے کھدمت کرنے کو لائی ہوں" سکینہ ڈائنوں کی طرح چیخی۔

"کھبردار جواب تو نے بات کی، جان کھینچ لوں گا۔" دین محمد چنگھاڑا۔

"لے میں کیوں نہ بولوں؟ سب بیچ دے گا تو بھوکا مرے گا، میں تجھے بھوکا کیسے دیکھوں گی، یہ تجھے الٹی باتیں سکھاتی ہے، اس نے تجھ پر جادو کیا ہے رے۔ یہ مرجائے گی پر تجھے بھوکا چھوڑ کر جائے گی۔"

"یہ مرجائے گی؟" دین محمد دیوانوں کی طرح کنیز کی طرف جھپٹا اور چوٹی پکڑ کر بے دردی سے پیٹنے لگا — "نکل جا، ابھی نکل جا" — وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ کنیز نے ایک لمحے کو اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ اس نے اپنے جسم پر پڑتے ہوئے گھونسوں سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ چھوٹے سونے سے اٹھ کر کنیز کے ساتھ لپٹ گیا تھا اور بُری طرح رو رہا تھا۔

"بس کر رے دینو، چھوٹے کو کیوں رُلاتا ہے، ابھی تو میں جندہ ہوں، میں اس کے کہنے سے ذمروں گی۔" سکینہ کی آواز میں بلا کا سکون تھا۔

دین محمد نے کنیز کو چھوڑ دیا اور اپنے بستر پر آکر لحاف میں منہ چھپالیا۔

"بس رے مجلی تھک گیا؟" کنیز نے زخمی نظروں سے دین محمد کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے کو سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن جب کنیز دین محمد کا کھانا لے کر گئی تو دین محمد نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، بس سر جھکائے روٹی کھاتا رہا اور کنیز اس کے قریب بیٹھی تکتی رہی مگر جب دین محمد نے برتن اس کی طرف بڑھائے تو ایک لمحے کو نظریں مل گئیں۔ اس کے ہونٹ کانپے اور وہ جلدی سے پیٹھ موڑ کر آگے بڑھ گیا۔

"جالم مارتا ہے تو پھر چھاتی سے بھی لگالے۔" کنیز سوچتی ہوئی تھکے تھکے قدموں سے گھر کی راہ ہولی۔ "شرمندہ ہے مجھ پر نہیں ملاتا۔ اسے ہاؤلے میں کوئی پرائی عورت ہوں، تیری ہی تو ہوں۔ تیرا کیا کصور، تجھ پر تو سکینہ نے جادو کیا ہے۔"

کنیز کو مارنے کے بعد جانے کیوں دین محمد پھر اس سے بات نہ کرسکا۔ وہ روز روٹی لے کر جاتی، جانے کتنی بہت سی باتیں کرتی —

"دینو رے گیہوں کی کیسی موٹی موٹی بالیاں پڑی ہیں۔ دینو رے! چھوٹے کے کپڑے بنوا دے۔ چھوٹے کی صورت بالکل تیرے جیسی ہے رے! دینو رے! مجھ سے ناراج ہے کیا؟ مجھے چھوڑ تو نہیں۔ دیکھ رے میں نے تیرے گھر کو چندن بنا دیا ہے۔ دینو رے! ایک بار تو مجھے بھی چھاتی سے لگالے۔ دینو رے ———"

دین محمد جانے سب کچھ سنتا بھی تھا کہ نہیں۔ کھانے کے بعد برتن اس کی طرف بڑھا دیتا اور فوراً ہی کھیت کے اندر چل دیتا۔ فصل کٹتے کٹتے سکینہ بڑی کمزور ہوگئی۔ دین محمد نے ساری فصل بیچ دی تھی اور کل صبح سکینہ کو شہر لے جا رہا تھا۔ اسٹیشن تک جانے کے لیے بیل گاڑی کا انتظام بھی کرلیا تھا۔ کنیز خوش تھی کہ اب سکینہ جا رہی ہے، وہیں اسپتال میں مرجائے گی، کنیز کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے گاؤں سے کئی آدمی آگرہ اسپتال گئے تھے جب وہ لے جائے گئے تھے تو ان کی سخت بُری حالت تھی۔ اسپتال جاکر وہ زندہ واپس نہ آسکے تھے۔ کنیز کو یقین تھا کہ سکینہ بھی واپس نہ آسکے گی اور پھر وہ اس خیال سے بھی کتنی خوش تھی کہ دین محمد نے اسے مارنے کے باوجود بیل یا بھینس نہ بیچی تھی۔ ساری فصل بیچ دی تو کیا ہوا۔ وہ خرید کر کھالے گی۔ گھی بیچ کر روپے کھرے کرلے گی۔

صبح منہ اندھیرے جب سکینہ جا رہی تھی تو بڑے دنوں کے بعد اس نے کنیز سے بات کی ——— "بچوں کو تیرے سہارے چھوڑ رہی ہوں کنیز، ان سے بُرائی نہ کیجیو۔ جندگی کا کیا بھروسہ" اور پھر بچوں کو لپٹا کر رونے لگی۔

"کنیز مر جائے گی پر انھیں تکلیف نہ ہونے دے گی۔" کنیز نے جواب دیا اور روتے ہوئے بچوں کو لپٹا کر کوٹھری میں چلی گئی۔

دین محمد سکینہ کو بیل گاڑی میں بٹھا کر سامان اٹھانے آیا تو کنیز کو یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"تو تو کچھ نہ کہیو رے کہ انھیں اچھی طرح رکھنا، یہ تو میرے اپنے ہیں، تو جا۔"

آٹھ دس دن گزر گئے، نہ دین محمد آیا نہ کوئی خبر لگی۔ کنیز پل پل انتظار میں گزارتی۔ خواب میں کتنی ہی بار اس نے سکینہ کو مرتے دیکھا تھا، اس نے آخری ہچکی کی آواز تک سنی تھی۔ اس نے اطمینان کی ٹھنڈی لمبی سانسیں بھری تھیں مگر جب خواب سے چونکتی تو پھر عجیب سا عالم ہو جاتا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ بچوں کو جیسے تیسے روٹی کھلا دیتی مگر خود کھانا بھول جاتی۔ ہاں دوپہر میں جانے اسے کیا ہوتا کہ انگوچھے میں دو روٹیاں باندھ لیتی، لٹیا میں چھاچھ بھرتی اور پھر ذرا دیر بعد انگوچھا کھول کر رونے لگتی۔ "ارے دین محمد! تو اس کے پیچھے پھرتا ہے!" جانے وہ کس سے فریاد کرتی۔

ان دنوں اسے اماں بھی یاد آنے لگی تھی ——— "جانے کیسی ہوگی، سردیاں کیسے کاٹی ہوں گی۔ اس کے گھٹنوں پر سوجن چڑھی ہوگی تو کس نے سینکا ہوگا۔ ایک بار تو آ کر مل جاتی ری۔ شاید ڈرتی ہوگی کہ کنیز ساتھ ہی نہ لگ آئے۔"

اماں کی یاد سے وہ بہت جلدی پیچھا چھڑا لیتی۔ اسے اپنے گاؤں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ جانے کیوں گاؤں کا خیال بھوت کا سایہ بن جاتا۔

دسویں دن صبح صبح دین محمد آ گیا۔ کنیز اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ گھٹ کر آدھا رہ گیا تھا۔ رنگ ایسا پیلا کہ لگتا برسوں کا بیمار ہے۔ اس نے آتے ہی بچوں کو لپٹا لیا۔ کنیز دور کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

"سکینہ کی حالت بڑی خراب ہے ری۔ اس کا آپریشن ہوا ہے۔" دین محمد نے کنیز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے ہوئے تھے۔

کنیز کچھ نہ بولی، دین محمد کے پیروں کے پاس بیٹھ کر راستے کی دھول پونچھنے لگی ——— "یہ حال بنا لیا رے، سکینہ اب نہ اچھی ہوگی، تو کیوں پاگل ہوا جاتا ہے۔" کنیز بڑے اطمینان سے سوچ رہی تھی۔ آپریشن کی خبر نے اسے اچھی طرح یقین دلا دیا تھا کہ اب سکینہ لوٹ کر نہ آئے گی۔

"تو مجھے جلدی سے روٹی دے دے، کام سے جانا ہے ری۔" دین محمد نے اپنے پاؤں کھینچ لیے "کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

کنیز نے جلدی سے روٹی، پیاز کی گٹھی اور تھوڑا سا مکھن اس کے سامنے لا کر رکھ دیا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ اتنے دن بعد دین محمد کو دیکھ کر اسے چپ لگ گئی تھی۔ اس سے ایک بات بھی نہ کی جا رہی تھی۔

جلدی جلدی روٹی کھا کر دین محمد اٹھ کھڑا ہوا اور بھینس کے کھونٹے سے زنجیر کھول کر اسے باہر ہانکنے لگا۔ کنیز بھاگ کر سامنے آ گئی۔ "ابھی سے کہاں چلا رے، ابھی تو پیروں کی دھول بھی نہیں جھڑی۔"

"بھینس کا سودا کر آیا ہوں، اسے بیچنا ہے ری، بہت سی دوائیں خریدنا ہیں، آرام کا بلکت نہیں۔"

"بچے بن دودھ کے کیا کریں گے رے؟ یہ تیرے آنگن کی سان ہے! میں اسے نہ بکنے دوں گی۔" کنیز نے زنجیر پکڑ لی۔
دین محمد ایک لمحے کو جیسے بے بس سا ہو کر کنیز کو تکنے لگا اور پھر اسے اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ دیوار سے جا لگی۔
دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دین محمد نے مڑ کر کنیز کی طرف دیکھا جو ابھی تک دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ "میرا انتظار نہ کیجیو۔ میں اسٹیشن چلا جاؤں گا۔"
"بھینس نہ بیچ دینو تجھے میری قسم نہ بیچیو۔" کنیز دروازے تک دوڑی اور پھر جیسے تھک کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی۔ "اری سکینہ! تو مرنے سے پہلے میرا گھر لٹا کر جائے گی۔ تجھے گور میں بھی چین نہ پڑے، تیرے کیڑے پڑیں۔"
دین محمد بھینس کو ہنکاتا چلا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے دھول کا بادل امنڈ رہا تھا۔ کنیز بڑی حسرت سے ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب دین محمد نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دروازے کا سہارا لے کر اس طرح اٹھی جیسے اچانک بوڑھی ہو گئی ہو۔ اس کی ساری طاقت جواب دے گئی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہی تھی —— "بیچ دے رے، کنیز پھر سے بھینس خرید لے گی، تیرے آنگن کی سان نہ جانے دے گی۔"
بھینس جانے سے آنگن کیسا سُونا سُونا سا لگتا۔ کنیز نے باہر چھپر کے نیچے بندھے ہوئے بیل کھول کر آنگن میں باندھ لیے پھر بھی بھینس والی بات نہ بنی۔
دین محمد کو گئے چھ دن ہو گئے۔ ان دنوں میں کنیز نے ایک بار آنگن اور برآمدہ لیپ لیا تھا۔ بیلوں کے لیے کھیت سے بھوسا اٹھا اٹھا کر گھر لائی تھی۔ گھر کی دیواریں جھاڑی تھیں، جالے چھڑائے تھے، پھر بھی کام کر کر کے اس کا جی نہ بھرتا۔ رات ہوتے ہوتے وہ اس قدر تھک جاتی کہ کسی کروٹ چین نہ پڑتا۔ نیند نہ آنے سے ساری فکریں دھاوا بول دیتیں۔ دین محمد کی یاد بری طرح ستاتی۔ اسے بار بار خیال آتا کہ سکینہ کی موت پر اس کا کیا حال ہو گا۔ ایسے وقت میں اس کا پاس ہونا کتنا ضروری تھا۔ وہ اسے تسلی تو دے لیتی، اس کے آنسو تو پونچھ دیتی۔ اب وہ اکیلا کیا کرے گا۔
دس دن گزر رہے تو کنیز کا سارے کاموں سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ وہ بولائی بولائی پھرتی۔ بچے سارا دن باہر گلی ڈنڈا کھیلتے اور تنہا کنیز کو ڈھیروں خدشات ڈسنے آ جاتے —— اگر سکینہ اچھی ہو گئی تو؟ آپریشن کے بعد وہ اتنے دن تک نہیں آیا۔ وہ اتنے دن کیسے زندہ رہی۔ کیا اس کی اتنی لمبی زندگی ہے؟ کیا وہ نہیں مرے گی؟
انجام کے انتظار میں کنیز کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتیں۔ چھوٹے اگر کسی وقت کھیلتے کھیلتے آکر دروازہ بند کر دیتا تو کنیز دوڑ کر کھول دیتی —— "نہ میرے لال دروازہ نہ بند کر تیرا ابا آئے گا۔"
گیارھویں دن دوپہر کو دین محمد آ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے بچوں کو تلاش کر رہا ہو اور پھر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ کنیز جلدی سے اس کی طرف لپکی —— "سکینہ کیسی ہے رے، تجھے کیا ہو گیا؟ تو تو پہچانا بھی نہیں جاتا۔"
کنیز جواب کے لیے اس کا منہ تک رہی تھی اور وہ کھاٹ سے پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ گال پچک گئے تھے اور ہونٹوں پر سیاہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔
"بول رے سکینہ کیسی ہے؟" کنیز بہت بیتاب ہو رہی تھی۔

"بے بچا نکلی، ساتھ چھوڑ گئی جالم۔" دین محمد جیسے خواب میں بولا۔

"ہائے ری سکینہ ـــــ" کنیز نے اپنا سینہ کوٹ لیا، بال نوچ ڈالے مگر اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اتنے زور زور سے سینہ پیٹتے ہوئے اسے ذرا بھی تکلیف کا احساس نہ ہو رہا تھا۔

وہ سینہ پیٹتے ہوئے دین محمد کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی مگر نہ تو دین محمد رویا نہ اس نے کنیز کو سمجھایا۔ اس کا چہرہ کس قدر سپاٹ ہو رہا تھا۔ شاید وہ بہت رو لیا تھا۔ شاید اسے صبر آ گیا تھا۔

کنیز اس کے یوں خاموش بیٹھنے پر کس قدر مسرت محسوس کر رہی تھی ـــــ "ساری باتیں جندگی کے ساتھ ہوتی ہیں، مرے کو دو چار دن سے جیادہ کون روتا ہے ری! سب بھول جاتے ہیں" ـــــ اس نے بڑے فخر سے سوچا اور دین محمد کے پیروں کی دھول اپنے آنچل سے جھاڑنے لگی ـــــ "جندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، پل کے پل کیا سے کیا ہو جاتا ہے، اب تو گم نہ کر یو۔" کنیز نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔

"سکینہ کی کھاطر میں نے جانے کیا کیا سہا۔ ایک رات گاؤں والوں نے گھیر کر لاٹھیوں سے مارا بھی تھا۔ جکھم اب تک ہرے ہیں۔" دین محمد نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اس کے کھیرے بھائی نے کتنا جور مارا، کتنے جتن کیے پر سکینہ میرے پاس آ کے رہی۔ اس کا عاسک جہر کھا کر مر گیا پر سکینہ اس کی موت پر بھی نہ گئی۔ کہتی تھی میں تو ایک پل کو بھی تیرا ساتھ نہ چھوڑوں۔ جا، جالم! آکھر کو سدا کے لیے ساتھ چھوڑ گئی نا۔" دین محمد نے احمقوں کی طرح ہر طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

پھر وہ ایک دم چونک پڑا اور کنیز سے بولا "ـــ کنیج! ایک جروری بات تو میں بھول ہی گیا۔"

اسی ضروری بات کے لیے تو کنیز نے چھ مہینے دین محمد کی پوجا میں گزارے تھے۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "ہائے جلدی سے بول دے نا جروری بات۔"

دین محمد نے کرتے کی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر کنیز کی طرف بڑھا دیا "تیرا کام کھتم ہو گیا کنیج! چھ مہینے پورے ہو گئے۔ یہ لے، میں نے کاگج لکھوا لیا ہے۔ اب جا۔"

"دینو رے! ـــــ" کنیز آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے جیسے کچھ کہنا ہی نہیں تھا۔

پلٹ کر ایک پل کے لیے اس نے چھوٹے کو دیکھا پھر اٹھی، کاغذ کو پاجامے کے نیفے میں اڑسا اور بولی "ہاں رے، اب چلوں، نہیں تو سام پڑ جائے گی۔"

گاڈ بلس یو

مہندر ناتھ

جے سنگھ جب وکٹوریہ ٹرمنس سے باہر نکلا تو اُس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ہلکا سا بستر۔ دُور سمندر میں سُورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر گہرے سیاہ بادل آوارہ گھوم رہے تھے۔ اُسے بمبئی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ آج پہلی بار اس بڑے پھیلے ہوئے شہر میں وارد ہوا تھا۔ اس شہر کے متعلق اُس نے بے شمار افسانے سُنے تھے اُنھیں کو ذہن میں محفوظ رکھ کر اُس نے ادھر کا رُخ کیا۔ کاریں اور بسیں بے تحاشہ بھاگ رہی تھیں۔ لوگوں کا جمِ غفیر چاروں طرف رواں دواں تھا۔

جے سنگھ کو صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی۔ وہ کچھ دن بمبئی میں ٹھہرے گا اور پھر جالندھر شہر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ وہاں اُس کی ماں اور اُس کی بہن انتظار کر رہے تھے۔ جن کپڑوں میں وہ ملبوس تھا اُس سے صاف عیاں تھا کہ وہ ایک معمولی سا سپاہی تھا جو کانگو کے محاذ پر امن قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یوں دیکھنے میں جے سنگھ کافی وجیہہ اور خوش شکل تھا۔ لمبا قد، ذرا چھریرا بدن، گندمی رنگ، سینہ چوڑا چکلا، کسرتی بدن، لمبی لمبی باچھیں، عمر بائیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ چکنے چکنے گالوں پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ شاید آج اس نے شیو نہیں کی تھی۔ براؤن قمیص اور براؤن نکر اور موٹے موٹے بھاری بوٹ پہنے ہوئے، وہ ایک باوقار سپاہی لگتا۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے؟ کس ہوٹل میں ٹھہرے؟ ایک دو دنوں کے لیے وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ تاکہ صبح ہوتے ہی وہ اس خوبصورت شہر کو دیکھ سکے۔ بمبئی کی اونچی اونچی شاندار عمارتیں جو عام طور پر سات آٹھ منزلہ ہوتی ہیں — کافی گرانڈیل اور پُرشکوہ نظر آتی ہیں۔ اس شہر میں اجنبی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے بھاری بوٹوں کی تھاپ اکثر راہگیروں کو چونکا دیتی۔ ایک دو لڑکوں نے اس کے سامان کو اُٹھانے کے لیے پیش کیا۔ مگر جے سنگھ کا پُروقار چہرہ جب انھیں گھور کر دیکھتا تو وہ فوراً اپنی راہ لیتے۔ اس لمبے تڑنگے سپاہی کا ایک تھپڑ بہت مہنگا پڑے گا۔

فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر وہ سوچنے لگا کہ وہ کس ہوٹل کی طرف رُخ کرے؟ اچانک ایک ٹیکسی اس کے سامنے رُکی، اور — ایک ہاتھ اُس کی طرف بڑھا۔ لانبی لانبی مخروطی انگلیاں، جن کے ناخنوں پر پالش تھا۔ اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔ جے سنگھ ایک لمحے کیلئے ڈرا۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر ٹیکسی میں دیکھا۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پہلے وہ اس مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھا، اُس نے سوچا شاید اس لڑکی نے غلطی سے اشارہ کر دیا۔ وہ پھر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ لڑکی نے پھر مسکرا اس کی طرف دیکھا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا اور کہا "کم اِن۔"

جے سنگھ ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ دوسرے لمحے خون نے جوش مارا۔ اور وہ ٹیکسی کے اندر تھا۔ جب سیٹ پر بیٹھا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے دائیں بائیں دو لڑکیاں تھیں۔ ان دو لڑکیوں کو دیکھ کر وہ بالکل بدحواس سا ہو گیا۔ وہ اب کیا کرے؟ یہ لڑکیاں اُسے کہاں لے جائیں گی؟

"تم کہاں سے آیا؟" ایک لڑکی نے اُسے کہنی مار کر کہا۔

"میدانِ جنگ سے۔"

"لڑنے جا رہے ہو یا لڑ کر آ رہے ہو؟" دوسری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کانگو سے آ رہا ہوں اور گھر جا رہا ہوں۔" جے سنگھ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"جالندھر میں۔"

"اِدھر کیوں اُترا؟"

"بمبئی دیکھنے۔"

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ایک بولی "میرا نام میری ہے۔" دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلی لڑکی نے کہا "اور یہ میری چھوٹی بہن ایلس ہے۔" جے سنگھ کی گردن گھڑی کے پنڈولم کی طرح دونوں طرف گھومنے لگی۔ وہ دونوں لڑکیوں کے بیچ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔

"تمہارا نام؟" میری نے زبان کو دانتوں کے بیچ میں سے نکالتے ہوئے پوچھا۔

"جے سنگھ"

"تم سکھ ہو؟"

"نہیں تو۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اتنی شیریں، اتنی شہد آگیں ہنسی اُس نے آج تک نہ سُنی تھی۔ اُس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا تھا۔ کس بازار سے گزر رہا تھا۔ عالیشان عمارتیں کدھر تھیں۔ ٹیکسی دوڑی جا رہی تھی۔ اُس کا سوٹ کیس اور بستر کہاں تھا، وہ ایک لمحے کے لیے چونکا۔ دیکھا کہ سوٹ کیس اُس کے پاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ اور سامنے کی سیٹ پر اس کا بستر رکھا ہوا تھا۔ ٹیکسی میں اتنی کم روشنی تھی کہ دونوں لڑکیوں کے چہرے دھندلے دھندلے سے دکھائی دیتے تھے۔ لڑکیوں کی قربت نے اس کے سانس کی رفتار کو تیز کر دیا۔ خون کی گردش تیز تر ہوتی گئی۔ اگر اُس کے جسم کا درجۂ حرارت لیا جاتا تو یقیناً ۱۰۴ ڈگری نکلتا۔

ایک غیر آباد جگہ پہ ٹیکسی رُکی۔ پہلے میری اُتری۔ پھر ایلس، اُس کے بعد جے سنگھ اُترا۔ اُس نے اپنا سوٹ کیس اور بستر اُتارا۔ ایک لڑکی نے اُس کا سوٹ کیس لے لیا اور دوسری نے بستر اٹھانا چاہا مگر اُس نے خود ہی بستر اُٹھا لیا۔ وہ چلنے لگا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے آواز دے کر کہا "سیٹھ ٹیکسی کا کرایہ؟"

اُس نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ میری نے کہا "میں دیکھتا کیا ہے؟ کرایہ کیوں نہیں دیتا؟"

جے سنگھ نے دام ادا کئے اور لڑکیوں کے ساتھ ہو لیا۔

ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جہاں دونوں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ برآمدے میں داخل ہوتے ہی مَیری چلائی "ممی ممی۔ دیکھو نا — تمہارے لیے ایک خوبصورت GUEST لائی ہوں۔"

ایک موٹی بھدی عورت باہر نکلی۔ اُس نے گھوم کر جے سنگھ کو دیکھا۔ ایلس نے ممی کو آنکھ ماری جسے ممی نے دیکھ لیا مگر جے سنگھ نہ دیکھ سکا۔

تینوں اندر چلے گئے۔ مکان زیادہ کشادہ نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے سے دو کمرے ایک رسوئی ایک برآمدہ ایک چھوٹا سا غسلخانہ۔ جس کمرے میں اُسے بٹھایا گیا وہ ڈرائنگ روم تھا۔ صوفہ قیمتی نہ تھا مگر صاف اور ستھرا تھا۔ ایک تپائی جس پر ایک نیلے رنگ کا گلدان تھا جس میں گلاب کے پھول خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک پرانا گراموفون رکھا تھا۔ دیواروں پر مغربی اور مشرقی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سُرخ رنگ کے پردے لگے ہوئے تھے۔ گراموفون کے قریب ہی ایک سنگھار میز بچھی ہوئی تھیں۔ اور گھر سے بے سروسامانی کے آثار نمایاں نہ تھے۔ گھر کی حالت دیکھ کر جے سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ لڑکیاں اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟ وہ اُسے اپنے گھر کیوں لائیں؟ کیا یہ لڑکیاں اس کا بستر اور ٹرنک چھین کر اُسے قلاش بنا دیں گی؟ اس کی جیب میں صرف چار سو روپے تھے۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے لیے کچھ کپڑے خریدنا چاہتا تھا۔ ماں کے لیے ایک سوتی ساری۔ اور بہن کے لیے ایک آرٹیفیشل سلک کی ساری۔ گلے کے لیے ایک نقلی موتیوں کا ہار۔ اور کانوں کے لیے لمبے لمبے بُندے اور جھلملاتے ہوئے ستاروں میں گڑھی ہوئی چُنری۔ وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ مَیری اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ اور اُس نے چائے کی پیالی پیش کی۔ کمرے میں روشنی کافی تیز تھی۔ اور روشنی میں اُس نے میری کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اُس کے اتنا قریب بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا گرم گرم سانس اُس کے رخساروں کو چھو رہا تھا۔ میری تو واقعی حسین تھی۔ بڑا ہی خوبصورت بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ بلاؤز آسمانی رنگ کا تھا۔ اور اسکرٹ کی رنگت گلاب کے پھولوں کی طرح سُرخ تھی۔ اور اُس کے نیلے نیلے بلاؤز میں اس کے گول اور سڈول بازو ثمربار ڈالیوں کی طرح جھکے ہوئے تھے۔ کتنی شفاف سی جلد تھی۔ دودھ میں نہائی ہوئی پنڈلیاں۔ جے سنگھ کی نگاہیں کبھی مَیری کے جسم سے ٹکرائیں اور کبھی اس کے حسین چہرے پر آ کر اٹک جاتیں۔ ایسی گوری گوری لڑکیاں اس نے جالندھر میں کبھی نہیں دیکھیں۔ اتنی بے باک اور بے دھڑک بات کرنے والی لڑکیاں اسے کب اور کہاں ملیں گی۔ مگر یہ لڑکیاں اُس سے کیا لیں گی؟ وہ کس مصرف کے لیے اُسے یہاں لائی تھیں؟ وہ یوں کسی لڑکی کے ساتھ نہ بیٹھا تھا۔ اتنی بے تکلفی کسی لڑکی نے اس کے ساتھ نہ برتی تھی۔

"مَین تم کیا کھائے گا؟"

"کھانا کھاؤں گا۔"

"ڈنر کھائے گا؟"

"یس مَیری"

"تم انگلش جانتا؟"

"میں میٹرک پاس ہوں مَیری۔" اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ایلس۔ ڈارلنگ ایلس۔ سنگھ کین سپیک انگلش۔"

اتنے میں ایلس آگئی۔ وہ واقعی میری سے چھوٹی تھی۔ میری سے زیادہ حسین نہ تھی۔ میری سے کچھ زیادہ ہی دُبلی تھی۔ میری کے مقابلے میں کم باتیں کرتی۔ جو کچھ میری کہتی اُسی پر عمل کرتی۔ میری کے آنکھ کے اشارے کو سمجھتی تھی۔

رات کا اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اپنے اردگرد دو جوان لڑکیوں کو دیکھ کر اُس کے دماغ میں عجیب و غریب خیالات اُبھرے۔ یہ بیس بائیس برس بڑے سپاٹ اور بے رنگ گزرے تھے۔ وہ نہایت ہی شریف اور دیانتدار قسم کا نوجوان تھا جسے سنگھ کو اپنی ماں اور بہن سے بے حد پیار تھا۔ وہ انھیں دو زندگیوں کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی جیب میں صرف چار سو روپے تھے۔ اور وہ ان چار سو روپوں کو سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے خیال ضرور آیا کہ وہ کسی ایسے چکر میں نہ پھنس جائے کہ لڑکیاں اُس کے روپوں پر ہاتھ صاف کر دیں۔ اُس نے سوچا اس وقت یہاں سے جانا درست نہیں۔ جب صبح ہو گی تو وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو سنگھ؟" میری نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ تم مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟"

"سچ کہہ دوں سنگھ؟"

"ہاں میری۔"

"تم فٹ پاتھ پر اکیلے کھڑے تھے؟"

"ہاں"

"اُس وقت تم بہت اچھے لگے۔"

"کیوں؟"

"تمہارے ایسے لڑکے اس شہر میں بہت کم آتے ہیں۔" اُس نے اس کے گال کو سہلاتے ہوئے کہا۔

سنگھ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔

"تم ڈرو نہیں۔ صبح ہوتے ہی تم جہاں جانا چاہو گے ہم تمھیں پہنچا دیں گے۔ تمھیں بھوک لگی ہے؟"

"ہاں۔"

"کچھ پیو گے؟"

"کھانے کے ساتھ پانی"

"کھانے سے پہلے کچھ پیو گے؟"

"کیا؟"

"وسکی۔ شراب۔ دیسی؟"

"نہیں نہیں میری، میں نے آج تک شراب نہیں پی۔ میں شراب نہیں پیوں گا۔ میری ماں نے شراب پینے سے منع کیا تھا۔"

"ہماری ممی ہمیں شراب پلاتی ہے اور وہ خود بھی پیتی ہے۔ تمہاری ممی ایکدم خراب ہے۔ ایلس تین گلاس۔"

ایلس دوڑتی ہوئی اندر گئی۔ فوراً ایک بوتل دیسی شراب اور تین گلاس لے آئی۔ پہلے گلاس میں شراب ڈالی، پھر سوڈا۔ میری نے ایک گلاس سنگھ کو دیا۔ "بوائے اب پی لو" میری اور ایلس نے مسکراتے ہوئے گلاس کے ساتھ گلاس ٹکرائے۔ ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا، بجلی کی روشنی میں تینوں چہرے چمکے۔ اور میری اور ایلس نے گلاس خالی کر دیا۔

سنگھ ابھی تک ہاتھ میں گلاس پکڑے ہوئے تھا۔ "مین شرم کا بات نہیں۔ اگر تم شراب نہیں پئے گا تو فل مین کیسے بنے گا"

میری نے سنگھ کے ہاتھ سے گلاس لے لیا، پھر سنگھ کے منہ کو لگایا "تمھیں میری قسم"۔

سنگھ نے ایک گھونٹ لیا۔ بڑا کڑوا ذائقہ تھا۔ پھر دوسری بار منہ لگاتے ہی گلاس خالی کر دیا۔ "شاباش مین۔ اب تم لڑے گا۔ اب تم کانگو میں PEACE قائم کرے گا۔"

اور اسی طرح سنگھ دو تین پیگ پی گیا۔ زندگی میں پہلی بار شراب پی تھی۔ اس لیے شراب زیادہ چڑھی، رخسار تمتما اٹھے۔ سارے بدن میں خون لہریں مارنے لگا۔ ڈر اور خوف کا جذبہ غائب ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اداسی اور غم کی جگہ خوشبوؤں نے لے لی۔

میری اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ شراب کے نشے میں میری کی آنکھیں اور سُرخ ہو گئیں۔ ماتھے پر زلف لہرا گئی۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میری اس کے قریب سرک رہی تھی۔ ایلس نے اُٹھ کر ریکارڈ لگا دیا۔ راک اور رول کا ریکارڈ لیکتی مچلتی، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آرکسٹرا کی ایک دھن، جو دماغ سے زیادہ جسم پر اثر انداز ہوتی۔ جو انسان کو اچھلنے کودنے پر مجبور کرتی۔ دونوں لڑکیاں اپنی جگہ سے اُٹھیں اور راک رول کی دھن پر ناچنے لگیں۔ ان دونوں لڑکیوں کے جسم اُس دھن پر تھرکنے لگے۔ سنگھ کو شراب چڑھ گئی۔ وہ فطرتاً ہنگامی زندگی کا دلدادہ نہ تھا۔ اس لیے آگ کی تپش کو سینے میں دبائے وہ صوفے پر بیٹھا رہا۔ اس ناچ، موسیقی اور رنگ کی محفل کو دیکھتا رہا۔ جب ریکارڈ ایک بار ختم ہو جاتا تو لڑکیاں دوبارہ ریکارڈ لگا دیتیں۔ اور اپنے جسم کو ٹوسٹ دیتے ہوئے، تیزی سے بل کھاتی ہوئیں، اُس دھن پر تھرکتیں۔ اس تیز و تند روشنی میں دو جوان جسم اُس کی آنکھوں کے سامنے تھرک رہے تھے۔ ایک خاص انداز میں ایک خاص پوز میں۔ ایک خاص ڈھنگ میں۔ یہ دونوں جسم جذبے کی پوری شدت کے ساتھ دھن میں رچے ہوئے بل کھائے جا رہے تھے۔

اچانک میری اُس کی طرف لپکی اور اُسے کھینچ کر بیچ میں کھڑا کیا اور اُسے ناچنے کے لیے کہنے لگیں۔ سنگھ بے چارا کیا ناچتا۔ دونوں لڑکیاں اس کے اردگرد ناچنے لگیں۔ شراب اور چڑھ گئی۔ پھر دونوں تھک کر صوفے پر بیٹھ گئیں، سنگھ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

"مین ہم تم کو کل ناچ سکھائے گا۔"

اتنے میں ممی آئی اور کہا "کھانا تیار ہے۔"

تینوں ساتھ والے کمرے میں گئے اور ایک چھوٹی سی میز کے اردگرد بیٹھ گئے۔ کھانا کافی لذیذ تھا۔ سنگھ کی بھوک چمکی۔ اُس نے بغیر کسی شرم کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے سبھی لوگ خاموش رہے۔ صرف میری مُسکرا مسکرا کر اُس کی طرف

دیکھتی رہی۔ ایلس شراب کے نشے میں جھوم رہی تھی۔ ممی اُس کے آگے سے پلیٹ ہٹا کر کہنے لگی "ایلس اب جا کر سو جاؤ۔"

ایلس چپکے سے اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

سنگھ اور میری ڈرائنگ روم میں آئے۔

"سنگھ تم صوفے پر سو سکتے ہو۔ کیا میں جاؤں؟" وہ جانے کے لیے مڑی۔ پھر ایک قدم آگے بڑھی۔ دروازے کے قریب جا کر دونوں پردوں کو آپس میں ملا دیا۔ پھر سنگھ کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

"ہاے سنگھ! کس می"

سنگھ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

میری صوفے پر بیٹھ گئی۔ سنگھ کو اپنے قریب بٹھایا، اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے قریب لائی اور کانپتے ہوئے لبوں کو چوما۔ سنگھ کے ہاتھوں میں بلا کی سختی آگئی تھی۔ سنگھ کے رخسار تپ اُٹھے۔ سنگھ نے میری کی کمر کے گرد ہاتھ رکھا۔ میری نے اپنا جسم پتھر کی طرح سخت کر لیا۔

"مجھے چھوڑ دو" میری نے سنگھ کا ہاتھ اپنی کمر سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اُچک کر اُس سے الگ ہو گئی۔ "گڈ نائٹ مین"۔ اور پردے کو سرکا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میری کے چلے جانے کے بعد اُس کا سر گھومنے لگا۔ آنکھوں میں غنودگی سی چھا گئی اور وہ صوفے پر سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ کمرے میں دھندلی دھندلی سی روشنی تھی۔ سورج سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی دروازوں اور کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اُس نے اپنے آپ کو اپنے بستر پہ پایا۔ اچانک اُس کا ہاتھ نکر کی جیب میں گیا۔ بٹوہ اپنی جگہ پر تھا۔ اُس نے فوراً بٹوہ نکالا۔ اور نوٹ گنے۔ ایک نوٹ بھی کم نہ تھا۔ اُس بٹوے میں صرف ایک تصویر تھا۔ میری کی تصویر BATHING COSTUME میں۔ اس تصویر میں جسم کا ہر خط اُبھر آیا تھا۔ اور تصویر پر لکھا تھا۔ آئی لو یو ڈارلنگ۔ اُس کی زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اُسے تصویر دی تھی اور اُس پر اپنے ہاتھ سے پیار بھرا فقرہ لکھا تھا۔ جو کچھ اُس نے اُن لڑکیوں کے متعلق سوچا تھا۔ سب کچھ غلط نکلا۔ یہ دونوں لڑکیاں بے حد اچھی تھیں۔ کسی لڑکی نے اُسے دھوکا نہیں دیا۔ کون کہتا ہے کہ اس دنیا میں اچھے لوگ نہیں۔ یہ لوگ مجھے جانتے نہیں، مجھے دیکھتے ہی اپنے گھر لے آئے۔ مجھے کھانا کھلایا، شراب پلائی، میری نے سونے سے پہلے اس کا بوسہ لیا، کتنے شیریں ہونٹ تھے میری کے۔ اور پھر دونوں لڑکیوں نے راک اینڈ رول کی دھن پر ناچیں تھیں۔ میری کی مسکراہٹیں، اُس کی دلنواز ہنسی، اُس کے جسم کی گرمی، ایلس کی شوخی اور پھر اس قسم کی مہمان نوازی اس زندگی میں کہاں ملے گی۔ وہ ان سب کا کتنا شکر گزار تھا۔ اجنبی شہر میں ان لوگوں نے اُسے پناہ دی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا۔ سامنے سے میری ہاتھ میں چائے کی ایک پیالی پکڑے ہوئے داخل ہوئی اور اُس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ چائے کی پیالی سے ہلکی ہلکی بھاپ اُڑ رہی تھی۔ اور ریشمی زلفوں کی طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی اپنے ہاتھ میں لے لی اور دل سے ہر قسم کے شکوک و شبہات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ میری کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر وہ ایک عجیب سی مسرت محسوس کرنے لگا۔ یہ واقعی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ کوئی تصنع، بناوٹ نہیں، کوئی لالچ اور فریب نہیں۔ کوئی مانگ نہیں۔ اُس نے

میری کے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھا، جو اُس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے پہلی بار میری کے پاؤں کو دیکھا کتنے حسین اور متناسب تھے اُس کے پاؤں۔ ایڑیاں صاف شفاف، اُجلی اُجلی، پھر اُس نے میری کے چہرے پر نگاہ ڈالی بے حد سوئی ہوئی آنکھیں۔ پلکیں خلوص اور پیار سے رخساروں پر جھکی ہوئی اور کالے سیاہ بال۔ اس کے مضبوط اور توانا کندھوں پر بادلوں کی طرح جھکے ہوئے۔ گردن بے حد سپید سپید سی۔ جہاں بھورے بھورے سے بال لرز رہے تھے۔ "کیا دیکھ رہے ہو تین"؟

"تمہیں"

وہ اُس کے اور قریب آگئی۔ اور اس کی دائیں ٹانگ اُس کی بائیں ٹانگ کے ساتھ تھی۔ سنگھ میری کی گرم ٹانگ کی آنچ کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایسی خوشی سے ہمکنار ہو رہا تھا جو شاید اُس نے زندگی بھر محسوس نہ کی تھی۔ نرم نرم گوشت کا ہلکا ہلکا سا دباؤ۔ خون کی گرمی کی ہلکی ہلکی حدت۔ گرم گوشت کا ہلکا ہلکا سا نرم احساس، اس کی ٹانگوں کے بال، میری کے نرم بالوں سے اُلجھ گئے تھے۔ ایک خفیف سی بجلی کی لہر اس کے رگ و پے میں سما گئی۔ یہ نشہ عجیب و غریب سا تھا۔ شراب کا نشہ دل کے تار کو چھیڑتا ہوا اُسے ایک انجانی وادی میں پہنچا رہا تھا۔ ایک نرم اور گرم وادی میں۔ ایک خوابناک وادی میں۔ جہاں ریشم ہی ریشم تھا۔ جہاں نرمی کے گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ ایک شیلی غنودگی سی۔ جو اُس کے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ حاوی ہو رہی تھی — وہ چاہتا تھا کہ میری اُس کے قریب بیٹھی رہے۔ شاید زندگی بھر اُسے ایسا موقع نہ ملے۔ شاید وہ کانگو کے محاذ پر مارا جائے۔ اس لیے وہ اس وقت مشفق اور مہربان میری سے الگ نہ ہونا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں جتنے شک اور وسوسے تھے، اب سب ختم ہو گئے تھے۔ شک اور شبہات کی جگہ محبت نے لے لی۔ دل میں بہاروں کے شگوفے پھوٹ پڑے تھے۔

میری اپنی جگہ سے اُٹھی اور کہنے لگی "تک سنگھ جلدی نہا کر تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم باہر چلیں گے تمہیں بمبئی دکھائیں گے۔"

وہ جلدی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ سنگھ نے ناشتہ کیا اور تینوں ٹیکسی میں بیٹھ کر بمبئی دیکھنے چلے۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار سمندر دیکھا۔ گیٹ وے اوف انڈیا کے سامنے پانی کی وسیع چادر پہلی بار دیکھی تھی۔ ایک کے بعد دوسری آ رہی تھی۔ دُور جہاز لنگر انداز تھے اور بادلوں کے قافلے آسمان پر پرواز کر رہے تھے۔ کبھی کبھار بارش زور سے آتی کہ سر چھپانے سے پہلے ہی وہ بھیگ جاتے۔ میری نے آئس کریم کھانے کی فرمائش کی۔ میری نے آئس کریم کھاتے ہوئے اس کی کریم چھین لی۔ اور اپنی آئس کریم اُسے دے دی۔ جہاں کہیں وہ کھڑا ہوتا وہ اس کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی۔ جہاں وہ بیٹھتا۔ اُس کے قریب آکر بیٹھ جاتی اور پھر مسکرا مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتی۔ میری کی آنکھوں میں عجیب قسم کا نشہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا بلاوا تھا جس سے وہ آج تک نا آشنا تھا۔ گیٹ وے اوف انڈیا سے ہو کر میرین ڈرائیو کی طرف بڑھے۔ پھر چوپاٹی سے ہوتے ہوئے HANGING GARDEN میں پہنچے، وہاں تند و تیز ہوا پھولوں کو چومتی گزر رہی تھی۔ ہر پلاٹ میں رنگین پھول مہک رہے تھے اور ڈھلوان کے نیچے سمندر لہریں مار رہا تھا۔

دوپہر کو انھوں نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ اُس کے بعد ائیر کنڈیشن سینما میں تینوں نے ایک فلم دیکھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ شاید اس کے بعد بھی یہ حادثہ کبھی نہ ہو۔ وہ چند دنوں کا مہمان تھا۔ کل یا پرسوں گھر

چلا جائے گا۔ وہ میری اور ایلس کے قریب اتنا آچکا تھا کہ اُس کی ماں اور بہن ذہن کے دریچے سے بہت دُور کھڑی تھیں۔ فلم دیکھنے کے بعد وہ دونوں بہنوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ میری کے ہاتھ میں تھا۔ اور میری اس کے ہاتھ کو دبا رہی تھی۔ یہ گوشت پوست کی انگلیاں نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ یہ نرم نرم انگلیاں جو اُس کی طاقتور انگلیوں کے درمیان پیوست تھیں۔ زندگی کا ایک وحشی راگ گا رہی تھیں۔ اور وہ ایک بے سُدھ۔ شرابی کی طرح، اور ہی لذّت سے ہمکنار ہو رہا تھا۔

جب فلم ختم ہوئی تو ہال سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جہاں ٹکٹ بکتے ہیں، وہیں انہیں کھڑا رہنا پڑا۔ بہت سے لوگ وہیں کھڑے تھے۔ باہر جانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ میری اس کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ یہ اُس کی زندگی کا عجیب سا تجربہ تھا۔ میری اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ پہلے پیچھے کھڑی تھی۔ جب کسی نے دھکا دیا تو وہ آگے آکر کھڑی ہو گئی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ میری کے بال اس کے رخساروں سے کھیل رہے تھے۔ میری کے دونوں کندھے اُس کی جوان چھاتی سے ہمکنار تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے، دونوں ہاتھوں میں پسینہ آگیا تھا۔ دونوں کے دل کی دھڑکنیں تیز تر تھیں۔ آواز حلق میں اٹک گئی۔ اچانک بارش بند ہو گئی۔ تینوں باہر نکلے۔ شام ہو چکی تھی۔ میری اسے ایک دوکان میں لے گئی۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے لیے ایک بلاؤز کی فرمائش کی۔ ایلس نے اپنے لیے چپل کی مانگ کی۔ پھر میں نے آنکھیں مٹکا کر سنگھ کی طرف دیکھا جیسے وہ کچھ اور خریدنا چاہتی ہے۔ سامنے ایک نہایت خوش رنگ قسم کا کپڑا لٹک رہا تھا۔

"یہ میرے جسم پر کیسا رہے گا؟"

"بہت ہی عمدہ۔"

"تو پھر ایک پیس خرید لوں؟"

ایلس نے موتیوں کے ہار کی فرمائش کی۔ ہار بھی خرید کر دیا۔ جب دونوں چلنے لگیں۔

"ارے ممی کے لیے کچھ نہیں خریدا۔" میری چلائی۔

پھر ممی کے لیے کپڑے خریدے گئے۔ جب وہ اس دوکان سے باہر نکلے تو فوراً دونوں ایک اور دکان میں گھس گئیں۔ وہاں سے LIPTON چائے کا ایک ڈبہ خریدا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر اور VANISHING CREAM بھی خرید لی۔

"بس اب اور کچھ نہ خریدیں گے۔" میری چلائی اور اُس نے سنگھ کے ہاتھ کو دبایا۔ تینوں گھر کی طرف چل دیے۔

کھانا کھانے سے پہلے تینوں نے شراب پی۔ پھر راک اینڈ رول کا ڈانس کیا اور اس کے بعد ڈنر۔ ممی کپڑوں کو دیکھ کر پھولے نہ سمائی۔ آج ممی کے چہرے پر رونق تھی۔ اُس کی باتوں میں کرختگی اور اکھڑ پن نہ تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اُسے اُس پر یقین نہ آرہا تھا۔ پرماتما نے مرنے سے پہلے ہی جنت کے دروازے کھول دیے تھے۔ سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ بھی نہ ملا۔ کھانا کھانے کے بعد فوراً سنگھ کو نیند آگئی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ میری نے سونے سے پہلے اُس کے لبوں کو چوما تھا۔

اگلے دن ناشتہ کرنے کے بعد تینوں باہر نکل گئے۔ جو ہُو کو دیکھا۔ وہیں ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ پھر ایک انگریزی فلم دیکھی۔ باہر نکل کر ایک ریستوران میں کیک اور کافی پی۔ پھر دونوں بہنیں ایک اسٹور میں گھس گئیں۔ وہاں سے کلپ، ٹاپس، باڈی، نیل پالش، گلے کے لیے موتیوں کا ہار اور پھر بسکٹ کے ڈبے اور اسی طرح دیگر چیزیں خریدیں۔ ان سب کے

رام سنگھ کو دینے پڑے۔ تین دنوں سے وہی خرچہ کر رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کا سرمایہ ختم ہو رہا تھا۔ شام کو گھر آ کر میری نے اُس سے بیس روپے مانگے جو سنگھ نے اسے فوراً دے دیے۔ پھر دیسی شراب آگئی اور تینوں نے پی۔

شراب پی کر، پھر کھانا کھا کر، جلدی جلدی سنگھ اپنے کمرے میں آگیا۔ آج شراب زیادہ نہیں چڑھی تھی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ کیا کر رہا تھا؟ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ ان تین چار دنوں میں تین سو روپے خرچ ہو چکے تھے۔ صرف ایک سو کا نوٹ باقی تھا۔ اب وہ جالندھر نہیں جا سکتا۔ اُسے اپنے کئے پر افسوس سا ہونے لگا۔ مگر میری کی محبت اُس کے دل میں آ جاگزیں ہو گئی تھی۔ چار دن جو اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اگر ایک دن وہ اور ٹھہرا تو اس کی جیب بالکل خالی ہو جائے گی۔ مگر وہ کیا کرے؟ کوئی اُسے دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اُس سے پیسے نہیں مانگ رہا تھا۔ یہ ان کی ضروریاتِ زندگی تھیں، انھیں پورا کرنا اس کا فرض تھا۔ بیچاری لڑکیاں میری — میری تو کتنی خوبصورت ہے۔ کتنی اچھی ہے۔ 'یُو آر مائی ڈارلنگ' صرف میری، میری ہو۔ اتنے میں میری اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ شراب میں بدمست۔ وہ اتنا کیوں پیتی ہے۔ اُس نے سوچا۔ میری اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ان نگاہوں میں صرف شراب کی مستی نہ تھی۔ حُسن اور شباب اپنے پورے عروج پر تھا۔ دو آتشہ رنگ و روپ کا ایک خوبصورت مجسمہ۔ میری اس وقت بے حد اچھی لگی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ شاید بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھار بارش اور ہوا کا ملا جلا تھپیڑا، دروازے سے ٹکراتا اور پھر ایک شور بلند ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ شور کم ہو جاتا۔

وہ میری سے کیا کہے۔ شراب پی کر میری بھی اس سے کچھ نہیں کہتی۔ شراب پی کر زیادہ سنجیدہ اور متین ہو جاتی ہے۔ میری نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ناریل کے درخت کے اوپر چاند اٹک کر رہ گیا ہو۔ آج اس نے شراب تھوڑی پی تھی۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں ممی کام کر رہی تھی۔ ایلس اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھی۔ کیا یہ بلب فیوز (FUSE) نہیں ہو سکتا۔ اس وقت روشنی کتنی بُری لگتی ہے۔ اچانک روشنی ایک لمحے کے لیے ماندی پڑ گئی۔ اُس نے موقع پا کر میری کی پیشانی کو چوم لیا۔

"میں جاگ رہی ہوں سنگھ۔ تم سو کیوں نہیں جاتے۔ الوداع میرے سنگھ۔"

وہ اُٹھنے لگی۔ سنگھ نے اس کا ہاتھ کھینچ کر بٹھا لیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں" وہ رونی آواز میں بولا۔

"مجھے جانے دو" میری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جانے لگی۔ سنگھ نے اسے پھر پکڑ لیا۔

"مائی CHILD اب تم سو جاؤ۔"

سنگھ کو غصہ آیا۔ یہ کیا سمجھتی ہے؟ کیا میں بچہ ہوں۔ اُس نے میری کو زبردستی اپنی طرف گھسیٹا اور اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ میری کچھ نہ بولی۔

"سنگھ مجھے چھوڑ دو" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

وہ پھر اُسے پکڑنے کے لیے اُٹھا۔ میری نے اُسے ہلکا سا چانٹا مارا۔

"ڈونٹ بی سلی (DON'T BE SILLY) چپکے سے سو جاؤ۔" اور اپنی کمر کو ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہلکا سا چانٹا لگنے کے بعد اُسے اس بات کا احساس ہوا کہ جو کچھ اس نے کیا اسے نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ اپنے کئے پر نادم ہونے لگا۔ ہاں، اُسے کل یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

جب صبح ہوئی تو میری اُسی طرح چائے کی پیالی لے کر وارد ہوئی۔

"جو کچھ رات کو ہوا مجھے اُس کا بے حد افسوس ہے۔ شراب چڑھی ہوئی تھی نا۔ معاف کر دو سنگھ۔ آج نیشنل پارک چلیں گے پکنک کرنے۔" اس نے پھر پیار بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے گالوں پر رگڑا، پھر زور سے اُس کے بالوں کو کھینچا اور پھر ایک ہلکا سا بوسہ اس کے ہونٹوں کا لیا۔

باورچی خانے سے ممی کی آواز آئی۔ "میری ذرا اِدھر آنا۔"

میری چلی گئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد تینوں تیار ہو گئے۔ رات جو کچھ سنگھ نے سوچا تھا اُس پر عمل نہ کر سکا۔ دراصل وہ میری سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت میں تو بہت ہی ناجائز حرکتیں جائز ہوتی ہیں۔ نیشنل پارک جانے سے پہلے میری اور ایلس اُسے درزی کے پاس لے گئیں جہاں انھوں نے بلاؤز اور اسکرٹ سلنے کے لیے دیے تھے۔ سنگھ نے درزی کا بل ادا کیا۔ درزی کی دوکان پر میری اور ایلس کو دو تین لڑکیاں اور مل گئیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور سب لڑکیاں اٹھ کر باہر نکلیں۔

نیشنل پارک پہنچ کر جو کچھ اُس نے دیکھا شاید اُس کا اثر سنگھ پر نہ ہوتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس سارے گروپ میں پیسے خرچ کرنے کے لیے صرف وہی رہ گیا تھا۔ کھانا، پینا، چائے، بس کا کرایہ، ٹافیاں، پھل سب کچھ خریدنے کے لیے اس کی جیب خالی ہو رہی تھی۔ میری زیادہ تر اپنی سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہی۔ وہ اب سنگھ کے قریب نہ آئی۔ ایک عجیب قسم کی اُداسی اُس کے ذہن پر چھا گئی۔

واپسی پر میری اُس کے ساتھ بیٹھی اور پوچھنے لگی۔ "تم اُداس کیوں ہو؟"

وہ اُسے کیا بتاتا کہ وہ اُداس کیوں ہے؛ وہ خاموش رہا۔

جب تینوں گھر پہنچے تو دیکھا ڈرائنگ روم میں تین مرد شراب پی رہے تھے۔ تینوں نے میری اور ایلس کو دیکھا، پھر تینوں کی نگاہیں سنگھ پر جم گئیں۔ سنگھ نے پہلی بار ان تینوں مردوں کو میری کے مکان پر دیکھا تھا۔

ایک نے ایلس کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا۔ دوسرے نے اپنا شراب کا گلاس میری کو پیش کیا۔ میری شراب کو غٹ غٹ پی گئی اور پینے کے بعد میری مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگی۔

سنگھ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں یقین نہ کر رہی تھیں۔ وہ کیا کچھ دیکھ رہا تھا؟ یہ مرد کون تھے؟ اس سے پہلے کیوں نہیں آئے؟ آج ایلس اور میری نے اپنا رویّہ کیوں بدل لیا؟

ایک نے شراب کا گلاس سنگھ کو پیش کیا۔

سنگھ نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔

"غصے کو تھوک دو مین۔"

جس کے ساتھ میری بیٹھی ہوئی تھی، وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اور وہ ایک سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اپنا شراب کا گلاس میری کو پیش کر رہا تھا" اور ہیو اور ہیو میری" اُس نے میری کے شانے کو چومتے ہوئے کہا۔

اچانک سنگھ کا ہاتھ اُٹھا، اور اس نے آگے بڑھ کر اُس ادھیڑ عمر کے منہ پر ایک زور کا چانٹا رسید کیا۔ طمانچہ لگتے ہی تینوں سنگھ پر حملہ آور ہوئے۔ اور سنگھ کو مارنا پیٹنا شروع کیا۔ سنگھ اکیلا تھا وہ تین تھے۔ اس نے کافی مزاحمت کی مگر وہ تینوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چانٹے، مکے، لاتیں اُس پر برس رہی تھیں۔ نچلے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ اور اُس کا سر گھومنے لگا۔ وہ تینوں مل کر اُسے ہلاک کر دیں گے۔ وہ زندگی کی آخری سرحد پر کھڑا تھا۔ کوئی اُسے بچانے والا نہ تھا۔ زندگی میں اتنی بے رحمی کہاں سے آ گئی۔ میری کا بوڑھا عاشق سنگھ کے سر پر بوتل مارنے ہی والا تھا۔ میری نے سب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اچانک سنگھ کا سر چکرایا۔ اور وہ زمین پر گرا۔ جب اُسے ہوش آیا۔ اُس نے میری کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ سنگھ کے سامنے اُس کا سوٹ کیس اور بستر رکھا ہوا تھا۔ اس نے چپکے سے سوٹ کیس اور بستر اٹھایا اور سامان کو ٹیکسی میں رکھا۔ جب ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو اُس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا میری سامنے کھڑی تھی۔

"یہ لو پانچ روپے۔ سیدھے وکٹوریہ ٹرمنس چلے جاؤ۔ گاڈ بلس یو" اُس نے میری کی طرف دیکھا۔ میری کی آنکھوں میں کسی قسم کی کوئی نرمی نہ تھی۔ گزرے ہوئے دنوں کی محبت کا کوئی لمحہ باقی نہ تھا۔ وہ ایک پتھر کے بُت کی طرح اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے لب بھنچے ہوئے تھے آنکھوں اور چہرے سے وحشت اور کرختگی نمایاں تھی۔ شاید یہ میری نہ تھی کوئی اور لڑکی تھی۔ جب ٹیکسی چلنے لگی۔ تو سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گہری رات کے سناٹے میں اُسے صرف دو چہرے نظر آئے۔ ایک تھا اس کی ماں کا دوسرا اس کی بہن کا۔ جو ابھی تک اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

بے مصرف ہاتھ

جیلانی بانو

اللہ جانے میں رفّو پھوپو کی کہانی کب لکھ سکوں گی۔

بعض وقت جب میں کسی جذباتی لڑکی کی سنسنی خیز کہانی سُنتی ہوں، جب کوئی افسانہ نگار کسی معمولی سے واقعہ کو بڑے خوبصورت انداز میں لکھتا ہے تو مجھے اپنی بے بسی پر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ پھر خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی بھی آتی ہے۔ مجھ جیسے پاگلوں سے کون کہانیاں سُنے گا۔ پھر کہانی تو ہمیشہ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کے بارے میں لکھی جاتی ہے۔ بدصورت لڑکیوں کی تو کوئی کہانی نہیں ہوتی۔ کم سے کم ایسی لڑکی کی کہانی تو میں نے آج تک نہیں سُنی جس کے چہرے کی کھال اور گوشت غائب ہو۔ آنکھوں کی جگہ سُرخ گڑھے ہوں اور ٹھوڑی سے لے کر ناک تک کی ہڈیاں دکھائی دیں —— اوہ —— میں خود بھی اب رفّو پھوپو کو یاد کر کے لرز جاتی ہوں۔ یہی خوفناک صورتیں تو بچوں کو ڈرا کے پاگل بنا دیتی ہیں۔ سُنا ہے یہ چڑیلیں اپنے سحر سے انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔ پھر وہ آدمی زندگی بھر مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح تڑپتا رہتا ہے مگر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔

اگر میں بھی یہ کہانی لکھوں تو اپنے آپ کو ایسی مکھی لکھتے ہوئے کتنی شرم آئے گی۔ جاسوسی ناولوں کی ہیروئن بن کر مجھے کہنا پڑے گا کہ میں ایک سحر زدہ مکان میں رہتی تھی جس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ پھر وہاں مجھے ایک چڑیل نے دیکھا اور سو جان سے عاشق ہو گئی۔ سُنا ہے یہ چڑیلیں اپنے چاہنے والے کا کلیجہ چبا ڈالتی ہیں۔ وہ اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے۔

مینٹل ہاسپٹل کے اس بستر پر لیٹے لیٹے میں سوچ رہی ہوں کہ انھوں نے مجھے پاگل کیوں مشہور کر دیا —— اِ مجھے کون سی آگ جلا گئی —— میں کیوں راکھ بن گئی —— ! آخر میں اپنے بچے کو کیوں مارنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنا مُنّا بے مصرف کیوں نظر آتا ہے!

ٹھہریئے۔ میں ذرا اپنے آنسو پونچھ لوں۔

رفّو پھوپو کی کہانی لکھنے بیٹھی تو مجھے اپنی سُدھ بُدھ کہاں رہے گی۔ اگر ان سطروں پر کہیں ان کی نظر پڑ گئی تو —— اوہ نہیں چاہئے کہ اب میں رفّو پھوپو کا نام بھی اپنی زبان پر لاؤں اور آج میں اس سارے کاغذ پر صرف رفّو پھوپو کا نام ہی لکھے جاؤں گی۔

نہ جانے کہانیاں کیسے شروع کی جاتی ہیں۔ اب اس جھگڑے میں کون پڑے۔ کوئی نہ کوئی بات ہو گئی ہو گی۔ مجھے تو وہاں سے یاد ہے جب شادی کے بعد میں ان کے ساتھ پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔ انھوں نے میرے لیے حیثیت سے بڑھ کر بڑا خوبصورت سا مکان لیا تھا۔ اچھے سے اچھا فرنیچر خریدا اور ایک چھوڑ دو دو نوکر بھی رکھے تھے۔ ہم دونوں جیسی محبت میں سنے

آج کل کے تو کسی میاں بیوی میں نہیں دیکھی۔ ہمارے درمیان تو کوئی مول تول نہ ہوا۔ انھوں نے تو مجھے اپنی پلکوں پر بٹھا لیا تھا۔ لوگ محض الفاظ سے شاعری کرتے ہوں گے لیکن وہ تو سچ مچ میرے دل کی دھڑکن بنے بلکہ ہیں (آج جب وہ ڈاکٹر سے کہتے ہیں کہ میں نے ان کی اور منے کی جان لینے کی کوشش کی تھی) وہ اب بھی میری روح ہیں۔ میری زندگی ہیں۔ وہ دیکھتے تو کہ انھیں مارنے کے بعد کیا میں زندہ رہ سکتی تھی ——— ؛ وہ چاہے لوگوں سے کچھ کہتے پھریں لیکن وہ تو پھولوں میری زندگی نہیں تھیں۔ میری کچھ بھی نہیں تھیں۔ اگر وہ میری کچھ ہوتیں تو میں ان کے ساتھ کیوں نہ مرجاتی! یوں سلگ سلگ کر راکھ کیوں بنتی! تو خیر، آج کی بات چھوڑیئے۔ میں تو آپ کو اس دن کا قصہ سنا رہی تھی جب ہم "خود مختار منزل" کے اوپر والے پورشن میں آئے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ میں جا کر بالکنی میں کھڑی ہو گئی۔ نیچے مالک مکان کے گھر میں بچوں اور نوکروں کی چیخ پکار ہو رہی تھی اور سڑک پر انسانوں کا ہجوم بہہ رہا تھا پھر میری نگاہ اوپر اٹھ گئی جہاں وہ دو چاند مسکرا رہے تھے۔ ایک تو گیارہ تاریخ کا سہاگ رو چاند ہیں دیکھ دیکھ کر کھل اٹھا تھا اور اس کے قریب وہ کھڑے تھے۔ میں ان کی باہوں میں چھپ کر شرما گئی۔

"میرا چاند کہاں چھپ گیا ———!" انھوں نے جھک کر پوچھا۔

"اللہ کوئی مجھے بھی تو چاندنی میں لے جائے۔" نیچے کسی عورت نے بڑی مترنم آواز میں کہا۔ میں چونک پڑی۔

"نیچے مکان کے مالک رہتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ تمہارا دل بہلا رہے گا۔" انھوں نے اطمینان دلایا۔

"میں چاند کو نہ دیکھ سکوں مگر چاند تو مجھے دیکھ لے گا۔" وہی خوبصورت آواز کہے جا رہی تھی۔

"نیچے تو کوئی میرے چاند کو دیکھنا چاہتا ہے۔" انھوں نے مصنوعی خفگی سے کہا اور ہم دونوں بالکنی سے ہٹ آئے۔

جانے کیوں وہ بڑے تنگی مزاج ہیں۔ شادی کے بعد مہینوں انھیں یہی اندیشہ رہا کہ شادی سے پہلے میں کسی اور کو تو نہیں چاہتی تھی اور اب بھی جب میں ان کے ساتھ ہوتی تو وہ میرے چاروں طرف مجھے دیکھنے والوں کو دیکھتے۔ ہر عورت کی طرح مجھے بھی ان کی یہ بات بڑی اچھی لگتی۔ جانے کیوں ہم عورتوں کی تو یہ فطرت ہوتی ہے کہ ہم کسی کی نظروں میں سما کر سب کی نظروں سے چھپ جائیں۔

صبح مجھے معلوم ہوا کہ اس گھر کے بارے میں محلے والوں کی رائیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ "خود مختار منزل" کے رہنے والے واقعی اپنے دل کے بادشاہ تھے۔ ہماری ایک پڑوسن نے تو صبح ہی آ کر میرے کان بھرے کہ مالک مکان کی لڑکیوں سے ہوشیار رہنا۔ خوبصورت بلائیں ہیں چڑیلیں۔ ماشاء اللہ تمہارے میاں صورت شکل کے اچھے ہیں اور اس گھر میں مرنے جینے کے کھیل بہت ہوتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں نے زینے والا دروازہ بند کر دیا۔ سنا ہے مرد کی جوانی تو تیز ہوا میں کانپنے والا پتہ ہے۔ ذرا سی جنبش میں بہک جاتی ہے۔

پھر شام کو وہ بالکنی میں جانے لگے تو میں نے ان کا راستہ روک دیا۔

"آپ یہاں مت کھڑے ہونا۔ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔"

وہ ہنسنے لگے اور اس کے بعد انھوں نے پھر کبھی بالکنی کا رخ نہیں کیا۔

تیسرے دن کا ذکر ہے جب آفس جانے کے وقت میں ان کے سینے سے لگی کھڑی تھی کہ سیڑھیوں پر کسی نے دستک دی۔

وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ مالک مکان کی لڑکی تھی ساجدہ۔ بڑی خوبصورت سی، بڑی تیز طرار سی، بڑی فیشن ایبل سی، اسے دیکھتے ہی میں گھبرا گئی۔ عورت ذات اس معاملے میں بڑی سیانی ہوتی ہے۔ وہ آفس کی کنجیاں ڈھونڈنے لگے تو مجھے جانے کیوں غصہ آ گیا۔ آج ان کی آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا۔ سامنے پڑی چیز نظر نہیں آتی۔

وہ چلے گئے تو ساجدہ نے مجھ سے خوب باتیں کیں۔ جب گھڑی نے گیارہ بجائے ہیں تو اسے آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اتنی دیر میں ہم بے تکلفی اور دوستی کے میلوں لمبے فاصلے طے کر چکے تھے۔ اس نے اپنے بارے میں ہر بات بتا دی۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی اور مردوں سے کھیلنا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ آج کل اس نے ایک ہندو لڑکے کو پاگل بنا رکھا تھا۔ ان کا پورا خاندان بڑا جذباتی تھا اور رومانی حرکتیں کرنے میں وہ لوگ بڑے مشہور تھے۔ بڑی بہن ناجائز بچوں کو پالنے کے لیے ایک اسکول کھولنا چاہتی تھی اور اس کی خاطر وہ گھر بار چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ساجدہ کے ایک چچا ڈاکٹر تھے۔ ایک بار کوئی مریض ان کے آپریشن کی کسی خرابی سے مر گیا تو انھوں نے خود بھی خودکشی کر لی تھی۔ ساجدہ کا باپ کپڑے کا بہت بڑا تاجر تھا۔ اس مکان جیسے اس کے چار پانچ مکان شہر میں اور تھے۔ میں اسے چھوڑنے زینے تک گئی تو پھر کبھی آنے کی میں نے اسے دعوت نہ دی لیکن مجھے اس بات پر بڑا غصہ آیا کہ آخر اس نے مجھے اپنے گھر کیوں نہیں بلایا۔ میں چاہتی تھی نیچے اتر کے اس قصہ کہانیوں والے گھر کو دیکھوں۔ شام کو میں نے ان سے یہ بات کہی تو وہ خوب ہنسے۔

”تم خود ہی چلی جاؤ۔ تمہیں تو اپنی لینڈلیڈی سے ملنا چاہیے۔“

دوپہر کو میں نیچے گئی۔ زینہ ان کے صحن میں کھلتا تھا۔ ساجدہ کا گھر بڑا اچھا تھا۔ اتنے سلیقے سے سجے ہوئے گھر میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ جانے کتنے نوکر ہر طرف کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ دالان میں کرسی پر بیٹھی ایک خوبصورت سی ادھیڑ عمر کی خاتون نٹنگ کر رہی تھیں۔ میں سمجھ گئی وہ ساجدہ کی امی ہیں۔

میرے سلام کرنے پر وہ چونک پڑیں۔ سلائیاں ان کے ہاتھوں سے گر چکی تھیں۔ سب ہی گھبرا گئے اور یوں دیکھنے لگے جیسے میں نے چوری کرتے میں انھیں پکڑ لیا ہو۔

”ساجدہ کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا اور ساجدہ کی امی بدحواسی میں ساجدہ کو پکارنے لگیں۔

”کون آیا ہے —— !“ کسی نے بڑے نرم لہجہ میں پوچھا اور پردہ ہٹا کے باہر آ گیا۔

اسے دیکھ کر میں نے اپنی چیخ گلے میں گھونٹ لی۔ خوف کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ میرے سامنے ایک چڑیل کھڑی تھی۔ اس کا منہ شاید چیل کوؤں نے نوچ کھایا تھا۔ آنکھوں کی جگہ سرخ گڑھے تھے اور ناک سے لے کر ٹھوڑی تک کہیں گوشت اور کھال نہ تھی۔

”یہاں آئیے۔“ ساجدہ جلدی سے آئی اور اپنے ہاتھوں میں مجھے یوں سنبھال لیا جیسے میں گرنے والی ہوں۔ اس کی ماں نے بھی مجھے سہارا دیا۔ خوف کے مارے میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میرے پاؤں ساجدہ کے ساتھ جانے کو گھسٹ رہے تھے۔

”کیا اوپر والی کرایہ دار آئی ہیں —— ؟“ وہ چڑیل آگے بڑھنے لگی۔ ”مجھ کو ذرا میں بھی ان سے باتیں کر لوں گی۔“ وہ جانے کیسے

چل کر ہمارے کمرے میں چلی آئی۔

"یہ ہماری رفو پھوپو ہیں۔ کل میں ان کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی۔" ساجدہ نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔" ان کے منہ پر غلطی سے تیزاب گر گیا تھا اس کی وجہ سے سارا چہرہ جل گیا ہے۔"

یہ سن کر میں کچھ حواسوں میں آئی۔

"اسی لیئے تو ہم کسی کو اپنے گھر نہیں بلاتے۔ آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا ہے —— ؟" ساجدہ اور اس کی ماں شرمندہ ہو رہی تھیں اور ساجدہ مجھ سے چھپ کر اپنے آنسو پونچھنا چاہتی تھی۔

"پرسوں رات آپ ہی ہمارے صحن میں اُجالا پھیلا رہی تھیں —— ؟" بغیر ہونٹوں کی ملتی ہوئی ہنسی دیکھ کر ٹھنڈے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

جواب کا انتظار کیے بغیر انھوں نے پھر پوچھا۔" میری صورت دیکھ کر آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا ہے —— ؟"

"جی نہیں۔" میں نے نہایت مری ہوئی آواز میں کہا۔ یوں جیسے ماں کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر بچے جھوٹ۔ نہ بولنے کا اقرار کریں۔

اب میں نے ذرا اطمینان کی سانس لے کر اسے دیکھا۔ اس کے سیاہ بال اور سڈول جسم پچیس تیس برس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ گلابی گلابی سی رنگت تھی اور ہاتھ تو اتنے خوبصورت تھے کہ میں انھیں دیکھے گئی۔ ایسے گلابی سڈول ہاتھ صرف چغتائی کی تصویروں میں نظر آسکتے ہیں۔ تو شاید کل یہی آواز چاندنی میں نہانا چاہتی تھی۔

"آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں —— ؟" انھوں نے پھر پوچھا تو ساجدہ کی امی نے میرے کان میں کہا ——

"معاف کیجئے۔ آپ اس دروازے سے اوپر چلی جائیے ورنہ رفّو آپ کی جان کھا لے گی۔"

اور اب میں سوچتی ہوں کہ میں اس دروازے سے باہر کیوں نہ چلی گئی۔ آخر رفّو نے میری جان کھا لی۔ بعض وقت ذرا سی کاہلی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے! شاید یہ "خود مختار منزل" کا سحر تھا۔ شاید اس گھر میں کوئی ایسی خوشبو ضرور پھیلی تھی کہ انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ جبھی تو رفّو پھوپو کی اس خوفناک صورت میں جانے مجھے کون سی کشش نظر آئی کہ میں وہاں بیٹھی تھی۔

"بھابی جان اکیا۔ بہت خوبصورت ہیں —— ؟" آخر وہ میرے پاس آبیٹھیں۔

"ہاں! ماشااللہ بڑی پیاری سی صورت ہے۔" ساجدہ کی امی نے پھر سلائیاں اٹھا لیں۔

"جبھی تو ——" انھوں نے اپنے گلابی ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔" جبھی تو ہماری چھت پر آج کل چاندنی اتنی دمکتی ہے۔" شاید وہ ہنس رہی تھیں۔ بغیر ہونٹوں کی خوفناک ہنسی۔ میں شرما گئی۔ ہائے اللہ یہ لوگ ہماری سب حرکتیں دیکھتے ہیں۔ ساری باتیں سنتے ہیں۔

"مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔" وہ میرے اور قریب سرک آئیں اور بڑی محبت سے میرا سانولا ہاتھ اپنے گلابی ملائم ہاتھوں میں تھام لیا۔

"مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جب کسی میاں بیوی میں اتنی گہری محبت ہو۔ جب آسمان کا چاند کسی کو زمین پر مل جائے تو عورت کو پھر کیا چاہیے؟"

وہ جانے کیا کیا باتیں کر رہی تھیں۔ جلدی جلدی، ہنس ہنس کے، رُک رُک کر، ٹھنڈی سانسیں بھر کے اور خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں، جانے کیوں میرے دل میں ان کا احترام بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے لوگ دنیا میں کتنے کم ہیں جن کا چہرہ جل جائے اور دل سیاہ نہ پڑے۔

پھر انھوں نے چائے منگوائی۔ الماری سے پھل نکال کر لائیں۔ پنکھا کھولا، بالکل اسی طرح چلتی پھرتی رہیں جیسے آنکھوں والے کام کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ لاٹھی تھامے بغیر وہ کیسے چلتی ہیں۔ آخر میں پوچھ ہی بیٹھی۔ وہ پھر ہنس پڑیں۔

"مجھے اس گھر میں چلنے کی عادت ہے۔ اسی گھر میں تو میں پیدا ہوئی تھی۔ اکیس برس تک میں نے دونوں آنکھوں سے اس دنیا کو خوب دیکھ لیا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اب بھی ہر چیز نظر آتی ہے۔ میں نے تو صرف ایک شکل نہ دیکھنے کے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں"

رفو پھوپو کے اوپر مجھے کئی پردے لٹکتے دکھائی دیے۔ کون جانے اندر وہ کہاں چھپی بیٹھی ہیں۔

تین گھنٹے بعد وہ بڑی مشکل سے مجھے اجازت دینے پر آمادہ ہوئیں۔ چلتے وقت مجھے یوں لگے لگا جیسے میں ان کی سگی بہن ہوں اور برسوں کے لیے بچھڑ رہی ہوں۔

"پھر کب آؤ گی ———؟"

"کسی بھی دن" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں۔ ہم تو کل دوپہر کھانے پر تمھارا انتظار کریں گے" انھوں نے میری ساری کا پلو تھام لیا "تمھاری ساری کتنی مہک رہی ہے"

"یہ سینٹ انھوں نے لا کر دیا ہے" میں نے شرما کر کہا۔

"نہیں۔ ہم سے مت چھپاؤ یہ تو کسی کے پیار کی خوشبو ہے" ان کی ہنسی پھیل گئی۔

"آپ کو اس خوشبو کی بڑی پہچان ہے۔ پھر تو ہم بھی آپ کا دوپٹہ سونگھیں گے" میں نے ان کا دوپٹہ تھامنا چاہا تو وہ پیچھے ہٹ گئیں۔

"ہم سے ایسا مذاق مت کرنا ورنہ ہم خفا ہو جائیں گے"

گھر آنے کے بعد میں نے وہ ساری اتار پھینکی جسے رفو پھوپو نے چھوا تھا۔ اپنے ہاتھ خوب رگڑ رگڑ کے دھوئے اور میرا جی چاہا کسی طرح قے کر کے وہ چائے اور سیب نکال دوں جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے کھلائے تھے۔

پھر میں رفو پھوپو کے بارے میں سوچتی رہی۔ سنا ہے مرد جذبۂ رقابت میں ایسی آوارہ عورتوں پر تیزاب پھینک دیتے ہیں، ان کی ناک کاٹ دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی بھر اس بے وفائی کی نشانی اپنے چہرے پر لیے پھریں۔ مگر جلانے والے نے رفو کے ہاتھ کیوں چھوڑ دیے۔ ان کے ہاتھ بھی تو بڑے خوبصورت ہیں۔ کتنے گرم اور ملائم ——— توبہ ——— میں نے اپنے ہاتھ مسہری پر رگڑ ڈالے۔

شام کو وہ آفس سے آئے تو میں دن بھر کی کتھا انھیں سنانے کو بے قرار بیٹھی تھی۔

"ایسی آوارہ لڑکیوں کا تو یہی حشر ہوتا ہے" وہ لاپروائی سے بولے "اچھا ہے اب اس گھر کی دلچسپ کہانیوں میں تمھارا وقت خوب کٹے گا"

دوسرے دن شام کو میں ان کے ساتھ پکچر دیکھنے جا رہی تھی کہ زینے میں ساجدہ مل گئی "کل آپ نے خوب انتظار دکھایا۔ رفو پھوپو نے تو کل سے کھانا نہیں کھایا ہے"

"واقعی ———!" میں شرمندہ ہو گئی اور انھیں باہر ٹھہرا کے ساجدہ کے ہاں چلی گئی۔

ساجدہ کی امی نے میرے سلام کے جواب میں چاند سے بیٹے کی دعائیں دیں اور میری آواز سن کر رقّو پھوپو پلنگ سے اٹھ بیٹھیں۔
"اچھا تو آ گئیں ——— ! کل تو اپنے میاں کی صورت دیکھ کر تم اس نکٹی چڑیل کو بھول ہی گئیں۔"
"اس کا تو دماغ چل گیا ہے۔" ساجدہ کی امی نے میری پشیمانی دیکھ کر کہا۔ "میں نے کل لاکھ سمجھایا کہ تم کھانا کھا لو شاید انھیں یاد نہ رہا ہو، مگر یہ ایک سرپھری ٹھہری۔ کل سے بھوکی پڑی ہے۔"
"مجھے واقعی بڑی شرمندگی ہے۔ آپ کل سے میری خاطر بھوکی ہیں۔" میں نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔
"نہیں۔ بس یوں ہی میں نے کھانا نہیں کھایا ——" وہ لاپروائی سے بولیں۔ "تم جانے کیوں مجھے بہت پسند آ گئی ہو اور مجھ موئی کی یہ عادت ہے کہ ہمیں جو اچھا لگے ہم اسی کے ہیں یا پھر کسی کے نہیں۔ کل سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں تمھیں ایک منٹ کو نہ چھوڑوں۔ کل میں نے اپنے ہاتھ سے تمھارے لیے کلیجی پکائی تھی۔"
"تو آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا۔" میں نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔
"نہیں، اس کی کیا ضرورت تھی ——" وہ شدّتِ اضطراب میں کانپ رہی تھیں۔ "جو بات دل سے اُتر جائے اسے یاد دلانے سے کیا فائدہ ——!"
پھر مجھے جانے کیا ہوا۔ جانے کونسی آنچ تھی جس میں میری ساری نفرت اور خوف پگھل گیا اور میں نے جلدی سے رقّو پھوپو کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ مجھ سے چمٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سُرخ گڑھے گہرے سُرخ ہو رہے تھے۔ بغیر آنکھوں کے آنسو بہانا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔
ان کا دُکھ دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ ہمارے ساتھ ساجدہ اور اس کی ماں بھی آنسو پونچھ رہی تھیں۔
پھر ہم میز پر بیٹھ گئے۔ کل کی باسی کلیجی کے نوالے انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے کھلائے۔ اس کے بعد امرود کا وہ کچالو کھلایا جو انھوں نے خود بنایا تھا۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ کا بنا ہوا پان کھایا۔
سات بجے شام کو جب میں بڑی مشکل سے دوسرے دن دوپہر کو آنے کا وعدہ کر کے اُوپر آئی تو وہ سُوٹ اور جوتوں سمیت مسہری پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے غصّہ کے مارے منہ پھیر لیا اور میں سن ہو کر رہ گئی۔
رقّو پھوپو کے پاس بیٹھ کر مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں ان کے ساتھ پکچر دیکھنے نکلی تھی۔
میں نے انھیں ہزار طرح سے منایا مگر وہ طعنے دیتے رہے۔
"میں تو اسی قابل ہوں کہ تم اس نکٹی چڑیل کو دیکھ کر مجھے بھول جاؤ۔ اچھا ہوا تم محبت کی بھوکی تھیں وہاں تمھیں اپنے قدردان مل گئے۔"

اب میں سخت الجھن میں تھی کہ رقّو پھوپو کے بارے میں انھیں کیسے سمجھاؤں۔ اس دن سے آج تک میری یہ الجھن باقی ہے۔ جانے کیوں انھیں رقّو پھوپو سے بیر بڑھتا گیا اور میں ان کے چوری چھپے یوں نیچے جاتی جیسے ان کی غیر موجودگی میں اپنے کسی عاشق کے پاس جا رہی ہوں۔
مجھے دیکھ کر ساجدہ کی امی کہتیں: "رقّو نامراد کو تم کیا ملی ہو جیسے آنکھوں کی روشنی مل گئی ہے۔ سارا دن تمھارا ذکر کرتی ہے۔"

تمھارے لیے کھانے پکوائی ہے۔"

میری آواز سنتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آتیں۔ کئی بار وہ راستے میں رکھے ہوئے اگالدان، میز یا کرسی سے ٹکرا کے گر پڑیں۔ گھٹنے زخمی ہو گئے یا کہنیاں چھل گئیں مگر وہ گھٹنے سہلا کر مجھ سے لپٹ جاتیں۔

"تم کہاں ہو، یہ تو میں تمھاری خوشبو سے پہچان لیتی ہوں۔"

"میں تو کوئی خوشبو نہیں لگاتی رفو پھوپو! آپ جانے کیسے مجھے سونگھ لیتی ہیں۔"

"تم یہ باتیں نہیں سمجھو گی۔" انھوں نے آہ بھر کے کہا۔ "میں تو ہر وقت تمھیں دیکھتی رہتی ہوں۔"

"مگر رفو پھوپو میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ آپ مجھے دیکھتیں تو ریجکٹ کر دیتیں۔"

"نہیں تم بہت پیاری ہو۔" وہ میرے ہاتھ تھام لیتیں۔ "جبھی تو تمھارے میاں تمھیں اتنا چاہتے ہیں۔ مرد عورت کی شکل ہی تو دیکھ سکتے ہیں۔ روح میں جھانکنے کی فرصت کسے ملتی ہے۔" وہ بڑی فلاسفرین کر کہتیں۔

رفو پھوپو سے میری بڑھتی ہوئی دوستی ساجدہ کے ہاں بھی کسی کو پسند نہیں تھی۔ ان کی طرف جھکتے دیکھ کر اب ساجدہ بھی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی۔ ساجدہ کی اتی اٹھتے بیٹھتے رفو کو ڈانٹتیں۔

"تجھے تو دنیا میں اور کوئی کام نہیں رہا۔ مگر تو تری بچاری تو بیکار نہیں ہے۔"

کبھی یوں ہوتا کہ ان کے آفس سے آنے کا وقت ہو جاتا، میں گھر جانا چاہتی مگر رفو پھوپو میرے ہاتھ نہ چھوڑتیں۔ اب میں انھیں کیسے سمجھاتی کہ وہ میرے وہاں جانے پر کتنے خفا ہوتے ہیں۔ ایسے وقت پھر ساجدہ کی اتی اٹھتیں۔

"کم بخت نامراد بلا کی طرح چمٹ گئی ہے بچاری کی جان کو۔ وہ بھی تو گھر بار والی ہے۔ ہر وقت تیری وحشت ناک صورت کہاں تک تکے جائے۔"

پھر وہ زینے میں آکر مجھ سے معافی مانگتیں۔

"کیا کروں بیٹی! اللہ نے مجھے جانے کن گناہوں کی سزا دی ہے۔ کم بخت کو موت بھی تو نہیں آتی اسی لیے میں تو اپنے گھر میں کسی کو بلاتے ہوئے ڈرتی ہوں۔"

مجھے اور شرمندگی ہوتی۔ اب میں سب کو لاکھ یقین دلاتی کہ مجھے رفو پھوپو بہت پسند ہیں۔ میں ان کے پاس مجبوراً نہیں بیٹھتی مگر کوئی یقین نہ کرتا۔

گھر آتی تو وہ الگ خفا ہوتے۔ انھیں جانے کیوں رفو پھوپو اتنی بُری لگتی تھیں۔ اب تو وہ میری ساری لاپرواہیوں کا الزام رفو پھوپو پر رکھتے۔

"آپ تو یوں ان سے جلنے لگے ہیں جیسے وہ آپ کی رقیب ہوں۔" ایک دن میں ان سے لڑ پڑی۔

"اور نہیں تو کیا رقیب کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔" انھیں بھی غصہ آگیا۔ "میں خوب جانتا ہوں ایسی عورتوں کو۔ اب کوئی مرد تو اس کی صورت پر تھوکے گا نہیں اس لیے وہ تمھیں اپنے جال میں پھانس رہی ہے۔"

"آپ مجھے ایسی ذلیل عورت سمجھتے ہیں؟" بے بسی کے مارے میں رو پڑی۔

اس دن ہم دونوں خوب لڑے مگر یہ ہماری پہلی لڑائی تھی اس لیے انھوں نے مجھے فوراً منا لیا۔ میں نے اس دن رفو پھوپو سے کبھی نہ ملنے کی قسم کھائی تھی۔ آخر انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے اور وہ خود زبردستی مجھے زینے تک چھوڑنے آئے۔

مجھے ڈر تھا کہ تین دن تک نہ جانے سے رفو پھوپو نے اپنا جانے کیا حال کیا ہوگا۔ مجھ سے بہت خفا ہوں گی۔ مگر وہ حسبِ عادت اسی بے تابی سے میری طرف دوڑیں۔

"رفو پھوپو! میں تین دن نہ آسکی، بات یہ ہوئی کہ ——"

"اونہہ، بات کچھ بھی ہو ——" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔

"میں جانتی ہوں کہ کوئی مجھے آخر کیوں پسند کرے گا! تمھارے میاں بھی مجھ سے ملنے پر خفا ہوتے ہوں گے۔"

"نہیں اللہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔" میں حیران تھی کہ یہ بات انھیں کیسے معلوم ہوئی۔

"مجھے اتنا بے وقوف مت سمجھو نوری!" آج جانے کیوں وہ اتنی سنجیدہ ہو رہی تھیں۔ میں نے حماقت میں ہمیشہ چلتی ہواؤں کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔"

"رفو پھوپو! مجھے معاف کر دیجیے۔" میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"معافی کاہے کی چندا ——" لوگوں نے بڑے پیار سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کیا میں یہ بات نہیں جانتی کہ تمھارے میاں کیا چاہتے ہوں گے۔ مجھے تم اسی لیے تو اچھی لگتی ہو کہ کوئی تمھیں اتنا چاہتا ہے۔"

"رفو پھوپو ——" میں جانے کیوں چلّا پڑی۔ "وہ کون ظالم تھا جس نے تیزاب پھینک کر آپ کی دنیا جلا ڈالی۔" میری آنکھوں میں سچ مچ آنسو آگئے۔

"پاگل، تم سے یہ غلط بات کس نے کہی کہ کسی نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں نے تو خود اپنی آنکھیں پھوڑی ہیں۔"

"سچ ——" میں اچھل پڑی۔

"ہاں —— !" ان کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ "تم ذرا سوچو کہ جو ہماری جان بھی ہو اور روح بھی، جس کی محبت پر ہمیں اپنے وجود کی طرح یقین ہو وہ اچانک بدل جائے تو —— تو ——" ان کی آنکھوں کے گڑھوں سے جیسے خون ٹپکنے والا تھا —— "نجم میری آنکھوں میں بار بار جھانکتا تھا —— رفو! کیا بات ہے تمھاری آنکھوں کے اندر میں ہی میں نظر آتا ہوں؟ —— اس کی یہ بات سن کر میرا جی چاہتا تھا اپنی آنکھیں کس کے بند کر لوں، کہیں نجم پھسل نہ جائے —— اور پھر وہ نجم مجھ سے بدل گیا۔ ایک کروڑپتی کی دولت نے اسے کھینچ لیا۔ مجھے لوگوں کے کہنے پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ پھر اس نے خود مجھ سے کہا کہ ابّا جان زبردستی ایک لڑکی میرے سر منڈھ رہے ہیں۔ یہ سن کر میں چپ رہی۔ میں نے اس کی دلہن کے کپڑے خود سیے، رات رات بھر جاگ کر آنگن میں گیت گائے۔ جو چیز ہماری نہیں رہی اس کے لیے کیوں روئیں۔ پھر دروازے پر وہ شہنائیاں گونج اٹھیں جو ہمیشہ سے میرے کانوں میں بسی ہوئی تھیں۔ میں نے کتنے ہزار بار یہ خواب دیکھا تھا کہ گھر روشنیوں سے جگمگا رہا ہے آنگن میں میراثنیں گا رہی ہیں اور نجم کی بہنیں اپنے جگمگاتے دوپٹے اس کے سہرے پر ڈالے اسے مسند کی طرف لا رہی ہیں۔ پھر کوئی زور سے چلّایا: "نجم کی دلہن کہاں ہے ——؟" اور میں پان بناتے بناتے رک گئی۔ اس کے بعد میں اپنے گھر کی طرف

تیزی سے بھاگی۔ پھر سب مجھے ڈھونڈنے نکلے کہ میں نجم کی دلہن دیکھوں۔ نجم خود آیا۔
"میں تمھاری دلہن کو اس لیے نہیں دیکھوں گی کہ اس نے کہیں میری آنکھیں دیکھ لیں تو۔۔۔۔ "
یہ سن کر نجم چلا گیا مگر اس کی دلہن خود اندر آ گئی۔ میں گھبرا کے بھائی جان کی ڈسپنسری میں بھاگی اور تیزاب کی بوتل اپنے چہرے پر انڈیل لی۔"

اُفوہ۔۔۔ مجھے کس قدر سکون ہوا ہے اس دن۔۔۔۔" رفو پھوپو نے اطمینان سے کہا۔" جیسے میری جلتی ہوئی آنکھوں پر کسی نے برف کی ڈلیاں رکھ دیں۔ جیسے کلیجے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔
"مگر رفو پھوپو! آنکھیں اتنی سستی تو نہیں ہوتیں کہ ایک شخص کے لیے بند کر لی جائیں۔" میں آخر پوچھ بیٹھی۔
"مجھے آنکھیں جلانے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی چندا۔۔۔" انھوں نے بڑی محبت سے میرے ہاتھ تھام لیے" میں اب بھی اپنا ہر کام کر لیتی ہوں، اور پھر وہ آنکھیں میری کہاں رہی تھیں جن میں نجم بسا ہوا تھا۔"
میں نے ان کے ٹھنڈے سفید ہاتھ پکڑ لیے۔
"جانے نجم صاحب آپ کے ہاتھ کیسے بھول سکے ہوں گے۔ سچی رفو پھوپو! میں تو آپ کے ہاتھوں پر مرتی ہوں۔"
"ہائے اللہ! یوں نہ کہو بھئی۔" وہ خوش ہو گئیں۔" کہیں میں یہ ہاتھ تمھیں نہ دے دوں۔"
پھر ہم دونوں ہنس پڑے۔
"اب ان ہاتھوں کو کبھی مت چھوڑنا ورنہ یہ بھی بے مصرف ہو جائیں گے۔"
اس دن ہم خوب ہنسے ہنسے۔ رفو پھوپو کے دل سے بھی جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا اور وہ بہت خوش تھیں۔ ساجدہ اور اس کی امی بھی اس دن ہمارے پاس آ بیٹھیں۔ وہ دورے پر تھے اس لیے دن بھر ہم نے خوب لطیفے سنائے۔ ساجدہ کی امی نے پوریاں بنائیں اور رفو پھوپو نے خود فروٹ سلاد بنایا۔
وہ میرے لیے خود کھانا پکاتی تھیں چاہے کتنی ہی بار ہاتھ جلے۔ خود کپڑے خرید کر میرے لیے سلوائیں، میرے لیے تحفے بھیجتیں تو وہ اٹھا کر پھینک دیتے۔ رفو پھوپو کی لمبی لمبی سنا کر میں نے کتنا چاہا کہ ان کے دل میں رفو پھوپو کے لیے رحم جاگے مگر ان کا دل اور پتھر بن گیا۔ میں نیچے جاتی تو وہ میرا راستہ روک لیتے۔ پھر ایک دن انھوں نے کہا کہ اب ہم دوسرے مکان میں چلے جائیں گے۔ ان کی خود غرضی پر میں بھنا اٹھی۔ رفو پھوپو کو مجھ سے دور کر کے انھیں کیا ملے گا۔ میرا جی چاہا کہ ان سے خوب لڑوں۔ مگر عشقِ مصلحت آمیز نے مجھے صبر کرنا سکھا دیا تھا۔
اس دن رفو پھوپو کا اندھاپن میرے آنسو نہ دیکھ سکا، جب میں نے انھیں گھر بدلنے کی خبر سنائی۔
"یہاں تمھیں کیا تکلیف ہے؟" انھوں نے اداس لہجے میں پوچھا۔" اگر کرایہ زیادہ ہے تو میں بھائی جان سے کہہ کر کم کروا دوں گی۔"
"نہیں یہ بات ہے کہ ان کا آفس دور چلا گیا ہے اس لیے ہم وہیں رہیں گے۔"
"اچھا۔۔۔۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گئیں۔" جب تم نہیں آتی تھیں تو تمھاری آواز سن کر خوش ہو لیتی تھی۔"

"میں وہاں سے بھی آپ کے پاس آیا کروں گی۔" پھر میں رونے لگی اور یہ دیکھ کر میرے آنسو اور بہنے لگے کہ رفو پھوپو رونا چاہتی تھیں مگر رو بھی نہ سکتی تھیں۔

اب میں کبھی کبھار ان سے چھپ کر رفو پھوپو سے ملنے آجاتی تھی۔ ان دنوں مجھے متلی چکر شروع ہوا۔ رفو پھوپو نے یہ خبر سنی تو بس کھل اٹھیں۔

"نوری! اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے بینائی مل جائے۔ میں اپنے بیٹے کو دیکھ لوں۔"

وہ مجھے روز کھٹی میٹھی چیزیں پکا کر بھیجتی تھیں۔ انھوں نے ساجدہ سے بہت سے چھوٹے چھوٹے کپڑے سلوائے تھے۔ میری آواز سنتے ہی وہ کوئی لوری گانے لگتیں۔ پھر مجھے گلے لگا کر پیار کرتیں۔ انھیں ہنسی آتے چلی جاتی۔

پھر ایک دن انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"نوری! تمھیں یاد ہے نا میں نے اپنے ہاتھ تمھیں دے دیے ہیں ـــــ؛ تو بھئی ان کا مصرف یہ ہوگا کہ تمھارا بچہ پالیں گے۔ تم اس کے لیے آیا مت رکھنا۔ مجھے اپنے گھر میں رکھ چھوڑنا۔"

"ہائے رفو پھوپو! ایسا نہ کہئے۔" میں واقعی سہم گئی کیونکہ ایسی خوفناک صورت والی اندھی سے وہ اپنا بچہ کیوں پلوائے۔ آج کل تو وہ مجھ سے اور بھی خفا رہنے لگے تھے۔ رفو پھوپو ہمارے گھر سے اتنی دور تھیں۔ پھر بھی وہ ہر وقت ہمارے گھر پر چھائی رہتیں۔ اب وہ مجھ سے سیدھی طرح بات بھی نہ کرتے۔ آفس سے اچانک بے وقت لوٹ آتے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ میں گھر میں ہوں یا رفو پھوپو کے ہاں۔

کبھی کبھی میں سوچتی کہ بس اب رفو پھوپو سے میری دوستی ختم۔ میں اپنا گھر کیوں جلاؤں۔ وہ مجھ سے دور ہٹتے جا رہے تھے راتوں کو وہ دیر سے گھر آتے۔ میرے ساتھ کبھی کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔

پھر ایک دن رفو پھوپو کے تقاضوں سے تنگ آکر میں ان کے ہاں گئی تو بس ان سے الجھ پڑی۔

"میں آخر اپنے میاں کا بھی کچھ خیال کروں یا دن رات آپ ہی کے پاس بیٹھی رہوں۔ وہ میری لاپرواہیوں سے کتنے اداس رہنے لگے ہیں۔"

یہ سن کر رفو پھوپو خلافِ توقع کھل اٹھیں۔

"اللہ تم دونوں کی محبت قائم رکھے۔ میں اب کبھی تمھیں نہیں بلاؤں گی۔ بس اب میں اپنے بیٹے کو پیار کرنے خود ہی آؤں گی۔"

ان کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔

آخر میں ہار گئی۔ رفو پھوپو تو کانٹوں بھری جھاڑی بن کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ ایک طرف سے چھڑاتی تو دوسری طرف سے گھیر لیتیں۔

پھر میری طبیعت خراب ہوئی۔ جس وقت میں ہاسپٹل جا رہی تھی تو وہ بار بار آنکھیں مل رہے تھے۔ ان کی اُداس صورت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ میں اپنی تکلیف بھول گئی۔ آج کتنے دنوں کے بعد میں نے اپنے لیے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ منا پیدا ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ میرے پاس آ بیٹھے جیسے انھیں مجھ سے کوئی شکایت ہی نہ رہی ہو۔

منّے کو لے کر جب ہم گھر آئے تو میں نے ان سے ایک ہی التجا کی اور انھوں نے میری بات مان لی۔ آج تو وہ میری ساری خطائیں معاف کر چکے تھے۔ مجھے منہ مانگا انعام دے سکتے تھے۔

پھر وہ خود رفو پھوپو کو لانے ان کے ہاں گئے۔ ان کا ہاتھ پکڑ کے خود سیڑھیاں چڑھائیں اور جھولے میں سے بچہ اٹھا کے ان کی گود میں دیا۔

"یہ لیجئے یہ ہے ہمارا منّا۔"

"آپ کا منّا نہیں یہ تو میرا بچہ ہے۔" رفو پھوپو نے اسے اپنے سینے سے چمٹا کر کہا۔ "اسے میں پالوں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ——!" اچانک جانے کیوں انھیں غصہ آ گیا۔ "بھلا آپ بچے کو کیسے پال سکتی ہیں — انہیں صاحب میں اپنے بچے کے بارے میں اتنا جذباتی بننے کو تیار نہیں ہوں۔"

رفو پھوپو نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اپنے ہاتھ مروڑنے لگیں۔ میں بھی تڑپ کر رہ گئی۔ بھلا کوئی یوں بے مروتی سے جواب دیتا ہے۔

رفو پھوپو نے آہستہ سے بچہ مجھے دے دیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ کمرے میں بڑی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بے حد غصہ میں کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ پھر اچانک رفو پھوپو کی چیخ سن کر میں اچھل پڑی۔ وہ بُری طرح تڑپ رہی تھیں اور ان کے دونوں ہاتھ کرسی کے بیچ میں پھنس گئے تھے۔ ہم دونوں نے بڑی مشکل سے کھینچ کھینچ کر ان کے ہاتھ نکالے جو کہنیوں کے پاس سے ٹوٹ کے مڑ گئے تھے اور ساری کرسی خون سے رنگ چکی تھی۔

"رفو پھوپو! یہ آپ نے کیا کیا ——" میں غم کے مارے پاگل ہو گئی۔

"میں بے مصرف چیزوں کو اپنے پاس نہیں رکھتی۔" انھوں نے آہستہ سے کہا اور خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد مجھے جانے کیا ہوا کہ میں منّے کا گلا دبانے دوڑی۔ میرا بس چلتا تو میں منّے اور اس کے ابا دونوں کو ختم کر ڈالتی۔ دنیا سے ساری بے مصرف چیزوں کو مٹا ڈالتی۔

لیکن میری کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں سلاخوں کے پیچھے بستر پر لیٹی میں مُنّے کا انتظار کرتی ہوں۔ وہ کتنے بے درد ہیں کہ مجھے اس اندھیرے کمرے میں بند کر گئے ہیں۔ یہاں بیٹھی میں سوچتی ہوں کہ اپنے بے مصرف ہاتھوں سے میں رفو پھوپو کی کہانی ہی لکھ لیتی۔

پتھیرا

صادق حسین

اُس کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ بھٹوں کے مالک، راج مزدور، گاڑی بان، کیپ بھرنے والے، سب کے سب اُسے پتھیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ اینٹیں پاتھتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اُس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی۔ اُس کا بدن چلچلاتی دھوپ میں تانبا بن گیا تھا۔ اور اُس کے تانبے کے مضبوط ہاتھ حیرت انگیز تیزی سے مٹی کو پانی میں سوند سکتے تھے۔ اُس کی انگلیاں کمال پھرتی سے گندھی ہوئی مٹی کو آہنی سانچے میں ڈال کر کچی اینٹوں کی تخلیق کر سکتی تھیں۔ مٹی اور پانی۔ ان دو عناصر کے مزاج کو وہ اُتنا ہی پہچانتا تھا جتنا کہ بیگم جان اُس کے پیار، غصّے اور بھوک کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے تو وہ جیٹھ کی گرمی میں بھی ٹھیک وقت پر کھانا لے کر برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچ جاتی تھی۔ سر پہ اینڈوا، اُس پہ لسّی کی ہنڈیا اور روٹیوں کی پوٹلی۔ اس انداز میں بیگم جان کا قد اور بھی لانبا معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی بیگم جان نے برگد کی گھنی چھاؤں میں پہنچ کر اُس میدان کی طرف دیکھا جو زمین کی سطح سے نیچا تھا۔ جہاں پسینے میں شرابور مرد عورتوں کے جوڑے اپنے اپنے کام میں منہمک تھے۔ عورتیں گندھی ہوئی مٹی کے بچھے تلے لوندے بنا رہی تھیں۔ مرد آہنی سانچوں کو پلٹ پلٹ کر اینٹیں نکال رہے تھے۔ اگرچہ پیشے کی رُو سے اُن عورتوں کو پتھیرنیں اور مردوں کو پتھیرے کہنا مناسب تھا، تاہم اُن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نام تھا۔ صرف ایک چوڑے چکلے سینے والے نوجوان کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اُسے ہر شخص پتھیرا کہہ کر پکارتا تھا۔ آج بھی وہ نوجوان چار ہاتھوں کا کام دو ہاتھوں سے کر رہا تھا۔ چند ماہ پہلے جب بیگم جان اُس کے ساتھ کام کیا کرتی تھی تو دیکھنے والے دانتوں تلے انگلیاں دبا کر رہ جاتے تھے۔ جب پتھیرا اور بیگم جان مل کر کام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا جیسے مٹی، پانی، حرکت اور پسینے نے سارے میدان پر فتح پالی ہو۔ بیگم جان تو اب بھی چاہتی تھی کہ پتھیرا اُسے کام پہ آنے کی اجازت دے دے۔ لیکن یہ بات زبان پر لانے سے بیگم جان ڈرتی تھی۔ اس لیے کہ اُسے چند ماہ پہلے کی واردات بھولی نہیں تھی۔ اُس دن ایک نووارد نے اُس پہ آوازہ کسا تھا۔ اُس دن اگر ٹھیکیدار اور دوسرے لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو پتھیرا نووارد کی تکا بوٹی کر دیتا۔ اُس واقعے کے بعد دو چار روز تو بیگم جان خود ہی کام پر نہ آئی۔ بھٹے کے قریب اینٹیں جوڑ کر بنائی ہوئی کوٹھڑی میں پڑی رہی۔ لیکن جب اُس کی انگلیوں میں کھُجل ہونے لگی اور اُس نے کام پر جانے کی خواہش ظاہر کی تو پتھیرا اُسے اینٹوں کے میدان میں لانے کے بجائے قریب کے گاؤں میں لے گیا جہاں اُس نے بالا بالا ایک چھوٹا سا کچا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

آج بھی بھیرے کے جسم کا تانبا سورج کی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ بیگم جان کو دیکھتے ہی چمکتا ہوا تانبا کام جہاں کا تہاں چھوڑ کر روٹی، لسی اور بیگم جان کے پاس پہنچ گیا۔ اور برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر اس نے روٹی اور لسی کی طرف زیادہ اور بیگم جان کی طرف کم توجہ دی۔ شروع شروع میں بیگم جان کو بھیرے کا یہ رویہ سانپ بن کر ڈستا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ سمجھ گئی کہ بھیرے کی بھوک بھیرے کے پیار سے زیادہ جاندار ہے۔ بیگم جان یہ بھی جانتی تھی کہ بھیرا کھانا کھالینے کے بعد اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن آج بھیرے کی بھوک اور پیار میں نمایاں کمی تھی۔ جب ایسا ہوتا تھا تو بیگم جان سمجھ جاتی تھی کہ بھیرا اُداس ہے۔ اور تجربے نے اُسے بتا دیا تھا کہ جب بھیرا اُداس ہو تو اُس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ اسی لیے آج بیگم جان بھیرے کو کھانا کھلا کر چپکے سے کھسک گئی۔ اور بھیرا برگد کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا اور جب وہ اونگھتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ وہ سوچتا ہے، اُن باتوں کے متعلق جو اپنے پرائے کی زبان پر تھیں۔ دوسری شادی۔ کیونکہ پانچ سال سے اوپر گزر چکے تھے مگر ابھی تک کوئی آس نہ بندھی تھی۔ بیگم جان نے لاکھوں جتن کئے۔ پیر فقیر، تعویذ گنڈا، ٹونے ٹوٹکے، مزاروں پر منتیں، دوا دارو، اُس نے سب کچھ کیا مگر اُمید بر نہ آئی۔ آخرکار میٹھی میٹھی لوریاں اپنے ذہن کے گوشوں میں دبا کر وہ بھیرے کی بھوک، پیار اور غصے کی تن من سے دیکھ بھال کرنے لگی۔ بعض اوقات بیگم جان کو یوں معلوم ہوتا جیسے اینٹیں پاتھتے پاتھتے بھیرے کا دل بھی اینٹ کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب کبھی اُس کے ذہن کے گوشوں میں دبی ہوئی میٹھی میٹھی لوریاں اُبھر کر سارنگی کے تاروں کی طرح سُن سُن کر اُٹھتیں اور وہ اپنے خیالی ننھے مُنے کی باتیں کرتے کرتے بے اختیار رو پڑتی تو بھیرا اُٹھ کر چارپائی کی ادوائن کسنے لگتا، سُوتلی بٹنے میں محو ہو جاتا یا اچانک اُسے کوئی اور کام یاد آ جاتا۔ بیگم جان بانجھ ہے۔ اس موضوع پر بھیرا اپنے رشتہ داروں کی باتیں سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ بڑی بوڑھیاں ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر نسل کی سلامتی کی تلقین کرتیں مگر بھیرے کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگتی۔ کبھی کبھی گاؤں کی گلی سے گزرتے ہوئے جب بھیرا کسی بچے کی طرف غور سے دیکھتا تو بچہ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اور جُڑی بھویں دیکھ کر ڈر جاتا اور چیخیں مارتا ہوا گھر کو بھاگ جاتا۔ ایک دن بھیرا خود اپنی چیخ سُن کر سہم گیا۔ اور یہ وہ چیخ تھی جو دوسرا انسان نہیں سُن سکتا۔ یہاں تک کہ وہ کربناک گونج بیگم جان بھی نہ سُن سکی حالانکہ وہ اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ بیگم جان پہلی مرتبہ بھیرے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ پھر یکایک اُسے مسرت کا احساس ہوا، یہ سوچ کر کہ بھیرے کا دل اینٹ کی طرح سخت نہیں۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد بیگم جان سوچنے لگی۔ کہ اینٹ کی طرح سخت دل تو کہیں بہتر تھا۔ کیونکہ بھیرے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی تھی۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ بیگم جان کو یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہے۔ بھیرا بان کے کھٹولے پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کے تانبے ایسے سینے پر ایک پڑوسی کا بچہ بیٹھا، توتلی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ بھیرے کی آنکھوں سے بہتی ہوئی ندی کا راز بیگم جان اچھی طرح جانتی تھی۔ اور ایک دن بیگم جان کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا دھارا پھوٹ نکلا۔ اور اُس دھارا کا سرچشمہ وہ خوشی تھی جو ایک عورت ہی جان سکتی ہے۔ اُس دن بھیرا نے محسوس کیا کہ آسمان پر دھنک نکل آئی ہے۔ سوکھی ٹہنیاں ہری ہو گئی ہیں۔ کچی اینٹیں چاندی کی طرح چمکنے لگی ہیں اور تمام کائنات نغمہ و ساز سے گونج اُٹھی ہے۔ اُس کا غصہ بیٹے کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔ اور اُس کے پیار نے برگد کے پیڑ کے ڈالوں اور جٹاؤں سے زیادہ پھیل کر بیگم جان کو اپنی گھنی چھاؤں میں لے لیا۔ تانبے ایسے جسم میں دُگنی طاقت آ گئی۔ بیگم جان نے

وزنی چیزیں اُٹھانا بند کر دیں۔ ذائقہ کمتی چیزوں کی جستجو میں رہنے لگا۔ ایک دن بیگم جان نے دو چھوٹے چھوٹے کُرتے، نہالچے اور لنگوٹ سی کر اپنی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھ ڈالے۔ لمحات کے قافلے کھل کھل ہنستے بیت گئے۔ اور پھر ایک دن چپکیلی دھوپ میں، ایک عورت دوڑتی ہوئی اینٹوں کے میدان میں پہنچی۔ اُس نے پتھیرے کے کان میں کچھ کہا۔ پتھیرا فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ بھٹے کی چمنی سے بھی اونچا ہو گیا ہو۔ جیسے اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں آہنی سانچے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہوں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی سمت چل پڑا۔ اُس کے ہاتھ مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُس کے ماتھے پر لرز رہی تھیں۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ جاتی ہوئی پگڈنڈی پر اُس کے ننگے پاؤں کی دھمک سُن کر بٹیروں کی ڈار خوفزدہ ہو کر دوسری طرف نکل گئی۔ اُس کے دائیں بائیں گیہوں کی سنہری بالیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اُس کے پنجے اور ایڑیاں، پگڈنڈی کے کناروں پر اُگی ہوئی ہری ہری دُوب پر سلوں کی طرح دعائیں برسنے لگیں۔ ہر رنگ، ہر شے، ہر منظر سے بے نیاز وہ اپنے وجود سے ہٹ کر چلتا ہوا اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا۔ نئی زندگی کی پہلی آواز سُن کر اُس کا انگ انگ ناچ اٹھا۔ اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ وہ چیخ پڑے، قہقہے مارے، پچاس روپے کے سکّے جو اُس نے زمین میں دفن کر رکھے تھے۔ آج انھیں اندھیرے سے باہر نکال کر دائی کی جھولی میں ڈال دے۔ جذبات کے ہجوم میں اُس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اُس نے مسکرا کر بیگم جان کے خشک ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ عورتوں کے مبارکباد کے شور سے پھُولا نہ سمایا۔ آج بیگم جان پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ رات گئے دیئے کی لَو میں وہ سوئی ہوئی بیگم جان اور اپنے بچے کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے زمین میں سے پچاس روپے کے سکّے نکال کر بیگم جان کے میلے چکیلے تکیئے کے نیچے رکھ دیے۔ دوسرے دن بھانڈ آئے تو منہ مانگا انعام پا کر نہال ہو گئے۔ بہشتی، نیم کے پتوں کا سہرا سردل سے باندھ کر ہٹا تو پتھیرے نے دو روپے اُس کی مٹھی میں تھما دیے۔ دائی کو چھینٹ کا جوڑا اور پانچ روپے دے کر رخصت کیا گیا۔ بڑی بوڑھیوں نے منہ میٹھا کیا۔ اور جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں۔

چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ سُگھڑ عورتوں نے مشورہ دیا منّے کے ختنے کرا ڈالو۔ بچہ بڑا ہو جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔ بیگم جان نے پتھیرے سے ذکر کیا۔ اگلے دن پتھیرے نے اپنے ساتھیوں سے بات کی۔ آن کی آن میں میدان کے چاروں کونوں میں خبر پھیل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ بار بار دہرائے جانے پر یہ بات بھی خود بخود طے پا گئی کہ پتھیرا ساری برادری کو میٹھے چاول کھلائے گا۔ پتھیرا شام کو گھر لوٹ کر آیا تو بیگم جان بھانپ گئی کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے۔ بات کھلی تو بیگم جان نے تن کر کہا "میرے لاڈلے کے ختنے دھوم دھام سے ہوں گے۔ اگر دنیا میں ضرورت نہ ہوتی تو قرض اور سُود کا وجود نہ ہوتا۔" یہ سُن کر پتھیرے کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ دوسرے ہی دن وہ قرض مانگنے کے لیے ٹھیکیدار کے پاس جا پہنچا۔ ٹھیکیدار چارپائی پر بیٹھا ہوا پتھیروں کے جمعدار سے باتیں کر رہا تھا۔ پتھیرے کو دیکھ کر ٹھیکیدار مسکرا کر بولا: "بڑی عمر لے کر آئے ہو۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" پتھیرا زمین پر بیٹھ گیا۔

ٹھیکیدار بولا "تمھیں سُن کر خوشی ہو گی کہ مجھے ایک بہت بڑا ٹھیکہ ملا ہے۔ چند سرکاری عمارتیں ساٹھ دن کے اندر اندر تعمیر ہو جانی چاہئیں۔ مجھے بہت بڑی تعداد میں اینٹیں سپلائی کرنی ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ لیکن یہ میری آبرو کا سوال ہے۔ میں نے

فیصلہ کیا ہے کہ اگلے اتوار اس میدان میں اینٹیں بنانے کا مقابلہ ہو۔ جو شخص سب سے زیادہ اینٹیں بنائے گا اُسے اجرت کے علاوہ دو سو روپے کی رقم بطور انعام دی جائے گی۔"

"اللہ سرکار کو سلامت رکھے۔" پھیرا بولا

ٹھیکیدار نے چلم کا گہرا کش لے کر دھواں ناک سے باہر نکالا۔ جمعدار نے صافے کا شملہ دُرست کر کے مونچھوں کو دو چار تاؤ دیے۔

ٹھیکیدار بولا۔ "اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا میرے پاس اینٹوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے گا۔ اور پھر اس لالچ میں دوسرے بھٹوں کے کاریگر کم از کم ایک دن کے لیے میرا کام کریں گے۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ کاریگر لوٹ کر دوسرے بھٹوں پر نہ جائیں۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس علاقے میں ایسا جوان پیدا ہی نہیں ہوا جو تم سے زیادہ اینٹیں بنا سکے۔ اس لیے سمجھ لو کہ اگلے اتوار دو سو روپے کی رقم تمہارے پاس پہنچ گئی۔"

ٹھیکیدار کی گفتگو سُن کر پھیرے کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ گھر پہنچ کر اُس نے سارا قصہ بیگم جان کو سنایا۔ بیگم جان کو بے حد مسرت ہوئی۔ وہ بولی۔ "جب خدا دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔" طے پایا کہ اگلے اتوار بیگم جان اُس کے ساتھ کام کرے گی۔ اگر پھیرا بجلی کی طرح کوندے بھرے گا تو وہ شعلہ بن کر میدان کے سینے پر لپک لپک جائے گی۔ دو سو روپے کی رقم حاصل کرنے کے لیے۔ تاکہ مُنّے کے ختنے دھوم دھام سے ہو سکیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اتوار کے دن میدان کے چاروں طرف لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آنے لگے۔ قرب وجوار کے دیہاتوں سے بوڑھوں، جوانوں اور نوعمر لڑکوں کی ٹولیاں، سُورج نکلنے سے پہلے ہی تماشا دیکھنے آ پہنچیں۔ تماشائی دن کا کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ باجرہ، مکا اور گیہوں کی روٹیاں، آم کا اچار، گُڑ کی ڈلیاں، پیاز کی گنٹھیاں۔ برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں درجنوں پانی سے بھرے کورے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ہر شخص ٹھیکیدار کی سخاوت اور حُسنِ انتظام کی تعریف کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس میدان میں میلہ لگ گیا ہے۔ ڈھول کی پہلی آواز بلند ہو کر آس پاس کی وادیوں میں گونجی۔ میلوں ٹھیلوں کے شوقین جاٹ سینے پھیلا کر مست ہو گئے۔ میدان کے چاروں طرف انسانوں کی چوہری چوہری دیواریں کھنچ چکی تھیں۔ اس لیے نئے آنے والے تماشائیوں میں سے کچھ برگد کے پیڑ پر چڑھ کر ڈالوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ میدان سے ذرا پرے، ٹیلوں ٹبّوں اور اینٹوں کے چٹّے پر کھڑے ہو گئے۔

میدان کے بیچ نمبردار کا کلف دار شملہ دُور سے نظر آ رہا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ نمبردار کو ثالث مقرر کیا گیا ہے۔ اور نمبردار کے فیصلے سے پہلے ہر شخص فیصلہ کر چکا تھا کہ ٹھیکیدار بڑے دماغ کا مالک ہے جس نے اُس علاقے میں ایک نئے میلے کی بنیاد رکھی ہے کبڈی، سمّی، دنگل، کھلیانوں اور میلوں ٹھیلوں میں تو ہمیشہ ڈھول بجتے تھے مگر اینٹوں کے میدان میں کبھی ڈھول کی آواز نہ سُنی گئی تھی۔ وہاں تو صدیوں سے انسان کا پسینہ بہتا چلا آیا تھا۔ خدا جانے وہاں پھیروں کے کتنے قبیلے مٹی کھودتے کھودتے خود پیوندِ زمین ہو گئے تھے۔ آج اُس میدان میں مرد عورتوں کے جوڑے اپنے برسوں کے ریاض کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے گذشتہ شام مٹی گوندھ کر رکھ چھوڑی تھی۔ آج صبح گندھی ہوئی مٹی کو پانی کے چھینٹے دے کر تر کیا تھا۔ میدان میں ریت بچھی ہوئی

تھی۔ مرد لوہے کے سانچے سامنے رکھے ڈھول کی دوسری آواز کے منتظر تھے۔ عورتیں مٹی کا پہلا لوندا بنانے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ ڈھول کی دوسری آواز پر حرکت کا طوفان آنے والا تھا۔ اُس آواز سے پہلے خیالات کے قافلے، اپنی اپنی بساط کے مطابق، تمناؤں کے میناروں کا تیزی سے چکر کاٹ کر لوٹ آئے۔ منچلے تماشائی شرطیں بدنے لگے۔ کسی نے نسوار کی چٹکی لی۔ بانکے نوجوانوں نے سگریٹ سلگا لیے۔ بڈھے حقے گڑگڑانے لگے۔ ثالث نے اکڑ کر مونچھوں کو تاؤ دیے۔ جمعدار نے صافے کا پیچ ابرو پر سے ہٹا کر ٹھیکیدار کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ مشرق میں پھیلی ہوئی سُرخی گاؤں کی کنواری بیٹی کی طرح شرما کر چھپ گئی۔ آفتاب کی سنہری کرنیں بادل کی اوٹ سے اُبھر کر میدان میں جھانکنے لگیں۔

ڈھول کی دوسری آواز بلند ہوئی۔ حرکت کا طوفان آ گیا۔ لوہے کے سانچے بے تحاشا کھٹ کھٹ کرنے لگے۔ نسوانی ہاتھوں کے لوچ لچک اور پھرتی نے میدان کے ذرّے ذرّے کو گرما دیا۔ پسینے کے تھرتھراتے ہوئے قطرے آوازیں دینے لگے۔ دھرتی کانپ اُٹھی۔ زندگی کے سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ ڈھولکیے کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چوبیں ڈھول کے پڑوں کو اندھا دُھند پیٹنے لگیں۔ ڈھولکیا خود جوش میں آ کر اپنا سر دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔ دھما دھم۔ دھما دھم۔ گاؤں کے پہلوان نے علی کا نعرہ بلند کیا۔ تماشائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بیگم جان کے ہاتھوں کی پرچھائیاں کمال تیزی سے میدان کے تپتے ہوئے سینے پر گردش کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ پھیرے کے جسم کا چمکتا ہوا تانبا نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنی اور پرچھائیوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ سینوں کے اندر مچلتی ہوئی تمناؤں نے رگوں کو اُکسا کر انگلیوں میں برقی روئیں دوڑا دی تھیں سبتے بتے۔ گاؤں کے پہلوان نے ایک ٹانگ پر ناچ کر داد دی۔ کہیں دُور سے آیا ہوا کاریگر، بیگم جان اور پھیرا کی جوڑی سے آگے نکل گیا تھا۔ نیا جوش، نیا ولولہ، نئی دلچسپی کی لہر میدان کے چاروں کونوں میں دوڑ گئی۔ بیگم جان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ خیالوں کا تاج محل ڈھے لینے لگا۔ ہاتھ اوچھے پڑنے لگے۔

پھیرا بدستور کام کرتے ہوئے آہستہ سے بولا "گھبراؤ نہیں بیگو! تم تھک جاؤ گی تو میں اکیلا نپٹ لوں گا۔ میرے سینے میں میرا دم، میرا ایمان ہے۔ اور اگر ایمان مضبوط ہو تو انسان پہاڑوں سے ٹکرا سکتا ہے۔"

یہ سُن کر بیگم جان کے جُثّے میں قوت عود کر آئی۔ ہاتھ بجلیاں بن کر کوندے بھرنے لگے۔ دو سو روپے کے سِکّوں کی جھنکار کانوں میں امرت رَس گھولنے لگی۔ اُدھر پانسا پلٹ گیا۔ ایک سیاہ فام کاریگر سب سے آگے نکل گیا تھا۔ پھیرا تیسرے نمبر پر تھا۔ ڈھول کی شہ پا کر سیاہ فام کاریگر کا انگ انگ پھڑک اُٹھا۔ اُس کی صحت مند سانولی کی آنکھیں ہمت اور ارادے کی لَو دینے لگیں سبتے بتے۔ جیوما ئی کے لال۔ ایک کہرام مچ گیا۔ وہ شور، گرما گرمی گھنٹوں جاری رہی۔ پہلا ڈھولکیا تھک گیا تو دوسرے نے اُس کی جگہ لے لی۔ بیچ بیچ میں کاریگر پانی پی لیتے۔ کوئی کمر سیدھی کر لیتا۔ کوئی انگلیاں چٹخا لیتا۔ جنگ جاری تھی مگر کام کی رفتار سُست پڑ گئی۔ آہستہ آہستہ ہاتھوں کی حرکت ڈھول کی آواز کا ساتھ دینے سے انکار کرنے لگی۔ ٹھیکیدار نے میدان کا جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ ایک جیتنے کا کام ایک دن میں ہو گیا تھا۔ اور اب اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ہونے والی تھی۔ ایک ہی رفتار پر کام کرتے ہوئے پھیرا سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب وہ چار ہاتھوں کا کام دو ہاتھوں سے کر رہا تھا۔ اُس کے سینے میں اُس کا دم اُس کا ایمان تھا اور اُس کا مضبوط ایمان ایک عجیب و غریب وقار اپنے ساتھ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ بیگم جان تھک کر بیٹھ گئی تھی۔ صرف سیاہ فام جوڑا پھیرے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ باقی تمام کاریگروں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد یوں معلوم ہونے لگا جیسے پھیرے کے ہاتھ بھی کام کرنے سے انکار کر رہے ہوں جیسے اس کی انگلیوں میں شیشہ بھر گیا ہو جیسے وہ اندھیرے میں کوئی چیز ٹٹول رہا ہو۔ پھیرے کا مقابلہ کرنے والا آخری جوڑا دفعتاً رک گیا۔ جیسے ان کے سامنے کوئی بلند پہاڑ آ گیا ہو۔ سیاہ فام اور اُس کی ساتھن، شکست قدموں سے چلتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔ گاؤں کے پہلوان نے علی کا نعرہ بلند کیا۔ ڈھول کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

"پھیرا جیت گیا! پھیرا جیت گیا!" ہر طرف شور مچ گیا۔ لوگ میدان میں ناچنے لگے۔

ڈھولکیے کی شوخ، باغیانہ اور تیز و تند چوٹیں۔ ناچنے والوں کے بول۔ چیخ پکار۔ مستی میں آئے ہوئے انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"ہم جیت گئے ہیں۔ اُٹھو اب گھر پہنچ کر آرام کرنا۔" بیگم جان نے پھیرے کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

پھیرا زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ بیگم جان خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پھیرے کو اُٹھا رہی تھی۔

"جیئو مائی کے مال!"

گاؤں کا حکیم ہجوم سے نکل کر آگے بڑھا۔ اُس نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر پھیرے کی آنکھیں دیکھیں، نبض ٹٹولی، اور پھر سر ہلاتے ہوئے اپنی سفید چادر پھیرے پر ڈال دی۔

سناٹا چھا گیا۔

بیگم جان کو یوں لگا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ اور وہ اُس میں دھنسی جا رہی ہو۔ بیگم جان کی ایک چیخ سنائی دی اور وہ پھیرے کے ٹھنڈے جسم سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

"پھیرا جیت گیا" اس آواز سے میدان گونج رہا تھا۔ اس گونج میں بیگم جان کی نحیف اور لرزتی ہوئی آواز سنائی دی —
"نہیں، پھیرا ہار گیا۔ ٹھیکیدار جیت گیا ہے۔"

فاصلے

مختار مسعود

میرا دفتر شہر کے بارونق حصے میں بڑی سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک بوسیدہ عمارت میں واقع تھا۔ یہ دو منزلہ بارک لکڑی اور کھپریل کی بنی ہوئی تھی کسی زمانے میں کھپریل سرخ ہوگی اور لکڑی سبز مگر اب تو شہر کی گرد اور زمانے کی گردش نے انہیں خاکستری ہی نہیں بلکہ سیاہی مائل کر دیا تھا۔ یہ بارک عالیشان بنگلوں سے گھری ہوئی تھی جن کی کھڑکیوں سے کولر سر باہر نکالے دن رات گنگناتے رہتے، ادھر بے کسی کا وہ عالم تھا کہ ہر محراب اور روشندان میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کبوتر یوں پھڑپھڑاتے رہتے۔ گویا یہ ویرانہ انہی کے دم سے آباد ہے۔ یہ عقدہ بھی اسی دفتر میں کھلا کہ مہاجر اور کبوتر ہر دو کے لئے کسی عمارت پر تصرف کس قدر آسان ہے۔

میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا، سیڑھیوں کے بعد برآمدہ شروع ہوتا جس کے ایک کونے میں لکڑی کی اوٹ کی دوسری طرف ملاقاتیوں کے لئے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ یہاں ایک بوڑھا چپڑاسی ملنے والوں کی جانچ پڑتال کرتا، یہ چہرے اور جوتے دیکھ کر بتا سکتا کہ کون مالدار ہے اور کون معزز۔ یہ چہرے مہرے سے سائل اور سفارشی چال ڈھال سے سول اور فوجی اور محض کالر سے کلرک اور افسر میں تمیز کر لیتا، البتہ سمگلر اور لیڈر میں کبھی کبھی دھوکہ کھا جاتا سبھی ملاقاتی اس سے گرم جوشی سے ملتے، کچھ لوگ مصافحہ کے لئے بند مٹھی بڑھاتے، اور کچھ سگرٹ پیش کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے تاکہ اسے پیکٹ سے دو چار سگرٹ نکالنے میں زیادہ ڈھٹائی نہ دکھانی پڑے۔ دو چار ملاقاتی صوفوں پر بٹھا دیئے جاتے اور بیشتر برآمدے میں لکڑی کے کٹہرے سے ٹیک لگائے کھڑے رہتے، عام طور پر ان کی باری دیر سے آتی اس لئے وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتے، پہلے دانتوں سے ناخن تراشتے پھر ناک میں انگلیاں دیتے رہتے، اس کے بعد مہنگی بیڑیاں یا سستے سگرٹ سلگاتے جاتے، پھر دیر تک تھوکتے اور کھنکھارتے رہتے یہاں تک کہ گلا خشک ہو جاتا اور وہ کٹہرے سے ٹیک لگائے اونگھنے لگتے۔

ملاقاتیوں کی نشست کے ساتھ ہی میرے کمرے کا دروازہ تھا۔ یہ عام طور پر بند رہتا اور اس کے آگے بھاری پردے پڑے رہتے تیز ہوا یہاں ہمیشہ چلتی مگر صرف پردے کی سلوٹوں اور میری پیشانی کی شکنوں میں اضافہ کر سکتی یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے بیشتر دروازے مستقل بند تھے۔ کچھ دروازے سیاہی مائل گہرے سبز پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور بعض کے آگے بھاری بھرکم آبنوسی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے تو چوڑے پیندے اور لمبے ڈھانچے والی الماری دیکھتے ہی ملکہ وکٹوریہ یاد آجاتی ہے جس کی تصویر کبھی ہر قاعدے میں اور بت ہر چوک میں مل جاتا تھا۔ میرے دفتر کی آبنوسی الماریوں میں عہد وکٹوریہ کے ان دقیانوسی قوانین کی ضخیم اور مجلد کتابیں پڑی تھیں جو منسوخ ہوتی توڑے جاچکے ہیں بلکہ ان کو توڑنے والے ادارے بھی کئی بار توڑے جاچکے ہیں۔ میں نے ان کتابوں سے کبھی استفادہ نہیں کیا کیونکہ میں قوانین کے سلسلے میں صرف روزناموں کو مستند

ماتا ہوں۔ کمرہ بہت بڑا تھا اور اس کے ایک سرے پر کھڑکی کے پاس میں نے میز جما رکھا تھا۔ بسا اوقات میرے ہوتے ہوئے بھی یہ کمرہ خالی خالی سا لگتا لہٰذا اس احساس کو دور کرنے اور کسی اور احساس کو تقویت دینے کے لئے میں نے سر چارلس شیفیر سے لے کر اپنے پیشرو تک کے نام ایک خوشنما تختے پر لکھ کر آویزاں کر دیئے۔ سٹور روم سے چند پھیکی روغنی تصویریں بھی نکل آئیں اور انہیں بھی دیدۂ عبرت نگاہ کے لئے میں نے کمرے میں سجا دیا۔ یہ قد آدم تصویریں ان فرنگیوں کی تھیں جنہیں کبھی ہم بھی قد آور سمجھا کرتے تھے۔

یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ کہ اس کمرے کا فرش لکڑی کا تھا۔ ساگوان کے تپتے اور لمبے ٹکڑے اس قرینے سے جملائے ہوئے تھے کہ ان پر دری اور قالین بچھانے کی ضرورت ہی نہ تھی، یہ چوبی فرش مجھے اس کمرے کی سب سے نمایاں خصوصیت معلوم ہوتی اور میں بہت جلد اس سے مانوس ہو گیا۔ اگر میں سر جھکائے فائل دیکھ رہا ہوں اور ایک سایہ کاغذوں پر آ جائے تو میں سر اٹھائے بغیر جانتا تھا۔ کہ شفیق آئے ہیں، دبے پاؤں پنجوں کے بل سمٹے سمٹائے یہ اس طرح کمرے میں داخل ہوتے کہ ان کی چاپ تک چوبی فرش میں جذب ہو جاتی۔ کھٹ کھٹ کی نپی تلی آواز آتی تو میں سمجھ جاتا کہ محسن علی آئے ہیں، یہ ہمیشہ اچھے سوٹ اور نئے بوٹ پہنتے اور بوٹوں کی صرف ایڑیاں استعمال کرتے۔ کبھی کبھی سارا فرش ہلنے لگتا اور لکڑی چٹخنے لگتی، میں سمجھ جاتا کہ تماوی بہادر صاحب آئے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ آپ پہلے ہی کیا کم وزنی تھے، جواب جیب میں جمہوریت کا سنگِ بنیاد لئے پھرتے ہیں۔ فرش پر ننگے پاؤں کی سرسراہٹ ہوئی، میں نے جان لیا کہ چپڑاسی آیا ہے۔ اس نے میز پر ایک چٹ رکھی، ملاقاتیوں کا وقت شروع ہونے میں ابھی بہت دیر تھی، یہ صبح سویرے یوں چٹ لے آنے کا کیا مطلب، میں نے غصے سے سر اٹھایا، سر اٹھا ہی رہ گیا اور غصہ نہ جانے کہاں چلا گیا، چٹ پر ناپختہ قلم سے لکھا تھا ——— شیریں، لیلیٰ اور عذرا

چند دنوں سے تین عورتیں مجھے ہر روز ملنے آتیں، ان تینوں کا کام ایک ہی نوعیت کا تھا اور اگر یہ شہر کے مختلف حصوں میں رہتی تھیں مگر میرے دفتر کے باہر باقاعدگی سے جمع ہوتیں اور پھر اکٹھی ہو کر مجھے ملنے آتیں، ان عورتوں سے میری ملاقات ذرا معمول سے ہٹ کر ہوئی۔ عموماً مہربان دوست تعارف کا ذریعہ بن جاتے ہیں، کبھی بلی کے بھاگوں چھینکا خود ہی ٹوٹ جاتا ہے، کبھی سینما یا سفر میں نشستوں کی ترتیب رنگ لاتی ہے، کبھی ہوٹل یا کلب میں بازی لگ جاتی ہے، شہر کی بارونق سڑکوں پہ بھی راہ و رسم کے مقامات آتے ہیں، ٹیکسی اور تانگے بھی آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا سکتے ہیں، پکنک گاہوں میں بھی پینگیں بڑھانے کا سامان ہوتا ہے سمندر کے کنارے ہر ایک کا دل ڈوبتا اور ڈولتا رہتا ہے، نمائش میں تو سبھی نمود کیلئے بیقرار ہوتے ہیں، ٹیلیفون کا غلط نمبر بھی بعض اوقات صحیح نمبر نکلتا ہے۔

چند دن ہوئے دفتر کے باہر میدان اور سڑک کو گھیر کر قناتیں اور شامیانے لگائے گئے۔ شامیانوں کے نیچے کرائے کی کرسیاں بچھائی گئیں اور ایک کونے میں چند کرسیوں پر "برائے خواتین" کی چٹ بھی لگائی گئی۔ سامنے ڈائس سجائی گئی، یوں تو یہ عام سی ڈائس تھی مگر اس کی ترتیب کچھ مختلف تھی۔ بیچ میں ایک میز اور کرسی تھی، کرسی کی پشت اونچی اور سیٹ گہری تھی، میز پر دو گلدان تھے ان میں موسم کے پھول لگے ہوئے تھے مگر جتنے بے موسمی ہو سکتے ہیں وہ میز پوش پر کاڑھے ہوئے تھے، ڈائس کے دائیں جانب کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں جانب دفتر سجا ہوا تھا اور ڈائس کے درمیان مائیکروفون کی تاروں سے بچا کر تین بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے، ایک نیلا تھا دوسرا پیلا اور تیسرا سبز، تینوں میں تالے لگے ہوئے تھے اور تالوں پر مہریں تھیں۔

صبح سویرے لوگوں کا تانتا بندھ گیا، لوگ ہر طرح کی سواری پر آ رہے تھے، عام طور پہ وہ سواری کو دور کھڑا کرتے اور

پیدل چل کر شامیانے میں پہنچے، کبھی کبھی کوئی لمبی کار والا اسے شامیانے کے نزدیک لے آتا اور جونہی لوگ اسے گھورتے وہ فوراً ہجوم میں گم ہو جاتا۔ لوگ اجلے اجلے کپڑے پہنے تھے، سر ڈھکے ہوئے اور کاندھوں پر چادر یا بڑا رومال ڈالا ہوا تھا۔ شامیانے میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ اور عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بالآخر مقررہ وقت پر شفیق صاحب نے مائکروفون سنبھالا اور بولے "خواتین و حضرات حج کے لئے قرعہ اندازی شروع کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ...." اعلان کا باقی حصہ درود و سلام میں ڈوب گیا، نام نکلنے شروع ہوئے پہلے چند ناموں کا بھی تشویش سے استقبال کیا مگر جلد ہی انہیں اپنی اپنی فکر لاحق ہونے لگی سیٹیں کم تھیں اور عرضیاں زیادہ اس لئے بامراد کم ہوئے اور نامراد زیادہ صبح سے دوپہر، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام ہونے کو آئی مگر لوگ اسی طرح جمے بیٹھے رہے عماموں کی کلف یا قمیضوں کی استری کا ذکر ہی کیا، صبح کے کھلتے ہی دکھتے ہوئے آفتاب شام تک غروب ہو گئے اور امیدوں کی کتنی ہی کرنیں شفق رنگ ہو گئیں جہاں صبح عطر ہی عطر تھا وہاں دوپہر کو پسینے چھوٹتے اور شام کو آنسو بہہ نکلے بالآخر اعلان ہوا "یہ آخری سیٹ تھی اب قرعہ اندازی ختم ہوتی ہے"۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہجوم جو دن بھر ضبط کئے بیٹھا تھا آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور میں نے کئی آنکھوں سے شعلے نکلتے اور لاوا بہتے دیکھا۔ مجمع چھٹنے لگا کوئی چارخانہ رومال سے منہ پونچھ رہا تھا۔ کوئی عرضیاں اور رسیدیں سنبھال رہا تھا، چند انگڑائیاں لے رہے تو چند ٹانگیں سیدھی کر رہے تھے، کچھ لوگ واپسی کے لئے تیزی سے دو چار قدم بھی اٹھا چکے تھے، یکایک خواتین کی نشستوں سے کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح آواز آئی۔

"میرا نام کہاں ہے؟ مجھے اجازت کیوں نہیں ملی، تم خدا کے احکام پر قانون کی پابندی لگانے والے کون ہوتے ہو۔ یہ پاکستان ہے یا ...."

مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا، ہر شخص کے قدم جہاں پڑے وہیں گڑ گئے۔ سبھی نے مڑ کر اس صورت کو دیکھا جو تاب رکھتے ہی میں نہ آتی تھی، بلند اور پاٹ دار آواز میں اس نے چیخ چیخ کر عمر بھر کی داستان سنا دی۔

یہ سیاہ رنگ کی مکرانی عورت تھی۔ ڈیل ڈول میں لمبی چوڑی، بھرا بھرا جسم، بڑے بڑے ہاتھ پیر، ناک چھوٹی اور چپٹی منہ کشادہ اور دانت لمبے، اس کی آنکھیں ڈراؤنی تھیں جنہیں وہ دیر تک بغیر جھپکے کھولے رکھتی۔ اس نے بوہروں کی طرح فراک پہنا ہوا تھا جو ٹخنوں کو چھو رہا تھا، اس سیاہ پھول دار فراک کے نیچے میلا سا پاجامہ تھا، شاید وہ ننگے پاؤں تھی مگر اس کے سر پر جو کھچا ہوا دوپٹہ تھا اس کی کئی تہوں میں اس نے اپنے جسم کو لپیٹا ہوا تھا۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ رہی تھی اس نے سینے پر دوہتڑ مارنے شروع کر دئے اور اس کے منہ سے کف نکلنے لگا، ذرا سی دیر میں اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور ایسا لگا جیسے وہ ابھی اُسے زمین پر دے مارے گی۔ میں نے ہمت کی اور اس کے پاس چلا گیا۔ وہ میری بات سننے کے لئے تیار ہی نہ تھی، اور سنتی بھی کیسے وہ مدت سے ماہی گیروں کے گاؤں میں خاموشی سے زندگی بسر کر رہی تھی مگر صبر و شکر کی بھی تو حد ہوتی ہے۔ پچاس برس پہلے وہ ایک جھونپڑی میں پیدا ہوئی اور اگر اس نصف صدی میں اس کی زندگی میں کچھ ہلچل آئی تو صرف اتنی کہ وہ اسی بستی کی ایک جھونپڑی سے نکل کر دوسری جھونپڑی میں آ گئی عمر بھر یوں تنگی ترشی سے گزر کرنے کے بعد اس نے صرف ایک خواہش کی مگر وہ بھی قانون سے ٹکرا کر حسرت بن گئی۔ وہ مدتوں خاموشی سے سلگنے کے بعد یکایک اپنی مایوسیوں کی مشعل لئے دو جہان کو آگ لگانے نکل پڑی اور یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، بہر حال جب گھن گرج ختم ہوئی اور بادل بہہ نکلے تو میں نے اسے کل دفتر آنے کے لئے کہا،

بڑی دیر منانے کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ وہ صبح مجھے دفتر میں ملنے آئے گی۔

بات ختم ہوئی تو کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کوئی جہاز کمپنی کا نام پوچھتا تو کوئی روانگی کی تاریخ، کسی کو زادِ راہ کی فکر تھی تو کسی کو ہم سفر کی تلاش، کوئی مذہبی مسئلہ پوچھتا تھا تو کوئی سرکاری قانون۔ میں حتی الامکان ضابطے کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا رہا جن سے ناتسلی بخش ہونے کا مجھے یقین ہے۔ سوال و جواب سے طول پکڑا اور ہمارے حلقے میں کچھ عورتیں بھی شامل ہو گئیں۔ بیشتر خاموش تھیں مگر چند ایک نوان کے حصے کی باتیں بھی کر رہی تھیں، چونکہ کئی لوگ بیک وقت باتیں کر رہے تھے اس لئے شور کافی تھا۔ یکایک میں نے جھرمٹ میں ایک نورانی چہرہ دیکھا اور رک گیا۔ وہ عورت دیر سے مجھے بیٹا بیٹا کہہ کر پکار رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھے بغیر اُسے دلاسہ بھی دے چکا تھا۔ کہ اس کی بات سنی جائے گی، اب جو میں نے اس کی طرف دیکھا تو نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

یہ عورت پچاس سے اوپر ہو گئی اس نے ایک بجھا میلا ٹوپی دار برقع پہنا ہوا تھا جس کا تھوڑا سا حصہ اٹھا کر ٹوپی پر رکھا ہوا تھا۔ اور باقی گھیر میں اپنی غربت چھپائے کھڑی تھی، اس کے پاؤں میں ایک پرانی جوتی تھی جس کی ایڑیاں اس نے بٹھائی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ جھریوں کے باوجود دمک رہا تھا۔ وہ نچڑے ہوئے سفید بالوں اور آدھے گرے ہوئے دانتوں کے باوجود خوبصورت تھی، وہ بے حد گوری تھی، اس کے نقش باریک اور اس کی جلد شفاف تھی۔ مونہہ کچھ پوپلا اور ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں، اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا

"بیٹا مجھے ضرور بھیج دے۔ میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں، اللہ تیرا بھلا کرے۔"

وہ پنجابی لہجے میں بولتی تھی اور اس کی بوڑھی رگوں میں کشمیری خون دوڑ رہا تھا، وہ عورت بولتی کم اور روتی زیادہ تھی جب اس کی ہچکی بندھ گئی تو میں نے اسے دلاسہ دیا اور کہا صبح میرے دفتر میں آ جانا۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھا کر بڑی سادگی سے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے، تم کون ہو، تمہارا دفتر کہاں ہے، کیا مجھے کوئی اندر آنے دے گا؟ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دفتر سے بہت دور رہتی ہے اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے پیدل آتی ہے۔ اس کو کل پھر اتنی مسافت طے کرنی پڑے گی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ رات وہیں دفتر کے باہر سو رہے۔ اس نے نصف صدی برتن مانجھ مانجھ کر جو پیسے جوڑے تھے، انہیں لہوں پر ضائع کرنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ چونکہ اس کی بوڑھی ٹانگوں نے ابھی زندگی کا بوجھ کچھ ہی روز سے لباری تک اٹھائے جانا تھا اس لئے میں نے اسے جلد رخصت کیا، اور صبح وقت پر پہنچنے کی تاکید کر دی۔ جاتے جاتے اس نے مجھے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر دکھائے، یہ ایک بھیانک منظر تھا، پچاس سال تک برتن مانجھے جائیں تو ہاتھ محض کھال بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان ہاتھوں سے کمائے ہوئے پیسے کو بھی شاید ہاتھوں کی میل لگتی ہوں گے۔

بہت سے لوگ جب کئی بار وہی باتیں پوچھ چکے جو دن بھر بار بار لاؤڈ سپیکر پر دہرائی جا چکی تھیں تو بھیڑ خود بخود چھٹنے لگی میں نے سوچا اب کوئی کام باقی نہیں اور تھوڑے بہت لوگ جو ادھر ادھر کھڑے ہیں وہ محض میری رخصت کے منتظر ہیں اس لئے مجھے چلنا چاہیئے۔

میں نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ کسی نے سامنے سے راستہ روکا، ایک اور عورت ہاتھ میں کاغذات لئے کھڑی تھی۔ اس نے صرف میری طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں وہ اپنی سوتی ساڑھی کے پلو سے انہیں خشک کر رہی تھی مگر وہ خشک ہونے میں کب آتی تھیں۔ یہ ادھیڑ عمر کی سادی سانولی سی عورت تھی، اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کا معمولی سا پرس اور دوسرے میں ٹاٹ کا صاف سا تھیلا اور کچھ کاغذات تھے۔ میں نے سر جھکایا تو نظر اس کی کم قیمت اور پرانے ڈیزائن کی سیاہ گرگابی پر ٹھہر گئی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

اس کی گویائی جواب دے چکی تھی اس لئے میرا سوال اندھیرے میں کھو گیا۔ ایک طویل لمحے کے بعد اس نے نمناک پلکیں اور سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں تو میں نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا تو آپ ابھی صبح دفتر میں مل لیں"۔

اس نے خاموشی سے راستہ چھوڑ دیا اور میں دفتر کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ شام پڑ چکی تھی، عمارت میں کافی اندھیرا تھا اور صرف دو چار چندھے بلب چوکیداری کر رہے تھے، بوجھل قدموں کی چاپ برآمدے اور سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی کمرے تک میرا پیچھا کرتی رہی، اس اجنبی آواز سے گھبرا کر میں رک گیا، سامنے دیوار پر سر چارلس نیپئر کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ وہی سر چارلس ہیں جس نے سندھ فتح کرنے پر حکومت کو تار برقی سے اطلاع دی کہ آج مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا ہے۔

یہ تینوں عورتیں اس واقعے کے بعد روز میرے دفتر آتی تھیں اور آج بھی انہیں آنا ہے لیکن یہ چٹ جو چپڑاسی ابھی میز پر رکھ گیا ہے اس پر جو نام لکھے ہیں وہ ان کے تو نہیں ہیں، میرے پاس تو محمد بی بی، برکت بی بی اور بیگم روشن دین آیا کرتی ہیں، یہ شیریں لیلےٰ اور عذرا کون ہیں۔ میں نے چپڑاسی کو اشارہ کیا کہ انہیں اندر بھیج دو اور خود کسی فائل میں گم ہو گیا۔ جوتی فرش سے کٹ کٹ کرتی ہوئی مگر واضح آوازیں اٹھنے لگیں۔ اونچی ایڑیاں اور وہ بھی آہنی اور دو چار نہیں بلکہ چھ عدد فرش پر چل رہی تھیں لہٰذا وہ لپکا۔ لپکار کر ان کے آنے کی خبر دے رہا تھا یہ چوبی فرش خاکسار سہی مگر جہاندیدہ ہے۔ آوازیں بند ہوئیں، میز پر کچھ تو سایہ پڑھا اور کچھ خوشبو کے جھونکے آئے، میں نے ان جھونکوں کو کرسی پیش کی اور فائل مکمل کرنے کے لئے چند لمحے مانگے۔ میں بظاہر فائل میں گم تھا اور دراصل اسی ادھیڑبن میں لگا تھا کہ یہ کون ہیں اور کیا چاہتی ہیں۔

شیریں لیلےٰ اور عذرا تینوں جوان تھیں یا یوں کہئے ایک نوخیز، ایک نوجوان اور ایک جوان تھی۔ محتاط اندازے کے مطابق ایک سترہ برس دوسری بیس اور تیسری پچیس کی ہوگی۔ شیریں سب سے بڑی تھی، گدرے جسم بڑے بڑے کولھوں اور گول چہرے والی، اس نے سرخ ریشمی ساڑھی کے نیچے بغیر آستین کا مختصر سا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور اس کے گورے بدن کی ایک قاش بلاؤز اور جمپر کے درمیان جھانک رہی تھی اس کے بال کٹے ہوئے اور ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے لاپروائی سے ساڑھی کا پلو یوں ڈالا ہوا تھا جیسے ایک ہی وقت میں خود اعتمادی اور خودنمائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اس کے سینڈل، پرس، لپ سٹک، نیل پالش اور لپ اسٹک سبھی کا رنگ ایک تھا اور یہ موزونیت اس کی جاذبیت کو بڑھا رہی تھی۔ لیلےٰ سانولے رنگ اور تیکھے نقشوں والی لڑکی تھی، اس نے چست قمیض اور تنگ شلوار کے ساتھ گلے میں بل دار دوپٹہ ڈالا ہوا تھا، اس کی گردن صراحی دار اور انگلیاں مخروطی تھیں، اس کا جسم اگر مصور کے لئے تھا تو کمر شاعر کے لئے، اس کے بال سادے سے گھنگریالے تھے مگر اس نے اصلی بالوں کی نقلی چوٹیاں باندھی ہوئی تھیں، اس کی آنکھوں کے گرد سبز ہالہ بنا ہوا تھا اور سیاہ کی ایک لکیر آنکھوں کے گوشوں سے نکلی ہوئی تھی۔ اس نے بھوئیں نوچی ہوئی تھیں اور وہاں سیاہ پنسل سے ایک محراب بنائی ہوئی تھی۔ تنا کی پلکیں اپنی تھیں اور نہ ہی ناخن، معلوم نہیں اور کیا کچھ مصنوعی ہوگا مگر مجموعی طور پر وہ ایک ایسا موزوں مصرع تھی جسے دیکھ کر ہر ایک کو گرہ لگانے کی سوجھے۔ رہی عذرا تو وہ دبلے جسم اور گورے رنگ کی لڑکی تھی، اس نے سیاہ جین اور پیلا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور سارے بال پیچھے لے جا کر پونی ٹیل بنائی ہوئی تھی جن میں ایک سنہری چھلا جھلملا رہا تھا، اس نے جالی کا ایک شاپنگ بیگ گود میں لیا ہوا تھا جس میں جاکولیٹ کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔

یہ تینوں لڑکیاں بڑے اطمینان سے میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں، میں نے جس کی طرف دیکھا وہ مجھے بھری ہوئی دو نالی بندوق نظر آئی ان کی نگاہیں بے باک تھیں باتیں البتہ وہ رک رک کر بڑی ادا سے کرتیں۔ ان کے معنی خیز جملے بھی ادھورے تھے جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتیں پھر دیر تک مسکراتی رہتیں کبھی کبھی مسکراہٹ گوشۂ چشم سے پھیل کر ہونٹوں تک پہنچ جاتی خون کبوتر میں لتھڑی ہوئی قاشیں جدا ہوتیں اور موتیوں کی لڑیاں جگمگا اٹھتیں۔

جب گفتگو شروع ہوئی تو میں نے رسمی انداز میں پوچھا

"میں آپ کی کیا خدمت ادا کر سکتا ہوں۔

جواب میں وہ مسکرا دیں اور ایک نے کہا۔

"ہاؤ سویٹ آف یو۔"

میں ابھی سنبھلا نہ تھا کہ شیریں بولی

"خدمت تو ہمیں کرنا چاہیئے جو آپ کے پاس چل کر آئے ہیں ہمیں آپ سے کام سے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل ہم نے آپ کی شہرت سنی تو یوں ہی بلا نے آ گئے ورنہ ...." شیریں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"ہمیں آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق" لیلےٰ نے کہا

"اور میں تو صرف آپ کو دیکھنے آئی ہوں"۔ عذرا بولی "سنا تھا ...."

استنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے غیر ارادی طور پر پی۔ اے سے صرف اتنا کہا کہ میں کسی کال کے لئے فری نہیں ہوں میں نے ریسیور رکھا تو تینوں لڑکیاں فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھیں۔ مجھے وہ اچھی لگیں مگر کافی جھنجھلاہٹ ہوئی۔

میں نے اپنے وقت اور گفتگو کے رُخ کو ان لڑکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، یہ سوچے بغیر کہ جس ملاقات کی یہ ابتدا ہو اس کی انتہا کتنی جلد ہو سکتی ہے اور کون کون سے روگ لگا سکتی ہے ہم لوگ دیر تک بڑے خوشگوار ماحول میں گپ کرتے رہے، کافی کا دور بھی چلتا رہا، بات سے بات نکلتی رہی اور ہم ایک دوسرے کے قریب اور قریب تر ہوتے چلے گئے۔ بے تکلفی اور گرمجوشی بڑھتی گئی، قہقہے کمرے میں تیرنے لگے، میرے علم میں بھی خوب خوب اضافہ ہوا۔ شیریں ڈرائیونگ اور سومنگ کی شوقین ہے، لیلےٰ نٹنگ اور پکنک پسند کرتی ہے، عذرا والز، چاکولیٹ اور ریڈیو سیلون کی رسیا ہے۔ یہ تینوں ایک فیشن ایبل ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی ہیں، ان کے یہاں ٹیلیفون بھی ہے اور دو موٹریں بھی ہیں، یہ لوگ ڈنر کے لئے اکثر ایئرپورٹ جاتے ہیں اور وہاں رات گئے تک مختلف ملکوں سے آئے ہوئے طرح طرح کے جہاز اور مسافروں کو دیکھتے رہتے ہیں، چند پائلٹ ان کے جاننے والے ہیں اور جب ان کے جہاز آتے ہیں تو پھر یہ صبح سے پہلے واپس نہیں آ سکتیں۔ شیریں نے بتایا کہ اُسے ایکٹر اور پائلٹ بہت پسند ہیں لیلےٰ کرکٹ کے کھلاڑیوں پر جان دیتی ہے اور عذرا کا ہیرو صرف جمی ہے جمی کے بارے میں بات ہنسی میں ٹل گئی اور میں یہ بھی نہ جان پایا کہ وہ کالج کا لڑکا ہے یا کوئی پالتو چیز۔

یہ تو ظاہر تھا کہ تینوں لڑکیاں کھاتے پیتے اور آزاد گھرانے کی تھیں اور بہرطور ماڈرن کہلا سکتی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے ان کا تجربہ کہیں زیادہ وسیع اور گہرا تھا، وہ نیم وا آنکھوں، متبسم لبوں اور ادھورے جملوں کے اثر سے واقف تھیں اور ان کا برمحل استعمال کرتی تھیں۔ دیر تک وہ مکڑی کی طرح ایک نقرئی جال بنتی رہیں اور میں سب کچھ جانتے بوجھتے اس میں پھنستا رہا۔ دو ایک بار جی کڑا کر کے میں نے

اس جال سے نکلنے کی کوشش بھی کی مگر ہر کوشش عذرا کے ہونٹوں لیلےٰ کی زلفوں اور شیریں کے ننگے پیٹ کی تلاش سے ٹکرا کر ناکام ہوگئی۔

وہ چلنے کے لئے تیار ہوئیں، میں بھی تعظیماً کھڑا ہوگیا رخصتی کلمات کے ساتھ میں ان سے ہاتھ ملا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ آخر کس کام سے آئی تھیں وہ تینوں یکایک غمگین بننے کی کوشش کرنے لگیں، انہوں نے سرد آہ بھری اور کہا، ہم بڑی دکھی ہیں اور آپ سے بڑی امیدیں لے کر آئی ہیں۔ میں نے کام کی نوعیت پوچھی تو عذرا بولی۔

"پہلے وعدہ کیجئے کہ کر دیں گے۔"

میں نے سوال دہرایا تو لیلےٰ نے کہا۔

"معمولی سی بات ہی تو ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو شیریں نے بات پوری کر دی۔

"دیکھئے نا ہماری ممی کو جیل ہو گیا ہے آپ سپرنٹنڈنٹ کو کہہ دیں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

میں ایک طویل سکتے کے بعد سنبھلا اور صرف اتنا پوچھا کہ جیل کیوں ہو گیا معلوم نہیں کس نے جواب دیا کہ سمگلنگ کا کیس تھا، تھوڑا سا سونا اور کوکین بنگلے سے نکلی تھی۔

وہ رخصت ہوئیں تو میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور گہرا سانس لیا۔ میز پر کافی کی خالی پیالیاں پڑی تھیں، ایش ٹرے میں شیریں نے سگریٹ کے جو ٹکڑے پھینکے تھے اُن سے دھواں نکل رہا تھا۔ شیلف پر فائلیں جمع ہو گئی تھیں۔ کلاک پر نظر پڑی تو مجھے حیرت ہوئی کہ وقت دبے پاؤں اتنا آگے نکل گیا تھا۔

پٹے دار نے سلام کیا اور میز پر ایک چٹ رکھی۔ میں نے بڑی بے دلی سے اس پر نگاہ ڈالی، لکھا تھا — محمد بی بی، برکت بی بی، اور بیگم روشن دین۔

اڑان اپنی اپنی

امر سنگھ

وہ ماں کے بستر میں اُکڑوں پڑا تھا۔ ماں کا پلنگ اُسے ہمیشہ ہی اچھا لگتا۔ جب ماں بھی اس میں ہوتی تو یہ ایک طرح کی آسودگی دیتا اور جب ماں نہ بھی ہوتی تب بھی یہ آرام دہ محسوس ہوتا۔ نیند تو بہرحال اپنی پلنگڑی پر بھی آجاتی تھی۔ لیکن جو نیند اس میں گھس کر آتی تھی اس کی بات ہی اور تھی۔ ویسے اگر نیند نہ بھی آتی اور وہ آنکھیں کھولے اس پلنگ میں دبکا پڑا رہتا تو اسے یہ پلنگ ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک پُرسکون سیارے کی طرح معلوم ہوتا جہاں سے وہ ایک بالکل نئی اور انوکھی دنیا کا نظارہ کرتا رہتا۔

اور یہ دُنیا تھی سامنے والی نانک شاہی اینٹوں کی دیوار جس پر چونے گچ کا پلستر سیلن کی وجہ سے پھول کر اُدھڑ گیا تھا اور سفیدی کی بیسیوں تہوں اور فیروزی اور گلابی رنگ کے ڈسٹمپر کی دو تہوں کے نیچے سے جا بجا جھانکتا نظر آتا تھا۔ پلستر کے مختلف مقامات پر مختلف تہوں تک اُکھڑے ہونے کی وجہ سے اس پر مختلف اشکال اور رنگوں کے دھبے بن رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھبے عجیب وغریب پیکرات میں ڈھل جاتے اور پھر چھت کے ٹپکنے کے آثار مٹیلے اور سُرمئی رنگ کے دریا اور ندیاں نالے بن کر ان پیکرات کو قدرت کے گوناگوں کھلے نظاروں کے پس منظر مہیا کر کے ایک پوری دنیا کی تشکیل کر ڈالتے۔ جس میں یہ پیکرات ہاتھی، گھوڑوں، شیروں، بکریوں اور ہرنوں، کبوتروں، موروں اور چڑیوں۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی شکلیں اختیار کر لیتے۔ اور پھر اس دنیا کی ایک اور خوبی تھی۔ وہ یہ کہ ایک ہی پیکر اگر اپنے بائیں طرف کے پیکر کے ساتھ مل کر ماں کی گود میں لاڈ کرتے ہوئے بچے کا روپ دھار لیتا تھا تو اپنے دائیں ہاتھ والے پیکر کے ساتھ مل کر درخت کی ٹہنی سے جھولتا ہوا لنگور بن جاتا اور نیچے والے منظر کے ساتھ مل کر ایک سفید ریش بڈھے کا چہرہ۔

اور وہ گھنٹوں بستر میں دبکا ان پیکرات کے جوڑ توڑ کرتا اور ان کو نئے نئے معنی عطا کر کے نت نئی چیزوں کے نظارے کرتا اور محظوظ ہوتا رہتا۔

ایسی حالت میں وہ اس دنیا کے وجود کو بالکل بھول جاتا جو اس مکان کی نچلی چھت پر بستی تھی اور جہاں رہ رہ کر اس کی ماں اور باپ میں چخ چخ چلا کرتی تھی۔ اور اس ساری دنیا کو بھی فراموش کر دیتا جس کے بیچوں بیچ ماں باپ اور گھر کی یہ دنیا آباد تھی۔ لیکن یہ پُرشور دنیا بار بار اس کی حسین اور پُرسکون دنیا میں گھس کر اس کو تہس نہس کرتی رہتی۔ لیکن بار بار وہ اسے پھر سے بساتا رہتا۔

اس وقت بھی وہ ماں کے بستر میں دبکا سامنے کی دیوار کو تکے جا رہا تھا اور وہ اپنی دنیا کی سیر کرنے میں محو تھا۔ اس کی ماں

دو تین بار آواز لگا چکی تھی کہ وہ اسکول جانے کے لئے تیار ہو جائے لیکن وہ ان آوازوں کی طرف سے کان بند کئے مست مارے پڑا تھا اور دیکھ رہا تھا۔

— ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے ایک لڑکا (اس کی اپنی عمر کا) ایک ہرنی کے بچے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ ہرنی کے بچے نے اپنے دونوں اگلے کھر اٹھا کر لڑکے کی بڑھی ہوئی ہتھیلیوں پر ٹکا رکھے تھے۔ اور پیار بھری نظروں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک ہرنی گردن موڑے اپنے بچے کا بدن چاٹ رہی تھی ....

"او بے مدّی ......!"

اور پُر شور دُنیا پھر اُس کی پُر سکون دنیا میں آگھسی۔

یہ بلاقی کی آواز تھی جو معمول کے مطابق اُسے اپنے ساتھ مدرسے لے جانے کے لئے آیا تھا۔ اور اس کے دروازے پہ کھڑا آواز لگا رہا تھا۔ یہ آواز اس کے کان سے دماغ اور پھر دماغ سے دل میں چھید کرتی ہوئی گزر گئی اور اس کی حسین دنیا میں زلزلہ آنے لگا۔

"وے مدّی ...... وے مدنا .... وے مدن وے ......!"

اس کی ماں نے لگاتار تین آوازیں لگا کر اس کی دُنیا کو بالکل ملیا میٹ کر دیا۔

"آتا ہوں ....!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا اور بے دلی کے ساتھ پلنگ سے اُترنے لگا۔

وہ تو مست مارے پڑا رہتا لیکن اُسے معلوم تھا کہ اب اگر وہ زیادہ دیر یہاں رُکا رہا تو اس کی ماں خود اوپر آ جائے گی اور اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے گی۔ اس لئے جلدی سے وہ نیچے اُترا۔ اُسے بلاقی پر غصّہ آیا۔ لیکن پھر اُس نے یہ سوچ کر غصّہ تھوک دیا کہ اس میں بلاقی کا کیا قصور تھا۔ منشی جی نے اس کی ڈیوٹی اسے آواز دے کر مدرسے ساتھ لانے کی لگا دی تھی۔ جسے اگر وہ پوری نہ کرتا تو خود اس کی پٹائی ہو جاتی۔ اور پھر بلاقی اس کا دوست بھی تو تھا۔ اُس کی رفاقت میں بھی تو ایک طرح کی تسلّی ملتی تھی۔

"کہاں وفات ہو گیا تھا تو ....؟" ماں نے گھُرکا اور جلدی سے اس کا بستہ اس کے کندھے سے لٹکا دیا۔ دو اکنیاں اُسے دکھا کر اس کی جیب میں ڈال دیں۔ اور مدن من ہی من میں بھنّاتا دروازے کی طرف بڑھا جہاں بلاقی کھڑا کہہ رہا تھا "ارے یار .... جلدی چل نا!"

اسے بلاقی اپنے سبھی دوستوں سے زیادہ اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ ان سب سے مختلف تھا۔ اُس کی ناک کی نتھنی ہلتی دیکھ کر مدن کو ہنسی آ گئی۔ بلاقی کا اصل نام رام ناتھ تھا۔ چونکہ اس سے پہلے اس کے چھ سات بھائی مر چکے تھے۔ اس لئے اس کے والدین نے بچپن ہی میں کسی منّت کی بنا پر اس کی ناک میں ایک ننھا سا بُلاق ڈلوا دیا تھا۔ اس بلاق کی رعایت سے عرف عام میں اس کا نام بلاقی پڑ گیا تھا۔ خوش ہو کر مدن نے بلاقی سے اس کا حال چال پوچھا۔ جس کا جواب بلاقی نے رسمی طور پر دیا۔

اور پھر وہ دونوں مدرسے کی طرف روانہ ہوئے۔

گلی سے نکل کر وہ بازار میں پہنچے۔ گلی کے سامنے حلوائی کی دکان تھی۔ حلوائی گرما گرم پوریاں تل رہا تھا۔ پوریاں تلنے کی خوشبو ناک میں پہنچی تو بے شک وہ پیٹ بھر ناشتہ کر کے آیا تھا (نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے بعد ہی وہ بہانہ بنا کر چوری سے ماں کے بستر میں جا گھسا تھا۔ کیونکہ مدرسے جانا اسے بہت گراں گزرتا تھا) اس کی اشتہا بیدار ہو گئی۔ اس نے تجویز کیا کہ ایک ایک پوری کھا لی جائے۔ مگر بلاقی نے اسے جھاڑ پلائی کہ مدرسے کو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے اور مزید دیر ہو گئی تو ماسٹر جی پیٹیں گے۔ اور پھر کیا وہ گھر سے بھوکا آیا ہے؟ بلاقی

کی جھاڑ پی کر مدن نے اپنی اشتہا کا گلا گھونٹ دیا اور چپ چاپ بلاقی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

چوک میں شوالے کے ساتھ تیرتھ پتنگ فروش کی دکان تھی۔ پتنگ اڑانے کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے تیرتھ نے خوانچہ لگا لیا تھا۔ شوالے کی ساتھ والی دکان کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے تیرتھ نے اپنا خوانچہ دکان سے کافی آگے بڑھا کر بازار میں لگا رکھا تھا۔ خوانچے کے بیچوں بیچ انار دانے اور گڑ کو کوٹ کر بنائے گئے معجون نما چورن کا ایک مخروطی مینار کھڑا تھا جسے چاندی کے ورق لگا کر سجایا گیا تھا۔

اس مینار کو دیکھ کر مدن کے دل میں گدگدی شروع ہو گئی اور زبان سے رال ٹپکنے لگی۔ اس کا جی چاہا چورن کھایا جائے لیکن ابھی ابھی بلاقی نے اسے جھاڑ پلائی تھی اور اب چورن کا نام لیا تو وہ ایک بار پھر ڈپٹ دے گا۔ لیکن کھٹے میٹھے چورن کا چٹ پٹا ذائقہ اس کی زبان پر گھلنے لگا۔ اور وہ اس کی ترغیب کے آگے بے بس ہو گیا۔ ایک دزدیدہ نگاہ سے اس نے بلاقی کی طرف دیکھا۔ بلاقی کی نظر بھی چورن کے سیاہ اور روپہلے مینار پر ٹکی ہوئی تھی۔ "شاید بلاقی کے دل میں بھی چورن کھانے کی تمنا مچل رہی ہو" مدن نے سوچا اور اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

"بلاقی یار!" اس نے جھجکتے جھجکتے کہا "تھوڑا سا چورن لے لیں....؟" اور وہ بلاقی کے چہرے کو تکنے لگا۔

جی تو بلاقی کا بھی للچا رہا تھا۔ پوری کے معاملے میں تو سوال بھوک اور اشتہا کا تھا۔ مگر یہاں سوال بھوک اور اشتہا کا نہیں بلکہ مزے کا تھا۔ لیکن اس نے مدن کو پوری اس بنا پر نہیں کھانے دی تھی کہ اسکول کو دیر ہو رہی تھی اور اب چورن کھانے پر رضامندی ظاہر کی تو مدن کیا سوچے گا کہ چونکہ اب اپنا جی چورن کھانے کو چاہ رہا ہے اس لئے رکنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس نے نیم رضامندی سے چہرے پر فہمائش کے تاثرات لاتے ہوئے گھور کر مدن کی طرف دیکھا۔

"اس میں کوئی دیر نہیں لگے گی" مدن نے بلاقی کے چہرے پر فہمائش کے جھوٹے تاثرات دیکھ کر ملتجیانہ استدلال کے ساتھ کہا "جھٹ سے چورن لے لیں گے اور چلتے چلتے کھاتے جائیں گے"

یہ دلیل اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ بن گئی۔ بلاقی یوں تو خاموش رہا مگر اس کے قدموں کا رخ اپنے آپ ہی تیرتھ کے خوانچے کی طرف ہو گیا۔

"بھائی، ٹکے کا چورن دینا!" مدن کی آواز میں اطمینان تھا۔

تیرتھ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ مینار کے ایک حصے سے چٹکی بھر چورن الگ کر کے کاغذ پر رکھا اور مدن کی طرف بڑھا کر بولا،

"لے!"

"آگ لگا کر دے نا"

"ٹکے کے چورن کو آگ نہیں لگتی" خوانچے والے نے کہا۔

چورن کی لذت تو خیر ہوتی ہی تھی۔ لیکن جب اسے آگ لگتی تھی تو اس کا اپنا ہی لطف ہوتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آگ لگنے سے چورن کا مزا کسی حد تک مارا جاتا تھا اور اس کا ذائقہ کچھ کسیلا سا ہو جاتا تھا۔ مگر آگ لگتے وقت چورن کی چٹکی پر سے ایک شعلہ لپکتا اور پلک جھپکتے میں ہلکے نیلے سے گلابی اور پھر بسنتی رنگ میں بدل کر خاموش ہو جاتا کہ بس لطف آجاتا۔ دوسرے ہی پل ہوا میں سفید دھوئیں کا ایک ننھا منا بادل عجیب وغریب شکلیں اختیار کرتا ہوا پھیلنے لگتا اور ایک آدھ منٹ میں ہوا میں تحلیل ہو کر بالکل نابود ہو جاتا۔ اس ایک آدھ منٹ میں اشکال کی جس نئی نویلی دنیا کی جھلک نظر آجاتی وہ بے حد حیران کن اور نظر نواز ہوتی۔ ایک تھرل (THRILL) کا احساس اس کو دیکھنے سے ہوتا۔ چورن کا اصل لطف تو یہ آگ ہی تھی۔

"اچھا۔۔ا تو ایک آنے کا دے دو۔" مدن نے جلدی سے ایک آنہ پیشگی ہی خوانچے والے کو دیتے ہوئے کہا۔
خوانچے والے نے چورن کی ایک چٹکی کا اضافہ کرکے اسے کاغذ پر پھیلایا اور ایک پیڑا سا بنا دیا۔ اس نے ایک شیشی میں سے پوٹاشیم کلوریٹ کا تھوڑا سا سفوف اس پیڑے کے گڑھے میں انڈیل دیا۔ چورن کے بنارکی چوٹی پر اس نے ایک چھوٹی سی شیشی گاڑ رکھی تھی جس کے کھلے منہ میں ایک سلائی پڑی تھی۔ اس نے یہ سلائی نکالی اور گندھک کے تیزاب میں بھیگے ہوئے اس سلائی کے سرے کے ساتھ پوٹاش کو چھو دیا۔ ایک شعلہ لپکا اور چشم زدن میں نیلا، گلابی، نارنجی اور بسنتی رنگ بدل کر گل ہو گیا۔ اور پھر سفید دھوئیں کا ایک ٹکڑا ہوا میں پھیلا سے کی طرح پھیلنے لگا۔ خوانچے والے نے چورن کی پڑیا بنا کر مدن کے ہاتھ میں تھما بھی دی مگر وہ محوِ لطف حیرت ہوا اس دھوئیں کو تکتا رہا۔ اسی طرح جس طرح وہ اپنی ماں کے پلنگ کے سامنے والی دیوار کو تکا کرتا تھا۔
دھوئیں کا بادل ہوا میں تحلیل ہو کر ناپید ہو گیا اور مدن پھر اس پُرشور دنیا میں لوٹ آیا۔ اس نے چورن کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کی دو گولیاں بنائیں اور ایک گولی بلاقی کو دے دی۔ خوانچے سے ہٹتے ہوئے جس وقت مدن چورن کی گولی بلاقی کی ہتھیلی پر رکھ رہا تھا تو اس کی نظر بانس کی مہین مہین تیلیوں سے بنے ہوئے تین فٹ مربع پنجرے پر پڑی جس میں تیتر نے سُرخ بال رکھا تھا۔ پنجرے کے وسیع اور لق و دق فرش پر ایک تنہا سُرخ اداسی سے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔
مدن کو ایک دم وہ نظم "ایک پرندے کی فریاد" یاد آگئی جو ابھی کل ہی مدرسے میں استاد نے پڑھائی تھی اور لڑکوں سے کہا تھا کہ وہ اسے حفظ کر لیں۔ اور مدن کا دل بے حد اُداس ہو گیا۔ چورن اُسے بدذائقہ سا معلوم ہونے لگا اور اس نے اپنے حصّے کا چورن بھی بلاقی کو دے کر کہا:
"لو یار۔ یہ بھی تم ہی کھا لو۔"
بلاقی نے حیران ہو کر مدن کی طرف دیکھا اور اُسے اداس پا کر بولا:
"کیوں، کیا بات ہے؟ تم کیوں نہیں کھاتے؟"
"میرا جی نہیں چاہتا۔" مدن نے بے چین سا ہو کر جواب دیا۔
"جی نہیں چاہتا! کیوں؟"
"یونہی ——"
"ابھی ابھی تو اتنے شوق سے لیا ہے تم نے!" بلاقی نے پوچھا "اب ایک دم کیا ہو گیا ہے تمہارے جی کو؟"
"کچھ نہیں!" مدن کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔
"مدّی ۔۔۔۔۔!" بلاقی نے اُسے اپنے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا "یار کیا ہو گیا ہے تمہیں ایک دم" میں خاموش رہا۔
"لو یہ چورن کھاؤ!" بلاقی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "تمہیں میری قسم جو نہ کھاؤ تم ۔۔۔۔۔۔ اور ہاں۔ بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہے؟"
"بلاقی ۔۔۔۔۔۔!"

"ہاں!"

"یار، تم نے وہ..... تیرتھ کا سُرخ دیکھا؟"

"ہاں!" بلاقی نے کہا "کیوں، تمہارا بھی جی چاہتا ہے ایسا سُرخ پالنے کو؟"

"نہیں - یار نہیں"

"تو پھر؟"

"اسے دیکھ کر میرا دل اُداس ہوگیا ہے" مدن جذبات کی رَو میں بہتے ہوئے بولا "تم نے دیکھا وہ بے چارا کس طرح اکیلا اور اداس ہو کر بیٹھا ہے پنجرے میں؟"

مدن کو سنجیدہ دیکھ کر بلاقی بھی سنجیدہ ہوگیا۔

"ہاں!"

"یار! یہ لوگ کیوں آزاد پرندوں کو قید میں ڈال دیتے ہیں؟" مدن نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"اُن کا شوق ہے" بلاقی نے جواب دیا (وہ مدن سے پہلے ہی اپنے دل میں اُٹھنے والے اسی قسم کے سوالوں کے جواب اپنے بزرگوں سے پا چکا تھا اور پوری طرح مطمئن نہ ہونے کے باوجود سعادت مند بچے کی طرح بزرگوں کے کہنے پر صاد کر چکا تھا۔)

"یہ بھی کیا شوق ہوا!" مدن بولا "دوسروں کو دُکھ دے کر خوش ہونا یہ بھی کوئی "انسانیت" ہے؟"

بلاقی کو بھی کل والی نظم یاد آگئی اور اس کا نیم مطمئن دل بے اطمینان ہوگیا۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔

"میرا بس چلے تو" مدن بولا "جتنے بھی پرندے پنجروں میں ہیں، سب کو آزاد کر دوں"

"لیکن ہمارے بس میں ہو جب نا!" بلاقی پر بھی اداسی طاری ہونے لگی۔

"بلاقی یار! ایک بات ہے"

"کیا؟"

"کیوں نہ ہم تیرتھ سے کہیں کہ وہ اس پرندے کو آزاد کر دے"

"لیکن وہ ہماری بات نہیں مانے گا"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس نے سُرخ لڑانے کے لئے پال رکھا ہے"

"اچھا تو سرخوں کو لڑاتے بھی ہیں؟"

"ہاں - بڑی بڑی شرطیں بد کر" بلاقی نے اپنی جانکاری انڈیلی "اور تیرتھ کے اس سرخ نے تو کئی پالیاں ماری ہیں"

"یہ تو اور بھی بُری بات ہے" مدن نے ترس کے جذبے سے پگھلتے ہوئے کہا۔

"ایک تو اِن بے چاروں کو قید میں ڈالتے ہیں۔ اوپر سے انہیں آپس میں لڑاتے بھی ہیں۔ اتنے خوبصورت اور بھولے بھالے پرندوں پر..... یہ تو سراسر ظلم ہے۔ ہے نا بلاقی؟"

"ہاں، ہے تو سہی۔" بلاقی نے حامی بھری۔ "مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

مدن خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

"بلاقی!" مدن کو جیسے بات سوجھ گئی۔ "یار۔ کیوں نہ ہم اپنی کتاب والی نظم تیرتھ کو سنائیں۔ اور جب اس کا دل پسیج جائے تو اُسے کہیں کہ وہ اس مُرغ کو آزاد کر دے۔"

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔" بلاقی نے صاد کیا۔

سامنے مدرسے کا پھاٹک آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اندر چلے گئے۔

یہ ہفتے کا روز تھا۔ چوتھی گھنٹی پر چھٹی ہو جانے والی تھی۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مدن کو بھی یہ جان کر خوشی ہو رہی تھی کہ آج حساب کا اُستاد نہیں آیا تھا۔ اور آخری گھنٹی کیونکہ حساب کی تھی اس لئے چھٹی اور بھی جلدی ہو جائے گی۔ لیکن ان کی خوشی مایوسی میں بدل گئی جب ہیڈ ماسٹر نے چھٹی دینے سے انکار کر دیا اور لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی کتاب میں سے ایک ایک پیرا نقل کر کے دکھائیں۔ اس حکم پر مدن جھنجھلا اُٹھا۔ آخر اس میں کیا تُک ہے۔ نقل کرنے کا کام تو پہلے دوسرے درجے میں ہوتا ہے۔ اور اس کی تو املا میں بھی شاذونادر ہی کوئی غلطی ہوتی تھی۔ ایسے لڑکوں کو کتاب پر سے نقل کرنے کا کام دینا سراسر زیادتی ہے۔ بے ضرورت، بے مصرف صرف بٹھائے رکھنے کے لئے بٹھائے رکھنا حماقت آمیز ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

خیر کڑوا گھونٹ کر کے اس نے چند ہی منٹوں میں مطلوبہ پیراگراف نقل کر لیا۔ مدن اور بلاقی نے سب سے پہلے جا کر اپنی اپنی کاپیاں ہیڈ ماسٹر کو دکھا دیں۔ اور پوچھا کہ کیا اب انہیں گھر چلے جانے کی اجازت ہے۔ مگر ہیڈ ماسٹر نے ڈپٹ کر انہیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جانے کا حکم دے دیا۔

غصّے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے وہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس وقت مدن کو اسکول ایک قید خانہ معلوم ہو رہا تھا جس میں وہ خود ایک مجبور اور بے حس قیدی کی طرح بند تھا۔

چپ چاپ اور بے کار بیٹھے بیٹھے وہ بُری طرح بیزار ہو رہا تھا۔ ایک ترنگ سی اس کے دل میں اُٹھی۔ اس نے کتاب کھولی اور "پرندے کی فریاد" نکال کر پڑھنے لگا۔ بلاقی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ دونوں اس نظم کو استاد کی بتائی ہوئی دھن میں گا گا کر پڑھنے لگے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ   وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

. . . .

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے   دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

جوں جوں نظم آگے بڑھتی گئی۔ غم و اندوہ، حسرت و مایوسی کا ایک طوفان مدن کے سینے میں بیدار ہوتا گیا۔ اس نظم کا پرندہ تیرتھ کا مرغ بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اور پھر جیسے مرغ نہیں وہ خود پنجرے میں بند تھا۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ قریب تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑیں کہ چھٹی کی گھنٹی زور زور سے بج اُٹھی۔ چاروں طرف شور مچ گیا اور لڑکے اُٹھ اُٹھ کر باہر کو بھاگنے لگے۔ مدن نے جھٹ اپنی کتاب بستے میں رکھی اور بلاقی کی طرف دیکھا۔ بلاقی اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتا ہوا چلنے کو تیار تھا۔

وہ دونوں اسکول سے باہر نکل آئے۔

بازار میں پہنچ کر مدن کی نظر بازار کے بیچوں بیچ جا رہی بھیڑ سے کی گاڑی پر پڑی جس نے اپنے پیچھے شوالے والے چوک کا سارا منظر چھپا رکھا تھا اور اُسے یک لخت یاد آیا کہ اس گاڑی کے عین پیچھے شوالہ ہے۔ شوالے کے اُوپر سے گھوم کر اُن کا اپنا بازار آجاتا جس میں تھوڑی دُور جانے پر حلوائی کی دکان کے عین سامنے والی گلی میں اس کا گھر ہے اور چند منٹ تک چلنے کے بعد وہ اپنے گھر پہنچ جانے والا ہے تو اس کے دل سے اچانک وہ چھوٹی سی خوشی مفقود ہو گئی جو چھٹی کی گھنٹی بجنے پر اس کے دل میں ایک ننھے سے لیمپ کی طرح روشن ہو گئی تھی۔

یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو اس کا جی باہر نکلنے کو نہ چاہتا تھا۔ اسکول میں وہ چھٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کرتا رہتا تھا مگر جب اسکول سے نکل کر بازار میں پہنچتا تو اس کا دل گھر واپس جانے کو نہ چاہتا۔

اس کے قدم رُک گئے۔

”کیا بات ہے، مدنی!“ بلاقی نے پوچھا ”رُک کیوں گئے؟“

”بلاقی یار! اب گھر جائیں گے کیا؟“

”اور کیا؟“

”یار! ابھی سے گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔“

”تو اور کہاں جاؤ گے؟“

مدن خاموش ہو گیا۔ وہ اور جا بھی کہاں سکتے تھے۔ اور وہ اداس ہو کر بے دلی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

”یار! یہ بازار بھی کتنا چھوٹا ہے!“ مدن کو خاموشی جیسے گراں محسوس ہونے لگی تھی۔ ”جھٹ ختم ہو جاتا ہے۔“

”تمہارا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا؟“ بلاقی نے پوچھا۔

”نہیں!“

”تو میں بتاؤں؟“

”کیا؟“

”تمہارے پاس ایک اکنی ہے نا صبح والی؟“

”ہاں!“

”اور ایک اکنی میرے پاس بھی ہے۔“

”پھر؟“ مدن نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا۔

”تو ہمارے پاس ہو گئے دو آنے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تیرتھ کی بھمیری پر آٹھ بار داؤ لگا سکتے ہیں۔ بس خوب مزا رہے گا۔ وقت بھی گزر جائے گا اور میٹھی گولیاں بھی کھانے کو مل جائیں گی۔“

"اور کیا معلوم قسمت کھل جائے۔" مدن نے خوشی سے چہک کر کہا "اور ہماری سوچ ... اس کے منہ سے بر آجائے۔"

"ہاں۔ پھر ہمارے پاس بہت سی گولیاں ہو جائیں گی اور ہم دن بھر مزے سے چوستے رہیں گے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔"

اور وہ دونوں تیزی سے چوک کی طرف چلنے لگے۔

شوالے کے اوپر سے گھوم کر جوں ہی وہ تیرتھ کی دکان کی طرف مڑے تو ان کے دل بجھ کر رہ گئے۔ تیرتھ کی دکان بند تھی۔ انہوں نے اردگرد چاروں طرف نظر دوڑائی کہ شاید اس کا خوانچہ کہیں نظر آجائے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ تیرتھ کی دکان کے سامنے کھڑے مایوسی اور بے دلی سے اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔

اچانک سُرخ کی سریلی سیٹی کی آواز اُن کے کان میں پڑی۔ وہ سُرخ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ ایک سیٹی پھر گونجی اور جھٹ ہی سُرخ نے اپنے نغمے کی پوری استھائی الاپ ڈالی۔

آواز اوپر کی طرف سے آرہی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دکان کی چھت پر۔ منڈیر کے کونے کے اوپر تیرتھ کا پنجرہ پڑا تھا اور اس میں سرخ بڑے جوش کے ساتھ گلا پھلا پھلا کر گا رہا تھا۔

اس کا گانا سُن کر مدن کو پھر اسی پرندے والی نظم کا خیال آگیا اور سُرخ کی ہر تان کے ساتھ نظم کے مصرعے یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ اس کا دل رحم سے بھر آیا۔ پنجرے میں بند سُرخ کی فریاد اس کی برداشت سے باہر ہونے لگی اور جب :

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

کے آخری مصرعے اس کے ذہن میں گونجے تو اس نے روہانسی آواز میں پکارا ——

"بلاقی!"

"ہاں!"

"سُن رہے ہو، بے چارہ سُرخ کس طرح رو رو کر فریاد کر رہا ہے۔"

"یار۔ میرا بس چلے تو ابھی اس کو آزاد کر دوں۔" بلاقی نے بھی گلوگیر ہو کر کہا۔

اُنہوں نے پھر چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ بازار میں قریب قریب خاموشی اور ویرانی چھا رہی تھی۔ اِردگرد کے مکانوں کی کھڑکیوں میں بھی کوئی نظر نہ آتا تھا۔ مندر اُداس پڑا تھا۔ دکاندار دکانوں پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ تیرتھ کی دکان کی چھت پر سُرخ کے سوا اور کوئی متنفس دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شوالے کی چھت پر جانے والی تنگ سیڑھیوں پر مرمّت کی وجہ سے بلبے کی تہہ جم کر ایک ہموار سی چڑھائی بن گئی تھی۔ لیکن اس پر چڑھ کر چھت پر پہنچنا آسان کام نہ تھا۔

"بلاقی!"

"ہاں!"

"کیوں نہ ہم ان سیڑھیوں پر چڑھ کر شوالے کی چھت پر چلے جائیں۔" مدن نے تجویز پیش کی۔

"وہاں جاکر کیا کریں گے؟" بلاقی نے پوچھا

"وہاں سے پھاند کر تیرتھ کی چھت پر چلے جائیں گے۔ اور ——" اس نے بلاقی کا ردِ عمل جانچنے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ بلاقی کی آنکھوں میں اشتیاق و اتفاق دیکھ کر وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا" اور —— چپکے سے پنجرے کی کھڑکی کی تیلی نکال دیں گے اور بے چارہ مرغ جو آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے۔ پھر سے اُڑ جائے گا۔

"لیکن۔ جو کسی نے دیکھ لیا تو ——" بلاقی نے خدشہ ظاہر کیا

"دیکھے گا کون؟" مدن نے کہا "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے"

بلاقی نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر مدن کا بازو دبا کر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "اچھی طرح دیکھ لو۔ . . . دیکھ لیا نا!"

"دیکھ لیا" مدن نے پھر چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا۔

وہ دونوں آگے پیچھے اینٹوں ڈھیلوں کے انبار پر سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اوپر چڑھ گئے۔ چھت پر پہنچ کر اطمینان کی خاطر انہوں نے پھر اردگرد کا جائزہ لیا۔ سبھی مکانوں کی کھڑکیاں یا تو بند تھیں یا بالکل خالی تھیں۔ آہستہ سے منڈیر پھاند کر وہ تیرتھ کی چھت پر آگئے۔ یہاں سے ایک بار پھر چاروں طرف جھانک کر تسلی کر لی اور پھر آہستہ آہستہ اس پنجرے کے قریب آگئے۔ مرغ گاتا گاتا ایک دم خاموش ہو گیا۔ مدن کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی رہائی کا انتظار کر رہا ہے۔ چپکے سے مدن نے کھڑکی کی تیلی کھینچ لی اور وہ پیچھے ہٹ کر مرغ کے اڑنے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن مرغ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

ایک لمحہ، دوسرا لمحہ، تیسرا لمحہ . . . . لیکن مرغ نے پھر سے گانا شروع کر دیا۔

"معلوم ہوتا ہے مرغ کو نظر نہیں آیا کہ ہم نے تیلی کھینچ لی ہے" بلاقی نے سرگوشی کی اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پوری کھول دی۔ مرغ اُڑ کر تیلیوں کی پچھلی دیوار پر جا بیٹھا۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ کر انتظار کرنے لگے۔ مرغ پھدک کر دیوار سے اُتر آیا اور فرش پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"یہ اُڑتا کیوں نہیں؟" مدن نے تعجب کے ساتھ پوچھا "اب تو کھڑکی پوری کھلی ہے"

"پتہ نہیں —— شاید کھڑکی اسے نظر نہ آ رہی ہو" بلاقی نے کہا" میرا خیال ہے اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔

اور مدن کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بلاقی نے اپنا ہاتھ پنجرے میں ڈال دیا۔ مرغ پھڑپھڑا کر پچھلی دیوار کی تیلیوں پر جا آویزاں ہوا۔

"بے وقوف، ہم تجھے آزاد کرانے آئے ہیں" بلاقی نے جھنجھلا کر زیرِ لب کہا اور ہاتھ پھر مرغ کی طرف بڑھایا۔ مرغ بے چینی سے پھڑپھڑاتا ہوا پنجرے میں ادھر اُدھر اڑنے لگا۔

"او —— تیرتھ۔ اوئے تیرتھا۔ اوئے لڑکے تیرا مرغ اڑائے دے رہے ہیں"

مدن اور بلاقی نے خوف زدہ ہو کر دیکھا۔ سامنے والی کھڑکی میں ایک موٹا تو ندیل براہمن اضطراب کے ساتھ اپنے جنیؤ کا دھاگہ پھراتے ہوئے تیرتھ کو خبردار کر رہا تھا۔ ایک ثانیہ بھی رُکے بغیر وہ دونوں سر پر پاؤں رکھ بھاگے اور ملبے پر سے گرتے لڑکھڑاتے اُتر کر تیزی سے اپنی گلی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

گلی میں داخل ہو کر وہ رُکے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ گلی کی نکڑ پر آ کر بازار میں شوالے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ تیرتھ

انہیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اُن کے دل کو کچھ قرار آیا اور وہ اُن عمودی ریلوں کا سہارا لے کر باتیں کرنے لگے جو اس نئے زمین میں گاڑ رکھی تھیں کہ گاڑیاں وغیرہ گلی کے اندر نہ جا سکیں۔

بلاقی فکر مند ہو رہا تھا کہ اب مدرسے کون سے راستے سے جایا کریں گے۔ چوک سے گزرے تو تیرتھ پکڑ لے گا کہ ہم نے اُس کا سُرخ اڑا دیا ہے۔ مدن کی رائے تھی کہ کیونکہ تیرتھ نے ہمیں دیکھا نہیں اس لئے وہ کیوں کر جان سکے گا کہ اس کا سُرخ ہمیں نے اڑا دیا ہے۔ بلاقی کا خیال تھا کہ وہ موٹا پنڈت اس کو بتا دے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مدن کی اس کو پہچان نہ رہی ہوگی لیکن بلاقی کے بارے تو وہ ضرور تیرتھ کو بتا دے گا کہ نقلی والے لڑکے نے اس کا سُرخ اڑا دیا ہے۔ مدن نے بلاقی کی تسلی کے لئے خیال دوڑایا کہ پنڈت کو اس کی نقلی ہرگز ہرگز نظر نہ آئی ہوگی کیونکہ بلاقی پنجرے کی آڑ میں تھا۔ اور پھر جب وہ بھاگے تھے تو ہمہ وقت اُن کی پشت ہی پنڈت کی طرف رہی تھی۔ اور نقلی تو بلاقی کی ناک میں پڑی ہوئی تھی۔

بلاقی کی کافی حد تک تسلی ہو گئی۔ مگر اب مدن کی رائے تھی اور کافی تکلیف دہ رائے تھی کہ ایک بار چوک میں سے گزر کر تسلی کر لی جائے کہ سرخ واقعی اڑ چکا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ کوئی ہمیں پہچانتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بلاقی کے سر پہ سے بلا آتی ہوئی مل گئی جب مدن نے خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود ہی چوک میں جائے گا اور بلاقی وہیں کھڑا رہ کر اس کا انتظار کرے۔ بلاقی مطمئن ہو گیا۔ مگر جب مدن چلنے لگا تو بلاقی کو وہاں اکیلے کھڑے رہنا دو بھر دکھائی دینے لگا۔ اس نے مدن کو روک لیا اور رائے دی کہ مدن کو واپس اسی رستے سے چوک کی طرف نہیں جانا چاہئے۔ بلکہ گلی کے پچھلے راستے سے عقبی بازار میں جائیں اور وہاں سے اوپر سے گھوم کر شوالے والے چوک میں سے اس طرح گزریں جیسے ہم اِس واقعہ سے قطعی بے خبر ہیں اور دن میں پہلی بار وہاں سے گزر رہے ہیں۔ بلاقی نے اس مہم میں خود کو بھی شامل تو کر لیا تھا۔ مگر اب اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ مدن کے ساتھ رہے گا تاکہ آڑے وقت میں ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ کسی کو اگر شک آمیز نظروں سے اپنی طرف دیکھتا پائیں تو اول تو بلاقی مدن کی آڑ میں ہو کر نکل جائے۔ بالفرض پکڑے بھی جائیں تو صاف مُکر جائیں اور کہیں کہ ہم تو مدرسے سے آ رہے ہیں۔

ان تمام وسوسوں کے ساتھ خود کو تسلیاں دیتے ہوئے اندر سے سہمے سہمے مگر بظاہر بالکل بے پروا وہ چوک میں سے گزرے تیرتھ کی دکان کھلی تھی اور وہ اپنا خوانچہ لگائے بیٹھا تھا۔ قریب ہی دکان کے بڑھاؤ پر اس کا پنجرا پڑا تھا۔

تیرتھ کو دیکھ کر اُن کا دل دھڑکا۔ بلاقی مدن کی اوٹ میں ہو گیا مگر مدن نے خوف کے تاثرات چہرے پر نہ آنے دیئے۔ بے فکری کا انداز بنائے چلتا چلتا کنکھیوں سے وہ تیرتھ کے چہرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ مدن کو یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ تیرتھ کی نظریں شک و شبہ کی آمیزش سے مبرا تھیں۔ وہ انہیں اسی طرح معمول کے انداز سے دیکھ رہا تھا جس طرح دوسروں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اس کے سامنے سے گزر گئے۔ مدن کے دل میں ایک بار راس کی رَوَلٹ پر قسمت آزمائی کرنے کا خیال آیا مگر اس نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ ساتھ چلتا گیا۔

جب وہ پھر اپنی گلی کے سرے پر پہنچ گئے تو ان کے دل ہر طرح کے خوف اور وسوسے سے آزاد تھے۔ اور بلاقی نے تو یہاں تک کہہ دیا:

"ارے یار! بات تو کچھ بھی نہ تھی۔ ہم خواہ مخواہ ہی ڈرتے رہے۔"

اور پھر وہ اپنی کچھ دیر پیشتر کی حالت کو یاد کرتے، اپنی ہی باتوں کو دُہراتے اور انہیں مضحکہ خیز رنگ میں پیش کر کے ہنستے رہے۔

اور اس طرح ہنس ہنس کر انہوں نے خوف کے اس ہنگامی تناؤ کو ختم کر ڈالا اور جب یہ ہنگامی تناؤ ختم ہوگیا تو مستقل تناؤ نے جو اس ہنگامی تناؤ کی وجہ سے تحت الشعور میں چلا گیا تھا مدن کے دل میں پھر سے سر اُبھارنا شروع کیا۔ ایک دم وہ خاموش ہوگیا۔ بلاقی نے چونک کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور وہاں سنجیدگی طاری دیکھ کر وہ خود بھی خاموش ہوگیا۔

"لیکن یار! وہ سُرخ تو کم بخت اڑا ہی نہیں" مدن کے چہرے پر کرب آلود بے قراری کے آثار نمودار ہوگئے۔

"حیرانی ہے" بلاقی نے کہا "کھڑکی آخر کافی دیر تک کھلی رہی ہوگی"

"ہاں۔ اور اتنی دیر میں ایک چھوڑ پچاس سُرخ اُڑ کر آزاد ہو سکتے تھے"

"معلوم ہوتا ہے یہ سرخ بہت بدقسمت ہے" بلاقی بولا

"نہیں بے وقوف ہے" مدن کو سُرخ پر غصہ آنے لگا "ہم نے جو اتنی محنت کی، اس قدر خطرہ مول لیا۔ اس احمق نے سب بے کار کر دیا"

اپنی اس پرخطر محنت کے ضائع چلے جانے کا احساس کر کے بلاقی کو افسوس کے ساتھ فکر بھی ہونے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ اس ناکامی کا ازالہ کس طرح کیا جائے۔

"مدنی۔!" آخر اُسے سوجھ ہی گئی "تمہاری بات ٹھیک ہے۔ تیرتھ کا سُرخ واقعی احمق ہے۔ وہ ہماری بات سمجھا ہی نہیں"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ وہ ہماری بات ہی نہیں سمجھا"

لیکن مجھے ایک بات سوجھی ہے" بلاقی بولا۔

"کیا؟"

"وہ ہمارے پڑوس میں ہے نا، دامودر پنڈت!"

"ہاں۔"

"اس نے ایک طوطے کو قید کر رکھا ہے"

"ہوں!"

"وہ طوطا ہماری طرح باتیں بھی کرتا ہے" بلاقی نے قدرے توقف کے بعد مدن کو ہمہ تن توجہ پا کر کہا "میرا خیال ہے ہم اسے آزاد کرائیں"

"بالکل ٹھیک!" مدن نے خوشی سے تمتما کر کہا "لیکن اُسے اڑائیں گے کیسے؟"

"دامودر پنڈت اس وقت 'چندے' مانگنے گیا ہوگا۔ طوطے کا پنجرہ اُس کی برساتی میں سائبان کے ساتھ لٹک رہا ہوگا۔ ہم اپنی چھت پر چڑھ کر دامودر کی برساتی میں اُتر جائیں گے اور چپکے سے پنجرے کا دروازہ کھول دیں گے"

منصوبہ پوری طرح تیار تھا۔ وہ دونوں بلاقی کے گھر پہنچے۔ بستے ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ چھت پر جا چڑھے۔ بلاقی کی ماں نے اسے آوازیں دیں کہ وہ مدرسے سے آیا ہے۔ بھوکا ہوگا اس لئے کچھ کھا پی لے۔ مگر بلاقی نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی اُسے بھوک نہیں اور وہ تھوڑی دیر بعد کھائے گا۔ اور وہ مدن کو ساتھ لے کر دامودر پنڈت کی برساتی میں اُتر گیا۔ منڈیر میں سے نیچے جھانک کر انہوں نے اطمینان کر لیا کہ گھر میں کوئی ہے تو نہیں۔ مگر گھر میں ہوتا کس نے تھا۔ دامودر پنڈت مجرّد بوڑھا تھا اور اس وقت چندے روٹیاں وغیرہ مانگنے گیا ہوا تھا۔

پس پورے اطمینان کے ساتھ وہ طوطے کے پنجرے کے پاس چلے گئے۔ مدن نے لوہے کی تیلیوں سے بنائے گئے پنجرے کے دروازے کی کنڈی میں سے لوہے کی دیسی ساخت کی مڑی تڑی میخ نکال دی۔

طوطا جو پہلے "گنگارام، ما، چوری کھانی اُوں" کی رٹ لگا رہا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر طائیں ٹائیں کرنے لگا۔ مدن کو محسوس ہوا کہ وہ آزادی کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔ اُس نے جھٹ پنجرے کا دروازہ کھول دیا، طوطا سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

"گنگارام، ہم نے تمہارا پنجرہ کھول دیا ہے۔" مدن نے طوطے کو مخاطب کیا "اب تم آزاد ہو سکتے ہو۔ اور اپنے بال بچوں اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوشی سے اُڑانیں بھر سکتے ہو۔"

مگر گنگارام اپنے اڈے پر بیٹھا گردن گھماتا رہا۔ مدن کو خیال ہوا کہ طوطا باری باری سے اپنے دونوں کان آگے کر کے ان کی بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"یار! یہ گنگارام بہرہ معلوم ہوتا ہے۔" بلاقی نے اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

"گنگارام ما!" مدن نے بہرے کو سنانے کے لئے بلند آواز سے پکارا۔

"شی شی۔" بلاقی نے خوف زدہ ہو کر اُسے متنبہ کیا "کوئی سن لے گا۔"

"تو پھر کیا کریں؟" مدن نے دبی زبان سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے۔" بلاقی بولا "ہم دروازے کے آگے سے ہٹ جائیں اور پچھلی طرف جا کر اسے باہر کو دھکیلیں۔ شاید ہمیں سامنے کھڑے دیکھ کر یہ ڈرتا ہو۔"

وہ دونوں آگے سے ہٹ کر پنجرے کی پچھلی طرف آ گئے۔ طوطے نے جھٹ اپنا رُخ پچھلی طرف کر لیا اور خوف زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

مدن نے طوطے کو دروازے سے باہر دھکیلنے کے لئے اپنی انگلی پنجرے میں ڈالی۔ طوطے نے جھپٹ کر کاٹ لیا۔

"اوئی!" کر کے مدن نے انگلی باہر کھینچ لی۔ اور اسے اپنے منہ میں ڈال سہلاتے ہوئے بولا،

"بدمعاش، احسان فراموش!"

اور پھر غصے سے جھنجھلا کر گویا ہوا "بلاقی، بند کر دے یار پنجرہ۔ پڑا مرنے دے اس حرامی کو۔"

اور بلاقی نے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا۔

اچانک خفگی، جھنجھلاہٹ، قرار اور اکتاہٹ کے ملے جلے احساسات کے درمیان مدن کے دل میں گھر جانے کی خواہش شدت سے بیدار ہو گئی۔

اُترن

احمد شریف

اس کرسچان لڑکی کا نام تو اصل میں گریس سونی تھا۔ مگر اس کے جاننے والے سب اسے سوہنی کہتے تھے۔ حالانکہ سوہنی سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔

ایڈورڈ روڈ، کرپارام کمپاؤنڈ یا لندن بک کمپنی کے گرد و نواح میں ہر شام کسی نئے مرد کے ساتھ گھومتے پھرتے آپ نے بھی اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ شام کے وقت جب وہ بن ٹھن کر نکلتی تو ایڈورڈ روڈ پر واشنگٹن ٹائپ رائیٹر کمپنی سے لیکر فارس کارپٹس تک کے دکانداروں کے دلوں میں ہلچل سی مچ جاتی وہ ان دکانداروں کی لمبی قطار کے سامنے رامز ہوٹل میں رہتی تھی جو سلطنت برطانیہ کی طرح سکڑتے سکڑتے اب صرف دو چھوٹے چھوٹے رہائشی کمروں پر مشتمل رہ گیا تھا۔

- ان دنوں میں اپنی دکانوں میں پاشا کتب فروش کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔

ایک شام ہم دوکان کے پچھلے حصے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ اچانک پاشا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارنا بھول گیا اور پیالی ہاتھ میں لیکر ایک ٹک باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ برآمدے میں سوہنی میز پر رکھے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ پاشا نے اپنی حالت پر کسی حد تک قابو پایا اور چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کہنے لگا۔

- سالی گاہک کا انتظار کر رہی ہے۔

برآمدے کا زینہ چڑھتے میں نے اُسے دیکھ لیا تھا اور ابھی تک اس کے حسن سے مسحور سا تھا۔ لیکن میری حالت اتنی غیر نہ تھی جتنی پاشا کی۔ میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا۔ پاشا نے چائے کی آدھی پیالی پرے رکھ کر اپنی ڈھلکی ہوئی پتلون کو توند پر کسا، سوہنی کی طرف دیکھ کر توند پر ہاتھ پھیرا اور پھر میری طرف جھکتے ہوئے ایک آنکھ ذرا سی آنکھ میچ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"جسم دیکھو کیسا کسا ہوا ہے"۔

ویسے میں بھی اس وقت سوہنی کے سراپا میں ٹامک ٹوئیے مار رہا تھا۔ اس نے گھنگریالے کالے بالوں کا ایک پھول پیشانی پر بنا کر باقی بال کانوں کے پیچھے پھیلائے ہوئے تھے جن میں سونے کی تاروں کے ریزے چمک رہے تھے لمبی پلکوں میں گھری بڑی بڑی شفاف اور چمکیلی آنکھیں سوتے جاگتے کا قصہ کہہ رہی تھیں غازے کی سرخی اس کے رخساروں کے رنگ میں گھل مل گئی تھی بسکرٹ کے کھلے گریبان سے آدھی نوسیں اور گولائیاں جھانک رہی تھیں۔

وہ دونوں طرف الماریوں میں لگی کتابوں کا جائزہ لیتی اندر آگئی۔ اسے قریب سے دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ اتنی حسین نہ تھی جتنی دور سے نظر آتی تھی۔ لیکن مایوسی کا احساس جلدی ہی جاتا رہا۔ اس کے چہرے کے خدوخال رفتہ رفتہ آنکھوں کو جچنے لگے۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اوپر کا رسیلا ہونٹ تھا جو نچلے ہونٹ پر اس نفاست سے رکھا ہوا تھا کہ ذرا سا دبانے سے رس ٹپک پڑنے کا احتمال تھا۔

وہ پاشا کے قریب رک کر ایک کتاب کے نیم عریاں سرورق کو بغور دیکھنے لگی۔ بظاہر لاپروائی سے اس نے اس سڈول شانے کے گرد سکرٹ کے کسے ہوئے فیتے میں ایک انگوٹھا ڈال کر اسے ذرا سا اوپر اٹھایا اور پاشا سے مخاطب ہوئے بغیر پوچھنے لگی۔

"از دیئر اینی تھنگ ایب نورمل مسٹر پاشا"

اس نے پاشا کے نام کا پہلا حصہ پا دونوں ہونٹ ملا کر اس طرح ادا کیا جیسے پیار سے پاشا کا ہوائی بوسہ لیا ہو۔ پاشا کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور تیلون آپ ہی آپ توند پر سے ڈھلک گئی۔ اس نے ذرا سا منہ کھولا مگر کوئی آواز نہ نکلی۔ سوہنی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ نہ ہی اس کے جواب کا انتظار کیا۔ وہ مڑی اور خراماں خراماں باہر کی طرف چل دی اور میری نگاہیں ایک ایک قدم پر اس کے جسم میں پڑتے سوسو بلوں میں کھو گئیں۔ میں نے کئی بار اس کے پیچھے آنے والوں کو قدم بڑھا کر آگے آتے، اس کی صورت کا جائزہ لیتے اور پھر دانستہ رفتار سست کر کے پیچھے رہ جاتے دیکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کا جسم پشت کی جانب سے بے پناہ جاذب اور پرکشش تھا

پاشا ابھی تک منہ کھولے دروازے کی طرف تک رہا تھا۔ سوہنی دکان سے ذرا ہٹ کر بس سٹینڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ پاشا کی آنکھوں کے سامنے ہلا کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس بلایا اور اس کے شوق کو ہوا دینے کی خاطر ہنس کر کہا۔

"پاشا کہو تو ٹانکا لگوا دیں۔"

اس نے بہت لمبی سانس بھری، اور رغم سے چور لہجے میں بولا۔

"ہمارے ایسے نصیب کہاں۔"

اس کے دل سے نکلی ہوئی آہ ابھی کراہ بن کر دکان میں گونج رہی تھی کہ ڈاکٹر شفقتین کی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ وہ سٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے، کمر پر ہاتھ رکھے، برآمدے میں میز کے پاس کھڑا بس سٹینڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم اٹھ کر برآمدے میں آگئے۔

"ہوریبل۔"

اس نے ہمیں دیکھ کر سسکی سی لی۔ اور اپنے کلینک کی طرف چلا گیا۔ اس کا کلینک پاشا کی دکان سے آگے سٹائلش ٹیلرز سے ملا ہوا تھا اس کے پیچھے تلے قدموں کے تعاقب میں میری نظر برآمدے کی ٹائیلوں پر پڑی جہاں پان کی کئی پیکیں ایک دوسری کے پہلو میں کسی غریب کے بچوں کی طرح آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھیں۔ سٹائلش ٹیلرز کا کرنشا ریان کھانے کا عادی تھا۔ لگتا تھا اس شام اس نے معمول سے زیادہ ہی پان کھائے تھے۔ اور بار بار پیک تھوکنے باہر آیا تھا۔

بس آئی اور چلی گئی۔ سوہنی اس میں سوار نہ ہوئی۔ وہ ٹہلتی ٹہلتی نگاہوں کا ایک ہجوم اپنے ساتھ لئے، فارس کارپٹس کا موڑ کاٹ کر فیروزسنز کی زیر عمارت کی طرف چلی گئی۔ واشنگٹن ٹائپ رائیٹر کمپنی کا مکینک غفور، جس نے اس شام نہ جانے کتنی مشینوں کے پرزے کھول ڈالے تھے۔ ابھی تک بس سٹینڈ سے متصل کھمبے کے پاس کوئی گم شدہ پیچ ڈھونڈھ رہا تھا۔

اسی شام پاشا پر ٹوٹ کر اداسی چھائی رہی۔ میں نے اسے بہلانا چاہا مگر وہ ایک پاؤں کرسی پر رکھے، ماتھا تھامے، دکان پر آنے

جانے والوں سے بیزار، اس ملاح کی طرح بیٹھا رہا جس کی ناؤ ابھی ابھی ڈوبی ہو۔ بالآخر میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

ایک دن میں وہاں پہنچا تو دکان خالی پڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ پاشا غائب تھا۔ میں کرسی کھینچ کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں نثار کھڑا اپنی دکان سے نکلا۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر پیک تھوک کر مونچھیں پونچھتا ہوا اندر چلا گیا عفور کلینک ایک ٹائپ رائٹر پر جھکا لہک لہک کر گا رہا تھا۔

کو ٹھے توں اُڈ کانواں

سدّ پٹواری نوں جندِ سجناں دے ناں لانواں

اسی اثنا میں میری نظر پاشا پر پڑی۔ وہ ڈاکٹر ثقلین کے کلینک کے سامنے پودوں کے پاس ستون کی آڑ لئے مضحکہ خیز حالت میں کھڑا تھا۔ اس سے آگے فارس کارٹس کا مالک بوڑھا خان ترُوس حالت میں بیٹھا بے موسمی سیب چھیل رہا تھا۔ سارا ماحول ایسا تھا جیسے کوئی لڑکی تن کر انگڑائی لے رہی ہو۔ میں نے پاشا کو آواز دی۔

"پاشا"

مجھے اپنی آواز ضرورت سے زیادہ اونچی اور کرخت سنائی دی۔ پاشا چونک کر مڑا اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر روانگی کے وقت انجن کی طرح بھاپ چھوڑی۔

"شی"

اور انگلی سے ڈاکٹر ثقلین کے کلینک کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا سوہنی اندر ہے۔ میں اٹھ کر کلینک کے سامنے بس سٹینڈ پر آکھڑا ہوا۔ اتنے میں بس آکر رکی اور خلیل اترا۔ وہ بھی پاشا کی دکان پر کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ میری اس سے اچھی جان پہچان تھی۔ میں نے اس وقت اس سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور ہم وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ میری ساری توجہ ڈاکٹر کے کلینک کی طرف تھی۔ سوہنی شوکیس پر جھکی ڈاکٹر سے محوِ گفتگو تھی۔ ان کے پاس ایک انگریز سٹیج ایکٹر کھڑا ٹھوڑی پر آگے کی طرف مڑے ہوئے چند بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ سوہنی فکر مند لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر' میں موٹی ہوتی جا رہی ہوں"۔

ڈاکٹر کی آنکھوں میں دئیے سے جھلملائے۔ اس نے بھرپور نگاہوں سے سوہنی کے بھرے بھرے جسم کو دیکھا۔ سوہنی ہنس کر بولی۔

"دیکھو نا ڈاکٹر ننھی سی جان اور ہزار غم۔ پھر بھی —"

"لیکسیٹولو"۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ "برو کلیکس"۔

"نو' تو لیسدار اور چپچپا۔ بروکلیکس مجھے اچھا نہیں لگتا"۔ سوہنی نے برا سا منہ بنایا اور مڑ کر سٹیج ایکٹر کی طرف مڑ کر انگریزی میں بولی۔ "اینو ٹھیک رہے گا۔ کیوں ڈارلنگ"۔

ڈارلنگ نے اپنے وجود کو ذرا سا خم دے کر ہاں میں ہاں ملا دی۔ اینو کی شیشی لیکر سوہنی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وزن کرنے کی مشین ہے ڈاکٹر؟"

"ہوں ہوں"۔

ڈاکٹر نے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا اور پھرتی سے شوکیسوں کے پیچھے سے نکل کر دروازے کی طرف آیا۔ مشین لکڑی کے بکس میں بند دروازے کی اوٹ میں پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے دروازہ ذرا سا بھیڑ کر بکس کھولا۔ سوہنی نے مشین پر چڑھ کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور پوچھنے لگی۔

"کتنا وزن ہے ڈاکٹر؟"

اس وقت یونہی مجھے خیال آیا کہ اگر وہ پاشا سے وزن پوچھتی تو وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر فوراً صحیح صحیح وزن بتا دیتا۔ ڈاکٹر وزن دیکھنے کی خاطر اپنا رخسار سوہنی کی ران سے رگڑتا ہوا جھکا اور وزن دیکھ کر بولا

"ایک سو بیس پاؤنڈ"

"او گاڈ"

سوہنی نے جھرجھری لی اور بیہوش ہو کر ڈاکٹر پر ڈھیر ہو گئی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ ایکٹر نے ٹوپی اتاری اور بدحواس ہو کر جلدی جلدی ہوا کرنے لگا۔ سوہنی نے ڈاکٹر کی باہوں میں پڑے پڑے آنکھیں کھول دیں اور دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ڈاکٹر تم بہت سویٹ ہو۔"

اور پھر ایکٹر کے بازو میں بازو ڈال کر دکان سے باہر گئی۔ پاشا ابھی تک ستون کے پاس بت بنا کھڑا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرے تو سوہنی خلاف توقع رکی اور گرم جوشی سے بولی۔

"ہلو خلیل"

"ہلو سوہنی"

سوہنی نے اپنا ہاتھ جلدی سے سکرٹ پر رگڑا اور خلیل کے سامنے پھیلا کر کہنے لگی۔

"ذرا میرا ہاتھ تو دیکھو مسٹر خلیل"

خلیل نے سوہنی کے نرم و نازک ہاتھ پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔

"بہت نازک ہے"

"کم آن ڈارلنگ"

ایکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔ خلیل کو اس کی مداخلت ناگوار گزری۔ اس نے اسے ٹھیٹ پنجابی میں ڈانٹا۔

"اوئے ٹھہر اوئے کاغانی بکرے"

وہ کھسیانا ہو کر داڑھی کھجانے لگا۔ سوہنی اٹھلا کر بولی۔

"دیکھو نا میرا ہاتھ"

خلیل نے بڑی آہستگی سے پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔

"آج رات تمہارے ستارے روشن ہیں"

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ایکٹر کو لے کر رامز ہوٹل کی طرف چلی گئی۔ پاشا جا چکا تھا۔ میں نے خلیل سے کہا۔

"یار خلیل کسی طرح اپنے پاشا اور سوہنی کے ستارے ہی ملا دو۔"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اکا دکا ستارے ٹمٹما رہے تھے اور گھمبیر آواز میں بولا۔

"سوہنی کا ستارہ نوازل سے مہینوال کے ستارے سے ملا ہوا ہے۔"

اس پر اس وقت نہ جانے کیسے کیسے اسرار منکشف ہو رہے تھے۔ میں چپ ہو رہا اور ہم دونوں پاشا کی دکان کی طرف چلے آئے۔

پاشا کی دکانداری روز بروز چوپٹ ہونے لگی۔ یوں تو سوہنی سبھی کے اعصاب پر سوار تھی۔ لیکن ڈاکٹر تھاقبین وقتاً فوقتاً اسے آوارہ اور بدچلن کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ غفور مکینک اس کی یاد میں اور بھی اونچے سروں میں گانے لگتا۔ نثار کنڑے سے اور کچھ نہ ہوا۔ تو اس نے پان کھانے کی تعداد بڑھا دی اور خواہ مخواہ دل کا مریض بن بیٹھا۔ البتہ ایک پاشا ایسا تھا جس کو سچ مچ روگ لگ گیا۔ وہ ہر وقت اداس اور گم سم بیٹھا رامز ہوٹل کی طرف دیکھتا رہا۔ چند دنوں سے زندگی اس سے روٹھ سی گئی تھی۔

ایک دن میں اور خلیل دکان کے اندر بیٹھے پاشا کی حالت زار پر آنسو بہا رہے تھے کہ ایک خوش پوش گاہک دوکان پر آیا۔ پاشا نے جو کہ برآمدے میں بیٹھا تھا، اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ گاہک نے اس کی سرد مہری پر خفیف سا ہو کر خود ہی پوچھا۔

"ٹائمز آ گیا؟"

"پرسوں آیا تھا۔"

پاشا نے منہ پھیر کر روکھا سا جواب دیا۔ گاہک نے کہا۔

"ہمارے ہاں تو پہنچا نہیں۔"

"پرسوں ہی بھیج دیا تھا۔"

"اچھا!"

"جی۔"

پاشا سانپ کی طرح پھنکارا۔ گاہک کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ بیچارا اپنا سا منہ لے کر واپس ہو گیا۔ جب وہ دکان سے اتر کر دور چلا گیا تو پاشا زیر لب حقارت سے بڑبڑایا۔

"چلے آتے ہیں منہ اٹھائے۔ اپنے دفتر تک کی خبر نہیں کیا آتا ہے، کیا جاتا ہے۔"

دراصل اسے گاہکوں کا آنا بہت ناگوار گزرنے لگا تھا۔ دکان کی تباہی اور اس کی بگڑی ہوئی حالت پر خلیل کو بہت ترس آیا۔ کہنے لگا۔

"اے کاش......"

اس نے ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ سوہنی دکان کے سامنے سے گزری۔ خلیل بھاگا بھاگا ہوا باہر گیا اور چٹکی بھر اس کے پیروں کی مٹی اٹھا لایا اور پھر جا کر کچھ پانی کا ایک گلاس بھر کر دھیتی پر چڑھ گیا۔ وہ دھیتی پر بیٹھا دیر تک پانی میں سوہنی کے پیروں کی مٹی گھول کر اپنی پامسٹری اور نجوم کے ٹوٹکے چلاتا رہا۔ میں نے اگر بتیاں اٹھا کر جگہ جگہ روشن کر دیں۔ دکان کی ٹھہری ٹھہری فضا میں نقلی صندل کی

تیز خوشبو کے ساتھ دھوئیں کی تپلی تپلی لکیریں لہرانے لگیں۔

خلیل دو چسکی سے انہ اتو اس کی آنکھوں میں کشف کے گلابی ڈورے مچل رہے تھے اس نے گلاس پاشا کی طرف بڑھا کر کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح کہا۔

" لو، پیو"

" کیا ہے ؟"

" پاشا کے چڑچڑے پن میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔ خلیل مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

" شربت وصال"۔

پاشا پہلے تو ہچکچایا پھر گلاس لیا اور سارا پانی ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گیا۔

خلیل کی عملیات ہاتھ کے ہاتھ رنگ لے آئیں۔ پاشا کی دکان کئی رات تک کھلی رہنے لگی۔ ہم خوش تھے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا اور دکان تباہ ہونے سے بچ گئی۔ لیکن ہماری خوش فہمی جلدی ہی دور ہو گئی۔

سوہنی پر جان دینے والوں کی کمی نہ تھی۔ ایسے بھی تھے جو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے صدر کے بارونق بازاروں اور سڑکوں پر گھوم کر اپنے مال کی نمائش کرنے میں فخر محسوس کرتے اور ایسے بھی تھے جو چھپ چھپ کر اس کے کمرے میں آتے اور چند گھڑیاں اس کے ساتھ گزار کر رات کے اندھیرے میں واپس ہو جاتے۔ پاشا کی دکان رات گئے تک کھلی رہنے کا راز یہ تھا کہ اس نے ان لوگوں کو دیکھنے میں تسکین کا ایک پہلو نکال لیا تھا جو سوہنی کو قریب سے دیکھ کر رات کو واپس آتے تھے۔

خلیل کو پتہ چلا تو اس نے سر پیٹ لیا اور سر پکڑ کر دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر کسی سے بات کئے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

کئی روز بعد ایک دن شام کے وقت وہ دکان پر آیا تو بہت خوش تھا۔ ادھر پاشا کی حالت بارش میں مسلسل بھیگنے والے کاغذ کی سی ہوتی جا رہی تھی اس نے پاشا کے قریب آکر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور پھر اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے بولا۔

" سوہنی جا رہی ہے"

پاشا نے متعجب سا ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اس نے ڈھلکی ہوئی پتلون سلیقے سے توند پر کسی اور اسی وقت دکان بند کر کے ساتھ ہو لیا۔

ہم رامز ہوٹل کے برابر آفتاب ریسٹوران میں جا بیٹھے اب پتہ نہیں یہ اتفاق تھا یا خلیل نے سچ مچ سوہنی سے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ادھر چائے آئی ادھر سوہنی پہنچ گئی۔ پاشا نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ٹکٹکی باندھ کر گھور اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور پھر گردن جھکا کر جیسے دل میں اتری ہوئی تصویر یار دیکھنے لگا۔ سوہنی خلیل کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی اور ہنس کر ہاتھ اس کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ خلیل اس کے گورے گورے ہاتھ پر جیسے جیسے ہاتھ پھیر کر بغور لکیروں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر فکر مند لہجے میں سوہنی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

" آج کی رات تم پر بہت بھاری ہے"

اس نے تھوڑی دیر توقف کر کے سوہنی کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل دیکھا اور سرگوشی کی۔

"میرا گھر خالی ہے۔"

"میں بھی خالی ہوں۔"

وہ کسی بجھی ہوئی لیمپ کی طرح اشارے کو کافی سمجھ کر آہستہ سے بولی۔ ہم جلدی جلدی چائے پی کر اُٹھ کھڑے ہوئے

خلیل کا فلیٹ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کمرے میں ہم بیٹھے وہ سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی دیوار کے ساتھ، بڑے پلنگ کے سرہانے کھونٹی پر ریشمی کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ خلیل نے کونے میں رکھی ہوئی ہلکے نیلے رنگ کے بڑے کاغذی شیڈ والی ٹیبل لیمپ جلا دی۔ نیلگوں ماحول میں سوہنی کا حسن اور بھی نکھر آیا۔ خلیل اُٹھا اور الماری کے نچلے خانے سے کپڑوں تلے چھپا کر رکھی ہوئی وسکی کی آدھی بوتل نکال لایا اور دَور چلنے لگا۔ میں چونکہ پیتا نہیں اس لئے پینے والوں کا رنگ دیکھنے لگا۔

ماحول کی اجنبیت جلدی ہی دور ہو گئی۔ نشے نے وہ پردہ اٹھا دیا جو ابھی تک ہم لوگوں کے درمیان حائل تھا۔ سوہنی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے مچلنے لگے۔ اس نے اپنی جگہ پہلو بدل کر دہکتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر تر کیا اور ایک پہلو پر ذرا سی جھک کر سکرٹ کا گردن سے کمر تک کا زپ کھول ڈالا اور آپ ہی آپ بڑبڑائی

"بہت گرمی ہے۔"

زپ کھلنے سے سکرٹ کا کھلا گریبان اور بھی ڈھلک گیا اور پاشا کی نگاہیں گریبان میں اتر گئیں۔ سوہنی میری طرف سے ذرا سامنے موڑ کر بیٹھی تھی۔ اس کی مرمریں پیٹھ پر ریڑھ کی ہڈی کی کڑیاں گداز جسم پر قدرے ابھری ہوئی تھیں۔ میرا جی چاہا دو کڑیوں کے درمیانی ننھے سے گڑھے میں دھیرے دھیرے انگلی پھیرنے لگوں۔

ہلکی ہلکی خنکی کے باوجود سوہنی کی شفاف پیشانی اور رسیلے ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمایاں ہو گئیں اور اس نے سکرٹ اتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔ حسین عورت کو کپڑوں میں چھپی دیکھ کر آدمی کی حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ سوہنی کو نیم عریاں دیکھ کر تو میرے وجود میں آگ سی لگ گئی لیکن اس محفل میں میری حیثیت شہ بالے کی سی تھی۔ ایک برات کے دو دو دولہے موجود تھے۔ میں وہاں سے کسی بہانے کھسکنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ خلاف توقع پاشا نے آگے بڑھ کر سوہنی کی بریسیئر کے ایک حصے میں انگلی ڈال کر کٹوری سی اوپر اٹھا دی۔ اس چھیڑ خانی پر سوہنی کے جسم نے احتجاجاً سر ہلایا اور پھر معمول پر آ گیا۔ اس قسم کے حرکات غالباً سوہنی کے روزمرہ میں داخل تھیں۔ اس نے بریسیئر اتار کر پلنگ کے سرہانے پر ڈال دی اور چاندنی پر چت لیٹ گئی اس کا جسم چھت سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ خلیل، جو اتنی دیر سے خاموش تھا، دھیرے سے بولا۔

"سوہنی۔"

"ہوں۔"

اس نے لیٹے لیٹے ہنکارا بھرا۔ خلیل کہنے لگا۔

"تم کیسی سوہنی ہو؟"

"کیوں؟"

"ہماری سوہنی نے تو چناب میں ڈوب کر مہینوال کے لئے جان دے دی تھی۔"

"دے تو میں بھی دوں پر کوئی مانگنے والا ہی نہیں۔"

بات کرتے کرتے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پلنگ کے سرہانے جا کھڑی ہوئی اس کا پسینے میں تر ابور جسم دیکھ کر گمان ہوتا تھا۔ جیسے مہینوال کی سوہنی چناب پار کر کے ابھی ابھی کنارے پر آئی ہو۔ ہم سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اس نے کھونٹی پر ریشمی کپڑوں کے درمیان لٹکی ایک بریسٹر اتاری اور اُسے الٹ پلٹ کر سائز کا اندازہ کرتی ہوئی اپنی جگہ آبیٹھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے بریسٹ پہنی پھر اپنے بھرے بھرے جسم کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تولا اور خلیل سے کہنے لگی۔

"مسٹر خلیل، یہ بریسٹر مجھے دے دو۔"

خلیل کے سامنے موجود کا خون یک دم سمٹ کر اس کے چہرے پر چھلکنے لگا۔ وہ بریسٹر غالباً اس کی بیوی کی تھی۔ لیکن اس نے بات بنا دی ہنس کر کہنے لگا۔

"اتزن لے کر کیا کرو گی اسی کے ساتھ کی نئی لے دیں گے۔"

"یہی دے دو مسٹر خلیل" سوہنی نے لجاجت سے کہا اس نے گردن جھکا کر لمبی سانس لی اور بولی۔ "اس میں سے عورت کی بُو آتی ہے"
باشا جلدی سے آگے بڑھا اور سوہنی کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ بڑی عقیدت اور احترام سے اسے دونوں آنکھوں پر ملا اور پھر میرا بازو پکڑ کر اس طرح زینہ اتر آیا جیسے کسی عبادت گاہ سے نکل رہا ہو۔

بند راستے

احمد سعید

سوتے سوتے زلیخہ کا سانس آہستہ آہستہ تیز ہو جاتا، اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑنے لگتیں اور اس پر پسینے کی بوندیں ابھر آتیں، وہ گھبرا کر کروٹ پر کروٹ لیتی، پھر کچھ عرصہ کے لیے چُپ، بے حس و حرکت پڑی رہتی جس کے بعد اس کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہونے لگتے — یوں معلوم ہوتا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ اور وہ چیخنا چاہتی ہو۔ لیکن یہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتی۔ اب اُس کے اندر سے عجیب گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی جیسے اُس کے پہاڑی وطن پر بارش ہو، اس میں بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہوں جو بادل بن کر خونخوار درندے بن کر آگے بڑھتے اور اس پہاڑی علاقے پر آناً فاناً چھا جاتے اور ان میں سے بجلی کے کوندے دور دور سے آنے کو لپکتے، بجلی کہیں گرتی دکھائی دیتی اور گڑگڑ گڑ پہاڑی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتیں اور راستے روک دیتیں۔ جب بارش نہ ہوتی تو ریچھ اور شینہ (چیتے) اپنی کھوہ سے باہر نکلتے، ریچھ جو نوجوان عورتوں کو بھی اُٹھا کر لے جاتے اور سننے میں آیا تھا، ان کے تلوے چاٹ چاٹ کر انھیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیتے اور — اور — پھر یہ آدمی کے کسی کام کی نہ رہتیں۔ شینہ (چیتے) ان سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے کیونکہ یہ برق کی مانند تاریکی سے شکار پر آنِ واحد میں لپک کر اسے دبوچ لیتے۔ یہ چتکبرے، سبک رفتار جادوگر جن کی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح چمکتیں اور دہکتیں اور دن میں نیلگوں، گہرے ساکن پانی کی طرح اپنے دیکھنے والے کو مقناطیسی انداز میں پتھرا سی دیتیں — زلیخہ کے پہاڑی وطن کے دامن میں بھی ایسی جھیل تھی جس کے کنارے چیتے اور ریچھ پانی پیتے، الھڑ دوشیزائیں پانی بھرتیں اور بعض اس کی تہہ میں جھانکتے جھانکتے اس کی نذر ہو جاتیں۔

اس خواب کے اندھیارے میں ایسی دو آنکھیں — شینہ کی آنکھیں۔ زلیخہ پر حملہ آور ہوتی دکھائی دیتیں، پھر ایک ریچھ نما ہاتھ اس کی طرف بڑھتا، اُس کی کمر کے گرد حمائل ہو جاتا اور اُسے اُٹھا کر چھپاک سے تاریکی میں تحلیل ہو جاتا۔

"شینہ! شینہ!!" کبھی کبھار وہ خواب میں چلّا بھی اُٹھتی۔ یہ سنکر نہ صرف اُس کے پاس ہی سویا ہوا اُس کا بڑا بھائی عزیز گل بلکہ ان کے اڑوسی پڑوسی بھی لرز گئے تھے جیسے کالا چور نوجوان لڑکیوں کو رات کے وقت ان کے گھر سے سوتے سوتے اُٹھا کر لے جاتا اور ان سے زبردستی کر کے انھیں چچوڑی ہوئی ہڈی کی مانند کھیتوں میں پھینک جاتا۔ وہ شینہ کی مانند اندھیری راتوں میں چپکے سے گھر میں کہیں سے آ ٹپکتا تھا جسے آخرکار سپیشل پولیس نے بڑی مشکل سے گرفتار کیا تھا۔ نیوٹاؤن میں اس نے کچھ عرصہ

کے لیے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ پکڑے جانے پر وہ پولیس کا ایک افسر نکلا تھا۔
لیکن آج کی یہ چیخ نیوٹاؤن میں ڈیڑھ برس سے کام کرتی زینتے کے حلق سے نکلی تھی۔ اسے سن کر لوگوں نے کہا۔
"بیچاری بڑی دکھی ہے۔"
"اس کے شوہر کو بارہ برس کی قید جو ہو گئی ہے۔"
"توبہ توبہ۔ بارہ برس!"
"ایسا کون جرم کیا تھا اس نے؟"
"سنا ہے بہت بڑا ڈاکو ہے اپنے علاقے کا!"
"چھوڑ کیوں نہیں دیتی ایسے بدمعاش کو؟"
"بدنصیب کی جوانی برباد ہو جائے گی!"
"جبھی بھائی کے پاس یہاں آگئی ہے۔"
"پیٹ کیا کیا نہیں کرواتا۔"
"اس کا بھائی پہلے یہیں گھر کا کام کرتا تھا۔ اب کسی فیکٹری میں ملازم ہے۔"
"بیگم، تم کیا یہ قصہ لے بیٹھیں رات کے وقت۔"
"بڑے ظالم ہوتے ہیں یہ مرد بھی!"
"اخباروں میں تو آئے دن عورتوں کے ایسے قصے بھی چھپتے ہیں۔"
"بہت ترس آتا ہے تو سوت بنا لاؤ۔"
"پھر تو آپ کی مدت کی من کی مراد پوری ہو جائیگی۔ اسی سے مرد لوگ اس سے اتنی ہمدردی جتاتے ہیں۔ اگر میرے گھر اب کہیں آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی اس کی!"
"چھ چھ چھ! میں تو مذاق کر رہا تھا بیگم۔ پرست بھولنا، مولوی لوگ ایک سے زیادہ شادی پر پابندی کے سخت خلاف ہیں!"
"میں ایسے مولویوں کی داڑھی نہ نوچ لوں۔"
"لاحول ولا۔ اچھا بابا، اب سو جاؤ۔"
"سو جاؤں؟ زینتے! شہر میں شیر کہاں سے آیا۔"
"شیر خاں، شیر خاں!" مشتاں نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے بھائی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔
اس کے ردعمل میں عزیز گل نے اپنی طرف سے بڑا یقین دلایا کہ شیر خاں جلد رہا ہو کر گھر واپس آجائے گا اور زینتے کے مصیبت کے دن کٹ جائیں گے۔
...... آٹھ نو مہینے تک شیر خاں کا مقدمہ چلتا رہا تھا۔ ملزم کو اس دفعہ ڈاکہ میں بلکہ قتل میں مدد دینے کے جرم میں بارہ برس قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی۔ استغاثہ کے مطابق شیر خاں نے لاش کو غائب کرنے میں قاتل کی سب سے زیادہ مدد کی

تھی۔ اس کے باوجود شیر خاں کے لواحقین نے نہ صرف اسے بلکہ اس کے چچا قاتل کی سزا میں بھی تخفیف اور رحم کے لئے اپیل کی تھی۔ ایسے جرائم پیشہ خاندان کا نام سن کر کوسوں تک کے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس نے اپنے ہی خاندان کے دو تین افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے تھے۔ چنانچہ جب شیر خاں کے چچا، جمعہ خاں، کو سزائے موت ہوئی تو جہاں غیروں نے شکرانے کے دو دو نفل پڑھے، وہاں اس کے بعض اپنے رشتہ داروں نے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ اس نے انھیں ایک بڑے موذی سے نجات دلائی تھی۔ شیر خاں کو طویل سزا ملنے پر بھی انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔ گو چوری چکاری، ڈاکہ اور رہزنی تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی لیکن اس نے اپنے گاؤں کی چند دوشیزاؤں کی عصمت سے بھی کھیل ڈالا تھا کیونکہ اسے جب کبھی فرصت ملتی وہ کنواری لڑکیاں تاڑ کر انھیں یکے بعد دیگرے اپنی چیرہ دستی، طوفانی جوانی کی بھٹی میں جھونکنے کے متعلق سوچتا رہتا حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ چوری اور عورت اس کے لئے لازم و ملزوم ہو گئے — اُسے پہلی قید بھی عورت کے لیے چوری کرنے کے الزام میں ہوئی تھی — یہ زلیخہ تھی، اس کی خالہ زاد بہن۔

چھریرہ جسم، چیل جیسا دراز قامت، شیر جیسا پھرتیلا اور طاقتور، ہلکی ہلکی بھوری مونچھیں رکھے دمکتا گورا چٹا رنگ، بانکا چھیلا یہ تھا شیر خاں جسے خوف سے لوگ شیر خاں شیر کے نام سے یاد کرتے۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا، عید بقر عید کے موقعہ پر مظفر آباد سے انگریزی طرز کے بال کٹواتا، سر پر قراقلی رکھتا، ڈب میں کمانی دار چاقو جس سے اس نے ایک حملہ آور شیر کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالا تھا اور نتیجتاً شیر کا لقب حاصل کرنے کا مستحق بھی ہو گیا تھا۔ چوری چکاری تو اسے ورثے میں ملی تھی اور جوانی اس پر یوں ٹوٹ کر برسی تھی جیسے پل جھپکنے میں کیکر کے جھنڈوں کو بیر بیر چننے والے لگ جاتیں۔ جونہی اس کی مسیں بھیگنے لگیں نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک پیدا ہونے لگی اور اُسکے ہونٹوں پر اپنے دیس کے عشقیہ گیت مچلنے لگے۔

چن چڑھیا جداباں والا تے نال چناں دے ملیاں
تو ایں پری ہیں خاکی بندا کدوں طبیتاں رلیاں
چن چڑھیا مبارک والا دستے نال پینے دے لالی
کڈ کلیجہ ہے توں گئی اُوں

پنجرہ رہ گیا خالی

اور اس کا پہلا مخاطب زلیخہ تھی جس کی عمر اس وقت بمشکل تیرہ چودہ برس تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے اس کے اندر کیوں کھد بد ہونے لگتی حالانکہ شکل صورت میں اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ ایک عام پہاڑی لڑکی تھی۔ وہ اپنے خالہ زاد بھائی شیر خاں کو دیکھ کر گھبرا سی جایا کرتی۔ جب کبھی وہ عید بقر عید کے دن ان کے گھر آتا تو اُسے یوں دیکھتا جیسے اسے نگل جانا چاہتا ہو — "چور کہیں کا! مجھے چوری کی عید دینے آیا ہے۔ یہ جتانے کہ ان لوگوں کے پاس چار پیسے ہیں، بدمعاش کہیں کا!" وہ دل ہی دل میں کہا کرتی لیکن اُسے منہ پر یہ بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔ "بھلا میرے سامنے یہ کیوں ایسے گندے گیت گاتا ہے؟" البتہ چور اور بدمعاش ایسے القاب اُس نے شیر خاں پر دو تین مرتبہ جڑ دیئے تھے۔ یہ سن کر اُس کی ماں نے اُسے

خبردار کیا تھا کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ اگر زلیخے نے کبھی پھر شیر خاں کو اس نام سے پکارا تو وہ سوتے میں اُس کا گلا گھونٹ دے گا۔ اور جب اس نے خود مذاقاً شیر خاں سے زلیخے کے دیئے ہوئے القاب کا ذکر کیا تھا تو بے طرح والہانہ انداز میں قہقہہ لگاتا ہوا اُسے راستے میں اکیلا گھیر بیٹھا تھا۔

"اری ذرا ٹھہر جا — یہ تو بتا میں نے تیری کونسی چوری کی ہے۔ مت بھول، یہ چور ہی تجھ سے شادی کرے گا۔"

"تھوہ بھتوہ،" یہ سن کر زلیخے نے جیسے طیش میں آکر زمین پر تھوک دیا تھا اور زمین پر پاؤں پٹخ کر روہانسی ہو کر بولی تھی۔ "بدمعاش! میں تیری کیا لگتی ہوں جو تو مجھ سے شادی کرے گا۔"

"بس تیرا یہی غصہ، یہی نظر مجھے کھا گئی ہے۔ یاد رکھ تجھے شیر خان پسند کرتا ہے۔ قسمت جاگ اُٹھی ہے تیری!"

"مجھے — مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ بس مجھیں۔ مجھیں۔ ایک بار کہہ دیا۔"

"اگر انکار کرے گی تو — جانتی ہے نا مجھے؟" زلیخے یہ سن کر اور شیر خاں کے بدلتے تیور دیکھ کر یوں یکلخت دم بخود ہو گئی تھی جیسے وہ اُسے واقعی اُٹھا کرلے جائے گا اور کہیں کسی غار میں لے جا کر قتل کر دے گا لیکن شیر خاں کو زلیخے ایک مجسم دعوتِ کار معلوم ہوتی جو اس کے لیے عجب مہمیز کا کام دیتی۔ اس کے تحت اُس کے دل میں اُسے بیوی بنانے کی خواہش تیز تر ہو جاتی۔ اگر اس کی جگہ جیبر جان، مہر جان، قابل جان وغیرہ ہوتیں تو وہ انھیں دہلیں شیں کی طرح دبوچ لیتا۔ ایسی لڑکیوں میں سے ایک گل بے کا باپ شیر خاں کی دست درازی کرنے کی کوشش کرنے کی خبر سن کر چھوی سے کر اس سے بدلہ لینے اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شیر خاں کے چچا جمعہ خاں کو جونہی یہ خبر ملی تھی وہ بجلی کی طرح وہاں آ پہنچا تھا کہ یہ معاملہ اس وقت بڑی صلح صفائی سے رفع دفع کرا دیا گیا تھا۔ مگر اس واقعہ کے تیسرے روز ہی اس نے گل بے کے باپ کا چپکے سے صفایا کر دیا۔ جمعہ خان اس واردات سے ۱۲ گھنٹے قبل گاؤں سے باہر چلا گیا تاکہ کسی کو اس پر شک نہ گزرے۔ قتل کی رات شیر خاں ایک قریبی گاؤں میں ایک شادی میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں کو یقین تھا کہ مذکورہ قتل چچا بھتیجے کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ان کا بال تک بیکا نہ ہوا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد شیر خان نئے کپڑے پہنے معصومانہ خود اعتمادی سے زلیخے کا رشتہ لینے خود اپنی خالہ کے گھر آیا۔ اُس نے ایک ہی وار میں یہ قلعہ سر کر لیا کیونکہ اس نے رسمی علیک سلیک کرنے کے بعد اپنی خالہ کے سامنے سو سو کے دس نوٹ گن کر رکھتے ہوئے کہا۔

"— یہ زلیخے کے لیے ہیں۔ ایک ہزار روپے — ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے اتنی قیمت نہیں دی۔ اپنے گھر کی لڑکی تو — خالہ — خیر —"

شیر خاں کے ایسے غیر متوقع رویے اور اندازِ استدعا سے پہلے تو اس کی خالہ سناٹے میں آ گئی، اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ لیکن ایک ہزار روپے اپنے سامنے پڑے دیکھ کر اس کے اوسان بہت جلد بحال ہو گئے۔ اپنی نظریں نوٹوں سے ہٹا کر اس نے شیر خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"— لڑکی کو ہوش تو آ لینے دو شیر خاں —"

"کیا باتیں کرتی ہو خالہ — اپنے گھر جا کر جوان ہو جائے گی ۔ تم ۔ تم ۔ فکر نہ کرو ۔ ٹھیک ہی تو ہے ۔ اتنی لمبی چوڑی، ہٹی کٹی ہے ۔ ٹھیک ہے، سب ٹھیک" شیر خاں نے جواباً ہنستے ہوئے کہا۔

اس کی خالہ جانتی تھی کہ وہ بچپن سے ہی بڑا ضدی اور منچلا تھا ۔ جس چیز پر اس کا دل ایک بار آ جاتا اُسے لے کر ہی چھوڑتا ۔ اور اب کا شیر خاں آج سے پندرہ بیس برس پہلے کا بچہ نہ تھا ۔ وہ اپنے مشہور و معروف ڈاکو اور قاتل چچا جمعہ خاں کا دستِ راست تھا ۔ اس کا رات گئے نیلنے کا رشتہ مانگنے اکیلے ان کے ہاں آ نا اسی اَمر کا ثبوت تھا ۔ جب اس نے ہولے سے دروازے پر دستک دی تھی تو ایک لمحہ کے لیے اس کی خالہ کا دل بیٹھ گیا تھا اور اُس کی بکریاں تک چونک پڑی تھیں ۔ کیونکہ اتنی رات گئے کسی کے گھر صرف چور ہی آ سکتا تھا ۔" لیکن گھبراؤ نہیں خالہ ۔ میں ہوں شیر خاں تمہیں دروازہ کھولو ۔" سن کر اس کی خالہ کی جان میں جان آئی تھی ۔ دروازہ کھلتے ہی شیر خاں نے ایک ننھی سی ٹارچ کی تابکی کو چیرتی ہوئی شعاعیں اپنی خالہ کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے گاڑتے ہوئے ایک طرف موڑ دی تھیں ۔ اس سمے نیلنے ایک ڈراونا خواب دیکھ رہی تھی کہ اُسے کوئی ریچھ اُٹھا کر غار میں لے جا رہا ہے ، اس کی آنکھیں اندھیرے میں شیر کی آنکھوں کی طرح دمک رہی ہیں ۔ لیکن ان میں کچھ ایسا جادو ہے کہ وہ گُنگ ہو کر رہ گئی ۔ وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن چیخ اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی ۔ ریچھ غار کا دروازہ پنجہ مار کر کھول دیتا ہے اور ہنس کر نیلنے کو اندر کی طرف دھکیل دیتا ہے ۔ وہ دبک کر کمبل میں سکڑ گئی اور اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا ۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا ۔ اتنے میں اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کی خالہ کسی سے باتیں کر رہی ہے ۔

"گھبراؤ نہیں خالہ ۔ شیر خاں تم سے کبھی دھوکا نہیں کرے گا ۔ لیکن میرے یہاں آنے کا کسی کو پتہ نہ چلے ۔"

"......... نہ — نہیں نہیں بیٹا تم — فکر نہ کرو ۔ لیکن اتنی جلدی بھی کیا تھی ؟"

"تم بس یہ سنبھالو اور شادی کی تیاری کرو ۔ ایک مہینے کے اندر اندر ہو جائے بس سب کچھ ۔"

"بیٹا شیر — ہم بیوقوف لوگ ان کاغذوں کو کیا جانیں ۔ ہمیں تو گننا بھی نہیں آتا ۔"

"— ہوں — اچھا — تم فی الحال یہ اپنے پاس رکھو ۔ پھر بدل دوں گا ۔"

"نہ نہ بیٹا ۔ خدا نہ کرے ، کہیں بھیڑ بکریوں کے منہ لگ گئے تو میں تجھے کیا منہ دکھاؤں گی ..... اور لوگوں نے دیکھ لیے تو —"

"تو ؟ — تو —"

"..... میرا مطلب ہے مجھے کہیں چور نہ سمجھ بیٹھیں ۔"

"چور ۔ چور ۔ چوری ۔ ک ۔ ک ۔ کون کہے گا ۔ ہُں ۔" شیر خاں نے معاً اپنی ڈب سے کمانی دار چاقو نکال کر ، اُسے کھٹ سے کھول کر اپنی خالہ کے سامنے لہراتے ہوئے کہا — "جو تمہیں یا ۔ نیلنے کو کچھ کہے گا وہ ۔" اس نے چاقو کا پھل خیالی دشمن کے سینے میں گھونپتے ہوئے دکھا کر اس کا جواب دیا ۔ وہ ساتھ ہی ہنس پڑا اور اس نے چاقو بند کر کے اپنی خالہ کو اپنے شانے سے لگا لیا ۔

"ڈرگئیں خالہ — میں تو مخول کر رہا تھا۔" وہ پھر یکدم سنجیدہ ہو کر ایک ثانیہ کے لیے کچھ سوچ کر بولا۔ "فجر کی نماز تک تمھیں پانچ پانچ روپے کے نوٹوں میں ساری رقم مل جائے گی۔" کہتے ہوئے شبیر خاں جھپاک سے اُٹھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اندھیرے میں کالے بادل کی طرح تحلیل ہو گیا۔

"بکری بیچ دی ماں۔ بڑی قیمت ملی؟" زلیخہ نے شبیر خاں کے چلے جانے کے بعد کروٹ بدل کر کہا۔

"بکری! — بڑی خوش قسمت ہے پگلی۔ تجھے اتنا پسند کرتا ہے — اگر بوڑھا ہوتا اور شبیر خاں سے زیادہ پیسے دیتا پھر بھی تو — لیکن کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ مجھے تیرا باپ خرید کر لایا تھا۔ جیسے تیرا دادا تیری دادی کو۔ جس نے انکار کیا اس نے اپنا خون کروا لیا۔ لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتیں۔"

"کل گڑ کے چاول پکاؤ گی نا پھر؟"

"بکرے کا گوشت بھی کھلاؤں گی۔"

"سچ؟"

"ہاں۔ اب سو رہو۔ دُعا کرو......"

"دعا کرو" .... زلیخہ کے کانوں میں گونجا اور اس کا دل جیسے اس خیال سے بیٹھنے لگا۔ کیا شبیر خاں اپنا وعدہ پورا کرے گا — ہاں — وہ فجر کی نماز سے پہلے سو سو روپے کی سات گڈیاں اور ایک چھوٹا سا سونے کا ہار لے آیا — لیکن ہار کیوں؟

"روپے کم ہو گئے تھے، اس لیے یہ ہار سے پورے کر دیے ہیں۔"

"سونے کا ہے —"

"مجھ پر شک کرتی ہو —"

"اوہو۔ نہیں بیٹا۔ بھلا کبھی میں تم پر شک کر سکتی ہوں۔ میں نے زندگی میں —"

"فکر نہ کرو۔ زندگی رہی تو زلیخہ کو کئی سونے کے اور ہار لا کر دوں گا — ایک مہینے بعد برات لے کر آؤں گا۔"

وہ پھر چونک اُٹھا اور خالہ کے سرہانے کے ساتھ لگی کھاٹ کی طرف اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"چور! چور!!" اُسے دیکھ کر زلیخہ کے کانوں میں گونجا۔ "چور تمھیں کتنا خوش رکھے گا ورنہ ہم لوگوں کے پاس چار بکریاں اور ایک مریل گائے کے سوا ہے ہی کیا۔ گھر میں ایک کھاٹ۔ وہ بھی کسی سے مانگی ہوئی۔ چار ٹنٹناتے برتن۔ کھانے کو مکی کا آٹا۔ دن رات لسی کے ساتھ کھانے کو — وہ تو پاگل ہے — خوبصورت لڑکی سے شادی کرتا۔ وہ ساتھ چار پیسے کے کپڑے لتے اور زیور بھی لاتی۔ لیکن ماں کو دیے ہوئے روپے میری مٹھی میں تھوڑے آنے ہیں۔ اچھا کھانے پینے اور پہننے کو دے گا۔ اور سونے کا زیور بھی۔ سونے کا۔ زلیخہ۔ چور۔ چور۔ تیرا شوہر شبیر خاں نہیں — کیا چور رہے — پھر بھی! اور تو — بکری۔"

نے [illegible]

اس کے چند روز بعد گاؤں میں خبر سنائی دی کہ شیر خاں نے راستے میں کسی تاجر کو لوٹ لیا تھا۔ وہ ڈیڑھ ایک ہزار روپے کی اون راولپنڈی بیچ کر آ رہا تھا کہ اُسے کسی نے چاقو دکھا کر لوٹ لیا۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق مجرم شیر خاں تھا۔ اس کے کمانی دار چاقو نے اُسے یک لخت پکڑوا، اور چھڑوا بھی دیا۔ سارے علاقے میں فقط اُسی کے پاس ایسا چاقو تھا جو اس نے سرحد پار سے منگوایا تھا۔ ڈکیتی کے وقت اس نے منہ پر ٹھاٹھا باندھ رکھا تھا۔ اور اس پھرتی سے روپے اڑا کر رفو چکر ہو گیا تھا کہ اس کا پتہ نہ چل سکا۔ فقط اُس کا نمایاں چاقو تاجر کو امتیازی نشان اور ثبوت کے طور پر یاد رہ گیا تھا۔ یوں بھی جمعہ شیر خاں کے خاندان کا کوئی فرد کسی جرم کی لپیٹ میں آ جاتا تو نہ جانے پولیس کو اس کے خلاف ناکافی ثبوت کیوں ملتا اور وہ بچ نکلتا۔

شیر خاں نے اپنی خالہ کو ایک ہزار روپیہ اسی تاجر سے لوٹ کر دیا تھا۔ باقی روپے جمعہ خاں نے وہ مقدمہ و قدمہ لڑنے کے لیے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس نے سوسو کے نوٹوں کے عوض اسے ایک ایک روپے کے نوٹ اور ایک ہار بعد میں دے دیا تھا۔ چونکہ مستغیث بھی ایک بار سوخ تاجر تھا اس لیے وہ مجرم شیر خاں کو چھ ماہ قید کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن مقدمہ کے دوران ہی ایک ماہ بعد برات لے کر آیا اور زلیخے کو بیاہ کر لے گیا۔ اس نے اپنی ساس خالہ کو دلہن کو پوری طرح تیار کرنے کے لیے خوشبودار تیل، صابن حتیٰ کہ سہاگ کا لال ریشمی جوڑا بھی اپنی گرہ سے فراہم کیا تھا اور جب وہ کانوں میں چاندی کے بندے، پاؤں میں سرخ سی چپل لیکن گلے میں سونے کا ہار پہن کر آئی تھی جو اس کی ماں کو شیر خاں نے دیا تھا تو اس کے گھر میں دلہن بن کر قدم رکھتے وقت شیر خاں نے اُسے کہا تھا۔

"چوری کے لباس میں پری معلوم ہوتی ہو۔" یہ سن کر وہ پانی پانی ہو گئی تھی۔ اور اس کا جی چاہا تھا کہ شیر خاں کی پہنائی ہوئی سب چیزیں وہیں اتار کر اس کے منہ پر دے مارے۔ "زلیخے! میری بات تمھیں بُری لگی ہے۔ ہے نا۔؟"

لیکن وہ گم سم سی کھڑی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی گئی تھی، مور کی طرح اور اس نے اپنے کان اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیے تھے۔

"میں دو چیزیں تمھیں بھیجنا۔ بھو۔ ل۔ گیا تھا۔ معاف کرنا۔" کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب میں سے سونے کے بندے نکال کر اُسے پہنا دیے اور پاؤں میں پہننے کے لیے ایک زری کی جوتی اپنے پاؤں سے اس کی طرف سرکا دی۔ یہ بستر کے پاس ہی رکھی تھیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے لیے زلیخے کو اس بات کی خبر نہ رہی کہ وہ کہاں ہے، اُس کے پاس کون کھڑا اس سے کیا باتیں کر رہا ہے ——— وہ تو اپنے آپ کو ایک غار میں کھڑا دیکھ رہی تھی، وہی غار جو اس نے ایک ماہ پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ جب شیر خاں نے اُسے اُٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا تو وہ چونک کر اس سے لپٹ گئی جیسے کسی شے سے ڈر گئی ہو۔

"بکری، بکری ہے تو زلیخے۔ ارے کیا ہوا ہے تمھیں ؟ میں شیر خاں ہوں شیر خاں۔"

"شیں۔ شیں۔ شیر خاں شیں" زلیخے نے اُس کی مسحور کن نیلی نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے جواب میں وہ آنکھیں اس کے قریب قریب تر آتی گئیں۔

"شیر خاں شیں سب سے بڑا چور۔" یہ سن کر شیر خاں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پہ تام لگی ڈانگ دے ماری ہو

وہ ایک لحظہ کے لیے رُکا، پھر اس نے شیں کی مانند نیلنے کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔

" زلیخے، پر تیرا تو میں مالک ہوں۔" یہ سن کر زلیخے نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی، پھر ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی۔

" اسی لیے تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

" مجھے۔ تم پاگل ہو۔ لیکن وعدہ کرو تم چوری یا بُرا کام نہیں کرو گے۔"

" کوشش کروں گا۔"

شادی کے پندرہ روز بعد وہ ایک تاجر کو لوٹنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا، ڈیڑھ مہینہ تک مقدمہ چلتا رہا اور آخر کار اُسے چھ ماہ کی قید ہوئی۔

جب زلیخے اسے ڈسٹرکٹ جیل میں ملنے گئی تو اس نے ہاتھ باندھ اس سے استدعا کی کہ آئندہ کے لیے چوری کرنا چھوڑ دے۔

" پگلی، یہ مت بھول کہ اگر کوئی اور ہوتا تو کم ازکم ڈیڑھ دو برس کی قید ہوتی اسے۔ فکر نہ کر، بکری۔"

" مالک!۔ شیر خاں۔" زلیخے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔" اسی لیے شادی کی تھی مجھ سے ۰۰۰۰۰ اور۔ اور نہ جانے۔ آگے چل کر کیا ہو گا۔"

اس کے جواب میں شیر خاں نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے بڑے پیار سے دبایا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔" تیری خاطر اتنی قید کوئی مہنگا سودا نہیں۔"

اور اس کے جواب میں زلیخے نفی میں سر ہلا دیتی جیسے اُسے خطرہ ہو کہ نہ جانے شیر خاں رہا بھی ہو یا نہ ہو یا اس کی قید میں توسیع ہو جائے۔ اُسے ہر ماہ یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے پاؤں میں کوئی وزنی شے باندھ دی گئی ہو۔ لیکن پہلے یہ احساس صرف اس تک ہی محدود تھا لیکن ایک وقت آیا جب شیر خاں کو بھی اس کا پتہ چل گیا ۰۰۰۰۰ یہ سن کر کہ وہ باپ بننے والا ہے اس کا جی چاہا کہ جیل کی سلاخیں توڑ کر باہر نکل جائے۔ پر اب تو وہ رہا ہونے والا تھا۔ یہ اس کی پہلی قید تھی جو اس نے پہاڑی گیت گا گا کر اور ہر ہفتے زلیخے کو ملنے کی خوشی میں کاٹ لی۔ بلکہ وہ قید ہونے کا متمنی معلوم ہوتا تھا۔

جہاں تک زلیخے کا گھر پر اکیلا ہونے کا سوال تھا، گو اُس کی ساس اُس کے پاس ہفتہ ہفتہ آ کر رہ جاتی، وہ اتنے کشادہ اور بھرے پُرے مکان میں اب تک اپنے آپ کو اجنبی سی محسوس کرتی تھی۔ چار پانچ کمروں، صحن اور ڈیوڑھی پر مشتمل شیر خاں کا اپنے لیے بنا بنایا ہوا مکان اُسے یہ کہتا محسوس ہوتا۔" تم میری نہیں ہو۔" لیکن اس کے اندر دھرے آٹھ دس بکس اس کے نرم نرم بستر، نئے نکور سے پلنگ، اور گائے بھینس کی ایک جوڑی سب اب اس کے تھے۔ اتنی کم عمر میں شیر خاں یہ سب کچھ کہاں سے لے آیا تھا۔ نہیں۔ یہ اُسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملے تھے۔ وہ خاندان جس کا نام اور کارنامے سن کر بڑے بڑوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے۔ زرخرید بیویاں بھلا اس کے سامنے کیسے دم مار سکتی تھیں۔ لیکن زلیخا کو شیر خاں کے گھر میں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اُس کی قیدی ہو اور وہ گھر ڈسٹرکٹ جیل جہاں وہ اُسے ہر ہفتے ایک بار ملنے جایا کرتی۔ اُسے

یوں محسوس ہوتا کہ شیر خاں ہی اس گھر کا مالک نہیں۔ اس نے کسی کے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس وقت اُسے سینکڑوں گھر یاد آنے جو ایک ڈیڑھ کوٹھڑی پر مشتمل تھے جن میں اکا دکا بھیڑ بکری یا گائے بندھی نظر آتی۔ جن کے گوبر اور مینگنیوں میں فرشی گھاس پھوس پر سارا گھر، ماں باپ، بیٹا بیٹیاں کڑاکے کی سردیوں کے دو دو مہینے اندر ہی گزار دیا کرتے یا ساری رات دو تین کمبل یا پھٹی پرانی رضائی میں درخت کی سلگتی جڑ یا کٹی ہوئی بڑی سی شاخ کی آگ تاپتے، گھاس پھوس کی جوتیاں بناتے اور بھیڑ بکریوں کی اون کے کمبل بناتے بناتے، دن رات مکی کے آٹے کی روٹی اور لسی کھاتے پیتے گزار دیتے۔ ان کے تن پر مہینوں ایک ہی جوڑا چلتا جو آخر کار چیتھڑے بن کر ان کے جسم سے لٹکنے لگتا اور پھر وہ ان میں پیدا شدہ سوراخوں کو شکستہ گھروں کے سوراخوں کی طرح بند کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔

جب کبھی سورج نکلتا تو ان کے گھر کی چھتوں سے بڑے درختوں کی طرح منجمد پانی کی لٹکتی ہوئی جٹیں عجب سماں پیدا کرتیں۔ ان کو پگھلاتی سورج کی شعاعیں کتنی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ گاؤں سے ڈیڑھ ایک کوس جھیل پر اس وقت عجب سماں ہوتا۔ وہ نیلگوں جھیل جس کی تہ میں پریاں رہتیں اور جدھر جھانکتے، نوجوان لڑکیاں اپنے ہوش و حواس کھو سی بیٹھتیں اب برفیلا چٹیل میدان سی معلوم ہوتا۔ بعض نڈر، الھڑ دوشیزاؤں کی طرح زلیخے نے وہاں سے کئی مرتبہ پانی بھرا تھا اور اس کی منجمد سطح پر پھسلنے کا کھیل کھیلتی رہی تھی — جب برف کی تہ کہیں سے اچانک پھٹ جاتی اور ایک آدھ لڑکا یا لڑکی اس میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا تو گاؤں والوں کو یوں محسوس ہوتا کہ انھیں کسی گناہ کی سزا ملی ہے — یہ چھ ماہ پہلے کی بات تھی۔ زلیخے کے لیے۔ اس عرصہ میں اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ یک لخت پہاڑی غاروں سے نکل کر ان کی چوٹیوں پر پہنچ گئی ہو۔ لیکن یہ سب کچھ ایک خواب تھا، ناقابلِ یقین خواب، ماسوائے اس کے کہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر پہاڑوں کی طرح جامد و ساکت دکھائی دیتی تھیں۔ پر شیر خاں — جنگل کا شیر پنجرے میں یک دم قید کر لیا گیا تھا اور وہ ساری دنیا سے کٹ کر الگ ہو گئی تھی اس کا بڑا بھائی ہوش سنبھالتے ہی کام کاج کی تلاش میں لاہور چلا گیا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو برس سے گھر بیس روپے ماہوار کے حساب سے وطن جانے جاننے والوں کے ہاتھ روپے بھیجا رہتا۔ اس نے ماں کو تاکید کی تھی کہ یہ رقم اس کی شادی کے لیے جوڑتی رہے۔ جب وہ ایک برس بعد ایک مہینے کی چھٹی پر وطن آیا تھا تو اور تو اور ایک لحظہ کے لیے شیر خاں بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا — پتلون، بش شرٹ اور انگریزی جوتے پہنے، انگریزی وضع کے بال کٹوائے، بھرے بھرے اور تنے ہوتے سُرخ گالوں والا یہ شخص تو کوئی اجنبی معلوم ہوتا تھا!

"اوے۔ تو۔ صاحب کے خانسامے!" شیر خاں نے اسے پہچانتے ہوتے حقارت آمیز لہجے میں کہا "اتار اس اُترن کو، کیا ہم پر رعب جمانے آیا ہے؟" اس نے جل کر عزیز گل زلیخے کے بھائی کو کہا۔

کتنا دکھ ہوا تھا زلیخے کو شیر خاں کی یہ بات سن کر — وہ اب شیر خاں ہی کی بیوی بن کر اُس کے گھر بیٹھے پچھلے دنوں سے اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ عزیز گل اسی لیے اس کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ زلیخے کی شادی کے بعد گھر پر اس کی ماں کے پاس اس کے دو چھوٹے بھائی رہ گئے تھے۔ باپ تو مدت کا کھانستا کھانستا چل بسا تھا۔ اُس کے علاج کے لیے انھوں نے جو قرضہ اُٹھایا تھا وہ کئی برس تک ان کے سر پر گرجتا رہا زلیخے کی شادی کے بعد یہ بوجھ ان کے سینے سے کہیں جا کر

ہٹا تھا۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس کی چھوٹی بہن بھی کہیں ٹھکانے لگ جاتی۔ جہاں تک ان کے چھوٹے بھائی کی نوکری کا تعلق تھا اس کے لیے عزیز گل لاہور میں کوشش کر رہا تھا۔ لیکن شیر خاں کی بڑی سخت ہدایت کے مطابق وہ گھر سے باہر ایک لمحہ کے لئے بھی پاؤں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں جب تک اُس کا چچا جمعہ خاں گھر پہ نہ ہو تو وہاں پہ پہرہ دینا زلیخے کا فرض تھا۔ اُسے شیر خاں کا حکم تھا کہ کسی غیر شخص کو گھر میں گھسنے تک نہ دے۔ اگر کوئی اس کے بارے میں پوچھے تو کہہ دے کام سے ابھی باہر گیا ہے۔ گرفتار ہونے سے قبل اور بعد وہ متواتر کئی روز گھر سے غائب رہتا اور جب واپس آتا تو اچانک، دبے پاؤں، رات کے وقت۔

"اگر کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا سو رہا ہوں"۔ وہ اس سے کہتا۔

"لیکن لوگ اگر یہ پوچھیں کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے تو کیا جواب دوں؟ تم نے ——— مجھ سے حوالات میں وعدہ کیا تھا ......"

"اب ——— ہم ایک نہیں تین ہیں ——— تم، میں اور یہ بچی ——— اگر ——— کام ——— نہ کروں تو کھائیں کہاں سے"۔

"——— دوسرے کیا بھوکے مرجاتے ہیں"؟

"دوسرے ——— دوسرے ——— ہونہہ ——— زبان لگ گئی ہے اب تمہیں"

عزیز گل کو دیکھا ہے تم نے۔ تھوڑے سے پیسوں میں کتنا خوش رہتا ہے۔ جو کھاتا ہے اُسے لگتا ہے"۔

"تم جیسے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو۔ دن رات کھانے کو جو کچھ نہیں ملتا"۔ شیر خاں نے اب تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"..... تم اگر اپنے ہاتھ سے کما کر کھاؤ تو سوکھی روٹی بھی گھی ہو کر لگے گی!"

یہ سن کر شیر خاں یوں تلملا اٹھا جیسے اُسے کسی نے تیل میں بھیگا ہوا ہنٹر دے مارا ہو۔ کون ہوتی تھی زلیخے اُسے بار بار چور اور ڈاکو کہنے والی، اس کی زرخرید بیوی ——

"بکری کو کیا چارہ کہاں سے آتا ہے۔ تری جان کیوں ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ تو کھا پی اچھے کپڑے پہن، حنیفہ (ان کی لڑکی) سے کھیل اور موج کر ——"

"جس بکری کو ہر وقت اپنے سامنے چھری دکھائی دے وہ کیا کھائے گی"۔

"تو فکر نہ کر۔ تیرا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔ آنکھیں نہ پھوڑ ڈالوں اس کی جو تیری طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے"۔

"...... مجھے کیا معلوم تھا تو میرے ہی لئے پہلے چھ مہینے قید کاٹے گا"۔

"لیکن اب تو میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے"۔

"چھوڑ دیا ہے۔ کب؟ شادی کے بعد تین مرتبہ جیل جا چکے ہو ——— !"

یکے بعد دیگرے زلیخے شیر خاں کو بڑے معصومانہ انداز میں تازیانے پہ تازیانہ لگا رہی تھی۔ سچ بھی یہ ہے کہ اُسے خود معلوم نہ تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بکری کی طرح ممیا اٹھتی، کبھی خوف کے مارے، کبھی فضا کی مخصوص گھٹن محسوس کر کے ٹھیک ہے اپنے گاؤں میں اس نے شیر خاں کو شروع شروع میں چند نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کرنے کے سوا اور کوئی بُرا کام، چوری چکاری یا ڈاکہ ڈالتے نہیں دیکھا تھا وہ ایک ایسی بجلی تھا جو دور دور کے علاقوں میں گرتی تھی اور زلیخے کے لیے ایک مسحور کن لیکن ڈراونا خواب

...... رات کے سناٹے میں جب وہ منہ پر ڈھاٹھا باندھے گھر کے دروازے پر ہلکی سی خوفزدہ دستک دے کر اسے کھلواتا اور چپکے سے پہلے اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا جاتا، وہاں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا یا اس کی کوٹھڑی کی کھڑکی میں کوئی پراسرار سایہ اُسے چپکے سے کچھ تھما جاتا یا اشارے اشارے میں کچھ باتیں کرتا تو اس کے دل میں عجب وسوسے اُٹھتے۔ وہ دوسرے کمرے میں شب میں پڑے پڑے دل کے کان لگا کر اس پُر معنی لیکن ناقابلِ فہم بھنبھناہٹ کو سنا کرتی۔ اتنے میں شیر خاں اس پر پیچھے سے جھک کر دیکھتا کہ آیا وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ اس پر زلیخے کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کا گلا گھونٹ دے گا اور شیر خاں کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ وہ ابھی اٹھ کر اُسے ہتھ کڑی پہنا دے گی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پسینے میں شرابور ہو جاتے، ان کے سانس تھم جاتے، بالخصوص جب کبھی کبھار اس پر جھکے ہوئے شیر خاں کی سانس سہواً اُس کے چہرے پر پڑتی تو اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے۔ اگر ایسی کیفیت میں اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل جاتی تو عجب نہ تھا۔

”زلیخے۔ زلیخے۔“ شیر خاں اس کا منہ بند کرنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا: ”کیا بات ہے جانی۔ زلیخے۔ کیا ہوا؟“ وہ معاً اس کے بستر میں گھس کر اُسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے پوچھتا: ”خواب دیکھ رہی تھی کیا۔ ڈراؤنا خواب — کیا۔ کیا دیکھا — تو نے؟“

”معلوم نہیں۔ کیا تھا۔ خواب کہ —“

”کہ — تمھیں کوئی رسّوں سے باندھ کر کہیں دور لے جا رہا ہے۔“

”رسّوں سے....؟ ہا ہا ہا۔“

”اس کھڑکی سے آتا ہے وہ!“

”کھڑکی۔ کھڑکی۔ کون سی۔ اوہ۔ تو تمھیں اس سے ڈر آتا ہے۔ لو میں بند کر دیتا ہوں۔ مجھے دراصل اندر گرمی لگتی ہے اس لیے اسے بعض اوقات کھول دیتا ہوں۔“

”چلو کہیں اور چلے جائیں۔“

”باپ دادا کا وطن اور گھر چھوڑ کر۔“

”عزیز گل بھی کتنی دور گیا ہوا ہے۔ ہمارے وطن کے چھوٹے چھوٹے لڑکے آئے دن روٹی کمانے پنجاب جاتے ہیں“

”عزیز گل۔ اس کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کیا کرو۔ بڑا مغرور ہو گیا ہے، شادی پر بھی نہیں آیا۔“

”چھٹی نہیں ملی ہو گی۔ ورنہ ضرور آتا۔ میرے لیے ایک ریشمی سوٹ بنوا کر بھیج دیا تھا۔ لیکن اب یہ بات پُرانی ہو گئی ہے میں تو کہہ رہی تھی ہم بھی کسی بڑے شہر چلے چلیں۔ وہاں دونوں کام کریں گے۔“

”کا....م — کام — اگر تمھیں یہاں کی روٹی اچھی نہیں لگتی تو کہیں اور چلی جاؤ۔ تم جانا چاہتی ہو —؟“

”تمھیں کیا معلوم کہ لوگ ہمیں کیسی بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔“

”جلتے ہیں تم سے — کنگال امیروں سے جلا کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ گڑھا نہ کر........ کوئی میرے متعلق پوچھنے تو نہیں آیا تھا......؟“

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے سب لوگ ہر وقت ہمارے ہی گھر کو تکتے رہتے ہوں . . . ."

"تمھیں تو وہم ہو گیا ہے۔ اچھا اب سو جاؤ۔"

عزیز گل کو شیر خاں سے پہلے دن سے ہی نفرت تھی۔ جب اُسے پتہ چلا تھا کہ اس کی ماں زلیخے کی اس سے شادی کر رہی ہے تو اس نے اُسے ایک چور کو اپنا داماد بنانے سے روکا تھا کیا ہُوا اگر وہ اس کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کے جواب میں زلیخے کی ماں نے یہ جواب دیا کہ عزیز گل پھر اپنی بہن کے لیے کوئی ایک ہزار روپے دینے والا شوہر تلاش کر دے۔ ایسا دو ٹوک جواب سن کر عزیز گل خاموش ہو گیا تھا۔ بلکہ اُسے تب سے گھر خرچ کے لیے پیسے بھیجنے کی بجائے خود اپنی شادی کے لیے روپے جوڑنے کی فکر دامنگیر ہو گئی تھی۔ پتہ چلا تھا کہ وہ اب تنخواہ کے علاوہ فرصت کے اوقات میں مالی کا کام کر کے پچیس تیس روپے زائد بنا لیتا تھا۔ یہ کام سیکھ کر وہ گھر کے کام سے فارغ ہو کر جزوی طور پر نہ صرف اپنی کوٹھی میں ڈیڑھ ایک گھنٹہ صرف کرتا بلکہ ایک آدھ دوسری کوٹھی سے بھی روٹی کپڑا مفت۔ یوں اُسے کل سو روپے سے اوپر آمدنی ہو جاتی تھی سو روپے۔ صرف رات کو کام کرنے سے نہیں بلکہ دن کو۔ اُسے یہ خطرہ تو لاحق نہ رہتا کہ اُسے کوئی پکڑ کر لے جائے گا۔ شیر خاں تو اس عرصہ میں کئی بار چوری کرنے کے جرم میں سزا کاٹ آیا تھا۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ پولیس اسے ہاتھ تک نہیں لگا سکتی۔ لیکن عزیز گل کام سے فارغ ہو کر کتنی بے فکری سے سوتا ہوگا۔ جیسے وہ خود شادی سے پہلے گھر پر سوتی تھی۔ کاش وہ چند روز کے لیے بھائی کے پاس سکھ کی نیند سونے کے لیے چلی جاتے۔ لوگوں کی کھا جانے والی نظروں سے بچ جاتے۔ حنیفہ بھی تو اپنے ماموں کو کتنا یاد کرتی تھی . . . . لیکن اَب تو شاید وہ بھی ان سے خفا ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ مہینے سے اُس کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ اگر شیر خاں زلیخے کو لاہور یا کسی اور جگہ لے جانے کو تیار نہ تھا تو نہ سہی، وہ خود ہی چلی جائے گی۔ عزیز گل کے پاس لاہور۔ لیکن شیر خاں جب "کاروبار" کے سلسلے میں گھر سے ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ غائب رہے گا تو زلیخے کو گھر کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ نہ جانے اس میں کونسے خزانے بند تھے۔ ایک کمرہ اس کی اپنی کوٹھڑی تو اس کی عدم موجودگی میں ہمیشہ بند رہتی۔ زلیخے کو اس سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے اندر سے دو آدمیوں کے آپس میں گتھم گتھا ہونے کی آوازیں آ رہی ہوں۔ جب وہ بہت اکیلی محسوس کرتی تو اپنی چھوٹی بہن کو چند روز کے لیے اپنے ہاں بلا لیتی۔ صرف ایک دو روز کے لیے چونکہ شیر خاں کو اس کے سسرال میں سے کسی کا اس کے گھر آنا پسند نہ تھا۔

"نہ جانے کوئی کیا یہاں سے اُٹھا کر لے جائے۔ اتنی محنت سے گھر کی چیزیں بنائی ہیں۔ سب تیرے لیے ہیں، تیرے لیے زلیخے۔" شیر خاں زلیخے سے کہا کرتا۔ اُسے گھر کی ہر چیز اور اس کی تعداد یاد تھی۔ گھر میں کتنے پلنگ اور چارپائیاں، کتنے کمبل اور کتنے سرہانے ہیں۔ اگر ایک آدھ کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتی تو بہانے بہانے اپنے سسرال معلوم کرنے جاتا کہ وہاں تو منتقل نہیں ہو گئی۔

"ہم چور نہیں جو تم ہمارے ہاں پولیس کی طرح تفتیش کرنے جایا کرتے ہو۔" جب زلیخے کو شیر خاں کا اُن کے ہاں خود ہی کسی شے کو اِدھر اُدھر کسی بکس میں سہواً بند کرنے سے یا اپنے ساتھ باہر لے جانا بھول کر اُسے اپنے سسرال تلاش کرنے جانے کا پتہ چلتا تو وہ اُسے تنگ کر کہتی۔

" سنبھالو اپنا گھر، میں چلی — ہم چور جو ٹھہرے —" زلیخے نے ایک روز شیر خاں کو اس کے چھوٹے بھائی پر شک کرنے پر، غیر معمولی حد تک بگڑ کر کہا۔

" پہلے تو پاگل تھی، اب میں پاگل ہو گیا ہوں۔ غصہ تھوک دو۔ دراصل میں ہی بھول گیا تھا۔ میں وہ چادر ایک دوست کو دے آیا تھا۔" یہ چادر دراصل چوری کا مال تھا اس نے چند روز تک تو اُسے اپنی کوٹھڑی میں چھپا رکھا تھا، پھر ایک روز کسی کو بیچ آیا تھا اور یہ رقم کب کی کھا پی بھی چکا تھا۔

" تم فکر نہ کرو۔ میں اب باہر کم جایا کروں گا اور اگر تم چند روز کے لیے لاہور جانا چاہتی ہو تو ہو آنا۔ لیکن جونہی میرا پیغام پہنچے واپس چلی آنا۔"

شیر خاں کے منہ سے لاہور جانے کی اجازت سن کر زلیخے کو گھر کی دیواریں پیچھے ہٹ کر اس کے لیے باہر جانے کا راستہ بناتی معلوم ہوئیں۔ چھ برس میں پہلی بار آزادی کے خیال نے اُسے چکرا دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر خاں کو دیکھنے لگی۔ کیا یہ جھوٹ تو نہیں بول رہا۔ اس نے دل ہی میں سوچا۔ ضرور کوئی بات ہے۔

" سچ ؟ — کب ؟"

" جب بلاؤں تب آنا۔"

" تو ابھی نہیں جاتی۔"

" ہائے اُلٹی کھوپڑی — میں نے کہا ہے کہ کہ — جونہی بلاؤں واپس آجانا۔"

" اکیلی ؟ — تم ؟"

" فکر نہ کرو، تجھے کوئی راستے میں سے اُٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو شیر خاں کا نام لے دینا۔"

اس پر زلیخے ہنس پڑی، اس کی مخصوص خاموش ہنسی جو وہ بہت کم ہنستی۔

" تمہارے ساتھ بھی کسی کو بھیج دوں گا — . . . . . آجکل کاروبار بھی ذرا مندا ہو گیا ہے۔"

" اچھا ہوا — پھر شہر میں کوئی نوکری تلاش کر لیں گے۔"

" تو نری بکری کی بکری رہی۔ بھوکا نہیں مرنے دیتا تجھیں۔ وہ کم بخت —!"

" کون ؟ —"

" کو — کوئی نہیں۔ قسمت کے پھیر ہوتے ہیں۔"

" خدا کے لیے اب پھر کہیں جیل میں — میں تباہ ہو جاؤں گی۔ تمہیں۔ دیکھو۔ خدا رسول کا واسطہ دیتی ہوں۔"

" ارے، کیا بات بات پہ ڈر جاتی ہے تو بھی۔ شیر خاں تو شیر ہے شیر — تو شیر خاں شیر کی بیوی ہے.... تو پانچ چھ روز تک چلی جانا — اب تو خوش ہونا —؟"

ان دنوں شیر خاں بڑا گھبرا یا گھبرایا رہتا۔ اس کی وجہ علاقے کا نیا تھانیدار خداداد خاں تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے بدمعاشوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ جمعہ خاں، شیر خاں اور اُن کے ساتھی مدتوں کسی ایسے تھانیدار کا اپنے علاقے میں تبادلہ

ہونے سے رکواتے رہے تھے۔ لیکن جب سے حکومت نے ہر محکمے کے کئی بڑے بڑے افسر سکریننگ کے ذریعے بے ایمانی اور رشوت ستانی کے الزام میں برطرف یا موقوف کر دیے تھے تو جمعہ خاں پارٹی کی شامت آگئی۔ خداداد خاں جیسے جابر اور ایماندار افسر کو جمعہ خاں پارٹی کا ہی قلع قمع کرنے کے لیے اس علاقے میں تعینات کیا گیا تھا۔ اس نے بھی قسم کھائی تھی کہ ان خاندانی چوروں اور قاتلوں کی بیخ کنی کر کے ہی دم لے گا۔ اُسے اپنے کپڑوں پر پیوند لگوانے میں شرم نہ آتی، نہ ہی روکھی سوکھی کھانے میں۔ چنانچہ اس نے علاقے میں آتے ہی پہلے جمعہ خاں اور پارٹی اور تمام دس نمبریوں کی کانفرنس بلائی اور اس میں انھیں متنبہ کر دیا کہ اگر اُس کے پاس ان کے خلاف آئندہ کبھی کوئی شکایت پہنچی تو وہ انھیں الٹا لٹکا کر ان کی چمڑی اُتروا دے گا۔ اس تنبیہ کے علاوہ اس نے اپنے بیشتر ماتحت بھی بدلوا کر ان کی جگہ قابلِ اعتماد آدمی رکھے۔

خداداد نے یوں بدمعاشوں کے پاؤں میں جیسے میخیں گاڑ دی تھیں۔ چنانچہ اب شیر خاں کا بھی رات کے وقت حاضری دینے کے لیے گھر پر رہنا ضروری ہوتا۔ نئے تھانیدار خداداد خاں نے جسے شیر خاں اور پارٹی نے قہر خاں کا نام دیا کے آنے سے سارے گاؤں انھیں تھانہ دکھائی دینے لگا۔ جب رات کو پولیس کا سپاہی ان کے مکان کے سامنے آ کر ان کی حاضری کے لیے ان کا نام بلند آواز میں لے کر پکارتا اور اُن کے باہر آنے کا منتظر رہتا تاکہ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ وہ گھر پر موجود ہیں اور ان کے کسی نعم البدل نے ان کی طرف سے جواب نہیں دیا تو ان کے جی میں آتا کہ اُس کی گردن وہیں مروڑ کر رکھ دیں۔

"شیر خاں۔ کیوں بھئی گھر پر ہو؟" جب سپاہی شیر خاں کے گھر کے سامنے آ کر آواز دیتا تو اُس کا ہاتھ فوراً اپنے کمانی دار چاقو کی طرف لپکتا اور وہ دوسرے بدمعاشوں کی طرح پولیس کو ماں بہن کی گالیاں دیتا گھر سے باہر آ کر بڑے اکھڑ انداز میں جواب دیتا "ہاں بھئی۔ گھر پر ہی ہوں۔ نیند کیوں خواہ مخواہ خراب کیا کرتے ہو——" رات کے وقت حاضری دینا اُسے پولیس سے علانیہ جوتے کھانے کے مترادف تھا۔ کمبختوں نے اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ تھانیدار کے حکم کے مطابق انھیں شام کے چھ بجے سے لے کر صبح کے چھ بجے تک گھر سے باہر قدم رکھنا منع تھا۔

پولیس کے اس قدم سے زلیخے کو عجب سکون حاصل ہوا جیسے اس نے شیر خاں کو پنجرے میں بند کر لیا ہو۔ اب تو شیر خاں بُرے کاموں سے باز آ جائے گا اور اگر اُس نے کسی قسم کی گڑبڑ کی—— تو—— نیا تھانیدار اسے کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید نہ کر دے۔ پھر میں کیا کروں گی۔ کیا مجھے بھائی کے پاس لاہور جانا پڑے گا۔ زلیخے کا ذہن چرخے کی طرح چلنے لگا۔ وہ شیر خاں سے اس ضمن میں استفسار کرنے سے بھی ڈرتی کیونکہ وہ بات بات پر کھانے کو دوڑنے لگا تھا۔ نیا حکم نافذ ہونے پر اس نے تین دن کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر ایک رات جب وہ حاضری سے گیارہ بجے ہی فارغ ہو گیا تو باہر جانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہوا۔ اس وقت زلیخے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اکیلی رہ جائے گی۔ اُس نے اس کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑا کر اس سے کہا:

"شیر خاں! تمھیں خدا کی قسم باہر نہ جاؤ——"

"کہیں دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمھارا۔ میں ذرا ہوا خوری کے لیے باہر چلا ہوں۔ ورنہ میرا یہاں پڑے پڑے

دم گھٹ جائے گا۔ میں مرجاؤں گا زینتے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں۔ میں۔ اب۔ ابھی واپس آجاؤں گا۔ تمھیں معلوم ہے میں رات گئے گھر واپس آنے کا عادی ہوں۔ بس۔ بس۔ شطرنج کی ایک بازی کھیل آؤں۔" اس نے زینتے کا گال بڑے پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔" دروازے کے پاس ہی چارپائی ڈال لو۔ میں جونہی آؤں کھول دینا۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس کا کچھ جواب دیتی وہ بڑی سرعت سے گھر سے باہر نکل گیا۔ کالے کپڑے پہنے وہ تاریکی کا جزو بن گیا۔ اُس کے جانے کے بعد زینتے دروازے کا کنڈا لگا کر وہیں ڈھیر سی ہو گئی۔ اور اس کے کان شیر خاں کی واپسی پر لگ گئے۔ اس نے معاً اُٹھ کر دُور کونے میں جلتی لالٹین کی بتی نیچے کر دی تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ شیر خاں گھر پر نہیں ہے اور وہ دروازے سے ٹیک لگائے اس کا انتظار کرتی رہی۔

خیالات اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اُسے ایسے لگا جیسے ایک درخت سے ایک انسان نما شیر ایک راہ گیر عورت پر بجلی کی طرح لپک کر اُسے منہ میں اُٹھا کر لے گیا ہے۔ جب وہ لرز کر چونکی تو اُسے کہیں دُور سے "شیں، شیں" کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ والے دیہات میں چیتا حملہ آور ہوا تھا اور کسی کی بھیڑ یا بکری اٹھا کر لے گیا تھا۔" شیر خاں ابھی نہیں آیا۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس کی حاضری تو ہو گئی ہوئی ہے۔" زینتے نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ایک لحظہ کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس دوران ان کے کوٹھے پر دھب سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ بلی ہو گی۔ زینتے نے لاشعوری طور پر اپنے پاس پڑی ہوئی تلوار کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ لالٹین بجھ گئی ہے۔ لیکن اس نے تو ابھی شام کو اس میں تیل کی پوری بوتل ڈالی تھی! وہ عجب خوف سے کانپ اُٹھی۔ کسی نے بتی بجھا تو نہیں دی کیا؟ اس نے جلدی سے ٹارچ جلا کر اس کی وجہ معلوم کرنا چاہی لیکن ٹارچ تو اندر سے خالی تھی۔ اب اُس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ مکان میں ضرور کوئی گھس آیا ہے۔ سانس رکا کر۔ ہر نوع وہ جی کڑا کر کے تلوار ہاتھ میں تھامے گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ چلتی ایک کونے تک جا پہنچی اور تلوار تان کر، دبک کر وہاں بیٹھ گئی۔

اس وقت اُسے شیر خاں کی کوٹھڑی سے روشنی کی باریک سی شعاع رینگتی دکھائی دی۔ کوٹھڑی کا دروازہ شیر خاں جاتی دفعہ بند کرنا بھول گیا تھا، اُسے معاً خیال آیا۔ پھر روشنی بند ہو گئی۔ یہ ٹارچ کیا اس کی ہی تو نہ تھی۔ ہیں۔ وہ تو خالی تھی۔ شیر خاں کے پاس تو اپنی ٹارچ تھی۔ اس نے پھر آواز پر کان لگا دیئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کپڑے اتار رہا ہے۔ سر سر۔ سر سر کپڑوں کی سرسراہٹ۔ پھر ننگے پاؤں چلنے سے کوٹھڑی سے ملفوف سی آواز اُبھری۔ یہ رک گئی۔ پھر "زینتے۔ زینتے" کی دبی ہوئی کھسر پھسر سنائی دی — یہ تو شیر خاں تھا —" زینتے زینتے — جانی" اب زینتے کو یقین ہو گیا کہ یہ شیر خاں ہی تھا لیکن اس وقت اسے اس کی آواز میں عجب کپکپاہٹ سی محسوس ہوتی۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں ہوں۔"

"شیر — تم کب آئے؟"

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں نے لالٹین ابھی بجھائی تھی۔"

" اوہ - تو لالٹین تم نے بجھا دی تھی -"

" کیوں ؟"

" رات کے وقت اس کا جلنا ٹھیک نہیں - خواہ مخواہ پڑوسیوں کو شک گزرتا ہے -"

" اور بیٹری ؟"

" جاتی دفعہ اس کا مصالحہ میں جو نکال کر لے گیا تھا -"

" چور - !"

" چور ! - چور - زلیخے -" شیر خاں نے اپنی چیخ دباتے ہوئے کہا -

" ڈرو نہیں - لیکن تم آئے کہاں سے -"

" کھڑکی کھلی چھوڑ گیا تھا -"

" کھلی ! - شیر ، کھڑکی کھلی ! -"

" نہیں نہیں - میرا مطلب ہے میں نے خود باہر سے کھولی تھی -"

" وہ کیسے - اور کیوں -"

" کیسے تو پھر بتاؤں گا - کیوں ، اس لیے کہ تم اور ساتھ والے کہیں ڈر نہ جائیں -"

" بڑے چالاک ہو - بالکل ہنس ہو شیں !"

اس پر شیر خاں ہنس دیا -

" تم نے کپڑے بھی بدل ڈالے - میں بھی کہتی تھی یہ سُر سُر کی آواز کیا ہے -"

" - آں ... ہاں - راستے میں کیچڑ میں - پاؤں پھسل گیا ، سارے کپڑوں کا ستیاناس ہو گیا — کوئی - آیا تو نہیں تھا -"

" نہیں -"

" اچھا تو - جلدی جلدی دو ایک مرغے ذبح کر کے بھون ڈالو -"

" ابھی تو دن بھی نہیں چڑھا -"

" لیکن اب تو فجر کی بانگ بھی ہو چکی ہے -"

" ابھی کچھ دیر آرام کر لو -"

" کھا کر سوؤں گا -"

" مرغ میں لا دیتی ہوں - ذبح تم کر دینا -"

" نہیں نہیں آج تم خود ہی کر لو -"

زلیخے کے پاس ہر وقت پندرہ بیس مرغے مرغیاں رہتے - جو شیر خاں نے اپنے لیے پال رکھے تھے - لیکن جب زلیخے انھیں لینے برآمدے میں پڑے ڈربے کی طرف گئی تو ایک سایہ سا جھپاک سے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھ کر کوٹھے کی طرف چلا

اور جلدی سے ایک گٹھڑی اٹھائے نیچے اتر آیا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ یہ شیر خاں تھا۔ اس نے گٹھڑی میں سے کوئی چیز نکال کر پہلے اسے اچھی طرح کپڑے سے پونچھا، پھر اپنی جیب میں ڈال لیا اور گٹھڑی بکس میں بند کر کے اسے تالہ لگا دیا۔ ادھر ادھر جھانکا، پھر اپنے بستر پر یوں گر پڑا جیسے اس میں کھڑے ہونے کی سکت نہ ہو۔

وہاں پڑا پڑا وہ یک لخت چونک کر اٹھ بیٹھتا، پھر لیٹ جاتا۔

"یہ روشنی کدھر سے آرہی ہے۔ دروازہ بند کر دو زلیخے۔ کہاں ہو، کیا کر رہی ہو، دروازہ بند کر دیا تھا نا؟" اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا "بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی میرا پیٹ کاٹ رہا ہو۔"

"ابھی ایک ہی ہوا ہے۔"

"وہی لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

جب زلیخے ایک مرغا بھون کر اس کے پاس لے آئی تو شیر خاں نے اُسے اپنے قریب آنے کو کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"آنکھیں بند کر لو۔"

"بات کیا ہے آخر؟"

"میں جو کہتا ہوں، آنکھیں بند کر و۔"

"کیا ہے۔ یہ؟"

"اب آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔"

"ہار۔ سونے کا ہار۔ شیر خاں۔ کیا رات میں چو۔"

"چوری نہیں، قتل کا ہار۔ قتل کا، شیر خاں۔ خبردار اپنی جگہ سے نہ ہلنا!"

سپیدۂ سحر تیزی سے پھیل رہا تھا۔ سب انسپکٹر خداداد نے یک لخت دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔

زلیخے صحن سے لکڑی لینے آئی تو واپسی پر دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ اس وقت دبے پاؤں جوتا اتار کر پیچھے سے سیڑھی لگا کر، پولیس کے سپاہی ایک ایک کر کے کوٹھے پر آ رہے تھے اور اس پر لیٹ کر اس موقعہ کا انتظار کر رہے تھے کہ اگر ممکن ہو وہ دروازہ توڑے بغیر مکان میں داخل ہو جائیں۔ شیر خاں کے زلیخے کو اندر بلانے پر وہ پنجوں کے بل ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے لیکن اب سب انسپکٹر خداداد خاں عرف قہر خاں آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے سپاہیوں نے بندوقیں مضبوطی سے تھام لیں اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ دو سپاہی شیر خاں کی باہر کو نکلتی ہوئی عقبی کھڑکی پر پہرہ دینے لگے۔

خداداد کے ایک ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا جو اس نے شیر خاں پر تان لیا تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھ سیل والی بیٹری تھی۔ جونہی اس کی شعاع شیر خاں کی آنکھوں میں پڑی وہ جست لگا کر ایک کونے کی طرف لپکا۔ اتنے میں اس کے قدموں کے پاس ہی پستول کا ایک فائر ہوا اور شیر خاں دہشت کے مارے وہیں منجمد ہو کر رہ گیا۔

"رحم کرو سرکار، رحم۔ خدا کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔ یہ بے گناہ ہے۔"

"کر لو گرفتار۔ اور مکان کی فوراً تلاشی لو۔" خدا داد نے کڑک کر کہا۔ مکان کی ڈیوڑھی کے دروازے کے ساتھ لگی ایک بڑھیا بڑے فاتحانہ انداز میں خدا داد کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی ـــ پولیس کی خاص مخبر۔ اندر سے زلیخے نے خدا داد کے قدموں پر پڑ کر گڑگڑا کر شیر خاں کو چھوڑ دینے کی التجا سنائی دے رہی تھی۔ وہ روتی چیختی، سینہ پیٹتی تھانیدار سے منت سماجت کرتی جاتی کہ اب شیر خاں کو چھوڑ دو ــ" اگر اس نے کبھی پھر چوری کی تو میں اس کا خون کر دوں گی!"

"خون!۔ حضور یہ دیکھیے، بکس سے گٹھڑی میں بند یہ خون آلود زنانے کپڑے برآمد ہوئے ہیں۔" ایک سپاہی نے تھانیدار کو ایک گٹھڑی اور چند کپڑے دکھاتے ہوئے کہا۔

"بالکل تازہ ہے ـــ ہے نا شیر خاں؟"

یہ سن کر شیر خاں چیتے کی مانند کپڑوں کی طرف جھپٹا۔ لیکن تھانیدار نے اس کے سر پر زور سے پسٹول کا دستہ مار کر اُسے ایک طرف ہٹا دیا۔ اس اچانک حملے کی تاب نہ لا کر شیر خاں تیورا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

"ہتھکڑی لگا کر تھانے لے چلو۔ اور جمعہ خاں کے ساتھ اسے بھی حوالات میں بند کر دو۔"

"شیر خاں نے کیا خون کیا ہے۔ اور یہ ہار" زلیخے چیخ اٹھی اور معاً غش کھا کر فرش پر جا گری۔

"یہ ہار بھی اتار لو۔ بڑی بدقسمت ہے۔ بیچاری!!"

چنانچہ شیر خاں کو اسی رات چار میل دور ایک گاؤں میں ایک نوجوان لڑکی کے قتل میں مدد دینے کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے پہنچایا گیا۔ اس واردات کی تفصیلات یہ تھیں کہ شیر خاں کے چچا جمعہ خاں نے رات کے پچھلے پہر ایک سواتی زمیندار کی بیاہتا لڑکی کو رات کے پچھلے پہر رسہ کے ذریعے اس کے والد کے گھر میں گھس کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پانچ برس ہوئے مقتولہ کے والد نے جمعہ خاں جیسے بدمعاش اور غیر سواتی شخص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت جمعہ خاں نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اگر اس نے اپنی لڑکی کی کسی دوسری جگہ شادی کی تو وہ اس سے سخت بدلہ لے گا۔ چونکہ لڑکی کا والد خاصا تگڑا اور رنڈر زمیندار تھا اس لیے اس نے جمعہ خاں کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی سال اپنے ہی خاندان میں اپنی لڑکی کی شادی کر دی تھی۔ اس دن سے جمعہ خاں لڑکی کو قتل کرنے کے لیے موقعہ کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ برس بعد وہ جب باپ کو ملنے گھر آئی تو جمعہ خاں نے اُسے کمرے میں تنہا پا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شیر خاں سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے لاش کو کوٹھے پر سے نیچے پھینک دیا تاکہ موخر الذکر اُسے فوراً ٹھکانے لگا دے۔ مقتولہ چونکہ نہایت قیمتی کپڑے اور ایک آدھ زیور پہننے کی عادی تھی اس لیے قاتل نے یہ چیزیں شیر خاں کو انعام کے طور پر دے دیں۔ علاوہ ازیں اُسے پانچسو روپیہ نقد دینے کا بھی وعدہ کیا۔ جمعہ خاں نے قتل کے وقت مقتولہ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تاکہ اس کی لاش باہر پھینک کر اوپر سے چھلانگ لگا کر فرار ہو جائے لیکن لڑکی کی چیخیں سنکر جب گھر کے افراد دروازہ توڑ کر اندر آپہنچے۔ اس عرصہ میں جمعہ خاں کوٹھے سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ لیکن شدید اندھیرے کے باعث زمین پر گرنے کی بجائے ایک پتھر پر جا گرا جس سے اس کا کولہا ٹوٹ گیا جس کے باعث وہ وہیں پکڑا گیا۔

اس اثنا میں شیر خاں نے وقت کی کمی کے باعث اور اس ڈر سے کہ رات گشت کرتا ہوا کوئی سپاہی اُسے گھر پر

موجود نہ پاکر اس پر کسی قسم کا شک کرے ۔ مقتولہ کے کپڑے ستے اور زیور اتار کر اسے ایک عمیق کھڈ میں پھینک آیا۔ اُسے یقین تھا کہ جنگلی جانور صبح ہونے سے پہلے لاش کو ہضم کر جائیں گے ۔ اسے راستے میں یہ بھی ڈر لگا رہا کہ اگر اس نے لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے چاہے تو کہیں سے کوئی جنگلی جانور اس پر حملہ آور نہ ہو جائے ۔ رات کو کالے کپڑے پہنے تاکہ وہ تاریکی کا ایک جزو بن جائے وہ لاش کو کندھے پر اٹھائے اور ایک ہاتھ میں تلوار لیے بجلی کی مانند مقتولہ کے گاؤں سے آدھ ایک میل دور کھڈ کی طرف لپکا اور لاش کو ٹھکانے لگا کر ایک اور راستے سے سرپٹ بھاگتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ جہاں اس نے پہلے اپنے مکان کے کوٹھے پر گٹھڑی کو پھینک دیا اور بعد ازاں اپنی کوٹھڑی کی کھڑکی کو اندر سے مخصوص طریقے سے کھول کر مکان کے اندر آ گیا ۔ اس وقت زلیخے کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کیے اونگھ رہی تھی ۔ اس کی دائیں جانب کمرے میں لالٹین جل رہی تھی ۔ اس نے لپک کر پہلے اُسے گل کر دیا ۔ پھر اپنے خون آلود سیاہ کپڑے بدل ڈالے ۔ وہ ہاتھ منہ راستے میں ہی ایک ندی پر دھو آیا ۔

اس کے نتیجے میں اس پر اور جمعہ خاں پر آٹھ نو مہینے مقدمہ چلتا رہا ۔ جمعہ خاں کو قتل کے جرم میں سزائے موت ہوئی ، شیر خاں کو اس میں شریک ہونے کی بنا پر بارہ برس قید بامشقت ۔ ہر دو مجرموں نے سزا میں تخفیف کے لیے ہائی کورٹ میں اپیل کی ۔

" بارہ برس ! جب عزیز گل نے زلیخے کو لاہور میں وطن سے آیا ہوا مقدمے کے فیصلے کے بارے میں خبر سنائی تو وہ ایک لحظہ کے لیے پتھرا گئی ۔ " بارہ برس ! "

" زلیخے ۔ فکر نہ کرو ۔ انھوں نے اپیل کی ہے ۔ قید کم ہو جائے گی ۔ " عزیز گل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ۔

" قید کم ہو جائے گی ۔ تجھے کیا ۔ جہنم میں جائے وہ اور میں ۔ تم نے تو ایک روز بھی گھر آ کر نہ پوچھا ۔ زلیخے زندہ ہو یا مردہ ، اور ماں ایک ہزار روپیہ لے کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی ..... "

" زلیخے ۔ زلیخے ۔ اس میں میرا کیا قصور ۔ ؟ "

" تمھیں کیا ۔ زلیخے جئے یا مرے ۔ تمھیں تو اپنی شادی کی پڑی ہے ، اپنی لگی ۔ "

مدت سے افواہیں گرم تھیں کہ اس دفعہ شیر خاں اور جمعہ خاں کو کوئی طاقت پوری سزا ہونے سے نہیں بچا سکے گی ۔ شیر خاں کے کہنے پر زلیخے نے گھر کی ہر شے حتیٰ کہ گھر تک بیچ کر مقدمہ لڑنے پر لگا دیا تھا ۔ جب اس پر آخری روپیہ خرچ ہو گیا تو اس نے عزیز گل کی طرف رجوع کیا ۔

" کچھ دیر جیل میں سڑنے دو ۔ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے ۔ " عزیز گل نے جل بھن کر اپنی شادی کے لیے پسماندہ سات سو روپے میں سے پہلے سو روپے زلیخے کو مقدمہ لڑنے کے لیے دیتے ہوئے کہا ۔ اور بعد ازاں تین سو روپیہ اور دے کر اس نے ہاتھ روک لیا ۔ زلیخے کو اپنی لڑکی سمیت اس کے ہاں پڑے چھ ماہ ہو گئے تھے ۔ عزیز گل کی بچی کچھی تنخواہ ان پر ہر ماہ خرچ ہو جاتی ۔

" بارہ برس کٹ کر نو یا دس رہ جائیں گے ... نو برس ۔ زلیخے ۔ اس وقت تک کیا ہو گا " اپیل دائر ہونے پر اس نے سوچا ۔

" نو دس برس " زلیخے نے بھی سوچا ۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی رنگت پیلی پڑ گئی اور اس کی آنکھ دھم دھم دھڑکنے لگی ۔ وہ

کئی روز متواتر بھائی کے ہاں کھانے کو ہاتھ نہ لگاتی۔ آخر کار اُس کی پڑوسن عورتوں کے سمجھانے بجھانے پر اس نے مصیبت کے یہ دن کاٹنے کے لیے بیس روپے ماہوار مع روٹی کپڑا پر ایک گھر میں ملازمت کر لی۔ جس سے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں کی چمک دوبارہ عود کر آئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اور ضیغم بھوکے نہیں مریں گے۔ کوئی چور اللہ سے ان کی محنت کا معاوضہ نہیں چھین کر لے جائے گا۔

اَب غلام محمد بلے نے جو اپنی نیلی آنکھوں کی وجہ سے بلا تنور والا کہلاتا عزیز گل کے نام زلیخے کے لیے پیام بھجوایا تو زلیخے چند ہفتوں سے بلے کے تنور پر روٹیاں لگوانے کے بہانے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھی رہتی۔ گورا چٹا، کشادہ پیشانی، گھنگھریالے بال چھریرہ جسم اور ضرورت کے وقت منہ پھٹ بلا۔ اس نے ایک روز خود زلیخے کو اُس سے شادی کرنے کی پیشکش کی تھی۔

"۔۔۔۔۔ وہ اب جیل سے واپس نہ آئے گا۔ جمعہ خاں کی مانند۔ میں نے تمھارے بیے تھانیدار سے مشورہ لیا ہے۔ وہ بھی کہتا ہے زلیخے سے کہو۔ شیر خاں سے کاغذ لے لے۔"

اس عرصہ میں عزیز گل کو ان دونوں کے روز بروز بڑھتے ہوئے تعلقات کی بھنک پڑ گئی تھی۔ جب یہ خدائی نقارہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تو عزیز گل نے زلیخے کا تیے سے ملنا قطعاً بند کر دیا۔

"اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ نہ صرف تمھارا بلکہ ہم سب کا خون کر دے گا۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔"

"اپنے ساتھ ہم سب کو مروانے پر تلی ہوئی ہے کیا؟"

"میں پہلے کیا کم مری ہوئی ہوں۔ میں برس سے یہ قید کاٹتے ہو گئے ہیں۔ مجھے کاغذ دلوا دو۔"

"کاغذ! ۔۔۔۔۔ تیری تو مت ماری گئی ہے!"

"تو جو بڑا عقل والا ہے۔ مجھے کاغذ لا کر دو گے کہ نہیں؟" زلیخے نے گھگھیا کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں اُس کا جواب معلوم ہے۔ پھر بھی ضد کرتی ہو۔"

"میں کب تک اس کی راہ دیکھتی رہوں گی!"

اس کے جواب میں عزیز گل کی گردن اس کے سینے پر یوں ڈھلک گئی جیسے کسی نے اس کا منکا توڑ دیا ہو۔ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی جیب سے ایک خط نکال کر زلیخے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"۔۔۔۔ کسی سے پڑھوا لو۔"

"یہ کب آیا تھا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ۔۔۔۔ کیا لکھا ہے ۔؟"

"کیا دکھاتا اور کیا سناتا ۔ ایک ہفتہ ہوا آیا تھا۔"

"کچھ منہ سے بولو تو۔"

" — اُسے بلے کے معاملے کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ اِس نے لکھوایا اور کہلوایا ہے کہ زندگی بھر طلاق نہیں دوں گا ۔۔۔ اور اگر ۔ کو ۔ کوئی گڑبڑ کی تو جیل سے رہا ہو کر سب کا خون کر دوں گا!"

ڈائن

اختر جمال

گھپ اندھیرے میں اچانک کسی نے اسے سوتے سوتے دبوچ لیا۔ وہ چیخ مارنا چاہتی تھی مگر اس کے حلق میں آواز گھٹ کر رہ گئی۔ کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ خود کو اس انجانے بھوت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ بالکل بے بس ہو گئی۔ آخر کار اس نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

اور جب اس نے تھک کر اپنے جسم کو ڈھیل دی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے بدن پر ڈھائی من کا بوجھ رکھا ہوا ہے ... گوشت ہی گوشت۔ بھیانک گوشت جس کے نیچے دب کر اس کا دم گھٹا جانے لگا۔ اسے اپنے گالوں پر موٹے موٹے دھکتے ہونٹ محسوس ہوئے مانو ان میں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ سانسوں کے شعلے اس کے کومل چہرے کو جھلسائے دے رہے تھے اور اس موٹے بھوت نے اسے بے تحاشہ چومتے ہوئے کہا "ڈرو نہیں ——— ڈرو نہیں پیاری! ——— میں ہوں چاندنی ——— تمہاری چاندنی۔"

"کون؟ ——— مس چاندنی ——— میرے اللہ!" اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ مس چاندنی نے اسے اچانک سوتے ہوئے کیوں پکڑ لیا ہے، آخر وہ کیا چاہتی ہیں؟ مس چاندنی ایک دم وفورِ جذبات سے پھوٹ پڑیں۔ "مجھے تم سے محبت ہے!" گہری سانس لے کر انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ "جس دن سے میں نے تمہیں دیکھا ہے میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ میں تمہاری محبت میں پاگل ہو رہی ہوں۔ مجھ پر رحم کرو ——— !"

"آخر ——— آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ سہم کر بولی۔

"میں بس تمہیں پیار کرنا چاہتی ہوں۔ میں ... میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔"

اس کا دل چاہا کہ ڈھائی من کے بوجھ کو زمین پر گرا دے اور اس کے سینہ پر چڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دے ——— ڈائن ——— بڑی آئی پیار کرنے والی۔ اس سے پیار کرنے والے بھلا کم ہیں ——— امی، ابا، بھیا، آپا ——— اور ——— اور ادریس بھائی ——— شاید وہ بھی پیار کرتے ہیں جبھی تو اس کی طرف میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور تنہائی میں ہمیشہ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کچھ نہیں کہہ پاتے ——— مگر آج تک کسی نے بھی اس طرح پیار نہیں کیا۔ یہ کیسا عجیب و غریب پیار ہے۔ یہ تو شاید دھوکے سے اسے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ آدھی رات کو اس طرح اچانک کمرے میں آنے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ لیکن وہ اسے کیوں مارنا چاہتی ہے؟ ——— اگر وہ اپنا نام نہ بتاتی تو اندھیرے کی کوکھ میں جنم لینے والی اس ڈھائی من کی چیز کو وہ ضرور ڈائن سمجھتی ——— مگر کیسی عجیب بات ہے

کہ وہ مس چاندنی ہے ـــــ!

کالج میں داخلہ لئے آج اسے پورا ہفتہ ہوا ہے۔ کاش وہ کالج میں داخلہ ہی نہ لیتی، بلا سے گھر پہ پڑھ پڑھ کر ہی امتحان دے ڈالتی امی تو یہی چاہتی تھیں مگر ابا میاں چاہتے تھے کہ فیروزہ ڈھیر سی ڈگریاں لے۔ کتنی اچھی اچھی باتیں سوچ کر انہوں نے اسے کالج میں داخل کرایا تھا۔ ہوسٹل اور کالج کے اخراجات کے لئے اپنے ضروری مصارف میں کمی کی تھی۔ مگر اس قربانی کا الٹا ہی نتیجہ ہوا۔ تعلیم و علیم تو الگ رہی اس کی جان پر بن آئی ـــ وہ ان کے غلیظ پیاروں سے تنگ آ کر رونے لگی۔

"ہیں! تم عجیب لڑکی ہو۔ پیار کرنے پہ روتی ہو ـــ پاگل! رو مت۔ میں اپنی جان بھی تم پہ نچھاور کر دوں گی۔ تم تو اتنی خوبصورت، اتنی سمجھدار لڑکی ہو۔ پھر بھی تم روتی ہو۔ اُف یہ تمہاری سسکیاں، میرے دل پہ چھریاں سی لگ رہی ہیں۔"

مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ روئے جا رہی تھی۔ وہ روتی رہی۔ وہ اس کے سر کے بالوں کو چھو کر کبھی سمجھاتیں۔ کبھی کمر پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتیں اور اندھیرے میں اُن کا ہاتھ بار بار بہک کر سینے پر آ جاتا۔

رونے کی بھی حد ہوتی ہے۔ سسکیاں دھیمی ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں اور مس چاندنی دلکش انداز سے فلمی ہیرو کی سی نرمی، مٹھاس اور جذباتیت سے بولیں ـــ "آہ وہ دن! جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسمبلی میں میری نظر جب نئی فسٹ ایئر کی لڑکیوں پر پڑی تو تم پہ اچانک گڑ کر رہ گئی۔ تم خاموش سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اپنا نام پکارے جانے پر تم نے آہستہ سے 'یس میڈم' کہا۔ ایک سیاہ لٹ تمہارے گورے گورے گالوں کو چوم رہی تھی۔ اور پھر جب تم نے دفعتاً آنکھیں اوپر اٹھائیں تو میں تمہیں دیکھتی رہ گئی۔ کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں تمہاری اف! ایسی آنکھیں جن پہ ہر نظارہ خود فدا ہو۔ سفید یونیفارم میں تم جنت کی حور لگ رہی تھیں۔" وہ اس تیزی سے جملے بول رہی تھیں جیسے یہ رٹے ہوئے ہیں اور جیسے خود بخود ان کے منہ سے نکل رہے ہیں۔ برسوں لیکچر دیتے دیتے وہ ہر ٹاپک پر کس قدر بے تکان بولنے کی عادی ہیں ۔ اسی طرح اظہارِ محبت کے طریقوں پر بھی انہیں پورا ملکہ حاصل ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ کون سی مچھلی کس انداز سے شکار کی جاتی ہے۔ بعض مچھلیوں کے لئے جال کو گہرا چھوڑ کر ڈھیل دینی پڑتی ہے اور بعض مچھلیوں کو بس ایک دم پھانس کر نکال لینا چاہئے۔ بعض مچھلیاں کھانے پینے کا لالچ زیادہ کرتی ہیں، ان کے لئے جال میں مٹھاس پیدا کرنی پڑتی ہے مگر بعض مچھلی صرف ہاتھ کی پھرتی ہی سے شکار ہو سکتی ہے۔ اور ایک بار چنگل سے نکل جائے تو ہاتھ آنا ممکن نہیں۔ وہ فیروزہ کو بھی اسی قسم کی سمجھتی تھیں۔ اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ تھوڑی دیر کے لئے اسے خوشی بھی ہوئی اور اس نے اپنی تعریفیں سُن کر مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو سچ مچ تقدیر کے حوالے کر دیا۔ جب اس نے پہلی بار مس چاندنی کو دیکھا تھا تو اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا تھا اور ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔ چھوٹا سا قد ـــ بے تحاشہ گوشت۔ بس جیسے گوشت کا لمبا ہو۔ سیاہ رنگ۔ موٹی ناک۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پیشانی برائے نام۔ گھنے سیاہ بال جو بڑی سی چوٹی کی صورت میں کمر سے نیچے تک جا رہے تھے۔ چوڑے چوڑے سفید دانت جو ہونٹوں کے پس منظر میں دن اور رات کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ اس نے دل میں توبہ توبہ کی۔ اللہ میاں نے اسے بھی بنایا ہے۔ بیچاری کا اس میں کیا قصور ہے۔

پرنسپل صاحبہ نے اس کے ابا جان سے مس چاندنی کا تعارف کرایا "آپ مس چاندنی ہیں۔ ہماری نفسیات کی لیکچرر اور ہوسٹل کی وارڈن۔

مس چاندنی نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ڈر گئی۔ یہ نفسیات کی لیکچرر ہیں۔ کہیں سمجھ نہ گئی ہوں کہ میں دل ہی دل میں ان کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ مس چاندنی نے شفیق مسکراہٹ سے کہا "ہمارے ہوسٹل میں کافی جگہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہر کمرے میں دو لڑکیاں رہتی ہیں لیکن میں انہیں علیحدہ کمرہ دے دوں گی تاکہ یہ سکون سے لکھ پڑھ سکیں۔" اباجان اس بات پر بہت خوش ہوئے۔ فیروزہ بہت محنتی اور ذہین لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک میں اپنے ضلع بھر میں سب سے زیادہ نمبر لئے ہیں۔ یہ واقعی بڑی اچھی بات ہے کہ اسے علیحدہ کمرہ مل جائے گا۔ فیروزہ کو کالج بہت پسند آیا۔ بڑی سی صاف شفاف عمارت۔ خوبصورت لان۔ بڑے بڑے گھنے درخت۔ پھر وہ گھنٹی بجنے پر اسمبلی میں گئی جہاں تمام اسٹاف اور ساری طالبات موجود تھیں۔ سفید براق جیسے یونیفارم میں تمام طالبات اپنے درجوں کے مطابق لائن میں کھڑی تھیں۔ اور ان کے عین مقابل اسٹاف۔ ان کے سیاہ گاؤن اسے ساریوں اور کپڑوں پر بہت بھلے معلوم ہوئے۔ پرنسپل صاحبہ کے قریب ہی اسے مس چاندنی دکھائی دیں۔ سیاہ گاؤن میں وہ چھپ سی گئی تھیں۔ اس نے سوچا کم ازکم انہیں تو سفید گاؤن پہننا چاہیے تاکہ یہ دکھائی تو دیں۔ حاضری کے بعد قرآن شریف کی تلاوت ہوئی اور اسلامیات کی مس پروفیسر صاحبہ نے تفسیر بیان کی۔ اس کا دل خلوص، نیکی اور اچھے جذبات سے پُر ہو گیا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں خوب محنت سے پڑھوں گی اور دنیا میں بہت اچھے اچھے کام کروں گی۔

پہلا پیریڈ انگلش کا تھا۔ اسے انگلش کی لیکچرر بہت پسند آئیں۔ دبلی پتلی سنجیدہ سی خاتون۔ انہوں نے پہلے ہی دن اپنی قابلیت سے نئی طالبات کا دل موہ لیا۔ دوسرا پیریڈ نفسیات کا تھا۔ نیا مضمون تھا اور اس نے بڑے شوق سے لیا تھا۔ اگرچہ مس چاندنی کو دیکھ کر وہ نفسیات سے سہم سی گئی تھی۔ جیسے مس چاندنی کی شخصیت گویا خود نفسیات کے مضمون کی شخصیت تھی۔ جب وہ پیریڈ لینے آئیں تو اس کا سارا ڈر جاتا رہا۔ اسے مضمون بہت اچھا لگا مگر ایک بات بہت عجیب سی معلوم ہوئی۔ لیکچر کے دوران جب بھی اس کی نظریں اوپر اٹھتیں وہ انہیں اپنی جانب دیکھتا پاتی۔ وہ پریشان سی ہو گئی۔ قلم ایک کرتا ہے۔ کہیں سیاہی تو منہ پر نہیں لگ گئی۔ اس نے رومال سے دو تین مرتبہ چہرہ پونچھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی اس نے سرگوشی میں کئی آوازیں سنیں۔ سالِ گزشتہ کی فیل شدہ لڑکیاں آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

چند دن تو وہ پریشان سی رہی۔ ہر وقت پیچھا کرتی ہوئی نظریں۔ خواہ وہ کلاس میں ہو یا اسمبلی میں، مس چاندنی کی نظریں اسے اپنے چہرے کو کھرچتی محسوس ہوتیں اور وہ پریشان سی ہو جاتی۔ آخر وہ اس طرح کیوں دیکھتی ہیں۔ ہوسٹل کے وارڈن ہونے کی حیثیت سے وہ لڑکیوں کے معاملات میں دخل دینے کی عادی ہیں مگر اسے ان کا بار بار آ کر پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھنا بھی اچھا نہ لگا۔ اس کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہی خاص قسم کا تھا جسے نہ صرف وہ بلکہ سب ہی لڑکیاں محسوس کر رہی تھیں۔ حد سے زیادہ خاطر و مدارات کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اور آج ہفتہ بھر بعد اچانک وہ اس طرح ٹوٹ پڑیں! اور اب لڑکیوں کی مسکراہٹ اور سرگوشیوں کا مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا۔

مس چاندنی جس طرح آئی تھیں اسی طرح صبح ہونے سے پہلے چلی گئیں۔ سویرے جب وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اسے اپنے سارے وجود سے گھن آئی۔ اس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا مس چاندنی کے بوسوں کے داغ شاید وہ ساری زندگی نہ دھو سکے۔ وہ گھبرا کر غسل خانے میں گھس گئی اور دیر تک ٹھنڈے پانی سے بدن مل مل کر نہائی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ہاتھوں کا میل اس کے بدن سے چپٹ کر رہ گیا ہے۔ کیوں نہ وہ آج ہوسٹل سے سارا سامان لے کر گھر چل دے۔ مگر پھر یہ تعلیم۔ وہ کسی اور کالج میں چلی جائے گی۔ اور اگر دوسرا کالج

کبھی اسی نوعیت کا ہوا تو . . . . . تو کیا وہ پڑھنا چھوڑ دے گی ؟

اور پھر جب وہ آئینے کے سامنے بال سلجھا رہی تھی تو اچانک اس کے دل میں ایک انوکھی تمنّا پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی شکل کو غور سے دیکھا۔ مس چاندنی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ کاش! کاش وہ بدصورت ہوتی۔ انتہائی خوف ناک ۔ ڈائن ——— اوہ! وہ کانپ گئی۔ مس چاندنی کی طرح! وہ بھی تو ڈائن لگتی ہیں۔ اور اگر وہ ڈائن ہوتی تو مس چاندنی پر تی اور کسی پر اچانک ٹوٹ پڑتی ——— نہیں ——— نہیں۔ وہ ڈائن بننا نہیں چاہتی۔

وہ جب ناشتہ کے لئے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو ساری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہر طرف مسکراتی ہوئی، طنز اور شرارت سے پُر آنکھیں۔ اس نے چوروں کی طرح نظریں جھکا لیں۔ جیسے تیسے میز تک آئی اور خاموشی سے توس اٹھا کر بغیر مکھن لگائے نگلنے لگی۔ اس کی ہم جماعت رضیہ اسے چپ چاپ دیکھ کر بولی " فیروزہ کیا بات ہے۔ تم تو بالکل زرد اور بیمار نظر آ رہی ہو۔"

" رات بھر میرے سر میں درد رہا۔"

" میں نے تمہارے کمرے میں آدھی رات کو دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز سنی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی تھی . . . . . "

رضیہ بات بھی پوری نہ کرنے پائی تھی کہ سال دوئم کی شگفتہ ہنس کر بولی ———

" مس چاندنی غالباً اسپرو کی ٹکیہ دینے گئی ہوں گی۔"

فیروزہ گھبرا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ رخسانہ نے چاروں طرف دیکھ کر کہا " خبردار! ہونٹ بند، زبان بند، آنکھیں بند، کان بند۔"

" ناک بند نہ کریں ؟" شگفتہ نے ہنس کر پوچھا۔

" ہاں، سونگھنے کی اجازت ہے۔" رخسانہ ہنس پڑی۔ " تمہیں پتہ ہے کُتّے سونگھ کر ہی سراغ رسانی کرتے ہیں۔" اور پھر وہ سب ہنس پڑیں۔ صرف رضیہ اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر رضیہ سے لپٹ جائے اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی۔ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اس کے پاؤں من من بھر کے ہوگئے اور زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ اس کے حلق میں کانٹا سا پھنس گیا اور اس کی آواز بھی حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پلکیں بوجھل ہو کر آنکھوں میں ہلکیں بن گئیں۔ اس کے دانت چبانے سے عاجز تھے۔ نرم نرم توس ہڈی کی طرح سخت لگ رہا تھا۔ مگر وہ اسے دانتوں تلے پکڑے رہی۔ اور پھر جب اس نے بی اے کی لڑکیوں کو ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے دیکھا تو یکایک بھاگ جانے کی خواہش اتنی شدید ہوگئی کہ وہ چائے کی پیالی آدھی چھوڑ کر بغیر کسی سمت دیکھے تیزی سے کمرے کی طرف بھاگی۔ چٹخنی بند کر کے اس نے چاروں طرف دیکھا وہ کانپ کیوں رہی ہے۔ اسے کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔ ساری لڑکیوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ ہر طرف ڈائنیں نظر آ رہی ہیں۔ وہ کیا کرے، کہاں جائے! وہ سیدھی پرنسپل صاحبہ کے پاس جائے گی اور انہیں سب کچھ بتا دے گی۔ صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ ایسی صورت حال میں ایک دن بھی کالج میں نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن بھلا کیا پرنسپل صاحبہ اس کے متعلق جانتی نہ ہوں گی۔ پھر . . . . پھر شاید ان باتوں کو بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ ورنہ مس چاندنی کو کب کا کالج سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ اور اسے پرنسپل صاحبہ سے کہنا بھی بے کار نظر آیا۔ اگر مس چاندنی دشمن ہو گئیں تو جینا عذاب کر دیں گی۔

اُف میرے اللہ! میں کیا کروں؟ اس نے آئینہ دیکھا۔ وہ سچ مچ بیمار لگ رہی تھی۔ اس کے گالوں کی سرخی اور شادابی جیسے رات بھر میں کسی جونک نے چوس لی تھی۔ وہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ کیسا خوف ناک اور گھناؤنا پیار تھا۔ کیسی محبت تھی جس نے اسے رات بھر میں مسل کر رکھ دیا۔ جیسے ننھی سی کلی گرم لو کے جھکڑ سے ایک لمحہ میں باسی پھول بن جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ خدا کا دوسرا نام محبت ہے۔ آفرینش کا راز اور زندگی کا مقصد محبت ہے۔ وہ رات بھر اس کے کانوں میں کہتی رہیں مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے محبت ہے۔ اُف! کیا یہ محبت ایسا خوف ناک اور گھناؤنا چولا بھی پہن سکتی ہے؟ یا پھر یہ محبت نہیں کچھ اور ہے۔ مگر یہ سب کیا ہے؟ —— یہ کیا ہے؟ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کمرہ بند کرکے اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہے۔ کسی کلاس میں شریک نہ ہو۔ اسے دروازہ کھولنے کے خیال سے ہی ڈر لگ رہا تھا۔ تنہائی اور خاموشی —— کتنی پیاری چیزیں ہیں۔ اور اسے اچانک موت کی آرزو ہوئی —— تنہائی، خاموشی —— گہرا سکوت —— وہ گم ہو جانا چاہتی تھی۔ اس طرح کہ کوئی بھی اسے نہ ڈھونڈ سکے۔ گھنٹی کی آواز سنائی دی اور وہ اُچھل پڑی۔ اب وہ کیا کرے۔ اسے کمرے میں بند دیکھ کر بھی طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوں گی۔ ہو سکتا ہے مس چاندنی ہی پوچھنے آجائیں کہ وہ کلاس میں کیوں نہیں گئی۔ مس چاندنی کی آمد کے خوف سے وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی ساری قوت اکٹھی کرکے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور کتابیں لے کر نیچے اتر گئی۔

مس چاندنی نے اسے اسمبلی میں آج اور بھی زیادہ پیار سے دیکھا۔ وہ لرز گئی۔ اب اس بھوت کا سایہ اسے زندگی بھر نہ چھوڑے گا۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کی ساری شخصیت، اس کی تمام زندگی، اس کی جوانی، خوبصورتی، ذہانت اور علم۔ یہ سب چیزیں بھینٹ چڑھ جائیں گی۔ اس نے سوچا لوگ پرانے زمانے کے قصے کس قدر تعجب اور افسوس سے پڑھتے ہیں کہ دیوی دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھانے کے لئے زندہ انسانوں کے گلے پر چھری پھیری جاتی تھی اور شوہر کے مرنے پر عورتیں ستی ہوتی تھیں۔ مگر کیا اس سے زیادہ خوف ناک بھینٹ بھی ممکن ہے جو وہ دے رہی ہے۔ کاش وہ پرانے زمانے میں جنم لیتی اور بخوشی ایک بار زندگی کا چولا اتار کر کالی دیوی کے چرنوں میں ڈال دیتی۔ اور اپنی پاک روح لے کر آسمانوں میں اڑ جاتی۔ مگر اب تو اسے ہر رات مرنا اور ہر صبح جینا ہے۔

وہ آنے والی رات کے خوف سے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اچانک مس چاندنی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس کا رواں رواں خوف سے کانپ گیا۔ مس چاندنی نے بڑے پیار سے کہا "فیروزہ، تمہارے بھائی ملنے آئے ہیں۔"

وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک روشن ستارہ نکل آیا۔ منجدھار میں ہاتھ پیر مارتے مارتے اچانک کشتی کی پتوار ہاتھ میں آگئی۔ "میرے بھائی، بھیا!"

"ادریس نام بتاتے ہیں۔"

وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ "ادریس بھائی؟"

"کیوں، کیا تمہارے بھائی نہیں ہیں؟"

"جی ...... جی، ہیں۔"

"سگے یا رشتے کے ——؟"

وہ جواب دیئے بغیر بجلی کی سی تیزی سے مہمان خانے کی طرف بھاگی۔ ادریس بھائی رشتے کے بھائی تھے جبکہ صرف سگے بھائی

مل سکتے تھے۔ مس چاندنی نے انہیں سگا بھائی سمجھ کر مہمان خانے میں بٹھا دیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر لپٹ جائے اور کہے کہ خدارا مجھے یہاں سے لے چلو، ابھی، اسی وقت — مگر وہ سنبھل گئی۔

"فیری، میں نے سنا کہ تم ہوسٹل میں ہو۔ سوچا تم سے ملتا جاؤں۔" ان کی بڑی بڑی سیاہ پتلیاں چمک رہی تھیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ اس کا رواں رواں کہہ رہا تھا ادریس بھائی خدا کے لئے مجھے اس قید خانے سے لے چلو۔ یہاں مجھے نا کردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے لے جاؤ۔ ورنہ میں مرجاؤں گی، پھر تم عمر بھر پچھتاؤ گے۔ مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔ چپ بیٹھی زمین تکتی رہی۔ نہ جانے اسے ادریس بھائی کے سامنے آکر کیا ہو جاتا ہے، نہ بولا جاتا ہے نہ نظر ہی اٹھتی ہے۔

"فیری، مجھ سے بات نہ کرو گی؟" ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا اور ایک دم طوفان امڈ آیا۔

ادریس بھائی پریشان ہو گئے۔" فیری، رو مت — پگلی۔ ہمت سے کام لو۔ کیا گھر بہت یاد آتا ہے؟"

"ہاں، ادریس بھائی میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے گھر بہت یاد آتا ہے۔"

"واہ، چڑیا کا ساول ہے۔ سنا ہے تمہاری ہفتہ بھر کی چھٹی بھی ہونے والی ہے۔ ماموں صاحب کو لکھ دو آکر لے جائیں گے۔"

"مگر ادریس بھائی میں آج ہی اور اسی وقت جانا چاہتی ہوں — ورنہ — ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

"اوہ، فیری! میں تو تمہیں بہت بہادر اور سمجھ دار سمجھتا تھا۔ اور تم اس قدر ڈرپوک نکلیں۔ بھلا میں تمہیں کیسے لے جا سکتا ہوں، سب لوگ — سب لوگ کیا کہیں گے۔"

"تو پھر آپ ابھی جا کر ابا جان کو بھیج دیجئے۔"

"میں! میں انہیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ میں تم سے ملنے گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"کیوں......" کیوں انہوں نے اس قدر پیار سے دہرایا کہ وہ شرم سے دُہری ہو گئی۔ ان کی جھکتی ہوئی پتلیوں کو دیکھنے کی اس میں ذرا بھی ہمت نہ تھی۔

"سچ ادریس بھائی۔ مجھے گھر بہت یاد آتا ہے۔ مجھے۔ مجھے لے چلئے۔"

"فیری، چند روز میں تمہارا جی لگ جائے گا۔ ہم تو کوئی سال بھر گھر سے باہر رہے اور اب ٹریننگ کے لئے سمندر پار جانا پڑے گا۔ بھئی ہم تو آج تک نہیں روئے، اور نہ ہی اتنی دور رو رو کر جا کر روئیں گے۔"

"آپ مرد ہیں۔"

"واہ، تم تو عورتوں کی برتری کے بڑے دعوے کیا کرتی تھیں۔"

"اب مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ مجھے لے چلئے ادریس بھائی۔ مجھے اپنے ساتھ......"

"فیری، میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔ مگر ایسے نہیں۔ بڑے زور شور سے، ڈنکے کی چوٹ! میرے ساتھ چلو گی فیری؟ ہم پھر اپنا گھر بنائیں گے۔"

"ہٹیئے آپ بڑے خراب ہیں۔ جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔" گلاب کے پھول اس لمحہ آتشیں ہو گئے اور اس نے

شرما کر اپنا چہرہ دوپٹہ میں چھپا لیا۔ وہ شریر آنکھیں مسکرانے لگیں اور اسی لمحہ مس چاندنی اچانک کمرے میں داخل ہوئیں۔ اور اس مجرمانہ اور شریفانہ ماحول میں ایک دم بوکھلا کر رہ گئیں اور انہیں شدت سے اپنے فرض کا احساس ہوا۔

"ملاقات کا وقت ختم ہے۔" ایک طرف شرم کی سرخی اور دوسری طرف نگاہوں کی چمک انہیں ذرا بھی نہ بھائی۔ ان کا بس چلتا تو اس لمحہ ادریس کو دھکے دے کر باہر نکال دیتیں۔ وہ ان سے کچھ کہے بغیر "خدا حافظ فیری" کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"یہ تمہارے سگے بھائی تو نہیں لگتے۔" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

فیروزہ سہم گئی۔

"جی میرے ما...... موں ...... کے ......"

"پرنسپل صاحبہ کو خبر ہو گئی تو مجھے بھی باتیں سننا پڑیں گی۔ آئندہ یہ صاحب نہ آئیں تو اچھا ہے۔"

"وہ انجینئرنگ کے لئے باہر جا رہے ہیں۔"

"خیر، پھر میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" اور انہوں نے اطمینان کا قہقہہ بلند کیا۔

فیروزہ نے سفید جھک کپڑوں میں ملبوس سیاہ گوشت کے کھمبے کو لرز کر دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

مس چاندنی کو پہلی نظر دیکھنے پر جس چیز کا احساس ہوتا تھا وہ بدصورتی کے علاوہ بہت زیادہ صاف و شفاف لباس تھا۔ یوں تو سب ہی ٹیچرز صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنتی تھیں لیکن مس چاندنی کے کپڑوں میں کچھ اتنی نفاست اور صفائی ہوتی تھی کہ متوجہ کر لیتی تھی۔ اکڑتا ہوا کلف اور بولتی ہوئی استری — وہ دن میں دو مرتبہ ضرور نہاتیں۔ چپل تک کئی بار دھوتی تھیں۔ انہیں دھونے دھلانے کا مرض سا تھا۔ ایسا لگتا کہ ان کی روح پر ایسے داغ ہیں اور اتنا گھناؤنا اور کثیف جامہ ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی بدن ملیں۔ سر اور جوتے دھوئیں، غلاظت نہیں چھوٹتی۔ خاکدان میں جو ذرا سی روشن چنگاری ہوتی ہے وہ ان کے ہاں بھی شاید ڈھیر سی راکھ میں دبی دبی آنچ دے رہی تھی اور ضمیر کی لعنت بس ان سے دھلوائے جاتی تھی اور وہ دھو دھو کر تھک جاتی تھیں۔ انہیں چین نہیں آتا تھا۔

چند روز فیروزہ بھی اسی طرح دھونے دھلانے پر تلی رہی۔ مگر پھر وہ تھک گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ اس غلاظت اور گندگی کو زندگی بھر نہیں دھو سکے گی۔ وہ خواہ کتنا ہی رگڑ رگڑ کر دھوئے مگر ان کے ہاتھوں کا میل اور ہونٹوں کے داغ اتنے ہی اُبھر آتے تھے۔ اور پھر وہ میل اس قدر بڑھتا گیا کہ اس کے جسم کا رنگ بن گیا اور داغ اس قدر پھیل گئے کہ اس کی شخصیت بن گئے۔ جب تک داغ نظر آتے رہے وہ اپنے وجود سے ایسی ہی نفرت کرتی رہی جیسے وہ ایک کوڑھی ہے۔ مگر جب وہ داغ اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گئے تو پھر اسے عزیز ہو گئے اس نے پرانی فیروزہ کو دفن کر دیا۔ وہ اب ایک نئی فیروزہ تھی جس کا رنگ روپ، شوخی اور ادائیں سب نرالی تھیں۔ گلاب کی کومل اور سندر کلی ایک دم بچھو بن گئی۔ اب جو ذرا اس پر کوئی فقرہ چست کرتا یا آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا تو وہ اس جرم کی سزا دلوائے بغیر نہ رہتی۔ مس چاندنی کے کان بھر دیتی اور مس چاندنی اس کے لئے دارڈن سے سوتن بن جاتیں۔

فیروزہ انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی سے مس چاندنی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھومتی۔ سنسان گوشوں اور باغ کے کنجوں میں ان کی باتیں سنا کرتی۔ مس چاندنی جہاں فیروزہ کو دور سے بھی دیکھتیں تو اس طرح کھڑی ہو جاتیں جیسے انسان نہیں کھمبا ہیں۔ فیروزہ اپنی خوبصورتی سے پہلے جتنی لاپرواہ تھی اب اتنی ہی مغرور اور خود پسند ہو گئی تھی۔ وہ روائتی محبوبہ کے ناز و انداز سیکھ رہی تھی۔ اردو غزلوں

کا سارا ماحول اس کے سامنے کھلے سبق کی طرح تھا۔ اس کی چال تک میں اترا ہٹ آگئی۔ وہ اکثر روٹھ جاتی اور مس چاندنی سو کھا سا منہ لئے اسے منانے کے جتن کرتیں۔ کئی بار ہوسٹل کے لان میں یہ منظر دیکھا گیا کہ فیروزہ کرسی پر اکڑی ہوئی بیٹھی ہے اور مس چاندنی اس کے سامنے کھڑی ہیں۔ لڑکیاں کھسر پھسر کرکے کہتیں کہ آج تک کسی کے ایسے نخرے نہیں اٹھائے تھے۔ یہ بڑھاپے کا عشق ہے۔ مس چاندنی بہت جذباتی ہو گئی ہیں۔

جب چھٹیوں میں تاریخ و جغرافیہ کی سوسائٹی کی طرف سے سیر و تفریح کا پروگرام بنا اور بہت سی لڑکیاں اور لیکچرر چلنے کو تیار ہو گیا تو مس چاندنی پیش پیش تھیں۔ کام کے سلسلہ میں وہ بہت سرگرم تھیں۔ اس لئے ان کے سر پر خاصا کام اکٹھا کر دیا جاتا تھا جسے وہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا کرتی تھیں۔ وہ ایک اچھی منتظمہ تھیں اس لئے ہر مہم میں آگے آگے ہوتیں چناب کی سیر کا وہ دن بڑا خوبصورت تھا۔ چناب کے کنارے شیشم کے گھنے درختوں کے سایوں میں دوپہر کتنی حسین معلوم ہوتی ہے۔ اور جب کنارے کی ریت میں پیر ڈال کر بیٹھ جائیں تو عجیب طرح کی آسودگی محسوس ہوتی ہے۔ کنارے پر ہوا یوں اٹھلاتی ہوئی چلتی ہے جیسے سوہنی کی روح محبت کا ابدی راگ گا رہی ہو۔ شام ہوتے جب چاروں طرف سورج کی ہلکی ہلکی سرخی چھا جاتی ہے تو سورج کا عکس چناب میں یوں اتر جاتا ہے جیسے تھکا ہوا بچہ ماں کی آغوش میں سونے کے لئے لیٹ جائے۔ کائنات ایک خوبصورت اکائی معلوم ہوتی ہے۔ ہر طرف حسن، بے پناہ حسن اور گہرا سناٹا۔ خاموشی کا حسن پہاڑوں پر محسوس کیا جا سکتا ہے یا ساحل پر۔ چناب کے پل پر سے گزرتی ہوئی موٹریں، لاریاں اور تانگے پل بھر کے لئے خاموشی کا طلسم توڑتے ہیں اور پھر چاروں طرف سناٹا اپنا جادو جگا دیتا ہے۔

فیروزہ ہمیشہ سے قدرتی مناظر کی شیفتہ تھی۔ چناب کے کنارے آ کر اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہی سوہنی کا دوسرا جنم ہے۔ وہ مس چاندنی کو بھی بھول گئی اور تنہا ٹہلتی ٹہلتی دور نکل گئی —— بہت دور —— اس لمحہ اس کے اندر وہ پرانی فیروزہ جاگ گئی تھی جو آج سے چار سال پہلے فسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی۔ وہ چلتی گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ سورج غروب ہونے کے بعد واپس جانا ہے۔ اچانک اس کی نظر دریا کے کنارے اس درخت پر پڑی جسے کسی نے کاٹ کر چبوترہ سا بنا دیا تھا۔ اس پر ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھی ہوئی تھی۔ سارا جسم ننگا تھا۔ فیروزہ کو اس لمحہ وہ بھی قدرت کا ایک حصہ نظر آیا۔ چمکتی ریت۔ پانی۔ شیشم کے ہرے بھرے درخت اور وہ آدمی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک ننگے مرد کو پہلی بار اس طرح دیکھا تھا۔ انسانی حسن کا جادو دل و دماغ میں ایک عجیب سی مسرت بھر دیتا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی یونانی دیوتا کے دربار میں خاموش کھڑی ہے۔ یا وہ سائکی ہے جو اپنے کیوپڈ کی تلاش میں زندگی بھر آوارہ رہی ہے۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ جال ڈالے بیٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سمندر کی ساری مچھلیوں نے اس کے بازوؤں میں پناہ ڈھونڈ لی ہے —— چمکتی پیٹھ، لمبی لمبی مضبوط ٹانگیں اور فولادی ہاتھ جن میں جال تھا۔ محنتی اور مضبوط ہاتھ جو مچھلیاں پکڑتے ہیں، لکڑیاں کاٹتے ہیں، ہل چلاتے اور بیج بوتے ہیں۔ جن کے بل پر تہذیب و تمدن کی اونچی عمارت قائم ہے۔ اور عروج و ترقی کی منزلوں سے بے پرواہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی تلاش میں راستے سے کانٹے ہٹاتے اور پھول چنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ کتنے خوش نصیب ہوں گے جنہیں یہ مضبوط ہاتھ محبت سے تھامیں گے اور کتابوں سے رٹے ہوئے محبت بھرے فقروں کو دہرانے کی بجائے اپنے دل کی ساری دھڑکنیں اور بیتابیاں محبت کے سیدھے سادے بوسوں میں جذب کر دیں گے۔ وہ ہاتھ —— اور فیروزہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور اس لمحہ اس نے دور سے ایک آواز سنی اور چونک کر دیکھا۔ مس چاندنی دور سے ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ ان کی آواز

پردہ آدمی بھی چونک پڑا ―― وہ سچ مچ اُچھل پڑا۔ کہیں سوہنی کی روح تو نہیں ہے۔ اور جب مس چاندنی دوڑتی ہوئی آئیں اور اس آدمی سے بے خبر تنہائی کے احساس سے سرشار ہو کر فیروزہ سے لپٹ گئیں تو وہ دیہاتی بوکھلا کر بھاگا۔ جیسے ویرانے میں کوئی چڑیل دیکھ کر بھاگتا ہے۔ اس کے سیدھے سادے دماغ میں ایک خیال اُبھرا ―― یہ وہی چڑیل ہے جس نے سوہنی کا گھڑا بدل دیا تھا اور اب سوہنی کو ستاتی پھر رہی ہے۔ اور روحوں کی اس نگری سے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دور چلا گیا۔ یہ سوہنی ہر جنم میں کچا گھڑا کیوں اٹھا لیتی ہے۔ فیروزہ مس چاندنی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مس چاندنی، میں کالج چھوڑنا نہیں چاہتی۔ ہو، کیا کروں۔ جی چاہتا ہے جان بوجھ کر فیل ہو جاؤں۔"

"پگلی تیرا کیریر خراب ہو جائے گا۔"

مس چاندنی کو بھی یاد آیا کہ اب فیروزہ کا سالانہ امتحان سر پہ ہے اور وہ عنقریب چلی جائے گی۔

"فیروزہ تو کالج سے چلی جائے گی مگر میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ اب کوئی یہ جگہ پُر نہ کر سکے گا۔"

فیروزہ مسکرا دی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بھی ایک خوبصورت جھوٹ ہے، کیونکہ مس چاندنی فسٹ ایر کی رخسانہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں اور اسے بھی رخسانہ پسند تھی۔ مس چاندنی اجارہ داری کی قائل نہ تھیں۔ ان کے لئے فیروزہ، رخسانہ وغیرہ وغیرہ ایک ہی وجود کی طرح تھیں۔ ایک دوسرے سے ان کی دوستی کا بندھن کچھ عجیب سا تھا۔ اُلجھے ہوئے بے شمار دھاگے کچھ اس طرح بٹے ہوئے تھے کہ انہیں سلجھانا اور الگ الگ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ایک بڑی سی گتھان تھی جسے کوئی نہ توڑ سکتا تھا نہ کھول سکتا تھا۔

مس چاندنی کی سابق دوستیں بھی اکثر ملنے آیا کرتی تھیں۔ پرانی شاگردیں بھی تھیں۔ جن میں سے کوئی ایم اے میں تھی اور کوئی شادی شدہ کئی بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی وہ مقناطیس کی کشش سے کھنچی چلی آتی تھیں۔ ان میں سے جب بھی کوئی آتا فیروزہ کے کمرے میں ٹھہرتا۔ فیروزہ مس چاندنی کو تجدید ملاقات کا پورا موقع دیتی تھی اور خود نئے رومان کے نشے میں سرشار ہو جایا کرتی تھی۔ مس چاندنی کی ہر پرانی محبوبہ فیروزہ کی عاشق بن کر لوٹتی۔ اور فیروزہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ جب وہ دیکھتی کہ اس کی محبت میں سارا جہان پاگل ہے۔ اس کا روواں روواں کھل اٹھتا۔ وہ ناچتی، اٹھلاتی رہتی۔ جیسے وہ سکندر اعظم ہے جس نے ساری دنیا فتح کر لی ہے۔ یا کولمبس ہے جس نے ایک نئی دنیا دریافت کر کے اس پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اور حباب کے کنارے وہ دونوں ہنستی اور گدگداتی رہیں۔ حبیب لبسوں کے ہارن کی بار بار آواز آئی تو وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

مس چاندنی لڑکیوں میں بیٹھ کر انہیں کی طرح زندہ دل ہو جایا کرتی تھیں۔ گیتوں اور ٹپوں کے شور میں مس چاندنی کے قہقہے بھی شامل ہوتے تھے۔ سب ہی خوش اور مگن تھے مگر مس چاندنی کے قہقہوں کی گونج میں دوسروں کی ہنسی دب کر رہ گئی تھی۔ مس چاندنی بہت ہنستی تھی۔ اکثر تو ان کی ہنسی سن کر تعجب ہوتا تھا کہ آخر ہنسنے کی بات کیا ہے۔ ایسا کھنکتا ہوا زوردار قہقہہ ہوتا کہ اس کی گونج دور دور سنائی دیتی۔ پھر اس ہنسی میں وہ بشاشت کی لہر، زندگی کی اُمنگ، اور مسرت کی شوخی نہ تھی جو ہنسی کو ہنسی بناتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہنسی ایک طرح کا ہتھیار ہے جسے وہ انتقام کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ وہ ساری دنیا سے انتقام لے رہی ہیں۔ نہ جانے کس بات کا انتقام شاید اپنی بدصورتی اور محرومی کا انتقام!!

مس چاندنی نے آنکھ کھولتے ہی نفرت اور حقارت دیکھی تھی۔ ایسا لگتا جیسے ہنسیں اسے اپنے ساتھ لے چلنے سے کتراتی ہیں۔

اور والدین پیار کرتے ہوئے بھی اداس ہو جاتے ہیں۔ اگر اپنے گوشت کا لوتھڑا کوئی نالی میں پھینک سکتا تو شاید اسے نالی میں پھینک دیا جاتا۔ جب وہ اپنی سب بہنوں کے ساتھ اچھے اچھے کپڑے پہنتی تو کبھی کوئی اس کے کپڑوں کی تعریف نہ کرتا اور بہنوں کے کپڑوں کی سب تعریف کرتے حالانکہ اس کے کپڑے بھی ویسے ہی ہوتے تھے۔ تعریف تو الگ رہی۔ اسے اچھے اچھے کپڑوں میں دیکھ کر لوگ چپ ہو جاتے اور پھر جب وہ ذرا سمجھدار ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ لوگ اس پر ترس کھاتے ہیں۔ اسی لئے چپ ہو جاتے ہیں۔ مگر رحمدل لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں مذاق اڑانے والے اور نفرت کرنے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ یہ دکھ بھرا احساس زندگی کو ہمیشہ کے لئے تلخ بنانے کو کافی تھا۔ اُسے بھڑکیلے اور بیش قیمت کپڑوں سے خود بخود نفرت ہو گئی۔ جوانی اور احساس کمتری ساتھ ساتھ زندگی میں داخل ہوئے جوانی کے لطیف اور نرم و نازک احساسات دنیا سے بہت زیادہ پیار کرنے کا جذبہ۔ جینے اور کام کرنے کی اُمنگ۔ آنکھیں بند کر کے کسی انجانے نشے میں سرشار رہنے کی آرزو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شرم، نفرت اور سب سے زیادہ خوف —— ! آئینہ دیکھتی تو سارے گھر سے چھپ کر جیسے چوری کر رہی ہے اور پکڑے جانے کا اندیشہ ہے۔ بڑی آپا اُسے ہمیشہ ایسے موقع پر مسکرا کر دیکھتیں۔ بڑی آپا جسے اپنے لمبے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ خود تو دو دو گھنٹے آئینے کے سامنے بیٹھی بال سلجھایا کرتی اور جو اسے دیکھتی تو پوچھتی چاندنی کیا کر رہی ہو وہ گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ جاتی اور اس لمحہ اُسے بڑی آپا سے انتہائی نفرت محسوس ہوتی۔ اس کا دل چاہتا کہ بڑی آپا سے صاف پوچھے کہ کیا مجھے آئینہ دیکھنے کا حق نہیں ہے، میری بھی تو دو آنکھیں، ناک، کان، دماغ سب کچھ ہے کیا میں بھینگی ہوں کانی ہوں۔ خدا کا بھی کتنا احسان ہے کہ اس نے صحیح سلامت پیدا کیا۔ اگر میں اندھی، لولی لنگڑی ہوتی تو نہ جانے یہ لوگ کیا سلوک کرتے" اور یہ سوچ کر وہ کبھی خدا کی ناشکری نہ کرتی اور صابر و شاکر نظر آتی۔ "ہر شخص کو اپنی صحت پسند ہے یہ کتنی اچھی بات ہے۔ اسی لئے تو دنیا رہنے کے قابل ہے مگر خدا جانے دوسروں کو کیوں تکلیف ہوتی ہے میں اگر بری ہوں تو نہ دیکھا کریں، اپنی آنکھیں بند کر لیا کریں" کئی بار اس نے یہ باتیں سوچیں مگر کسی سے کچھ نہ کہا۔ جب اس کا رونے کو جی چاہتا تو وہ ہنس پڑتی اور وہ اسی طرح ہنستی رہی۔ عید، بقرعید، شادی بیاہ، ہر موقع پر وہ بھی خوشی خوشی سب کے ساتھ شریک ہوتی مگر اس کے لئے ہر نئی تقریب اور تہوار نئے نشتر ساتھ لیے آتا۔ ایسے موقعوں پر اس کے ڈھیر سے رشتے کے بھائی گھر میں آتے جاتے تو احساس کمتری اس کی رگ رگ میں سلگ اٹھتا۔ رشتے کے بھائی اس کی بہنوں کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح منڈلاتے اور وہ کلیاں ایک ایک کر کے کسی نہ کسی کی جھولی میں گر گئیں اور اب پھول بن کر مہک رہی ہیں۔ کسی کا میاں تھانیدار ہے کسی کا اوورسیر، کسی کا ٹھیکیدار۔ مگر وہ اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور محنتی ہوتے ہوئے بھی بوجھ بنی رہی۔ ماں باپ پر زمین پر —— اور کبھی کبھی تو اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اپنے جسم کا بوجھ وہ خود بھی نہیں اٹھا سکتی وہ اتنی ذہین نہ ہوتی تو بے حس پتھر بن جاتی مگر اب تو نفرت اور انتقام کی چنگاریاں اس کی رگ رگ میں سلگ رہی تھیں۔

جب اس نے فسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تو والدین نے مزید تعلیم کے لئے لاہور بھیج دیا اور وہ ہوسٹل میں رہنے لگی۔ چاندنی کی شادی کا خیال اس کے والدین نے بھی دل سے نکال دیا اس کا کوئی پیغام نہ آتا تھا اور آتا بھی تو کسی بوڑھے رنڈوے یا نکمے لڑکے کا۔ اس وجہ سے یہی مناسب سمجھا گیا کہ وہ تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔

ہوسٹل میں چاندنی کی روم میٹ ایک بڑی عمر کی لڑکی تھی جو ایم۔ اے کے پہلے سال میں تھی وہ حد درجہ خلیق اور سمجھدار تھی اس نے چاندنی کی قدر و قیمت پہلی ہی نظر میں بھانپ لی۔

کیا ہوا جو اس کے خط و خال بُرے اور رنگ کالا ہے اس نے ایک دن پوچھا "تمہارا نام چاندنی کیوں رکھا ہے؟" چاندنی حسب معمول ہنس پڑی۔ "والدین اپنی تسکین کے لئے بدصورت بچوں کے خوبصورت نام رکھ دیتے ہیں۔"

"واہ، کیا تم بدصورت ہو" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ظاہر ہے باجی، یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے"۔ اس کی آنکھیں ہنستے ہوئے سنجیدہ ہو گئیں۔

"کیا صرف گورا رنگ نہ ہونے سے انسان بدصورت کہلاتا ہے۔ کالے رنگ میں تو زیادہ جاذبیت ہوتی ہے۔ یہ حبشی کس قدر سیاہ فام ہوتے ہیں مگر گوری قوموں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں تم نے کبھی اپنے جسم کو غور سے دیکھا ہے۔"

وہ زندگی میں پہلی بار شرما گئی۔ پہلی دفعہ کسی نے اُسے پسندیدگی سے دیکھا تھا مسرت کی ایک انجانی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھیں تشکر کے احساس سے چھلک گئیں۔

اس رات جب اس کی روم میٹ نے سردی سے کپکپاتے ہوئے کہا "مجھے تو ہمیشہ کسی نہ کسی کے ساتھ سونے کی عادت ہے اکیلی لیٹتی ہوں تو بستر بہت ٹھنڈا لگتا ہے۔ یہاں آجاؤ۔ دونوں ساتھ سوئیں گے تو بستر خوب گرم ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا زرینہ باجی"۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے اس کے پاس چلی گئی۔

رات کی تاریکی میں نہ تو نقش نظر آتے ہیں اور نہ گورا چٹا رنگ۔ اندھیرے میں آنکھیں نہیں ہاتھ دیکھتے ہیں اور صرف گوشت نظر آتا ہے اور زرینہ کے ہاتھوں نے چاندنی کو پسند کر لیا۔

چاندنی کو ایک راستہ مل گیا۔ وہ اس نئے تجربے سے خوش تھی۔ اس کے رخسار چومے جانے کی خواہش سے سلگ اُٹھتے تھے سینے میں جذبات اور احساسات کا جوار بھاٹا اُٹھتا تھا۔ اس کی باہیں ٹوٹتی تھیں اور کمر آپ ہی آپ بل کھا کر دکھنے لگتی تھی۔ آنکھیں ہر سو پیار اور محبت کی متلاشی تھیں۔ چاندنی نے زرینہ باجی کو پا کر ساری دنیا پا لی۔ اسے مسرت سے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آ گیا اور پھر اُسے مردوں سے نفرت ہو گئی۔ سختی، کرختگی، خود غرضی بس مرد اپنے لئے جیتا ہے اپنے لئے محبت کرتا ہے، اپنے جذبات اور خواہشات کی تسکین اس کی زندگی کا مقصد ہے اپنی ہوس اور نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے حسین چہرے کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کا نام اُس نے محبت رکھ چھوڑا ہے اسی وجہ سے اُسے کبھی کسی بدصورت لڑکی سے محبت نہیں ہوتی۔ اور .... اور زرینہ باجی! وہ خود کتنی خوبصورت ہیں مگر وہ محبت کرنا اور دل رکھنا جانتی ہیں۔ انہیں مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مرد اُن کا دم بھرتے ہیں۔ مگر وہ کسی کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں "مردوں سے محبت کا نتیجہ کیا ہے۔ بس کتیا کی طرح بہت سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں"۔ زرینہ باجی نے ایک دن ہنس کر کہا۔ اور اس نے سنجیدگی سے سُنا اور حرف آخر سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ان کی باتیں گرہ میں باندھ لیں۔

ایک دفعہ زرینہ باجی کی ایک بڑی پرانی دوست ملنے آئیں۔ چھوٹے سے قد کی گول مٹول سی گوری چٹی عورت۔ وہ بھی زرینہ باجی کی طرح ہنس مکھ اور زندہ دل تھیں۔ زرینہ باجی اور وہ لپٹ کر ملتی رہیں جیسے ان دونوں نے مل کر دنیا کی ساری خوشی سمیٹ لی ہے اور پھر ان کی دوست زرینہ باجی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولیں "میں چھٹی ہوتے ہی بھاگی چلی آ رہی ہوں۔ تیرے لئے مر رہی تھی"۔ زرینہ باجی نے اسی گرمجوشی سے لپٹ کر انہیں پھر پیار کیا۔ "تو اگر ایک دن اور نہ آئی ہوتی تو میں خود پہنچ جاتی"۔ ان کی دوست کسی کالج میں لیکچرر تھیں۔ رات کو جب زرینہ باجی اور ان کی دوست اکٹھی سونے لیٹیں تو چاندنی کو بہت برا لگا پہلی بار رقابت کی آگ اس کے دل میں سلگی۔ اس کا خون زور زور سے ٹھلنے کو

جی چاہا۔ وہ سمجھتی تھی کہ زرینہ باجی کی تنہا حقدار وہی ہے وہ بستر پر اداس لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر زرینہ باجی نے اُسے پیار سے پکارا اور ہنس کر کہا "ہم دونوں تو اکٹھے سوتے ہی ہیں آج تم ثریا کے ساتھ لیٹ جاؤ۔"

"نہیں ـــ میں ـــ میں نہیں سوؤنگی"۔ وہ شرما گئی۔ جیسے کوئی کسی نامحرم کا نام لے دے۔

"ارے ننہ یاؤ مت" ثریا نے اٹھ کر پیار سے اُس کا ہاتھ تھاما اور اس کے بستر میں گھس کر لیٹ گئی۔

ثریا دو دن رہیں اور جب وہ چلی گئیں تو چاندنی کو ان کا پیار۔ رہ رہ کر یاد آتا رہا اسے خوشی تھی کہ اُسے زرینہ باجی کا ایک وجود اور مل گیا تھا۔ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ زرینہ باجی کے بہت سے وجود ہو جائیں اور اُن کا ہر وجود اس سے محبت کرے اور وہ زرینہ باجی کے ہر وجود کو پوجے۔ اور پھر اسے بہت سی زرینہ باجیاں ملیں۔ ان کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں نام کو بھی حسد، جلن اور رقابت کا مادہ نہ تھا وہ سب آپس میں اس طرح شیر و شکر تھیں جیسے ایک مذہب کو ماننے والے اور ایک پیغمبر کی امت۔ چاندنی کو اپنی زرینہ باجی کے ہر نئے وجود میں ایک نئی مسرت ملتی۔ اور پھر جب وہ ایم۔ اے کے پہلے سال میں آئی تو پھر خود چاندنی سے زرینہ باجی بن گئی اور پھر ایک دم زندگی کے اڑتیس سال گزر گئے۔ زندگی میں اس نے کھویا زیادہ یا پایا زیادہ وہ کبھی اس کا اندازہ نہ کر سکی۔ بہرحال سوسائٹی میں وہ ایک اچھی حیثیت کی مالک تھی اور اب اپنے گھرانے میں سب سے ممتاز فرد تھی۔ اور تو اور اب وہ رشتے کے بھائی جو اُسے کبھی منہ بھی نہ لگاتے تھے آدھی درجن بچوں کے باپ بننے کے بعد اس سے مرعوب ہو کر دیکھنے لگے تھے۔ اور اپنی دبلی سوکھی سدا بیمار رہنے والی بہنوں کے ساتھ جب وہ بیٹھتی اور سمجھداری کی باتیں کرتی تو بہنیں احساس کمتری کے مارے بول بھی نہ پاتیں اور ان کے شوہر اس کے تندرست جسم اور ذہین دماغ پر دل ہی دل میں عش عش کرتے۔ مگر اب اسے اس قسم کی پسندیدہ نگاہوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس نے کبھی کسی بہنوئی یا رشتے کے بھائی کو منہ تک نہ لگایا۔ وہ ان سے اس طرح بات کرتی تھی جیسے وہ سب اس کی سطح سے نیچے ہیں۔ محلے اور پڑوس میں دور دور تک اس کی عزت تھی۔ ساری جوانی شرافت سے گذار دی کسی نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ اس کی شرافت اور پاکبازی کا لوگ کلمہ پڑھتے تھے۔ ماں باپ کو اپنے بیٹوں پر اتنا فخر نہ تھا جتنا اپنی لائق بیٹی پر۔ وہ سب کی مدد کرتی تھی۔ سب کا خیال رکھتی تھی۔ شادی بیاہ کے موقع پر سب سے آگے ہوتی۔ ایسی محفلوں میں وہ کسی مرد کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ اس کی شرم و حیا خاندان کے لئے ایک مثال تھی۔ البتہ جب لڑکیوں میں بیٹھتی تو اس عمر میں بھی شوخ اور چنچل بن جاتی اور پھر بڑی بوڑھیاں بلند قہقہے سن کر سوچتیں کہ کیا حرج ہے آخر بیاہ نہیں ہوا، لڑکی ہی ہے۔ اس کا ہنسی مذاق ساری محفل میں جان ڈال دیتا۔ خود دلہن کو سنوارتی اور پھر پیار سے چوم کر اسے آئینہ دکھاتی۔ ایک دفعہ ایک بہت خوبصورت دلہن کو دیکھ کر وہ بے اختیار بولی "ہائے، مجھے تیرے دولہا پر رشک آتا ہے"۔ بڑی بوڑھیوں نے ترس کھا کر اُسے دیکھا۔ وہ سمجھیں اس کا بھی دلہن بننے کو جی چاہتا ہوگا۔ لیکن یہ بات سبھی جانتے تھے کہ اب چاندنی شادی نہیں کرے گی حالانکہ اب اس عمر میں اس کے اتنے پیغام آتے تھے جتنے بہنوں کے بھی نہ آئے تھے۔ یہاں تک کہ کنوارے لڑکوں کے بھی پیغام چلے آتے تھے۔

"کیا ہوا جو شکل و صورت خراب ہے آخر آدمی کا بچہ ہے پھر اتنی پڑھی لکھی ہے۔ پھر پانچ سو روپے ماہوار کماتی ہے۔ صورت لیکر کیا چاٹنا ہے زندگی میں صورت ہی تو کام نہیں آتی۔ مفلسی اور بد[illegible] سے اچھی اچھی صورتیں بھی بگڑ جاتی ہیں اور پھر اگر پانچ دس سال لڑکے سے بڑی ہے تو کیا ہوا! ہمارے رسول کی سنت ہے ...." پیغام لانے والے کچھ اس قسم کی باتیں سوچتے تھے مگر اب چاندنی بہت سمجھدار تھی وہ صاف کہہ دیتی "مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے؟" اس فقرے سے سب لاجواب ہو جاتے واقعی اسے شادی کی کیا ضرورت ہے

وہ کس کی محتاج ہے۔

نئی دنیا کی سرحدوں میں ایک عرصہ دراز کے بعد پرانی دنیا کا ایک مسافر آگیا مس پانی نے ہنس کر کہا "تمہارے وہ بھائی آئے ہیں جو ایک بار فسٹ ائیر میں ملنے آئے تھے۔"

ایک لمحہ کے لئے وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ ادریس بھائی! وہ تو ان چار سالوں میں انہیں بھول ہی گئی تھی۔ گھر سے آئے ہوئے خطوں میں کبھی کبھی ان کا ذکر ہوتا تھا۔ اور اُسے معلوم تھا کہ وہ انگلینڈ میں ہیں اور بخیر و عافیت ہیں مگر خدا جانے کیوں ان سالوں میں اس نے ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا وہ اپنی گذشتہ زندگی کو بھی اب بھول چکی تھی یہاں تک کہ گھر جاتی تو بچپن سے چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کرتی۔ گھر میں ذرا جی نہ لگتا اور اب پورے چار سال بعد ادریس بھائی اس سے ملنے آئے ہیں نہ جانے اتنے عرصے وہ کیا کیا کرتے رہے۔ وہ اس الھڑ لڑکی سے ملنے گئے تھے جس نے ان سے رو رو کر گھر لے جانے کی خواہش کی تھی اور اب وہ ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی سے ملیں گے جو شادی بیاہ کی منزلیں طے کئے بغیر ہی ایک پختہ کار عورت بن گئی ہے۔ ایسی کلیاں بھی تو ہوتی ہیں جو نسیم سحر کے ہلکے جھونکوں سے کھلنے کے بجائے اچانک تند و تیز ہوا کی لپیٹ میں آکر پھول بن جاتی ہیں۔ اور ماحول میں خوشبو بکھیرے بغیر آندھی کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں سے پل بھر میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ ان کی کوکھ اندھی ہوتی ہے ان کی چھاتیاں پتھر ہوتی ہیں ان سے لہو کی دھاریں دودھ کے قطرے بن کر ننھے ہونٹوں میں زندگی کا رس نہیں ٹپکاتیں، ان کی ماں تا کو کوئی نہیں جگا سکتا۔ وہ جاگنے سے پہلے ہی مر جاتی ہے۔ عورت ماں کبھی ہوتی ہے اور جب ماں مر جاتی ہے اور صرف عورت زندہ رہ جاتی ہے تو وہ عورت شیطان بن جاتی ہے ایسا شیطان جس سے ابلیس بھی پناہ مانگتا ہے۔

اس نے کھڑے مس چاندنی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ہنس پڑی۔

"ادریس بھائی تو میرے رشتے کے بھائی ہیں۔"

"او، تم بن لو۔ کوئی حرج نہیں"۔ انہوں نے مہربان ہو کر کہا۔ انہیں کسی رقیب کا کھٹکا نہیں تھا۔ بلکہ اُن کا دل رقیب کو نیچا دکھانے کی خواہش سے مچل اٹھا تھا۔

جب وہ مہمان خانے میں آئی تو ادریس اس طرح گرمجوشی سے آگے بڑھا کہ وہ گھبرا گئی۔ جیسے وہ اٹھا کر لے جائیگا۔

"ادریس بھائی آداب!"

اس نے فیروزہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ "فیری، کتنے عرصہ بعد تمہیں دیکھا ہے۔ تم کس قدر بدل گئی ہو۔"

"اچھا! سچ مچ! . . . . کیا تبدیلی دیکھی آپ نے؟"

"پہلے تم ایک کلی کی طرح معصوم اور شرمیلی تھیں اور اب ایک شگفتہ پھول کی طرح شوخ اور شریر معلوم ہوتی ہو۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اور آپ اب تو چھت کی برابر لمبے ہو گئے ہیں۔ ہمارے مہمان خانے کی چھت پہلے ہی سے ٹپکتی ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے ولایت سے اکیلے آ گئے ہیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی دنیا کے دستور کے مطابق [illegible] ایک عدد میم لائیں گے۔ افسوس بڑی بھدی . . . ."

"لو یہ میں تو اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہاں سے کیا لاتا۔ نہ پوچھو یہ چار سال کیسے گذارے ہیں۔ اور اب میں اپنا وعدہ

پورا کرنے آیا ہوں، اب میں جلد ہی تمہیں لے جاؤں گا۔"

"اوہو۔ ادریس بھائی، اب تو وہ سب باتیں پرانی ہو گئیں، آپ کو اب تک یاد ہیں"

اس نے ترس کھا کر دیکھا "سچ پوچھئے تو اب کالج چھوڑنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ آپ نے سچ کہا تھا کہ رفتہ رفتہ دل لگ جائے گا اب تو جناب مجھے ایم۔اے۔ کرنا ہے"۔

"وہ ـــــــ وہ تو تم بعد میں بھی کر سکتی ہو"۔

"خوب، بھلا پنجرے میں بند ہو کر بھی کیا کر سکتا ہے؟"

"تو .... تم شادی کو اب پنجرہ کہنے لگی ہو"۔

"ادریس بھائی، سچ، میں تو آزاد فضاؤں میں اڑنا چاہتی ہوں"۔

"ہم دو ہنسوں کے جوڑے کی طرح آزاد فضاؤں میں پرواز کریں گے"۔

وہ ہنس پڑی "اچھا جی، تو ولایت میں آپ کی دال نہیں گلی ـــــــ چ .... چ ـــــــ بڑا افسوس ہے"۔

"بڑی شریر ہو۔ پہلے دیسی تو لے آؤں پھر ولایتی کی کوشش کروں گا"

"اوہو! یہ دم خم!" وہ ہنسنے لگے۔

"سچ ادریس بھائی، آپ بے حد دلچسپ آدمی ہیں"۔

"خوب، اچھا کمپلیمنٹ دیا، شکریہ! بھلا آپ کیا کم دلچسپ ہیں۔ اور جب دو دلچسپ آدمی مل جائیں گے تو زندگی واقعی دلچسپ ہو جائے گی"۔

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے منہ دھو رکھئے۔ اچھا، آپ چائے پئیں گے۔ دیکھئے آپ کے لئے گرما گرم سموسے اور پکوڑے آ رہے ہیں" مس چاندنی نے ٹرے میں چائے بھجوائی۔ وہ رقیب پر دل کھول کر مہربان تھیں۔ اب وہ ہارا ہوا پورس تھا جو سکندر اعظم کے سامنے تھا۔

"بیزی، اب مجھے چلنا چاہیئے، ڈرتا ہوں کہیں تمہاری وارڈن نہ نازل ہو جائیں۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں بالکل جیل خانے کے داروغہ کی سی شخصیت ہے۔ اس روز میں تو واقعی ڈر گیا تھا"۔

"ادریس بھائی، آپ احسان فراموشی کر رہے ہیں کیا جیل کا داروغہ اس طرح خاطر کرتا ہے؟"

"اچھا، تو یہ تکلفات انہوں نے فرمائے ہیں۔ بڑا خیال رکھتی ہیں تمہارا۔ غالباً انہیں

"معلوم ہے کہ ہم کوئی ایسے ویسے نہیں بلکہ تمہارے ہونے والے ...."

"ہٹئے بھی۔ چپ رہیئے ورنہ ابھی انہیں بلا لوں گی"۔

"خدا کے لئے انہیں مت بلاؤ۔ اب ولایت سے میم لیکر تمہیں آیا تو شے لطیف سے بالکل محروم بھی نہ سمجھو بیٹھی میں تم جلدی آ جاؤ گی"۔

"آپ میرا اس قدر مذاق اڑا رہے ہیں، یاد رکھئے بدلہ لوں گی"۔

پہ شانے سے بچپن سے سمجھا رہی ہوں محبت سے

"دیکھا جائے گا۔ ہمیں بھی بہت سے بدلے لینے ہیں۔" اور اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ ہولے سے چھو کر وہ چلا گیا۔

بیچارے ادریس بھائی۔ اس نے سوچا، اُسے سچ مچ بڑا ترس آیا۔ اس نے اپنے دل کے گوشوں میں دور دور تک جھانکا۔ وہاں اس نام اور صورت کا مکین نہیں تھا۔ کسی نے دریچے سے جھانکا ضرور تھا مگر اب پورے چار سال گزر گئے اور بھلا دریچے بھی کوئی کھلے رکھتا ہے۔ تہہ خانوں میں جو چراغ کی ننھی سی لو ٹمٹما رہی تھی اُسے سرد سرد جھونکوں نے کب کی گل کر دی تھی۔ اب تو دل کی جگہ کسی نے برف کی ٹھنڈی سل رکھ دی ہے۔ چار سال بعد اس صورت کو دیکھنے سے جذبات و احساسات میں ذرا بھی تو آنچ نہیں اٹھی۔ بھلا برف کی سل بھی کہیں آگ جلا سکتا ہے۔ کتنے پاگل ہیں ادریس بھائی۔

فیروزہ جب بی۔ اے کا امتحان دے کر گھر لوٹی تو ڈھیر سے رشتے ٹوٹ پڑے۔ اس نے بہت شور مچایا کہ میں آگے پڑھوں گی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ لڑکی کی عمر زیادہ ہو جائے تو اپنے جوڑ کے اچھے لڑکے نہیں ملتے۔ انہوں نے فیصلہ سنا دیا اور اس کے والد نے حسب عادت ان کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیا۔ فیروزہ کو بہت غصہ آیا۔ اماں بھی عجیب باتیں کرتی رہیں اور مس چاندنی کا چھٹیوں میں گھر آنا بھی اماں کو پسند نہ آیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ "دوستی ہم عمروں میں ہوتی ہے یہ تمہاری کیسی استانی ہیں، ہر وقت ہنسی مذاق اور قہقہے۔ اور بھی تو پروفیسر ہیں ان میں سے کوئی کبھی نہیں آیا۔ یہ کیوں ہر چھٹی میں تمہارے پاس آتی ہیں۔"

"اماں آپ کس قدر تنگ نظر ہیں۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہیں۔" اماں مصنوعاً خاموش ہو گئیں۔ اس کی بڑی بہن جب سسرال سے آئی تو تو اس باقاعدہ شادی کی مہم شروع کر دی۔ فیروزہ نے بحث مباحثے سے باجی کو قائل کرنا چاہا مگر اس کی ایک نہ چلی۔

"فیری عورت کی تکمیل ماں بن کر ہوتی ہے۔ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے اس کا گھر ہو، بچے ہوں۔ مجھے تو تمہاری مس چاندنی پر ترس آتا ہے۔ میں سوچا کرتی ہوں کہ جب یہ بوڑھی ہو جائیں گی تو زندگی انہیں کس قدر کاٹے گی۔"

باجی، وہ کبھی بوڑھی نہ ہوں گی۔ ڈھیر سے بچے پیدا کر کے عورت بوڑھی اور بدصورت ہو جاتی ہے شادی نہ کر کے وہ اپنی جوانی اور خوبصورتی میں بیس برس کا ضرور اضافہ کر لیتی ہے۔"

"لیکن فیری، مجھے تو یہ بوڑھی کنواریاں سنکی سی لگتی ہیں خواہ ڈاکٹر ہوں یا استانی ہوں یا نرس، ان میں کسی چیز کی کمی ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے توازن نہیں ہوتا۔" اور پھر باجی نے اس کے آئے ہوئے رشتوں پر تبصرہ کر کے کہا، "تم اچھی طرح سوچ لو، تمہاری مرضی سب چیزوں سے زیادہ مقدم ہے۔ اور ہاں ادریس بھائی کے متعلق تمہیں معلوم ہے وہ تمہارے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مستحق امیدوار ہیں۔ انہیں تم سے جو لگاؤ ہے اُسے سب ہی محسوس کرتے ہیں۔"

"مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے اچھا، کل صبح تک سوچ کر بتا دینا۔" باجی چلی گئیں، وہ بے معنی نظروں سے ہوا میں دیکھتی رہی۔ جو رشتے کے لئے آئے ہوئے خطوط سے نکال کر باجی رکھ گئی تھیں، اور پھر اس نے یکایک سب کو ماچس کی تیلی دکھا دی سر رکھ کر آتشدان میں ان کے جلنے کا نظارہ دیکھتی رہی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ادریس بھائی ...... ادریس بھائی اُسے واقعی چاہتے ہیں ان کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے جیسے سارا زمانہ جانتا ہے مگر ایک وہی نہیں جاننا چاہتی۔ جن دنوں وہ اسکول جاتی تھی جانے کیوں اسے ادریس بھائی کے متعلق سوچتے ہنسنے کا خبط سا تھا۔ اور پھر اسے ان کا پہلی بار کالج آنا یاد آیا اور پھر آخری ——— لوگ تو ولایت جا کر خوب عیش کرتے ہیں اور وہ اس کی یاد کو سینے سے لگائے رہتے۔ بیچارے! آخر اُن میں کیا برائی

ہے۔ کیوں نہ وہ ان سے شادی کر لے۔ اچھے خاصے خوش مذاق آدمی ہیں اگر شادی ہی کرنا ہے تو پھر ادریس بھائی سے زیادہ مناسب آدمی نہیں ملے گا اور پھر ادریس بھائی اُسے چاہتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی بات ہے اور وہ بیچارے یہ خبر سن کر کس قدر خوش ہو جائیں گے کہ اس نے انہیں پسند کر لیا ہے۔ خوب، تو اب وہ اسے بیاہنے آئیں گے۔ کتنے خوش ہوں گے کہ آخر جیت ان کے حصے میں آئی پورس کو اس کی سلطنت واپس مل گئی۔

دولہن بننا، شادی ہونا۔ یہ سب دلچسپ منزلیں ہیں دلچسپ اور خوبصورت۔ اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ گہرے گہرے سرخ پردے۔ گل داؤدی کے سفید پھول مینٹل پر دو تصویریں تھیں۔ ایک اس کی اور دوسری ادریس کی۔ اس نے ادریس کی تصویر کو غور سے دیکھا کیسا بھولا بھالا اور معصوم سا چہرہ ہے۔ اور آنکھیں۔ یہ آنکھیں کتنی پُرکشش اور جادوگر مشہور ہیں۔ سچ مچ ان میں کوئی بات ضرور ہے۔ بیچاری رخسانہ! کتنی محبت کرتی ہے۔ ادریس بھائی سے۔ کاش اس غریب سے شادی کر لیتے۔ کس قدر خوش ہوتی اگر وہ اس کمرے میں دلہن بن کر آئی ہوتی ۔۔ بیچاری ۔۔ اس کے رخسار انگاروں کی طرح دہک اٹھتے۔ ان کے قرب کے خیال سے ہی اس کے بدن سے آنچ اٹھتی۔ شاید چپکے سے تصویر چوم لیتی۔ مگر یہ مرد بھی اچھے خاصے سنکی ہوتے ہیں جتنی ان کی پرواہ کرو اُتنے ہی بے نیاز اور جس قدر تغافل برتو اتنے ہی دیوانے۔ اب وہ ذرا بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی تو ہر ایک دم بھرتا ہے۔ اور بیچاری رخسانہ اپنے دل کا حال سہیلیوں پر کھول کر خواہ مخواہ رسوا ہوتی، ادریس نے آگے بڑھ ہاتھ تھامنے کے بجائے کہہ دیا "میں نے تو تمہیں ہمیشہ سگی بہن سمجھا ہے۔ میں تمہارے بارے میں اور کچھ سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں"۔ اور رخسانہ سسک سسک کر خاموش ہو گئی وہ سچ مچ سگی بہن بن گئی اس نے دل کھول کر ادریس کی شادی میں ارمان نکالے سر پہ آنچل ڈال کر دولہا کا ہاتھ پکڑ کر اندر لائی۔ ساری رسموں میں دولہا کی بہن کا پارٹ ادا کیا۔ دولہا کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس لئے سب نے اسے دولہا کی بہن مان لیا۔ ادریس نے آخر اُسے کیوں سگی بہن نہیں سمجھا۔ وہ اسے کن نظروں سے دیکھتا رہا۔ کسی زمانے میں اُسے بھی یہ نظریں اپنے روئیں روئیں میں چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر پھر اچانک ان آنکھوں نے اپنی ساری کشش کھو دی اس نے دوبارہ تصویر کو غور سے دیکھا اور سوچا مس چاندنی کاش اسے دولہن بنا ہوا دیکھتیں۔ اس نے جب بن سنور کر آئینہ دیکھا اُسے بیساختہ ان کی یاد آئی۔ وہ کتنی تعریف کرتیں خوبصورت الفاظ کا جال بن دیتیں۔ دیوانہ وار چومتیں۔ مگر وہ نہیں آئیں۔ شادی کا دعوت نامہ ملنے پر انہوں نے ایک خوبصورت انگوٹھی بھجوائی تھی۔ فیروزہ نے وہ انگوٹھی بھی منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ ہی پہن لی تھی اور دونوں انگوٹھیوں کو دیکھ کر سوچا تھا اب یہ ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔

پردوں میں سرسراہٹ ہوئی مینٹل پہ رکھی ہوئی تصویر میں یکایک جان پڑ گئی۔ بشاشت، امنگ، جوش اور مسرت۔ وفورِ جذبات سے اس کی آنکھیں بول رہی تھیں اور لبوں پہ ایک شریر مسکراہٹ۔ چند لمحوں تک وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جس بت کی زندگی بھر پوجا کی وہ اب اچانک ایک عورت کے روپ میں اس کے سامنے ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کی اپنی ہے۔ اس کے بچپن کی آرزو۔ جوانی کا خواب۔ اس نے سوچا اب وہ روٹھے گی اور شرمائے گی وہ اسے منائے گا اور وہ دل بھر کر ستائے گی۔

"فیری ۔ میری فیری!" وہ پیار سے تڑپ کر پکارا

"فیری، دیکھو آخر میں تمہیں لے ہی آیا۔ کیا اب بھی تم مجھ سے بھاگو گی؟"

وہ ایک مٹی کے بت کی طرح ہاتھ سے چھوتے ہی اس کی آغوش میں گر گئی۔ شرمانے اور لجانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس نے آپ کو قسمت کے حوالے کرنا سیکھ لیا تھا۔ اور پھر اچانک فیروزہ کا جی گھبرانے لگا۔ جذبات کی دہکتی ہوئی بھٹی میں اس کا جی گھٹنے لگا۔

کے ہیجان سے اُسے وحشت سی ہونے لگی اسے ایسا محسوس ہؤا کہ اس کا سارا وجود پگھل جائے گا۔ اس نے ایک نظر ادریس کی طرف دیکھا چوڑا چکلا سینہ، جذبات و احساسات کی تیز آنچ، مضبوط بازو جو پیار، حفاظت اور زندگی میں اعتماد کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ آنکھیں جو بھرپور مسرت اور آسودگی سے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ نہ جانے کیوں فیروزہ کو یہ سب چیزیں انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوئیں۔ وہ اسکی محبت بھری دیوانگی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی دلچسپ تماشا۔

اس کے پیار وہ یکایک تڑپ کر علیحدہ ہوگئی۔ عجیب طرح کی سختی اور کرختگی کا اسے احساس ہؤا۔ وہ ڈھیلا ڈھالا نرم محبت کا انداز چاہتی تھی۔ نرم نرم گوشت جو آسودہ کر سکے اس کا جی گھبرانے لگا۔ اُسے محسوس ہؤا کہ جیسے اُسے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہے جیسے وہ خود مرد ہے۔ اور اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے ڈھیر سارے زیورات نوچ کر پھینک دے۔ اور اپنے بیش قیمت بوجھل کپڑے اتار کر بھاگ جائے ـــــ دور۔ بہت دور کسی جنگل میں جہاں ہر طرف ہرنیاں چوکڑیاں بھرتی ہوں اور وہ ایک خوفناک ڈائن بن کر ان ہرنیوں کا پیچھا کرے۔

مچل

نوید انجم

شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک اٹھائے اچھلتی ہوئی وہ کمرے میں سے نکلی تو جیناں سمجھ گئی، یہ کانوں پر جو گلال برس رہا ہے تو ضرور فیروز اس کے پیچھے بھاگا ہوگا۔ ناگواری سے بھویں اچکا کر اس نے سوچا، نامراد بھی کیا مزے سے باؤلی ہوئی پھر رہی ہے۔ اتنی سی شرم بھی تو نہیں اور پھر یہ پھوپھی اماں بھی ایسی ہیں کہ کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مجال ہے جو اسے کبھی جھڑکا ہو یا اس فیروز کو ہی ڈانٹا ہو۔ اک دو بار صاف دیکھا بھی کہ صاحبزادے چھو کا دوپٹہ پکڑ کر کھینچ رہے ہیں اور وہ بے شرم سینے پہ اپنا ایک ہاتھ رکھے دوسرے سے دوپٹہ کھینچتے ہوئے ڈکرا رہی ہے، پر پھوپھی اماں نے ساری بات ہنس کر گزار دی۔

"اے چھوڑو بیٹا —— کام کرنے دو کم بخت کو۔" انھوں نے کہا اور اپنا پاندان کھولے پان بنانے میں مشغول ہوگئیں۔

جیناں نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ اماں ادھر ہوتیں تو جانے کیا کرتیں۔ وہ تو رائی برابر بات کو بھی لے بیٹھتیں اور وہ اودھم مچتا کہ کچھ نہ پوچھو —— وہ تو شکر کرو انھیں اس بات کی کوئی خبر ہی نہ تھی کہ پھوپھی کی نند کا بیٹا فیروز آج کل نوکرانی پہ آتی ہوئی جوانی دیکھ دیکھ کر مچل رہا ہے اور ان کی لاڈلی بیٹی سارے کرتوت دیکھ رہی ہے۔

اور اس شام تو غضب ہی ہوگیا جب جیناں نے دیکھا فیروز بالٹی پانی سے بھرے برآمدے کے پار والے غسل خانے میں نہانے گیا اور وہ نامراد اپنے نچلے لب کو دانتوں تلے دبائی موٹی موٹی کالی آنکھیں تجسس اور شرارت سے جھپکاتی غسل خانے کے دروازے کی دراڑیں سے جھانک کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ادھر ہٹ مردار!" جیناں نے کہا اور یہ کہتے وقت اس کے چہرے پر سرخی کی گہری لکیریں پھیلیں۔

"تمھیں کیا باجی ——؟" چھو نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"تجھے شرم نہیں آتی ——؟" اس نے بڑی کوشش کر کے کہا۔ "پھوپھی اماں کو بتا دوں گی، ہاں!"

"بتا دو —— اونہہ!" وہ منہ پھاڑ کر بولی اور پھر سے دراڑیں سے لگی جھانکنے۔

سچ پوچھو تو اس لمحے جیناں کے دل میں بھی جھانکنے کی خواہش اٹھی پر اس نے سختی سے اپنے اس احساس کو دبا لیا [illegible] تھی میں چھو کے ڈھیٹ پن پر بل کھاتے ہوئے ایک طرف کو ہو گئی۔

کن انکھیوں سے اس نے چھو کو دیکھا۔ مردار کی جیسے آنکھیں کھلی جا رہی تھیں۔ سینے پہ دونوں ہاتھ دھرے وہ [illegible]

کی کوشش کر رہی تھی۔ بالوں کی آوارہ لٹیں اڑ اڑ کر چہرے پر بکھر رہی تھیں اور دانت چمک رہے تھے۔

"اسے اگر اس نے تجھے دیکھ لیا تو ——" جیناں نے ڈر کر کہا۔

"تو کیا؟" اس نے مڑ کر تیزی سے کہا۔

اور اسی دم پانی کے بہت سے قطرے جیناں پر آ پڑے۔ گھبرا کر وہ ایک طرف ہوئی تو چھمو کی چیخ سُن کر اس نے دیکھا وہ بُری طرح پانی سے شرابور ہو رہی تھی —— اور فیروز دیوار کے اُدھر سے سر اٹھا اٹھا کر ہنسے جا رہا تھا۔

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں سے اندر بھاگ آئی۔

کمرے میں آتے ہی تولیہ لے کر اس نے اپنی بھیگی ہوئی گردن کو صاف کیا اور سینے میں دبے ہوئے غصّے کو ایک گہرا سانس لے کر ختم کرنا چاہا۔

چھمو کی کھنکتی ہوئی ہنسی سُن کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"ہائے رے —" وہ ہنستی ہوئی ہولے ہولے کہہ رہی تھی —" بڑا چالاک ہے بی —— دیکھو تو مجھ کو بھگو کر رکھ دیا!"

"کمینی —— !" جیناں نے غصّے سے کہا۔

"چل ہٹ بڑی بنتی ہے۔" چھمو نے جیسے مچل کر کہا "اللہ قسم تم نے تو دیکھا ہی نہیں۔ ذرا دیکھتیں تو خبر ہوتی!"

"میں کوئی تیری طرح ہوں؟" اس نے تنک کر کہا "مجھے کیا پڑی ہے کہ مردوں کو دیکھتی پھروں۔"

"سچی کہوں —— !" وہ اپنی آنکھیں نچا نچا کر کہنے لگی "میں نے اسے دیکھا تو ——"

"حرافہ!" اس نے بڑی کوفت سے کہا۔

"جا ری! بڑی شریف بنتی ہے۔" چھمو نے اس بار تنک کر کہا "مجھے معلوم ہے ری! جی میں تو تیرے بھی لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"

اس کا دل چاہا روتی ہوئی پھوپھی اماں کے پاس جائے اور سارا قصّہ کہہ سنائے۔ اس کمینی نے کیا سمجھ رکھا تھا اسے۔ کیا سارے ہی اس کی طرح ذلیل ہوتے ہیں! پر پھوپھی اماں کے سامنے اس کی ہمت نہ پڑی اور دیر تک وہ یہ سوچتی رہی کہ بات کا آغاز کس طرح کرے۔

"کہو بیٹی ——" پھوپھی اماں نے پان کی اتنی بڑی گلوری منہ میں ڈالی کہ ایک طرف کا گال پھول گیا۔

"وہ دیکھیے نا —— پھوپھی اماں ——" اس نے کہا "میرا مطلب ہے آج —— آج کیا تاریخ ہوگی؟"

"مجھ غریب کا تو حافظہ ہی ٹھیک نہیں بیٹی ——" پھوپھی اماں نے پیار سے کہا "اب تو تم لوگوں کے دن ہیں تاریخیں لے۔"

رک کر اس نے کہا "میرا مطلب ہے پھوپھی اماں آج مجھے اِدھر آئے ہوئے کتنے روز ہو گئے؟"

ہوں بیٹی —— کیا اتنے سے دنوں میں اماں کے لیے اداس ہو گئیں؟"

"نہیں —— نہیں یہ بات تو نہیں ——" اس نے جلدی سے کہا "میں تو سوچ رہی تھی اماں جانے کیا کر رہی ہوں گی اس وقت!"

"بیٹھی ہنڈیا پکا رہی ہوں گی ـــــ اور کیا کرنا ہے بیچاری نے۔" پھوپھی اماں نے کہا۔ "اللہ بخشے ہماری اماں بھی اس وقت چولہے کو لگی ہوتی تھیں۔"

پریشان ہو کر وہ پھوپھی اماں کے کرتے کو تُرپائی کرنے کے بہانے باغیچے میں جامن کے پیڑ کے نزدیک گھاس پر آ کر بیٹھ گئی۔ سوئی میں دھاگہ پروتے ہوئے اس نے سوچا۔ خیر چھیڑنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ آدمی سو طرح کے مذاق کرتا ہے پر یہ جو گندی باتیں کرتی ہے چھمو ـــ یہ بالکل اچھی نہیں۔ اماں نے کئی بار بتایا کہ ذرا سی گندی بات منہ سے نکلی نہیں کہ جنت میں بنے ہوئے عالیشان محل کی اینٹیں گرنی شروع ہو گئیں۔ پر یہ چھمو نامراد، اَن پڑھ اور پکی جاہل قسم کی لڑکی ہے۔ کیا جانے اللہ کے احکام کیا ہیں اور اس کی کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے۔

جس دن سے وہ پھوپھی اماں کے ہاں آئی ہوئی تھی، اس چھمو اور فیروز کی چھیڑ خانی دیکھ کر دل ہی دل میں درود پڑھتی رہتی تھی۔ ہزار بار لاحول بھیجنے کے باوجود اسے یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ چھمو کو فیروز کے چھیڑنے سے کیا ملتا تھا اور وہ بھی ایسا تھا کہ جونہی چھمو کو اکیلا پاتا کوئی نہ کوئی حرکت کر جاتا جس کا ذکر وہ بڑا مزا لے لے کر اس سے کیا کرتی ـــ" اے بی ـــ کیا بتاؤں اس نے کیا کہا۔" ایسے میں اس کی آنکھیں بڑی خوفناک انداز میں چمکتیں۔ "میں چینی لیے آ رہی تھی نا، کہنے لگا میری کڑا کے دار ریوڑی کدھر چلی ہو؟"

"گندا۔"

"تو اس میں گندگی کی بات کیا ہے؟" حیرت سے پلکیں اٹھا کر وہ بے شرمی سے بولی۔ "ہاں تو پتہ ہے اس نے کیا کیا؟"

"مجھے کیا خبر ـــ تو جانے اور تیرا وہ بدذات ......" وہ ہولے سے یہ کہتے کہتے رک گئی۔

"جا ری ـــ تجھے کیا خبر کیسا اچھا ہے وہ ـــ گبھرو جوان ہے گبھرو جوان ـــ" اس نے سینہ اکڑا کر کہا۔

اس نے سوچا اماں کہتی ہیں وہ لڑکیاں جن کی نسل ایسی ویسی ہو ـــ یا جن کی نسل میں کوئی فرق آ جائے وہ ایسی حرکتیں کرتی ہیں۔ اسے بے اختیار چھمو پر بڑا ترس آیا ـــ بے چاری کا اس میں قصور کیا ہو سکتا ہے۔ دلار سے بولی "چھمو! تیرا باپ کیا کرتا ہے؟"

"پڑا سوتا ہے۔" وہ بولی۔

"پر کام کیا کرتا ہے؟" اس نے اس کے بات کرنے کے برے انداز کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"کہا جو ہے پڑا سوتا رہتا ہے ـــ کام کرتا تو مجھے کاہے کو یہاں نوکر رکھواتا ـــ" چھمو نے گھٹنے سکیڑ کر کہا۔

"اور ماں ـــ؟"

"وہ مجھ نصیبوں جلی کو جنم دے کر خود میٹھی نیند سو گئی۔"

اسے چھمو پر بڑا ترس آیا ـــ ہے ہے بیچاری ـــ اور اس نے دل میں عہد کیا اب کبھی اس یتیم کو گالی ... اور وہ یتیم اب سب کچھ بھول بھال کر اٹھلا رہی تھی۔ "بی ـــ میں تو سوچتی ہوں جانے تو کیسی لڑکی ہے ـــ کیوں؟"

"اعد کیا۔" وہ ہولے سے بولی۔ "اچھا اک بات تو بتا۔"

"کیا؟"

"تیرا دل کبھی نہیں چاہا —" اس نے ہنستے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کس بات کو؟"

"اسے یہی کہ کوئی تیرے بالوں کو کھینچ کر بھاگ جائے۔"

"چل ہٹ —" وہ اسے گالی دیتے دیتے رُک گئی۔

"سچی بڑا مزا آتا ہے — پھر اس کے بازو بھی تو بڑے سخت ہیں — ابھی پرسوں اس نے ......" وہ ہنسنے لگی۔

"کیا — کیا پرسوں — اس نے؟" ہکلا کر اس نے پوچھا۔

وہ سرگوشیاں کرنے لگی "میں ڈیوڑھی میں آ رہی تھی کہ دروازے کے پیچھے وہ کھڑا تھا۔ میرے ادھر پہنچنے پر جھٹ سے سامنے آ گیا اور زبردستی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور —" وہ ٹھٹکنے لگی۔

"جا جا — میرے ساتھ بات نہ کر۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھ سے کلام بند کر دے — تو بڑی گندی ہے۔"

چھمو نے کمر کے گرد ہاتھ رکھا — "اللہ قسم یا تو تو پوری عورت ہی نہیں — اور یا تو جان بوجھ کر ایسی بنتی ہے!"

اس بار وہ گالی دیے بغیر نہ رہی پر وہ ڈھیٹ کلی کھی ہنستی رہی اور یہ آپ ہی آپ شرمندہ ہو کر کمرے میں چلی آئی۔

کرتے میں سوئی ٹانک کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک جمائی لی اور پھر انگڑائی کے سے انداز میں باہیں پھیلاتے ہوئے جامن کے پیڑ کے تنے کو گھورنے لگی۔ کچی جامنوں سے لدے پیڑ کی شاخیں تنے تک جھک آئی تھیں اور اس نے سوچا اس بار پھل خوب ہو گا اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ ان جامنوں کے پکنے تک پھوپھی اماں کے ہاں ہی رہے۔

شام سر پر آ رہی تھی اور شفق کی سرخی جمیلاں کے چہرے پر اپنا ہلکا ہلکا عکس ڈال رہی تھی اور وہ تنہائی چھوڑ کر ستانے کے انداز میں آنکھوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھے گھاس پر بیٹھی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور پلکیں جھپک کر دیکھا تو اسے فیروز گھورتا ہوا نظر آیا —!

اس نے جلدی سے سر پر دوپٹہ اوڑھ لیا۔

"وہ کدھر ہے —؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"کون — چھمو؟" اس نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

"ارے نہیں —" وہ بڑے عجیب انداز سے مسکرایا "میں تو مالی کا پوچھ رہا ہوں —"

"مجھے کیا خبر —؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو چھمو کدھر ہے —؟" اس نے اس بار مسکراہٹ کو ہنسی میں ڈھال لیا۔

مردود کے بعد مجھے سے بھی وہ مسکرائی اور اسے اپنے آپ پر شدید غصہ بھی آیا آخر ایسے میں یہ مسکراہٹ کیوں منہ پر آ بیٹھی تھی — کو میرسا فرق ... یہی ہو رہا تھا کہ یہ لڑکا بھی بس اسی نامراد کو پوچھتا رہتا ہے اور جان بوجھ کر اس نے بڑے معصوم لہجے ... بجھور ... ... نکار کر دیا کہ ...

"بھئی جواب نہیں تمہارا بھی - پوچھو زمین کی تو سنو آسمان کی۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "اجی میں ممانی جی کے بارے میں نہیں پوچھتا۔"
اس نے جل کر کہا "مجھے کیا خبر میں کوئی چھمو کی رکھوالی پر لگی ہوئی ہوں!"

وہ ہنستا ہی رہا —— اور وہ دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی کہ کم سے کم اسے یوں ہنسنا نہیں چاہیے ——!

اس سہ پہر گرمی بڑی تھی اور جینیاں کا دل چاہا کہ ٹھنڈے پانی سے خوب نہائے —— پر وہ نامراد چھمو گھنٹی دیر سے برآمدے والے نل کے اردگرد چادر لٹکائے بیٹھی نہا رہی تھی۔ کچھ دیر تو جینیاں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی پر جب وہ نہا کر نہ نکلی تو اس نے چادر کا کونا کھینچا اور چلائی "اے بی —— ذرا جلدی نہا —— نہانے بیٹھی ہے کہ جگالی پر لگی ہے ——"

"اے میں کوئی بھینس ہوں —— " وہ اندر سے بھینس کی طرح ڈکرائی۔

"اتنی دیر میں تو چھ آدمی نہا لیں ——"

"آتی ہوں!" اس نے زور زور سے چھینٹے اڑاتے ہوئے کہا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

اور جب جینیاں نہانے گئی تو پہلے تو اسے فرش کی صفائی کا خیال آیا —— جانے وہ کیسے نہاتی تھی کہ ہر طرف گندگی پھیل رہی تھی اور اچھی طرح فرش دھو کر صاف کر کے جب وہ اپنے جسم پر صابن مل رہی تھی کسی نے چادر اٹھا کر زور سے ایک بھیانک آواز نکالی۔ بوکھلا کر اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے فیروز کو گھورنے لگی جو حیرت، پشیمانی اور گھبراہٹ کے عالم میں آنکھیں پھاڑے اسے تک رہا تھا۔ وہ کچھ اس بری طرح سے سٹپٹائی کہ کچھ دیر تو اسے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ برہنہ نل کے بہتے ہوئے پانی کے دھارے کے عین نیچے کھڑی ہے اور پھر اچانک اس کے سارے بدن پر سوئیاں سی چبھیں اور چہرے پر جلن ہونے لگی۔

چادر چھوڑ کر وہ یہ کہتے ہوئے ہٹ گیا "معاف کرنا —— میں سمجھا تھا —— وہ ہے ——"

سینے پر ہاتھ دھرے وہ گم سم اسی حالت میں کھڑی رہی اور پانی کا دھارا ایک شور کے ساتھ اس کے جسم پر گرتا رہا اور پھر جب اسے احساس ہوا کہ یہ سب کیا ہوا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ روہانسی ہو کر اس نے اپنے لب دانتوں سے کاٹے اور پھر اپنے ننگے بازو کو زور سے کاٹ کاٹ لیا۔ پھر غصے سے اس نے اپنے سر کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔

جانے پھوپھی اماں اس وقت کہاں ہیں —— وہ رو سی دی —— اس کی چیخ سن کر وہ ضرور بھاگی آتیں، اور پھر اس نے اپنی چیخ سے کہیں زیادہ خوفناک آواز میں پکارا "چھمو —— چھمو ——!"

چھمو نے سامنے والے کمرے کے اندر سے آواز دی "کیا ہے؟"

"چھمو ادھر مر!" اس نے غصے سے کہا۔

"نہیں مرتی!" وہ وہیں سے چیخی۔

"ٹھہر تو جا مُردار —— میں ابھی تیری خبر لیتی ہوں!" اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

پر جب وہ نہا کر کپڑے پہنے باہر نکلی تو بڑے کمرے میں سے اسے پھوپھی اماں کی آواز آئی

کرتی ہوئی ادھر کو آئی۔ فیروز پھوپھی اماں کے آگے

"اچھا اک بات ہوتا"

آتا دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔

جیناں نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں، کچھ اور کہے بغیر بولی "پھوپھی اماں ——— چھمو کہاں ہے؟"

"جانے کہاں ہے اِدھر مرتی ہی نہیں" فیروز نے شرارت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

اس کے دل میں غصّے کی ایک لہر اٹھی ——— صرف ایک لمحے کے لیے اور پھر جیسے گدگدی سی ہونے لگی۔

"کیا بات ہے بٹیا؟" پھوپھی اماں نے کہا۔

فیروز نے جلدی سے کہا "ہاں ممانی جی! یہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی بڑے زور سے چلائی تھیں۔ ان سے پوچھیں کیا ہوا تھا؟"

تلملا کر اس نے منہ پھیر لیا۔

"کیا ہوا تھا بیٹی؟"

"وہ چھمو سے کام تھا"

"کام تھا چھمو سے پر یہ تو یوں چیخی تھیں جیسے سانپ دیکھ لیا ہو" فیروز نے بن کر کہا۔

"ہاں ———" اس نے غصہ دباتے ہوئے کہا "میں کیچوے کو سنپولیا سمجھی تھی!"

"ارے نہیں ———" پھوپھی اماں نے گھبرا کر کہا ——— "بیٹی ذرا خیال رکھنا ——— کیچوے اور سنپولیے میں فرق کم ہی معلوم ہوتا ہے کہیں غلطی سے ہاتھ لگا بیٹھیں تو خواہ مخواہ اذیت ہو گی۔ اللہ بچائے ان منحوسوں سے!"

اور اسے احساس ہوا وہ سانپ کو چھو بیٹھی تھی اور زہر اس کے تن بدن میں پھیل رہا تھا ——— پر یہ کیسا زہر تھا کہ ایک نشہ سا سارے انگ انگ میں گھل مل رہا تھا اور کیف میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر پپوٹے بھاری ہو ہو کر گرنے لگے تھے۔

وہ بہکے بہکے انداز میں کمرے میں سے نکل گئی۔

اور اب وہ جامن کے پیڑ تلے بیٹھی کوئی کام کر رہی ہوتی تو ذہن کسی اور ہی سوچ میں ڈوب رہا ہوتا اور آنکھیں نئے نئے خواب بُن رہی ہوتیں۔ ایسے میں اسے چھمو بھاگتی ہوئی نظر آتی تو وہ چونکتی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی اور پھر فیروز کو دیکھتے ہی اس کے لبوں پر ایک رسیلی مسکراہٹ پھیلنے لگتی۔ وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے زور سے چلاتا "چھمو اِدھر مرتی کیوں نہیں؟" تو وہ پلکیں بند کر کے اپنے لبوں پر بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کو سمیٹنے کی کوشش کرتی اور اب تو وہ خود چھمو کو بلا کر اپنے پاس بٹھاتی اور اُس سے سرگوشیوں میں پوچھتی "کوئی نئی بات نہیں کہی اس نے؟"

چھمو مزا لے لے کر اس کی کوئی نئی حرکت بتاتی اور وہ بڑے غور سے اس کی خرافات سُنتی اور پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بن کر کہتی "اللہ ہم تم سے بات نہیں کرتے ——— کیسی گندی باتیں کرتی ہو ———"

"اس کے رویے پر بڑی حیران ہوئی پر بعد میں اس نے یہ کہہ کر زور شور سے اپنی باتیں کرنی شروع کر دیں کہ اب مرد ونڈ ورنہ پہلے تو میں یہ سمجھی تھی تو پوری عورت ہی نہیں۔

کے بعد ضلع کر اٹھے کر اسے کچھ پتہ ہی نہ چلا اور جامنیں پک گئیں۔ انہی دنوں اماں کے ماموں پھوپھی اماں کے ہاں ... کو میر صادق علی ذکی چاند پور ضلع بجنور کا شبہ ... کی خواہش سمجھتے ہوئے کہہ دیا "اسے بیاہ نکاح کر دیا کہ ..."

اور جامنیں کھانے سے فیروز کی چھو سے چھیڑ چھاڑ ہوتی دیکھ کر وہ یوں محسوس کرتی رہی جیسے اسے کوئی میٹھی میٹھی لوریاں دے کے بہلا رہا ہو اور ایسے میں جب چھو اس سے اپنی باتیں کرتے ہوئے گدگدائی تو اس کے سارے وجود پر نشہ سا چھا جاتا اور کانوں میں مدھر گھنٹیاں سی بجنے لگتیں۔

دنوں کے گزرنے کی جا تو بالکل خبر نہ ہوئی اور جب اماں نے ابا کے ہاتھ یہ پیغام کہلا بھیجا کہ بیٹی تمھاری بہن زینت اپنے بیاہ کے بعد پہلی بار ملنے آئی ہوئی ہے تو اسے مجبوراً واپس آنا پڑا۔

پھوپھی اماں کے ہاں سے آتے ہوئے وہ چھو کو مل اور پھوٹ پھوٹ کر روئی اور جب دروازے سے باہر جانے کو تھی تو اس نے فیروز کو دیکھا۔ اس کی شریر آنکھوں میں ویسی ہی چمک تھی جیسی چھو سے مذاق کرتے وقت ہوتی تھی اور گیلے گیلے لبوں پر مسکراہٹ کی چمک شدت سے تھی۔ وہ اسے ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا "بھئی جیناں! ہم سے کوئی خطا تو نہیں ہوئی نا——؟"

اس نے بچوں کی طرح سر ہلا دیا۔

"ہمیں بھول تو نہ جاؤ گی؟"

وہ چپ رہی —— اور وہ چھو کے کندھے پہ ٹھوکا دے کر بولا "بھئی لوگ بڑے احسان فراموش ہوتے ہیں —— جاتے وقت یوں پرائے بن جاتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو——"

اور وہ خاموشی سے پلکیں جھپکتی اور کن انکھیوں سے چھو کو تکتی واپس آگئی۔

گھر پہنچ کر چند دن تو وہ نڈھال نڈھال سی رہی۔ دل میں آیا اماں سے پوچھے زینت میاں کے ساتھ آئی ہے تو کیا مجھے بلانا ضروری تھا، پر کچھ کہہ نہ پائی۔ اماں نے اس کے تیور دیکھ کر جیسے جان لیا کہ بیٹی کو پھوپھی اماں کچھ زیادہ ہی پسند آئی تھیں اور ایک دن موقعہ دیکھ کر اسے خوب سمجھایا بلکہ یوں کہو کہ بیچاری کو خوب لتاڑا۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے اور عزیزوں کے ہاں جا کر یوں گھر سے بیزار نہیں ہوا کرتے۔ انھوں نے اسے ایک طویل لیکچر کے بعد یہ ذہن نشین کرایا اور وہ چپکی بیٹھی رہی۔

"اے بتو—— آخر کو زینت پہلی بار ادھر آئی ہے۔"

زینت آئی تو کون سی ایسی آفت آگئی۔ اس نے دل میں سوچا—— اور اسے بڑی کوفت ہوئی۔ اس صبح جب وہ ذرا جلد اٹھی اور چائے کے لیے پانی گرم کرنے باورچی خانے میں گئی تو اسے زینت کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا اور اس نے دیکھا—— زینت کے میاں نے بیوی کے رخسار پہ ایک چٹکی لی اور بیوی نے گال ملتے ہوئے اک ذرا منہ بنایا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

جیناں کے سینے میں ایک میٹھا سا درد اٹھا—— اسے چھو یاد آئی اور فیروز کی یاد جیسے ابر
اور پھر اس کا دل چاہا زینت سے کہے "میں دیکھ رہی تھی دولہا بھائی نے تمھارے ... میں کو گالا
اسی طرح مذاق کیا کرتا تھا——" اس کے قدم تیزی سے زینت کے کمرے کی طرف اٹھے ... ہی لڑکی سے
ٹھٹھک گئی اور اسے بڑی شرم محسوس ہوئی ... کیسے ... آ گئے
زینت اور اس کے ... "اچھا اک بات تو بتا۔"

شروع ہونے لگا اور اس کا دل بے ساختہ چاہنے لگتا کہ وہ انھیں کہے میں جانتی ہوں ۔ وہاں پھوپھی اماں کے ہاں ـــــــ بر وہ
رُک کر رہ جاتی ـــــ

بات بے بات پھوپھی اماں کے ہاں کی کوئی نہ کوئی بات ذہن کے دریچے میں آ کر لٹک جاتی اور احساسات کی تیز
ہوا میں جھولتی رہتی پر اس لٹکنے اور جھولنے میں جو تکلیف محسوس ہوتی اسے بیان کرنا انتہائی مشکل تھا اور آنکھیں بند کر کے وہ گہری
سوچ میں ڈوبی ذہن کے دریچے سے لٹکی ہوئی باتیں نوچ نوچ کر اتارنے کی کوشش کرتی اور ایسے میں نڈھال ہو کر ہانپنے لگتی ۔

زینت اپنے شوہر کے ہمراہ کچھ دن کے بعد چلی گئی پر اس کے ذہن کے نازک پردوں پر چھمو اور فیروز کے گہرے نقش
چھوڑ گئی اور جوں جوں وہ فیروز کا خیال دور کرنے کی کوشش کرتی ، وہ اتنا ہی زیادہ یاد آتا اور اب تو وہ آنکھیں بند کرتی
تو اسے اپنے سامنے فیروز اندھیرے میں سے روشنی کی طرف آتا ہوا محسوس ہوتا اور کئی بار وہ کسی کا سانس اپنے کانوں میں
محسوس کرتے ہوئے کانپ گئی اور گھبرا کر آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتی پر وہاں کوئی نہ ہوتا ـــــ وہ اکیلی اور تنہا ـــــ
جیسے ازل سے ابد تک کے لیے تنہا اور اکیلی تھی اور بس کسی کے سانس کا کانوں سے چھونے کا احساس اس کا ساتھی تھا ـــــ پر
ساتھی کیسا اذیت دینے والا تھا !! آئینہ دیکھتے ہوئے اس دن پھر اس نے ہلکے سے اپنے دائیں رخسار پر ایک چٹکی لی ـــــ یوں
یسا محسوس ہوتا ہے ـــــ پھر ایک جلن سی محسوس ہوئی ہلکی سی جلن ـــــ اس نے زور سے دوبارہ چٹکی لی ـــــ اور درد سا محسوس
ا ـــــ پر چھمو کہتی تھی ۔ اور چھمو تو بہت کچھ کہتی تھی ۔

فیروز کے ہاتھ کا لمس آنکھیں بند کیے وہ اپنے رخسار پر محسوس کرنے لگی اور اسے خیال آیا چھمو ٹھیک ہی کہتی تھی ـــــ اور
سوچتے ہی وہ بہکی بہکی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگی جیسے وہ فیروز کی یادوں میں یوں گھر گئی تھی جیسے کوئی پاگل بچوں کے
ہجوم میں کھڑا ہو ۔

لیکن وہ پاگل چیخ سکتا ہے اور ادھر کوئی بھی نہ تھا ـــــ وہ تنہا تھی ، بالکل تنہا ـــــ کوئی سہیلی ، کوئی زینت ـــــ کوئی چھمو ، کوئی
ذکو بھی تو نہ تھا جس سے کچھ کہہ سکتی اور پھوپھی اماں کے ہاں کی باتیں یوں بار بار احساسات کی تیز ہوا میں لٹکی تو نہ رہتیں ۔

سردیاں آئیں تو لحاف اوڑھے وہ خود سے باتیں کرنے لگی ۔ اور پھر جیسے وہ خود اپنی ذات کو بھلا بیٹھی اور فیروز حقیقت
اس کے قریب رہنے لگا ۔ اپنے دونوں بازو اپنے اردگرد باندھ کر وہ جیسے فیروز سے لپٹی ہوتی اور پھر سارے دن کے
اسے سنایا کرتی ۔ اماں کی کہی ہوئی باتیں جھڑکیاں طعنے سو سو طرح کا غصہ وہ فیروز کو سبھی کچھ بتایا کرتی ۔ آج اماں نے یہ کہا ـــــ
رہی تھی کہ انھوں نے اسے اس بات سے جھڑکا اور ایسے ہی سارے قصے ـــــ

فیروز کو گھر کی ایک ایک بات سے باخبر کر دیا ـــــ باخبر کیا وہ تو سب کچھ جان گیا ۔ اس کے احساسات
مردوں اور اپنے تکیے کو بھینچتے ہوئے اس نے اپنے سارے ارمان اسے بتا ڈالے ـــــ
کے بعد ضلع بجنور کا اصل فیروز نہ ہو ـــــ بلکہ یوں کہو اس کے خواب فیروز کے وجود سے بننے جا رہے تھے
کو میر صادق علی والی چاند پور ضلع بجنور کا شبہ ... قد چلی جا رہی تھی ۔
نکاح کر دیا کہ ... کر رکھتی ہے اسے تو ـــــ وہاں

پھوپھی اماں کے ہاں ——"

اور اماں پوچھتی "کیا ہوا —— تیری پھوپھی اماں کو ؟"

وہ جھینپ جاتی اور پھر رات کو سوتے وقت وہ فیروز کو بتاتی —— وہ جو تم نے حرکت کی تھی نا —— ارے وہی جس سے میں چڑ گئی تھی تو ابھی آج وہی بات ابو نے کی ——"

اور پھر سپنوں میں کھوتی تو وہ بات حقیقت بنی ہوئی اور چھمو کی جگہ وہ خود اپنے آپ کو دیکھتی۔کبھی غسل خانے کی درازوں سے جھانکتے ہوئے تو کبھی جامنوں سے جھولی بھرتے ہوئے —— اور انہی دنوں اس کے خوابوں میں شہنائی کی آواز گونجنے لگی۔

سرور راتوں میں شہنائی سنتے ہی وہ مچل مچل جاتی۔ اب تو سب خوابوں کی جگہ حقیقت لے لے گی اور اب تو کوئی آئے گا۔ اس کا فیروز آئے گا اور اسے لے جائے گا —— وہاں لے جائے گا جہاں وہ خوابوں میں پہنچی تھی۔ ان تمام جگہوں پر جہاں اس کے ارمان اور آرزوؤں نے بسیرا کیا تھا۔ ایک ایک گھڑی قیامت بن رہی تھی اور وقت اس آہستگی سے چل رہا تھا کہ بار ہا وہ راتوں کو خوابوں سے چونکتی تو جھنجلا جھنجلا جاتی ——

جانے وہ لمحے کب آئیں گے —— !

اور پھر وہ لمحے آئے تو جیسے ایک ایک لمحے کے ہزاروں لمحے بن گئے۔ ایسے طویل ایسے سلسے کہ کاٹے نہ کٹتے۔ وہ دلہن بنی بیٹھی رہی اور اس کے اردگرد نہ جانے کہاں سے ایک دم آج اتنی ساری سہیلیاں —— ارے ہاں ! اسی کی سہیلیاں، آگئیں —— کوئی ڈھولک لیے بیٹھی ہے تو کوئی سہرا گا رہی ہے۔ ہر طرف شور ہے ' اک میٹھا میٹھا —— کانوں میں رس گھولتا ہوا شور ہے اور وہ حیرت سے اپنے اردگرد چوری چوری دیکھتی رہی۔ یہ سب کہاں سے آ گئے ہیں —— پہلے تو وہ تنہا تھی —— تنہا اپنے فیروز کے ساتھ' اور ہاں وہ چھمو جو اسے اپنی جگہ دے کر ماضی کے گڑھوں میں کود گئی تھی اب جیسے چھلانگ مار کر اس کے سامنے آ گئی ——

پر وہ ہے کہاں —— پھوپھی اماں کہاں ہیں —— وہ چھمو کہاں ہے ؟

دو ایک بار اس کے کانوں میں چھمو کی آواز آئی۔ اس نے چونک چونک کر گھونگھٹ اٹھا اٹھا دیا اور اسے دیکھنا چاہا پر وہ کہیں نظر نہ آئی —— البتہ پھوپھی اماں اپنے اتنے بڑے پاندان سمیت اسے اپنے پاس بیٹھی نظر آئیں اور اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول بیٹھا۔

اور پھر ایک طوفان سا اٹھا۔ خوشی اور مسرت کا طوفان —— اور اس نے خود کو اس میں گھرے ہوئے پایا اور پھر جب وہ چونکی تو اس نے دیکھا۔ اماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ابو رو رہے تھے —— اور اس کی سہیلیاں رو رہی تھیں۔ ابا نے سر پر ہاتھ رکھا تو بے اختیار آنسوؤں کا ایک سمندر اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھا اور وہ زار [illegible]

اور اب وہ بیٹھی تھی۔ پھولوں کی مہک میں بجی سجائی زیورات سے لدی پھندی وہ بیٹھی تھی اور [illegible] ساتھی اس کے قریب بیٹھا سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پلکیں جھپک سی رہی تھیں [illegible] کھنے اور اصرار کرنے پر بھی ان پلکوں کے [illegible]

اور پھر اس نے [illegible] "اچھا اک بات تو بتا۔"

چھوتا ماتھے کی بندیا کو ہلاتا بالوں کو لہراتا آنکھوں کی پلکوں پر سرسراتا ہوا ہونٹوں تک پہنچا اور پھر اس کے ہونٹوں میں گھل مل گیا۔

اس نے اسے محسوس کیا، چھوا، دیکھا اور اپنے آپ میں ڈھلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ ایک لمحہ جب وہ دونوں اپنی ذات ایک دوسرے میں گم کر چکے تھے ——— اور اس لمحے جب وہ کانپا اور جذبات کے تیز طوفان میں کمزور پتے کی طرح لرزا اور کانپنے لگا۔ وہ مدہوش ہوتے ہوتے اس سے بے اختیار اس بُری طرح چمٹ گئی جیسے کبھی جُدا نہ ہوگی اور اس کے لرزتے اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے سرگوشیوں میں نکلا "میرے فیروز ——— میرے اپنے ———"

اور پھر جیسے اس لمحے بجلی سی کڑکی ——— اس کی آنکھوں پر سے پلکیں گھبرا کر اٹھ بیٹھیں اور پھر کڑکتی ہوئی بجلی سے آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔ اس تاریکی میں اسے اتنی روشنی نظر آئی جیسے سورج سوا نیزے پر آن جھکا ہو ———

وہ اپنی مٹھیاں بھینچے تلملاتے ہوئے چیخ رہا تھا "وہ کون ہے ——— فیروز کون ہے؟ ——— مجھے بتاؤ!" اور قریب پڑی ہوئی تپائی پر ٹھوکر مارتے ہوئے چیخا "کتیا!"

خوف کے ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے خود کو یوں سمیٹا جیسے جنت کے عالیشان محل کی گرتی ہوئی اینٹوں سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے!

سرخ...

مردود ادب

کے بعد ضلع بجنور کا ...

... کو میر صادق علی والی چاند پور ضلع بجنور کا قصبہ

انکار کر دیا کہ ...

نئی کتابوں پر تبصرہ

شعر العرب

علامہ شبلی نعمانی نے فارسی شاعری کی تاریخ "شعر العجم" کے نام سے پانچ جلدوں میں لکھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اُردو شاعری کی تاریخ "شعر الہند" کے نام سے دو جلدوں میں تالیف کی۔ عربی کی جگہ اس وقت تک خالی تھی اسے پروفیسر عبدالصمد صاحب صارم الازہری نے "شعر العرب" شائع کرکے پورا کیا۔ اوّل الذکر دونوں تذکروں اور شعر العرب میں فرق یہ ہے کہ پہلی دونوں کتابوں میں بالترتیب فارسی اور اُردو کی تاریخ مسلسل طور پر بیان کی گئی ہے مگر موخر الذکر کتاب میں عربی شعراء کا مختصر حال اور ان کے بہترین عربی اشعار کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اوّل الذکر دونوں کتابیں علی الترتیب براہِ راست فارسی اور اُردو میں لکھی گئی تھیں مگر موخر الذکر کتاب ترجمہ ہے مشہور عرب فاضل ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ کی مشہور عالم کتاب "الشعر والشعراء" کا۔ عربی ادب میں اس کتاب کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے اور یہی شہرت غالباً اس کے ترجمہ کا باعث ہوئی۔ یہ قریباً دو سو شعراء کا مبسوط تذکرہ ہے جس میں امرؤ القیس سے لے کر اشجع السلمی تک کے شعراء کا حال ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے یہ تذکرہ جاہلی شعراء سے لے کر عباسی دور کے شعراء تک محدود ہے۔ بعد کے شعراء کے متعلق فاضل مترجم نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کا تذکرہ دوسری جلد میں خود مرتب فرمائیں گے۔ علامہ صارم ازہری پاکستان کے مشہور ادیب ہیں اور اب تک ایک سو بارہ عربی، فارسی اور اُردو کی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ زیرِ تنقید کتاب بڑی تقطیع کے ۴۲۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ترجمہ لفظی ہے اس لیے اس میں وہ شگفتگی اور روانی پیدا نہیں ہوسکی جو ایک تصنیف میں ہونی چاہیے۔ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا فاضل اور عالم ہو مگر وہ کسی زبان کے لفظی ترجمہ میں ہرگز لطافت اور خوبی پیدا نہیں کرسکتا۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ہی لے لیجیے اس کا لفظی ترجمہ ہے "ساتھ نام اللہ رحمٰن رحیم" بتلائیے کیا بات بنی؟ کتاب کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مترجم کو کتاب کے شائع کرنے کی عجلت میں شاید اس پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا ورنہ اس قسم کے فقرے اس میں نہ ہوتے کہ "میں نے اس کتاب میں صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن پر شعر غالب تھا" ص۱۲، یا مثلاً "ہمارے نزدیک اس کی بات بنا بہ تاخیر زمانہ کے یا نو پید ہونے کے بے قیمت نہیں ہوگئی ہے" ص۱۳، یا "اگر خدا ہماری خاطر اس سے مصائبات کو اور موت مقدر کو دفع کر دیتے تو کیا ہی بہتر ہو" ص۱۵، یا "اس کے سینہ میں راز گاہ ہے" ص۱۷، یا "رقیبوں کی آنکھیں چھپ جاتی ہیں" ص۱۴، "جوانمرد کی سخاوت کو تعزیت کرتا ہوں" ص۱۸، یا "اب ہم سخاوت کے ٹھوکر کھانے اور بخالت کے ہیں" ص۱۸، یا "نابغہ اقوا کرتا تھا" ص۱۲۔ امید ہے کتاب کے دوسرے اڈیشن میں یہ ساری باتیں دور ہوکر نئی شکل میں ناظرین کے سامنے آسکے گی۔

کتاب کے شروع میں مترجم نے ...

... کا مختلف اصناف پر بحث ... "اچانک بات ٹوٹتا"

صرف نام ہیں ہاں ان کے کلام کا انتخاب خاصا دیا ہے۔ اس کمی کو فاضل مترجم نے اس طرح پورا کیا ہے کہ کتاب کے آخر میں اکثر شعرا کا سنہ وفات لکھ دیا جو یقیناً بہت مفید اور اضافہ ہے۔ کتاب نیوز پرنٹ پر چھاپی گئی ہے اور غیر مجلد ہے قیمت آٹھ روپے ہے اور ملنے کا پتہ ادارہ علمیہ ۵ دھنی رام روڈ، انارکلی لاہور ہے۔ (م - ا)

تواریخ عجیب المعروف بہ کالاپانی

یہ کتاب جس قدر اسم بامسمّٰی ہے اسی قدر دلچسپ اور پُرلطف ہے۔ اس قدر زیادہ کہ شروع کر کے ختم کیے بغیر چین نہیں آتا۔ اس عجیب و غریب داستان کے مصنف مولوی محمد جعفر تھانیسری تم پانی پتی ہیں جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے مشہور مجاہد تھے اور انھوں نے جوشِ جہاد میں قید و بند کے ہولناک مصائب برداشت کیے۔ ان کو انگریز نے پہلے موت کی سزا دی، پھر اسے حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دیا۔ تقدیر کے زبردست تھے جو کالا پانی سے زندہ بچ کر بائیس برس بعد واپس آ گئے اور اپنے مصائب و آلام کی یہ پُردرد کہانی بڑے اثر انگیز الفاظ میں تحریر کی۔

اس کتاب کے کئی اڈیشن اس سے پہلے شائع ہو کر ختم ہو چکے تھے اور اب ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔ جناب محمد ایوب صاحب قادری ایم اے جوائنٹ سکرٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی صد ہزار مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کتاب کے مختلف اڈیشن بڑی محنت سے اکٹھے کیے اور پھر ان کی مدد سے نہایت صحت کے ساتھ اس اڈیشن کو مرتب کیا، اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا، اس پر تعلیقات کا اضافہ کیا، اس کا اشاریہ مرتب کیا، اس کے حواشی اور تعلیقات میں ڈیڑھ سو کتابوں سے اخذ و انتخاب کیا اور اس کے بعد اس کتاب کو شائع کیا۔ اس لحاظ سے یہ اس کتاب کا سب سے زیادہ بہتر اڈیشن ہے اور بلاشبہ ایوب صاحب کا بڑا اعلیٰ درجہ کا علمی کارنامہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی کم کتابیں ایسی لیاقت اور کاوش سے شائع ہوتی ہیں جیسی یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ ایوب صاحب کا دماغ علمی کاموں کے لیے نہایت موزوں واقع ہوا ہے اور وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں بڑی لیاقت، کاوش اور محنت کے ساتھ اسے انجام دیتے ہیں۔ اس سے قبل مولوی رحمان علی کی مشہور فارسی کتاب تذکرہ علمائے ہند کو بھی وہ ایسی ہی خوبی کے ساتھ مدون کر چکے ہیں ———

تواریخ عجیب کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے اور ملنے کا پتہ پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱) وحید آباد۔ گولی مار کراچی ۱۸ ہے۔ (م - ا)

تاریخ سرکشی ضلع بجنور

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کے وقت سر سید بجنور (یو۔پی) میں صدر امین تھے۔ یکایک ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو وہاں خبر پہنچی کہ فوج میں بغاوت ہو گئی اور دہلی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس اطلاع کے پہنچتے ہی دوسرے اکثر مقامات کی طرح بجنور میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس وقت وہاں ۲۰ کے قریب انگریز بہادر اور ان کے بچے موجود تھے مگر سب کے چہرے فق ہو گئے اور ان کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے کھیلتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ ایسے ہولناک وقت میں جبکہ انگریز کے لیے زمین و آسمان میں کہیں جائے پناہ نہ تھی سر سید نے کمال بہادری سے کام لے کر اور اپنی جان کو سخت خطرہ میں ڈال کر نہ صرف مسٹر شیکسپیئر ڈپٹی کمشنر اور تمام انگریز مردوں اور عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں بلکہ ان کو محفوظ مقام پر پہنچا کر مطمئن کر دیا اور انگریز ڈپٹی کمشنر کے چلے جانے کے بعد ضلع بجنور کا انتظام بڑی خوبی سے کیا۔ جب اس عظیم خدمت اور بے نظیر قربانی و ایثار کے صلہ میں انگریزی حکومت نے ... کو میر صادق علی والی چاندپور ضلع بجنور کا ضبط ... علاقہ بطور انعام دینا چاہا تو سر سید نے یہ کہہ کر اس کے ... انکار کر دیا کہ ... ہوں گا۔"

ہنگامہ کے اس تمام دوران میں جو جو ہولناک واقعات خاص بجنور اور ملحقہ علاقہ میں پیش آئے۔ سرسید کو جس طرح بار بار سینہ سپر ہوکر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں نے جس بری طرح علاقے کو لوٹا۔ جتنی تباہی اور بربادی اُس وقت ہر جگہ پھیلی جتنے ظلم اُس زمانہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے اور جس طرح سارے علاقے میں خود فساد برپا کرکے اُس کا سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ ان سب حادثات کا آنکھوں دیکھا نہایت دردناک حال ۱۸۵۸ء میں سرسید نے "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب اُس پُر آشوب زمانہ کے ہولناک واقعات کا نہایت صحیح مرقع ہے۔ مگر عرصہ سے نایاب تھی اور کہیں نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر سید معین الحق ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی مدیر بصائر کراچی و سکرٹری ہسٹاریکل سوسائٹی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کتاب کو ایڈٹ کرکے دوبارہ نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ شروع میں بطور مقدمہ سرسید پر ایک بصیرت افروز مضمون لکھا ہے۔ جس میں ان کی مختلف حیثیتوں کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پھر اُس پر نہایت محنت کے ساتھ حواشی لکھے ہیں۔ جن جن اہم شخصیتوں کے نام اس کتاب میں آئے ہیں۔ اُن کے حالات آخر میں بہت تلاش کے بعد فراہم کئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آج سے ایک سو برس پہلے کے اُس ہولناک اور خونی ہنگامہ کے تمام واقعات آنکھوں کے آگے پھرنے لگتے ہیں جس کی بربادی اور تباہی کو ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس سے زیادہ صحیح اور مستند مرقع ان واقعات کا آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ سائز ۱۸ × ۲۲/۸ صفحات ۳۱۰۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: سلمان اکیڈمی۔ حق نشان نمبر ۳۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۵

(م۔ ا)

تذکرہ صوفیائے پنجاب

پنجاب کے وہ صوفی اولیاء اللہ جن کی کوشش اور سعی کی بدولت اس علاقہ میں اسلام پھیلا۔ تاریخ اسلام کی نہایت اہم اور نمایاں شخصیتیں ہیں۔ اُن کے نام مبلغینِ اسلام کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور اُن کا تذکرہ زبانوں پر باقی رہے گا۔ ان بزرگوں کی زندگی کو عوام نے خوارق اور کرامات کے پردوں میں ایسا چھپایا کہ اُن کا اصلی چہرہ لوگوں کی نظروں سے مخفی ہوگیا اور کسی کو بھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ ان مقدس اصحاب کی اصلی کرامت اور حقیقی معجزہ یہ تھا کہ انھوں نے محض اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر۔ عرب۔ عراق اور ایران سے آکر سرزمین پنجاب میں ڈیرے ڈالے اور یہاں بیٹھ کر یہاں کے روحانی مُردوں کو زندہ کیا۔ روحانی بہروں اور اندھوں کو کان اور آنکھیں بخشیں۔ اور تین کروڑ ساٹھ لاکھ خداؤں کے پجاریوں کو خدا کے واحد و یگانہ کا بندہ بنایا۔ غرض اپنے روحانی فیض سے ایک عالم کو منور کیا۔ اور اپنی زندگیاں خدا کے دین کی نصرت و اعانت اور اسکی تبلیغ و اشاعت میں وقف کردیں۔ خود نہ کبھی اچھا کھایا نہ اچھا پہنا۔ جھونپڑیوں میں رہے اور میدانوں میں اپنی عمریں بسر کیں۔ مگر دنیا کو [illegible] لازوال دولت سے مالا مال کر گئے۔ خدا اُن سے خوش ہوگیا اور افضل البشر۔ خیر الرسل۔ نبی مجتبٰی۔ احمد مصطفٰے [illegible] حضرت محمد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے راضی ہوگئے۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا [illegible] کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے" [illegible] نہایت فخر سے کہتا ہے ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی [illegible] اچھا اک بات تو بتا [illegible] مدا وطن وہی ہے

[illegible]

"تذکرہ صوفیائے پنجاب" اِن ہی مقدس اور محترم بزرگوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے پنجاب میں بیٹھ کر اسلام کی تبلیغ کی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پنجاب کے کونہ کونہ اور قریہ قریہ تک پہنچایا۔ یہ قابل قدر اور لائق مطالعہ کتاب سالہا سال کی محنت و کاوش۔ تلاش و اقتباس۔ انتخاب و اخذ کے بعد مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرتب فرمائی ہے۔ اور ان بزرگوں کے حالات کی جمع و ترتیب میں حتی الامکان بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اور ایک بہت عمدہ ذخیرہ بزرگان دین کے حالات و واقعات کا ہمارے لیے فراہم کر دیا ہے۔ جن سے ہم اصلاح و ہدایت اور اخلاق و موعظت کے بہت سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ باقی رہے عیوب و نقائص تو اُن سے سوائے قرآن کریم کے کونسی کتاب خالی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی بعض باتیں غلط لکھی گئی ہوں۔ بعض بزرگوں کے حالات تشنہ ہوں۔ بعض صوفیوں کی سوانح موجود نہ ہوں۔ مگر ان معمولی فروگذاشتوں سے نہ دنیا کی کوئی کتاب خالی ہے اور نہ ان سے کتاب کی افادیت اور عظمت میں کچھ فرق آتا ہے۔ دنیا میں کون کہہ سکتا ہے کہ میری مرتبہ کتاب ہر نہج سے کامل۔ مکمل اور اکمل ہے اور اب اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں؟ پس اگر اس قابل قدر تذکرہ میں بھی بعض بزرگوں کے نام اور حالات لکھنے رہ گئے ہوں تو اسے مورد طعن بنانا اور قدوسی صاحب کی بے انتہا محنت پر پانی پھیرنا کوئی محمود صفت نہیں۔ جیسے موصوف نے نہایت کاوش کے ساتھ ۸۲ عربی۔ فارسی اور اُردو کتابوں سے اخذ کر کے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے صفحات ۱۰۰۰ ہیں اور اس میں ۹۳ بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ کاغذ اچھا لگایا گیا ہے اور ۹۳ صوفیاء کے تذکروں پر منقسم ہے۔ قیمت مجلد علاوہ محصول ڈاک پندرہ روپے ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ سلمان اکیڈمی جن نشان نمبر ۳۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۵

(م۔ ل)

مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور کی کلاسیکی مطبوعات

پاکستان میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر مجلس ترقیٔ ادب لاہور قدیم اُردو اساتذہ کے نثری اور منظوم شاہکار جدید اصولوں کے مطابق مرتب کرا کے شایانِ شان نفاست کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ ان کتابوں میں متن کی صحت، علامات وقف اور پیراگراف بنانے کا خاص خیال رکھا گیا ہے، نیز کتاب کی ادبی اہمیت، مصنف کے حالات زندگی اور طرزِ نگارش پر جامع مقدمے لکھوا کر شاملِ کتاب کیے گئے ہیں۔ تمام کتابیں دیدہ زیب ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں قیمتیں انتہائی کم رکھی گئی ہیں تاکہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔

اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں :-

۱۔ مسافرانِ لندن (سرسید کا سفرنامۂ لندن) مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۲/-

۲۔ قصصِ ہند، از شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ۲/-

۳۔ ابن الوقت، از شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد دہلوی ۳/۵۰

۴۔ وکرم اروسی، از مہاکوی کالی داس، ترجمہ محمد مرزا لکھنوی، مرتبہ عشرت رحمانی ۱/۷۵

۵۔ رسومِ ہند، از رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی، کپتان ڈبلیو۔ جے۔ ہالرائیڈ ۳/۵۰

۶۔ حیاتِ سعدی، از شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۲/۵۰

۷۔ فردوسِ بریں، از مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، مرتبہ سید وقار عظیم ۲/-

۸۔ مذہبِ عشق، از نہال چند لاہوری، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی ۲/-

۹۔ سوانح مولانا روم، از شبلی نعمانی، مرتبہ سید عابد علی عابد ۲/۵۰

۱۰۔ مقالاتِ سرسید (دس حصوں میں) مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی حصہ اول: ۴/۵۰، حصہ دوم: ۲/۵۰، حصہ سوم: ۳/-، حصہ چہارم: ۵/۵۰، حصہ پنجم: ۴/۵۰، حصہ ششم: ۴/۵۰، حصہ ہفتم: ۲/۵۰، حصہ ہشتم: ۱/۷۵، حصہ نہم: ۲/۵۰، حصہ دہم: ۲/۷۵

۱۱۔ دیوان خواجہ میر درد، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی ۳/۵۰

۱۲۔ فسانۂ مبتلا، از ڈپٹی نذیر احمد ۴/۵۰

۱۳۔ قواعدِ زبان اُردو مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ ۲/-

۱۴۔ نورتن، از محمد بخش مہجور ۶/-

۱۵۔ مہتاب داغ [illegible]/۵۰

مجلس ترقیٔ ادب [illegible] کلب روڈ لاہور

۳۰ تیس سال کے بعد

نقشِ چغتائی

کا نیا ایڈیشن نہایت آب و تاب اور رعنائی سے شائع کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

تصاویر کی ندرت۔ حسنِ طباعت۔ سائز۔ کاغذ۔ جلد۔ ضخامت کے اعتبار سے پہلے ایڈیشن سے بالکل مختلف، نہایت جاذبِ نظر اور دلکش ہے۔

چغتائی آرٹ

کی رنگینیوں کا بے مثل مرقع ہے۔ اس کی اشاعت پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ نیا ایڈیشن

چھ رنگین تصاویر۔ سولہ ایک رنگ تصاویر اور تین صفحۂ جمیل سے مزین ہے۔ ہر ایک صفحہ منقش حاشیہ کے ساتھ دو رنگ میں اور تمام متن بلاک میں ولائیتی کاغذ پر چھپا ہے

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

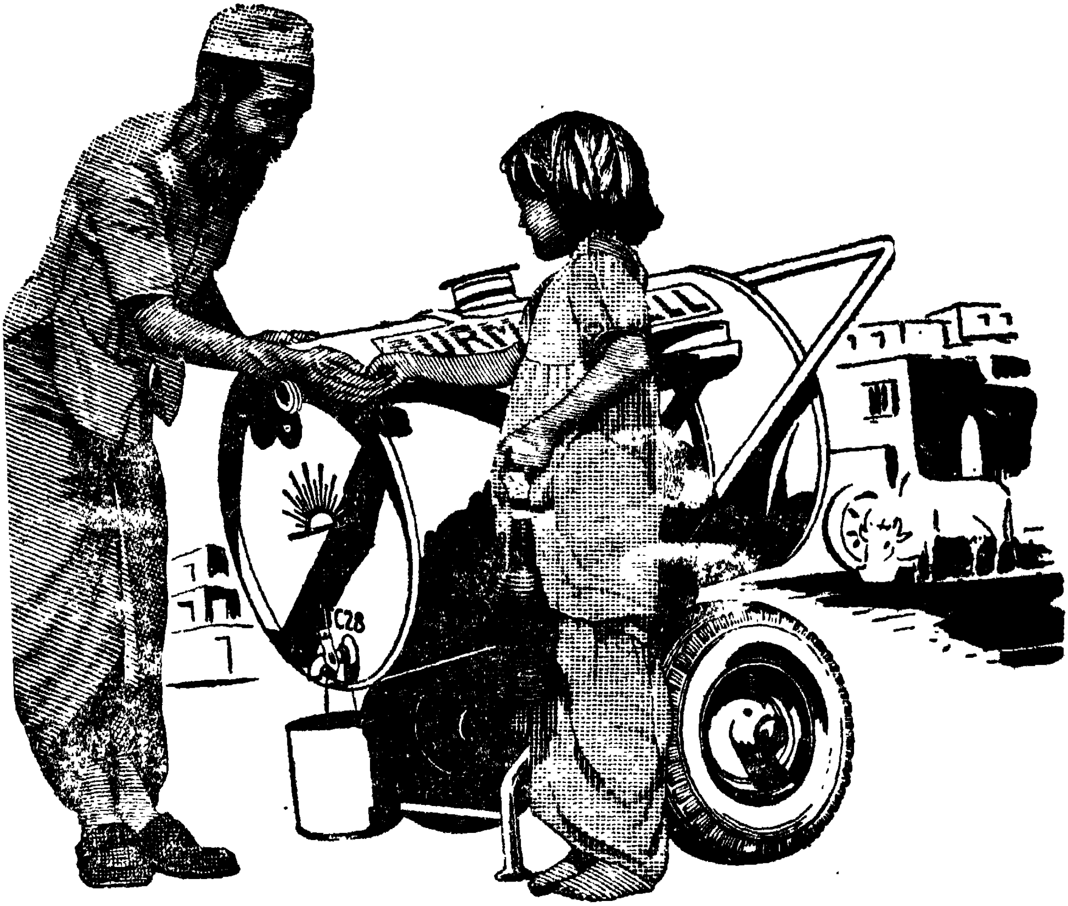
کی مثال قائم کی گئی ہے۔

آرٹ اور ادب

اس غیر فانی نقش کو دیکھ کر آپ پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہوگی۔ مصوری کی عدیم النظیر کے علاوہ اردو ادب اور طباعت کی عظیم الشان خدمت انجام دی گئی ہے۔

جلد سنہری نہایت خوبصورت بالکل نما

قیمت پچیس روپے



ہماری کتابیں

جو علم و ادب کی آبرو ہیں

غیرتِ بہارستان	امیر مینائی	انتخابِ کلام	۳/۵۰
بادۂ شبانہ	اختر انصاری	"	۳/۵۰
من آنم	فراق گورکھپوری	مجموعۂ مکاتیب	۴/-
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	مجموعۂ کلام	۷/۵۰
برف کے پھول	کرشن چندر	ناول	۲/-
میری یادوں کے چنار	"	"	۴/-
گدھے کی واپسی	"	طنزیہ	۳/-
سورج نہیں نکلا	اے حمید	ناول	۴/-
صاحب	محمد طفیل	خاکے	۳/-
جناب	"	"	۳/-
اندازے	فراق گورکھپوری	تنقید	۵/-
ہماری داستانیں	سید وقار عظیم	"	۵/-
انتقاد	عابد علی عابد	"	۳/-
ید بیضا	"	ڈرامے	۵/-
ایک حمام میں	عشرت رحمانی	ڈراما	۳/-
خلفائے محمد	عمر ابو النصر	سوانح	۱۰/-
بازار حیات	احمد ندیم قاسمی	افسانے	۳/-
آنچل	"	"	۳/-
اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	تنقید	۲/-
[illegible]	ابو عبید قریشی	سوانح	۴/۲۵
[illegible]کے پیچھے	منٹو	افسانے	۳/-
[illegible]	[illegible]	مجموعۂ کلام	۲/۵۰
			۲/-
			/۵۰

رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ	ناول	۷/-
مٹی کی مونالیزا	اے حمید	افسانے	۴/۵۰
سیاستِ الٰہیہ	ابنِ تیمیہ		۲/۵۰
مضامین جمال الدین افغانی		مضامین	۵/-
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	ناول	۴/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	"	۳/-
سویزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	خطوط	۲/۵۰
آنچ	قیسی رام پوری	ناول	۳/-

اسلامی کتب

بلالؓ	عباس محمود العقاد	سوانح	۲/۲۵
عہدِ نبوی کی اسلامی سیاست	عبد المتعال الصعیدی		۵/-
اسلام کا نظامِ عدل	محمود بن محمد بن عرنوس		۴/۵۰
خدیجہؓ	عبدالحمید الزہراوی	سوانح	۴/-
نبیٔ اُمّی	عمر ابوالنصر	"	۵/-
عرب کے تین مدبر	"	"	۳/-
خالدؓ		"	۴/-

تصانیف شوکت تھانوی

بھابی	۴/۵۰	بارِ خاطر	۴/-	مولانا	۳/۵۰
خدانخواستہ	۳/-	کُتیا	۳/۵۰	سسرال	۲/۲۵
مابدولت	۳/-	جوڑ توڑ	۴/-	وغیرہ وغیرہ	۳/-
غالب کے ڈرامے	۲/۵۰	نیلوفر	۶/-	بے قاعدہ	۲/-
غزالہ	۶/-	سودیشی ریل	۳/-	سانچ کو آنچ	[illegible]
کارٹون	۳/۵۰	بقراط	۲/۵۰	مضامینِ شوکت	[illegible]
نمک مرچ	۳/-	قاضی جی حصہ اوّل	۲/۵۰	قاضی جی حصہ دوم	[illegible]
		قاضی جی حصہ سوم			